علوم القرآن

تالیف

شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم

شیخ الحدیث ونائب صدر جامعہ دارالعلوم کراچی

ناشر

مکتبہ دارالعلوم کراچی

Marfat.com

عُلومُ القرآن

اور اصول تفسیر

تالیف

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ناشر

مکتبہ دار العلوم کراچی

Marfat.com

جملہ حقوق ملکیت بحق مکتبہ دار العلوم کراچی (وقف) محفوظ ہیں

باہتمام : شرافت علی

طبع جدید : یکم ربیع الاوّل ۱۴۳۶ھ بمطابق ۲۴ دسمبر ۲۰۱۴ء

اطلاع

کمپوزنگ کے ساتھ طبع ہونے والا یہ نیا ایڈیشن حضرت مصنف مدظلہم ودامت برکاتہم کی ترمیم وتصحیح کے بعد شائع کیا گیا ہے

ناظم مکتبہ دار العلوم کراچی

یکم ربیع الاوّل ۱۴۳۶ھ

ملنے کے پتے

مکتبہ دار العلوم کراچی
(احاطہ جامعہ دار العلوم کراچی)
فون نمبر : 021-35042280
بذریعہ استقبالیہ : 021-35049774-
ای میل : mdukhi@gmail.com

- ادارۃ المعارف احاطہ جامعہ دار العلوم کراچی
- مکتبہ معارف القرآن احاطہ جامعہ دار العلوم کراچی
- ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور
- ادارہ اسلامیات اردو بازار کراچی
- دار الاشاعت اردو بازار کراچی

Marfat.com

انتساب

اپنے والد ماجد

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ

کی خدمت میں

جن کی ذات میں احقر کے لئے ایک مثالی، بلکہ بے مثال باپ، ایک ہمہ جہت استاد اور ایک باریک بیں مربی و شیخ کی شفقتیں جمع ہیں،

اور

رُوئے زمین پر احقر کی محبت ہی نہیں، عقیدت کا بھی ان سے بڑا مرکز کوئی نہیں، حفظہ اللہ تعالیٰ۔

یہ حقیر کاوش اُن کی پیشگی اجازت کے بغیر ان کے نام نامی سے منسوب کر کے عرض گذار ہوں کہ ؂

اگر سیاہ دلم ، داغِ لالہ زارِ توام
وگر کشادہ جبینم ، گلِ بہارِ توام

محمد تقی عثمانی

Marfat.com

فہرستِ مضامین

مضمون	صفحہ
تقریظ: حضرت مولانا محمد یوسف بنوری مدظلہٗ	۱۷
پیش لفظ: حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہٗ	۱۹
حرف آغاز: مؤلف	۲۳
حصہ اوّل، القرآن الکریم	
باب اوّل، تعارف	**۲۹**
قرآن کریم کا نام اور وجہ تسمیہ	۲۹
وحی اور اس کی حقیقت	۳۱
وحی کی ضرورت	۳۱
وحی کا مفہوم	۳۳
وحی کی تعلیمات	۳۶
وحی کی اقسام	۳۷
(۱) وحی قلبی	۳۷
(۲) کلام الٰہی	۳۷
وحی ملکی	۳۸
حضور ﷺ پر نزول وحی کے طریقے	۳۸
(۱) صلصلۃ الجرس	۳۹
(۲) تمثیل ملک	۴۲

Marfat.com

صفحہ	مضمون
۴۳	۳...... فرشتہ کا اصلی شکل میں آنا
۴۴	۴...... رؤیائے صادقہ
۴۴	۵...... کلام الٰہی
۴۵	۶...... نفث فی الروع
۴۵	وحی اور کشف والہام
۴۶	وحی متلو اور غیر متلو
۴۹	وحی پر عقلی شبہات
۵۴	کیا قرآن کے صرف معنی وحی ہیں؟
۵۹	**باب دوم، تاریخ نزولِ قرآن**
۶۰	پہلا نزول
۶۱	دوسرا نزول
۶۲	سب سے پہلی نازل ہونے والی آیت
۶۵	مکی اور مدنی آیات
۶۷	مکی اور مدنی آیتوں کی خصوصیات
۷۰	نزول کا وقت اور مقام
۷۰	۱...... نہاری
۷۰	۲...... لیلی
۷۰	۳...... صیفی
۷۱	۴...... شتائی
۷۱	۵...... فراشی
۷۱	۶...... نومی
۷۲	۷...... سماوی

Marfat.com

مضمون	صفحہ

۸.....فضائی ۷۲
قرآن کریم کا تدریجی نزول ۷۲
ترتیب نزول اور موجودہ ترتیب ۷۴
اسبابِ نزول ۷۷
شانِ نزول کی اہمیت اور اس کے فوائد ۷۸
اسبابِ نزول اور شاہ ولی اللہؒ ۸۴
سبب نزول اور احکام کا عموم وخصوص ۸۷
سببِ نزول اور اختلافِ روایات ۹۱
تکرارِ نزول اور اس کی حقیقت ۹۷

باب سوم، قرآن کے سات حروف ۱۰۱

حروفِ سبعہ کا مفہوم ۱۰۲
''سبعۃ احرف'' کی راجح ترین تشریح ۱۱۰
اس قول کی وجوہِ ترجیح ۱۱۴
اس قول پر وارد ہونے والے اعتراضات اور ان کا جواب ۱۱۵
سات حروف کے ذریعہ کیا آسانی پیدا ہوئی؟ ۱۱۷
حروف سبعہ اب بھی محفوظ ہیں یا متروک ہوگئے؟ ۱۲۱
حافظ ابن جریرؒ کا نظریہ اور اس کی قباحتیں ۱۲۲
امام طحاویؒ کا قول ۱۲۶
سب سے بہتر قول ۱۲۷
اس قول کے قائلین ۱۲۸
اس قول کے دلائل ۱۴۰
اس قول پر وارد ہونے والے سوالات اور ان کا جواب ۱۴۵

Marfat.com

مضمون	صفحہ
لغتِ قریش پر لکھنے کا مطلب	۱۴۹
مرادف الفاظ سے تلاوت کا مسئلہ	۱۵۱
حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کا مصحف	۱۵۴
نتائجِ بحث	۱۶۰
سات حروف کے بارے میں اختلافِ آراء کی حقیقت، ایک غلط فہمی کا ازالہ	۱۶۱
باب چہارم، ناسخ و منسوخ	۱۶۵
نسخ کی حقیقت	۱۶۵
نسخ کا عقلی و نقلی ثبوت	۱۶۵
نسخ کے بارے میں متقدمین اور متاخرین کی اصطلاحات کا فرق	۱۶۷
قرآن کریم میں نسخ کی بحث	۱۶۹
منسوخ آیاتِ قرآنی کی تعداد	۱۷۳
نتیجہ بحث	۱۷۸
باب پنجم، تاریخ حفاظت قرآن	۱۷۹
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حفاظتِ قرآن	۱۷۹
عہدِ رسالت میں کتابتِ قرآن پہلا مرحلہ	۱۸۳
حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جمع قرآن، دوسرا مرحلہ	۱۸۷
حضرت عثمانؓ کے عہد میں جمعِ قرآن، تیسرا مرحلہ	۱۹۲
تسہیل تلاوت کے اقدامات چوتھا مرحلہ	۱۹۸
نقطے	۱۹۸
حرکات	۲۰۰
احزاب یا منزلیں	۲۰۰

صفحہ	مضمون

اجزاء یا پارے ۲۰۱

اخماس اور اعشار ۲۰۱

رکوع ۲۰۲

رموز واوقاف ۲۰۳

قرآن کریم کی طباعت، پانچواں مرحلہ ۲۰۵

قرآن اور ان کی تدوین ۲۰۶

باب ششم، حفاظت قرآن سے متعلق شبہات اور اُن کا جواب ۲۱۳

ابتدائی زمانہ کی آیات محفوظ نہیں رہیں: پہلا اعتراض ۲۱۴

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مرتبہ ایک آیت یاد نہیں رہی؛ دوسرا اعتراض ۲۱۶

سورۂ نساء میں سورۂ انعام کا حوالہ تیسرا اعتراض ۲۱۸

امام بخاریؒ پر مارگولیوتھ کا ایک بہتان؛ چوتھا اعتراض ۲۲۰

حضرت عائشہؓ سے کچھ آیتیں گم ہوگئیں تھیں؛ پانچواں اعتراض ۲۲۲

عہدِ رسالتؐ میں حفاظ کی تعداد؛ چھٹا اعتراض ۲۲۳

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور معوذتین؛ ساتواں اعتراض ۲۲۵

خلافت صدیقی میں جمع قرآن کی روایت مستشرقین کا؛ آٹھواں اعتراض ۲۲۸

خلافتِ صدیقی تک پورا قرآن لکھا نہیں گیا تھا؛ نواں اعتراض ۲۳۳

مختلف قراءتیں کس طرح وجود میں آئیں؛ دسواں شبہ ۲۳۵

قرآن کریم کی شاذ قراءتیں اور اُن کی حقیقت؛ گیارہواں شبہ ۲۳۸

باب ہفتم، حقانیتِ قرآن ۲۴۳

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ۲۴۳

کتبِ مقدسہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتیں ۲۴۴

Marfat.com

مضمون	صفحہ

اعجازِ قرآن ۲۵۰

قرآن کریم کی اعجازی خصوصیات ۲۵۶

الفاظ کا اعجاز ۲۵۶

ترکیب کا اعجاز ۲۶۰

اسلوب کا اعجاز ۲۶۱

نظم کا اعجاز ۲۶۷

قرآن کریم کی پیشگی خبریں ۲۶۹

رومیوں کی فتح ۲۷۰

فتحِ مکہ کی خبر ۲۷۲

یہودیوں کی تمنائے موت ۲۷۳

قرآن کریم کی حفاظت ۲۷۴

قرآن کریم کے انکشافات ۲۷۷

حقانیتِ قرآن اور مغرب کے غیر مسلم مصنفین ۲۷۸

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ کتاب ۲۸۵

قرآن کریم پر چند اعتراضات ۲۸۹

حضرت مریمؑ کے والد کا نام ۲۹۰

فرعون کا وزیر ہامان ۲۹۱

باب ششم، مضامین قرآن ۲۹۵

عقائد (ایجابی پہلو) ۲۹۵

نقلی دلائل ۲۹۶

منطقی دلائل ۲۹۷

Marfat.com

مضمون	صفحہ

قیاسِ استثنائی ۲۹۹
السبر والتقسیم ۲۹۹
تسلیم ۳۰۱
انتقال ۳۰۲
مشاہداتی دلائل ۳۰۳
تجرباتی دلائل ۳۰۶
عقائد (سلبی پہلو) ۳۰۷
بُت پرست مشرکین ۳۰۷
یہودی ۳۱۱
نصاریٰ ۳۱۳
منافقین ۳۱۴
احکام ۳۱۵
شانِ نزول ۳۱۷
قصص ۳۱۹
ماضی کے واقعات ۳۱۹
واقعات میں تکرار کیوں ہے؟ ۳۲۰
مستقبل کے واقعات ۳۲۲
امثال ۳۲۲

Marfat.com

مضمون | صفحہ

حصّہ دوم، علم تفسیر

باب اوّل، علم تفسیر اور اُس کے مآخذ ۳۲۷
تعارف ۳۲۷
تفسیر اور تأویل ۳۲۹
تفسیر کے مآخذ ۳۳۱
پہلا مأخذ؛ خود قرآن کریم ۳۳۲
دوسرا مأخذ؛ احادیث نبویؐ ۳۳۸
تیسرا مأخذ؛ اقوال صحابہؓ ۳۴۲
چوتھا مأخذ؛ تابعین کے اقوال ۳۴۴
پانچواں مأخذ؛ لغتِ عرب ۳۴۵
چھٹا مأخذ؛ عقل سلیم ۳۴۷
باب دوم، تفسیر کے ناقابلِ اعتبار مآخذ ۳۴۹
۱..... اسرائیلی روایات ۳۴۹
کعب الاحبار کون تھے؟ ۳۵۲
وہب بن منبہ ۳۵۳
حضرت عبداللہ بن عمروؓ ۳۵۵
۲..... صوفیائے کرام کی تفسیریں ۳۵۷
۳..... تفسیر بالرائے ۳۶۰
تفسیر میں گمراہی کے اسباب ۳۶۲
۱..... پہلا سبب؛ نااہلیت ۳۶۳
چند غلط فہمیاں ۳۶۵

مضمون	صفحہ

علماء اور اجارہ داری ۳۶۷

علماء اور پاپائیت ۳۶۹

۲..... قرآن کریم کو اپنے نظریات کا تابع بنانا ۳۷۴

۳..... زمانہ کے افکار سے مرعوبیت ۳۷۵

معجزات کا مسئلہ ۳۷۹

خلافِ عقل اور ماورائے عقل ۳۸۷

۴..... قرآن کریم کے موضوع کو غلط سمجھنا ۳۸۹

باب سوم، تفسیر کے چند ضروری اصول ۴۰۱

۱..... قرآن کریم اور مجاز ۴۰۱

۲..... قرآن کریم اور عقلی دلائل ۴۱۱

۳..... قطعی عقلی دلائل ۴۱۳

۴..... ظنی عقلی دلائل ۴۱۳

۵..... وہمی عقلی دلائل ۴۱۴

۶..... قطعی نقلی دلائل ۴۱۴

۷..... ظنی نقلی دلائل ۴۱۴

۸..... وہمی نقلی دلائل ۴۱۵

۳..... احکام شرعیہ اور عقل ۴۲۳

۱..... آزاد عقل اور ہدایت و گمراہی ۴۲۴

اسلامی احکام کی حکمتیں اور دین میں ان کا قیام ۴۳۳

حکمتوں پر حکم کا مدار نہیں ہوتا ۴۳۵

احکام شریعت کا اصل مقصد اتباع کا امتحان ہے ۴۳۸

Marfat.com

صفحہ	مضمون

قرآن وسنت کی تعبیر کا صحیح طریقہ ۴۴۲

زمانہ کی تبدیلی اور احکام شرعیہ ۴۴۶

زمانہ کی تبدیلی کا مطلب ۴۴۹

عقل کا صحیح دائرۂ کار ۴۵۰

باب چہارم، قرونِ اولیٰ کے بعض مفسرین ۴۵۵

حضرت عبداللہ بن عباسؓ ۴۵۵

گولڈ زیہر کا ایک مغالطہ ۴۵۸

مروّجہ تفسیر ابن عباسؓ کی حیثیت ۴۶۰

حضرت علیؓ ۴۶۰

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ۴۶۱

حضرت ابیؓ ابن کعبؓ ۴۶۲

صحابہؓ کے بعد ۴۶۳

حضرت مجاہدؒ ۴۶۳

حضرت سعید بن جبیرؒ ۴۶۴

حضرت عکرمہؒ ۴۶۵

عکرمہؒ پر اعتراضات کی حقیقت ۴۶۶

گولڈ زیہر کا ایک مغالطہ ۴۶۹

حضرت طاؤسؒ ۴۷۱

حضرت عطاء بن ابی رباحؒ ۴۷۲

حضرت سعید بن المسیبؒ ۴۷۳

محمد بن سیرینؒ ۴۷۴

Marfat.com

مضمون	صفحہ

حضرت زید بن اسلمؒ ۴۷۵
حضرت ابوالعالیہؒ ۴۷۷
حضرت عروۃ ابن الزبیرؒ ۴۷۷
حضرت حسن بصریؒ ۴۷۸
حضرت قتادہؒ ۴۷۹
محمد بن کعب القرظیؒ ۴۷۹
حضرت علقمہؒ ۴۸۰
حضرت اسودؒ ۴۸۱
مرۃ الھمدانیؒ ۴۸۱
حضرت نافعؒ ۴۸۲
حضرت شعبیؒ ۴۸۳
حضرت ابن ابی ملیکہؒ ۴۸۳
حضرت ابنِ جریجؒ ۴۸۴
حضرت ضحاکؒ ۴۸۵

قرونِ اولیٰ کے ضُعفاء یا مختلف فیہ مفسرین ۴۸۶

سُدّی کبیر ۴۸۶
سُدّی صغیر ۴۸۹
مقاتل ۴۹۰
ربیع بن انسؒ ۴۹۴
عطیۃ العوفی ۴۹۵
عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم ۴۹۶
کلبی ۴۹۷

Marfat.com

مضمون | صفحہ

متأخرین کی چند تفسیریں ۵۵۰

تفسیر ابن کثیر ۵۰۱

تفسیر کبیر ۵۰۳

تفسیر ابی السعود ۵۰۵

تفسیر القرطبی ۵۰۵

روح المعانی ۵۰۵

بیان القرآن، معارف القرآن ۵۰۷

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ وَاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ

تقریظ

از شیخ الحدیث حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری صاحب

اَمَّـا بَـعْـدُ ، قرآن کریم کے علوم پر عربی زبان میں عمدہ سے عمدہ قدماء ومتاخرین کی کتابیں آرہی ہیں، لیکن ان سے زیادہ تر علماء ہی استفادہ کر سکتے ہیں، اور زیادہ تر وہ کتابیں قدیم طرز، قدیم حاجات اور قدیم ذوق کے پیش نظر تصنیف کی گئی ہیں، اور بلاشبہ ان کتابوں نے اس وقت کے تقاضوں کو بہت خوبی سے پیش کیا، اور اُمت کو نفع پہنچایا، دہلی میں جب سرسید احمد خاں کی تفسیر وجود میں آئی ، اور ان کی تصانیف شائع ہوئی ہیں ، اس تفسیر سے جو اُمت کے عقائد پر زد پڑی ، اور جدید نسل کے سامنے غیر واقعی نظریات پیش کئے گئے ، نبوت کو کسبی کہا گیا، معجزات سے جنت ودوزخ ، ملائکہ وشیاطین کے وجود سے انکار کیا گیا، اور قرآنی صداقت کے لئے جدید اصول تجویز کئے گئے، حق تعالیٰ نے مولانا عبدالحق حقانی دھلوی دیوبندی کو کھڑا کیا، فتح المنان کے نام سے عمدہ تفسیر لکھی، اور ''البیان فی علوم القرآن'' کے نام سے بینظیر مقدمہ لکھا، اور تفسیر کی پہلی جلد میں اس مقدمہ کی تلخیص کی گئی، نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اس ضرورت کو پورا کیا، لیکن عرصہ سے یہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی ، کہ جدید

Marfat.com

نسل کی رہنمائی کے لئے جدید انداز پر ایسی کتاب اور قرآنی حقائق کو واشگاف کرنے کے لئے ایک مبسوط مفصل مقدمہ لکھا جائے، جس میں وحی اور نزول قرآن، ترتیبِ نزول، قراآتِ سبعہ، اعجازِ قرآن وغیرہ وغیرہ، حقائقِ قرآنی کے ابحاث اس طرح بصیرت افروز انداز سے آجائیں، جس میں مستشرقین کے اوہام ووساوس اور خرافات یا معاندانہ شکوک وشبہات کا تشفی کن مواد آجائے، اور مستشرقین کی قیادت میں مستغربین (مغرب زدہ طبقہ) کے مزعومات کا بھی جواب آجائے، الحمد للہ کہ اس عظیم اور اہم ترین مقصد کو ہمارے برادر محترم مولانا محمد تقی صاحب عثمانی خلف الرشید حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت حیاتہم المبارکہ نے بہت خوبی کے ساتھ معارف القرآن کا مبسوط مقدمہ تالیف کر کے اس دینی وعلمی ضرورت کو پورا کردیا، اور اُمت پر احسان کیا، حق تعالیٰ اُن کے علم، ان کے قلم میں برکتیں عطا فرمائیں، اور مزید توفیقات الٰہیہ سے سرفراز فرمائیں،

مقدمہ کا کچھ حصہ تو مسلسل دیکھا، کچھ جستہ جستہ مقامات سے دیکھا، الحمد للہ کہ بہت خوش ہوا، اور دل سے دعاء نکلی، وفّقنا اللّٰہُ وایّاہ لخدمة دینیه ابتغاء لوجه الکریم، وصلی اللّٰہ علیٰ سیدنا محمد سید العالمین وخاتم النبیین وعلیٰ اٰلہٖ واصحابه وعلماء امتہٖ اجمعین،

محمد یوسف بنوری عفی عنہ
مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی،

جمعرات
۱۲/جمادی الاولیٰ ۱۳۹۶ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ''معارف القرآن'' کی صورت میں احقر کو قرآن کریم کی ایک خدمت کی توفیق عطا فرمائی، اور یہ اطلاعات باعثِ شکر ومسرّت ہوتی رہتی ہیں کہ بفضلہٖ تعالیٰ اس سے مسلمانوں کو نفع پہنچ رہا ہے، جب اس تفسیر کی جلد اوّل نظر ثانی اور ترمیم کے بعد دوبارہ شائع ہونے لگی تو احقر کی خواہش ہوئی کہ اس کے شروع میں ''علوم القرآن'' کی معلومات پر مشتمل ایک مقدمہ شامل کر دیا جائے، مجھے اپنے امراض اور ضعف کی بناء پر خود اس کام کا تحمل نہ رہا تھا، اس لئے برخوردار عزیز محمد تقی سلمہٗ کو اس مقدمہ کی تالیف سپرد کی، انہوں نے ایک مختصر مقدمہ لکھ کر تو معارف القرآن جلد اول کے ساتھ لگا دیا، لیکن اسی دوران انہوں نے اسی موضوع پر ایک مفصل اور نہایت مفید کتاب کی بنیاد بھی ڈال دی، جو بفضلہٖ تعالیٰ اب پایۂ تکمیل تک پہنچ کر ''علوم القرآن'' کے نام سے شائع ہو رہی ہے۔

''علوم القرآن'' ایک وسیع علم ہے جس پر عربی میں ضخیم کتابیں موجود ہیں، اور اردو میں بھی کئی کتابیں آچکی ہیں، لیکن اس موضوع پر ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جس میں متعلقہ مباحث کو پوری تحقیق کے ساتھ حل بھی کیا گیا ہو، اور عہد حاضر میں مستشرقین اور متجدّدین نے

Marfat.com

جو شکوک وشبہات پیدا کر دیئے ہیں اُن کا علمی جواب بھی دیا گیا ہو، اس کے علاوہ ہمارے زمانہ میں بہت سے لوگوں نے تفسیر کی اہلیت کے بغیر قرآن کریم کی جو تفسیریں لکھدی ہیں اور ان میں تفسیر قرآن کے مسلّم اصولوں کو جس طرح پامال کیا ہے اُس کے پیش نظر یہ بھی ضروری تھا کہ تفسیر کے اصولوں کی وضاحت کی جائے، اور اُن کو نظر انداز کرنے سے جو گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں اُن کی طرف توجہ دلائی جائے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس کتاب میں وقت کی اس اہم ضرورت کو میرے وہم وگمان سے بھی زیادہ اچھی طرح پورا کیا گیا ہے، اور مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اگر اس کتاب کو حق طلبی اور انصاف پسندی کے جذبے کے ساتھ پڑھا گیا تو انشاء اللہ اس سے علم تفسیر میں بصیرت بھی حاصل ہوگی، اور اس راہ میں جو غلط فہمیاں، شکوک وشبہات اور گمراہیاں، مستشرقین کی تلبیسات اور عام لوگوں کی ناواقفیت سے عموماً ذہنوں میں پیدا ہوتی ہیں، ان کا بھی تشفی بخش حل مل جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کی تالیف کو برخوردار عزیز کے سپرد کرنے کی پہلی وجہ تو میرے مسلسل امراض اور روز افزوں ضعف تھا، اور یہ سمجھ کر یہ اقدام کیا تھا، کہ "اگر پدر نتواند پسر تمام کند" کا مصداق ہو تو ہو ہی جائے گا، لیکن کتاب کی تصنیف سامنے آئی، میں اگرچہ ضعفِ بصارت کے سبب اس کو خود نہیں دیکھ سکا، مگر اس کے بہت سے مباحث کو پڑھوا کر سنا تو میری مسرّت کی حد نہ رہی، جس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، کیونکہ یہ مکمل کتاب ماشاء اللہ ایسی ہے کہ اگر میں خود بھی اپنی تندرستی کے زمانے میں لکھتا تو ایسی نہ لکھ سکتا تھا، جس کی دو وجہ ظاہر ہیں، اوّل تو یہ کہ عزیز موصوف نے اس کی تصنیف میں جس تحقیق وتنقید اور متعلقہ کتابوں کے عظیم ذخیرہ کے مطالعہ سے کام لیا، وہ میرے بس کی بات نہ تھی، جن کتابوں سے یہ مضامین لئے گئے ہیں ان سب مأخذوں کے حوالے بقید ابواب وصفحات حاشیہ میں درج ہیں، انہی پر سرسری نظر ڈالنے سے ان کی تحقیقی کاوش کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

اور دوسری بات اس سے بھی زیادہ ظاہر یہ ہے کہ میں انگریزی زبان سے ناواقف

Marfat.com

ہونے کی بناء پر مستشرقین یورپ کی اُن کتابوں سے بالکل ہی ناواقف تھا جن میں اُنہوں نے قرآن کریم اور علوم قرآن کے متعلق زہر آلود تلبیسات سے کام لیا ہے، برخوردار عزیز نے چونکہ انگریزی میں بھی ایم، اے، ایل، ایل، بی اعلیٰ نمبروں میں پاس کیا، انہوں نے ان تلبیسات کی حقیقت کھول کر وقت کی اہم ضرورت پوری کردی۔

دل سے دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے اس نورِ نظر کو عافیتِ کاملہ کے ساتھ عمرِ دراز نصیب فرماویں، اور تمام شرور وآفات اور فتنِ ظاہرہ وباطنہ سے حفاظت کے ساتھ مزید دینی علمی خدمات کی توفیق عطا فرماویں، اور صدق واخلاص اور اپنی رضاءِ کامل عطا فرماویں، اور اس تصنیف کو اپنے فضل سے قبول فرما کر ان کے لئے اور میرے لئے ذریعۂ نجات بنائیں، اور مسلمانوں کو اس سے زیادہ سے زیادہ نفع پہونچائیں۔

واللّٰہُ المُستعان وعلیہ التکلان

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

دار العلوم کراچی ۱۴

یکم جمادی الثانیہ ۱۳۹۶ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

حرفِ آغاز

قرآن کریم پوری انسانیت کے لئے اللہ تعالیٰ کا اتنا بڑا انعام ہے کہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی دولت اس کی ہمسری نہیں کر سکتی، یہ وہ نسخہ شفاء ہے جس کی تلاوت، جس کا دیکھنا، جس کا سننا سنانا، جس کا سیکھنا سکھانا، جس پر عمل کرنا، اور جس کی کسی بھی حیثیت سے نشر و اشاعت کی خدمت کرنا دنیا اور آخرت دونوں کی عظیم سعادت ہے۔

صحیح مسلمؒ وغیرہ میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک روز ہم صفہ میں بیٹھے تھے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا، "تم میں سے کس کو یہ بات پسند ہے کہ وہ روزانہ صبح کو بُطحان یا عقیق (کے بازار) میں جایا کرے، اور ہر روز دو بہترین قسم کی اونٹیاں کسی گناہ یا قطع رحمی کا ارتکاب کئے بغیر پکڑ لایا کرے؟" ہم نے عرض کیا: "یارسول اللہؐ! اس کو تو ہم میں ہر ایک پسند کرے گا" آپؐ نے فرمایا: "اگر کوئی شخص روزانہ مسجد میں جا کر دو آیتیں سیکھ لیا کرے یا پڑھ لیا کرے تو یہ اس کے لئے دو اونٹنیوں سے بہتر ہے، اور تین آیتیں سیکھے تو وہ تین اونٹنیوں سے اور چار سیکھے تو وہ چار سے بہتر ہے"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی تلاوت، اس کے معانی کا علم حاصل کرنے، اس پر

Marfat.com

عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کے جو فضائل بیان فرمائے، اور امت کو جس طرح اس کی ترغیب دی، مذکورہ بالا حدیث اُس کی صرف ایک مثال ہے، اور حدیث کے مجموعے اس قسم کی احادیث سے بھرے پڑے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اُمتِ محمدیہؐ (علیٰ صاحبہا السلام) نے قرآن کریم اور اُس کے علوم کی ایسے ایسے پہلوؤں سے خدمت کی ہے، اور اس کے الفاظ و معانی کو محفوظ رکھنے کے لئے ایسی بے مثال کاوشیں کی ہیں کہ اُن کی تفصیلات کو دیکھ کر عقل مبہوت رہ جاتی ہے۔

قرآن کریم کے معانی مطالب کا تو کہنا ہی کیا ہے، اس اُمت نے کتاب الٰہی کے الفاظ، اس کی حرکات وسکنات اور اس کے حروف کو ٹھیک ٹھیک زبان سے ادا کرنے کی غرض سے ایسے ایسے علوم وفنون کی بنیاد ڈالی ہے جن کی نظیر دنیا کے کسی مذہب اور کسی زبان میں نہیں ملتی، ایک تجوید وقراآت ہی کے علم کو لے لیجئے، تو اس فن کی تفصیلات اور اس کی باریکیوں کی تشریح کے لئے اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ اُن سے ایک مستقل کتب خانہ تیار ہوسکتا ہے۔

غرض جن مختلف جہتوں اور گوناگوں پہلوؤں سے قرآن کریم کی خدمت کی گئی ہے اُنہی میں سے ایک خاص رُخ کی خدمت وہ کتابیں ہیں جو ''علوم القرآن'' کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔

''علوم القرآن'' ایک وسیع وعریض علم ہے، اور اس میں علم تفسیر کے مبادی اور اصول واضح کیے جاتے ہیں، قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کس طرح نازل ہوتا تھا؟ وحی کی حقیقت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی یہ کتاب کس ترتیب سے نازل ہوئی؟ کتنے عرصہ میں اس کا نزول مکمل ہوا؟ مکی اور مدنی سورتوں کا کیا مطلب ہے؟ شان نزول کسے کہتے ہیں؟ تفسیر قرآن میں اس کا کیا مقام ہے؟ قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ ہے یا نہیں؟ قرآن کے مختلف حروف اور قراءتوں کا کیا مطلب ہے؟ قرآن کریم کس قسم کے مضامین پر مشتمل ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو کس طرح محفوظ رکھا ہے؟ اور اس کی کتابت وطباعت کتنے مراحل سے گزری ہے؟ قرآن کریم کی تفسیر کے کیا اصول اور آداب ہیں؟ اللہ تعالیٰ کی اس کتاب کو سمجھنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ اور اس راہ میں کونسی غلطیاں انسان کو گمراہی کی طرف لے جاتی ہیں؟ یہ اور اس قسم

Marfat.com

کے دوسرے بہت سے سوالات کا مفصل جواب ''علوم القرآن'' میں دیا جاتا ہے۔

عربی زبان میں اس موضوع پر علامہ زرکشیؒ کی ''البرہان فی علوم القرآن'' (چار جلدوں میں) علامہ سیوطیؒ کی ''الاتقان'' (دو جلدوں میں) شیخ زرقانیؒ کی ''مناہل العرفان'' (دو جلدوں میں) آج بھی اس علم کی معروف ومتداول کتابیں ہیں جو اپنے موضوع پر مأخذ کی حیثیت رکھتی ہیں، اردو میں بھی اس موضوع پر متعدد کتابیں آئی ہیں، جن میں علامہ عبدالحق حقانیؒ کی ''البیان فی علوم القرآن'' سب سے زیادہ جامع اور ممتاز ہے۔

لیکن زمانہ کے لحاظ سے ضروریات بھی بدلتی رہتی ہیں، اس لئے یہ ضرورت تو عرصہ سے محسوس ہوتی تھی کہ عہدِ حاضر میں مغربی افکار کے زیرِ اثر ان موضوعات پر جو نئے سوالات پیدا ہوئے ہیں اُن کو سامنے رکھتے ہوئے اس موضوع پر کوئی نئی کتاب لکھی جائے، تاہم یہ تصور دُوردُور نہ تھا کہ اس ضرورت کی تکمیل میں مجھ ناچیز کا بھی کوئی حصہ لگ سکے گا۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سعادت مقدر میں تھی، اور اس کے حصول کی تقریب یہ ہوئی کہ احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم نے اردو زبان میں تفسیر ''معارف القرآن'' تالیف فرمائی، جو آٹھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، اور کسی جھجک کے بغیر کہا جاسکتا ہے کہ وہ سلفِ صالحین کے طرز کے مطابق عہدِ حاضر کی بے نظیر اردو تفسیر ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اُسے مقبولیت بھی بیحد عطا فرمائی، اور جب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونے لگا تو حضرت والد صاحب مدظلہم نے احقر کو حکم دیا کہ اس کے شروع میں ''علوم القرآن'' کی ضروری معلومات پر مشتمل ایک مختصر مقدمہ تحریر کروں۔

میں نے تعمیل حکم کے لئے یہ مقدمہ لکھنا شروع کیا، تو وہ پُرانی خواہش اُبھر آئی، اور اختصار کی کوشش کے باوجود یہ مقدمہ طویل ہوتا گیا، جب مسودے کے تقریباً دو سو صفحات لکھ چکا تھا، اور بہت سے ضروری موضوعات ابھی باقی تھے تو خیال آیا کہ اتنا طویل مقدمہ تفسیر کے شروع میں موزوں نہیں ہوگا، اس لئے حضرت والد صاحب مدظلہم کے ایماء پر میں نے تفسیر کے مقدمہ کے لئے تو اختصار کے ساتھ کچھ ضروری معلومات الگ جمع کر دیں جو تفسیر کے

Marfat.com

شروع میں بطور مقدمہ شائع ہوگئیں، اور اس مفصل مقدمہ کو مستقل تصنیف کی صورت دیدی، اپنے مشاغل اور عوارض کی وجہ سے اس کتاب کی تکمیل میں خاصی دیر لگ گئی، تاہم یہ اللہ تعالیٰ کا انعام وکرم ہے کہ جتنے ضروری مباحث میں اس کتاب میں لانا چاہتا تھا وہ اس میں کم وبیش جمع ہوگئے ہیں۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ "علوم القرآن" کے موضوع پر عہدِ حاضر کو جس نئی تصنیف کی ضرورت تھی وہ اس کتاب نے ٹھیک پوری کردی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ انشاء اللہ اس میں موضوع سے متعلق عہدِ حاضر کی ضروریات کا کافی سامان مل جائیگا، احقر نے اس میں "علوم القرآن" کے اُن مشہور مسائل کی تحقیق بھی یکجا کرنیکی کوشش کی ہے جن کی پوری تفصیل کیلئے بہت سی کتابوں کی مراجعت کرنی پڑتی تھی، اور بعض نئے مباحث بھی درج کردیئے ہیں، اگر وہ اہلِ نظر کے نزدیک کافی اور اطمینان بخش ہوں تو یہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہے، ورنہ کم از کم ان کی داغ بیل تو ڈال دیگئی ہے، اور آئندہ دوسرے اہل علم وفکر حضرات اُن کو پایۂ تکمیل تک پہنچاسکتے ہیں، یہ کتاب اگر فہم قرآن کے سلسلہ میں کسی صاحب کے کچھ کام آسکے تو احقر کو اپنی ناچیز محنت کا پورا صلہ مل جائیگا، قارئین سے اس دعاء کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حقیر کاوش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے، اور یہ احقر کے لئے ذخیرۂ آخرت ثابت ہو، آمین،

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ ۔

احقر محمد تقی عثمانی

۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۶ھ

خادم طلبۂ دار العلوم کراچی ۱۴

Marfat.com

حصہ اوّل

القرآن الکریم

- وحی
- نزولِ قرآن
- ناسخ ومنسوخ
- حفاظتِ قران
- حقانیتِ قرآن
- مضامینِ قرآن

Marfat.com

باب اوّل

تعارف

قرآن کریم کا نام اور وجہ تسمیہ

علامہ (۱) ابو المعالیؒ نے قرآن کریم کے پچپن (۵۵) نام شمار کئے ہیں، (۲) اور بعض حضرات نے ان کی تعداد نوّے (۹۰) سے بھی متجاوز بتائی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کی صفات مثلاً ''مجید''، ''کریم''، ''حکیم'' وغیرہ کو نام قرار دے کر تعداد اس حد تک پہنچادی ہے، ورنہ صحیح معنی میں قرآن کریم کے نام کل پانچ ہیں، القرآن، الفرقان، الذکر، الکتاب، اور التنزیل (۳) خود قرآن کریم نے اپنے لئے یہ پانچوں الفاظ اسمِ عَلَم کے طور پر ذکر فرمائے ہیں (۴) ان میں سب سے زیادہ مشہور نام ''قرآن'' ہے چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے کم از کم اکسٹھ (۶۱) مقامات پر اپنے کلام کو اسی نام سے یاد کیا ہے۔ (۵)

''قُرْاٰن'' دراصل قَرَأَ یَقْرَأُ سے نکلا ہے، جس کے لغوی معنی ہیں جمع کرنا، پھر یہ لفظ

---

(۱) ابو المعالی، کنیت عزیز یؒ بن عبدالملک نام اور شَیْذَلَہ لقب ہے، پانچویں صدی ہجری کے شافعی عالم ہیں ان کی کتاب ''البرھانؔ فی مشکلات القرآن'' کے علامہ زرکشیؒ اور علامہ سیوطیؒ نے بکثرت حوالے دیئے ہیں، ۴۹۴ھ میں وفات پائی، (ابن خلّکانؒ وفیات الاعیان، ص۳۱۸ ج۱)

(۲) دیکھئے السّیوطیؒ: ''الاتقان فی علوم القرآن'' ص۵۱ ج۱ مطبعہ حجازی بالقاہرہ ۱۳۶۸ھ

(۳) الزرقانیؒ: مناھل العرفان ص۸ جلد اوّل، مطبعہ عیسیٰ البابی الحلبی ۱۳۷۲ھ

(۴) الفرقان کے لئے دیکھئے سورۂ آلِ عمران آیت نمبر ۱ اور الذکر کے لئے آل عمران: ۵۸ والحجر: ۶ وص ۸ وغیرہ اور الکتاب کے لئے بقرہ: ۱ ونحل ۶۴ و۸۹ وکہف: وغیرہ اور التنزیل کے لئے یٰسٓ: ۵ واقعہ: ۸۰ والحاقہ: ۶۹

(۵) حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو علمی زادہ الحسنی: فتح الرحمن لطالب آیات القرآن، صفحہ ۳۵۸ و ۳۵۹ المطبعہ الاھلیہ بیروت ۱۳۲۳ھ

Marfat.com

''پڑھنے'' کے معنی میں اس لئے استعمال ہونے لگا کہ اس میں حروف اور کلمات کو جمع کیا جاتا ہے(۱) قَرَاَ یَقْرَأُ کا مصدر ''قِرَاءَۃٌ'' کے علاوہ ''قُرْاٰنٌ'' بھی آتا ہے، چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ﴾ (القیامہ:۱۷)

''یقین رکھو کہ اس کو یاد کرانا اور پڑھوانا ہماری ذمہ داری ہے۔''

پھر عربی زبان میں کبھی کبھی مصدر کو اسم مفعول (Past participle) کے معنی میں استعمال کرلیا جاتا ہے، کلام اللہ کو'' قراٰن '' اسی معنی میں کہا جاتا ہے، یعنی'' پڑھی ہوئی کتاب''(۲)

قرآن کی بہت سی وجوہِ تسمیہ بیان کی گئی ہیں، زیادہ راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اللہ کا یہ نام کفارِ عرب کی تردید میں رکھا گیا ہے، وہ کہا کرتے تھے:

﴿لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ﴾ (حٰمٓ السجدۃ:۲۶)

''اس قرآن کو سنو ہی نہیں، اور اس کے بیچ میں غل مچادیا کرو۔''

ان کفار کے علی الرغم نام رکھ کر اشارہ فرمادیا گیا کہ قرآن کریم کی دعوت کو ان اوچھے ہتھکنڈوں سے دبایا نہیں جاسکتا، یہ کتاب پڑھنے کے لئے نازل ہوئی ہے، اور قیامت تک پڑھی جاتی رہے گی، چنانچہ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم ساری دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔

بہرکیف! قرآن کریم کی اصطلاحی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''المنزل علی الرسول المکتوب فی المصاحف المنقول الینا نقلاً متواتراً بلاشبھة''

---

(۱) الراغب الاصفہانیؒ: المفردات فی غریب القرآن، ص۴۱۱، اصح المطابع کراچی ۱۳۸۰ھ

(۲) اس لفظ کے اشتقاق میں اور بھی کئی اقوال ہیں، لیکن وہ تکلف سے خالی نہیں، تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو الاتقان، ص۵۲ ج۱ ومناھل العرفان، ص۷ ج۱۔

Marfat.com

’’اللہ تعالیٰ کا وہ کلام جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا، مصاحف میں لکھا گیا، اور آپ سے بغیر کسی شبہ کے تواتراً منقول ہے‘‘ (۱)

یہ تعریف تمام اہل علم کے درمیان متفق علیہ ہے، اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

وحی اور اُس کی حقیقت

قرآن کریم چونکہ سرورِ کائنات محمد مصطفیٰ ﷺ پر وحی کے ذریعہ نازل کیا گیا ہے، اس لئے سب سے پہلے ’’وحی‘‘ کے بارے میں چند باتیں جان لینی ضروری ہیں:

وحی کی ضرورت

ہر مسلمان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں آزمائش کے لئے بھیجا ہے، اور اس کے ذمہ کچھ فرائض عائد کر کے پوری کائنات کو اس کی خدمت میں لگا دیا ہے، لہٰذا دنیا میں آنے کے بعد انسان کے لئے دو کام ناگزیر ہیں، ایک یہ کہ وہ اس کائنات سے جو اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے، ٹھیک ٹھیک کام لے، اور دوسرے یہ کہ اس کائنات کو استعمال کرتے ہوئے اللہ کے احکام کو مدِّ نظر رکھے، اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو۔

اِن دونوں کاموں کے لئے انسان کو ’’علم‘‘ کی ضرورت ہے، اس لئے جب تک اُسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی کونسی چیز کے کیا خواص ہیں؟ ان سے کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے؟ اس وقت تک وہ دنیا کی کوئی بھی چیز اپنے فائدے کے لئے استعمال نہیں کر سکتا، نیز جب تک اُسے یہ معلوم نہ ہو کہ اللہ کی مرضی کیا ہے؟ وہ کونسے کاموں کو پسند اور کن کو ناپسند فرماتا ہے، اس وقت تک اس کے لئے اللہ کی مرضی پر کاربند ہونا ممکن نہیں،

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تین چیزیں ایسی پیدا کی ہیں جن کے ذریعے اسے مذکورہ باتوں کا علم ہوتا رہے، ایک انسان کے حواس یعنی آنکھ، کان، ناک،

(۱) التلویح مع التوضیح ص۲۶ ج۱ مطبعة مصطفی البابی، مصر

Marfat.com

منہ اور ہاتھ پیر، دوسرے عقل، اور تیسرے وحی، چنانچہ انسان کو بہت سی باتیں اپنے حواس کے ذریعے معلوم ہو جاتی ہیں، بہت سی عقل کے ذریعہ، اور جو باتیں ان دونوں ذرائع سے معلوم نہیں ہو سکتیں اُن کا علم وحی کے ذریعہ عطا کیا جاتا ہے۔

علم کے ان تینوں ذرائع میں ترتیب کچھ ایسی ہے کہ ہر ایک کی ایک خاص حد اور مخصوص دائرہ کار ہے، جس کے آگے وہ کام نہیں دیتا، چنانچہ جو چیزیں انسان کو اپنے حواس سے معلوم ہو جاتی ہیں، ان کا علم نِری عقل سے نہیں ہو سکتا، مثلاً اس وقت میرے سامنے ایک انسان بیٹھا ہے، مجھے اپنی آنکھ کے ذریعہ یہ معلوم ہو گیا کہ یہ انسان ہے، آنکھ ہی نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ اس کا رنگ گورا ہے، اس کی پیشانی چوڑی، بال سیاہ، ہونٹ پتلے اور چہرہ کتابی ہے، لیکن اگر یہی باتیں میں اپنے حواس کو معطّل کر کے محض عقل سے معلوم کرنا چاہوں، مثلاً آنکھیں بند کر کے یہ چاہوں کہ اس انسان کی رنگت، اس کے اعضاء کی صحیح صحیح بناوٹ اور اس کے سراپا کی ٹھیک ٹھیک تصویر مجھے صرف اپنی عقل کے ذریعہ معلوم ہو جائے تو یہ ناممکن ہے۔

اسی طرح جن چیزوں کا علم عقل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے وہ صرف حواس سے معلوم نہیں ہو سکتیں، مثلاً اسی شخص کے بارے میں مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی ماں ضرور ہے، نیز یہ بھی علم ہے کہ اُسے کسی نے پیدا کیا ہے، اگرچہ نہ اس کی ماں اس وقت میرے سامنے ہے، نہ میں اس کے پیدا کرنے والے کو دیکھ سکتا ہوں، لیکن میری عقل بتا رہی ہے کہ یہ شخص خود بخود پیدا نہیں ہو سکتا، اب اگر میں یہ علم اپنی عقل کے بجائے اپنی آنکھ سے حاصل کرنا چاہوں تو یہ ممکن نہیں، کیونکہ اس کی تخلیق اور پیدائش کا منظر اب میری آنکھوں کے سامنے نہیں آ سکتا۔

غرض جہاں تک حواس خمسہ کا تعلق ہے وہاں تک عقل کوئی رہنمائی نہیں کرتی، اور جہاں حواس خمسہ جواب دیدیتے ہیں وہیں سے عقل کا کام شروع ہوتا ہے، لیکن اس عقل کی رہنمائی بھی غیر محدود نہیں ہے، یہ بھی ایک حد پر جا کر رُک جاتی ہے، اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا علم نہ حواس کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے، اور نہ عقل کے ذریعہ، مثلاً اسی شخص کے بارے میں

Marfat.com

عقل نے یہ تو بتا دیا کہ اسے کسی نے پیدا کیا ہے، لیکن اس شخص کو کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ اس کے ذمہ خدا کی طرف سے کیا فرائض ہیں؟ اس کا کونسا کام اللہ کو پسند ہے اور کونسا ناپسند؟ یہ سوالات ایسے ہیں کہ عقل اور حواس مل کر بھی ان کا جواب نہیں دے سکتے، ان سوالات کا جواب انسان کو دینے کے لئے جو ذریعہ اللہ نے مقرر فرمایا ہے اسی کا نام ''وحی'' ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ ''وحی'' انسان کے لئے وہ اعلیٰ ترین ذریعہ علم ہے جو اسے اس کی زندگی سے متعلق اُن سوالات کا جواب مہیّا کرتا ہے جو عقل اور حواس کے ذریعہ حل نہیں ہوتے، لیکن اُن کا علم حاصل کرنا اس کے لئے ضروری ہے، اور مذکورہ تشریح سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ صرف عقل اور مشاہدہ انسان کی رہنمائی کے لئے کافی نہیں بلکہ اس کی ہدایت کے لئے وحی الٰہی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اور چونکہ بنیادی طور پر وحی کی ضرورت پیش ہی اُس جگہ آتی ہے جہاں عقل کام نہیں دیتی، اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وحی کی ہر بات کا ادراک عقل سے ہو ہی جائے، جس طرح کسی چیز کا رنگ معلوم کرنا عقل کا کام نہیں بلکہ حواس کا کام ہے اسی طرح بہت سے دینی معتقدات کا علم دینا عقل کے بجائے وحی کا منصب ہے، اور ان کے ادراک کے لئے محض عقل پر بھروسہ کرنا درست نہیں۔ (۱)

وحی کا مفہوم

اس تمہید کو ذہن میں رکھ کر ''وحی'' کے مفہوم اور اس کی حقیقت پر غور فرمایئے:

''وَحْی'' اور ''اِیْحَاءٌ'' عربی زبان کے الفاظ ہیں، اور لغت میں اُن کے معنی ہیں ''جلدی سے کوئی اشارہ کر دینا'' خواہ یہ اشارہ رمز و کنایہ استعمال کر کے کیا جائے، خواہ کوئی بے معنی آواز نکال کر، خواہ کسی عضو کو حرکت دے کر، یا تحریر و نقوش استعمال کر کے، ہر صورت میں لغۃً اس پر یہ الفاظ صادق آتے ہیں۔ (۱)

---

(۱) یہاں وحی کی ضرورت کی طرف بہت مجمل اشارے کئے گئے ہیں، اس موضوع پر مفصل بحث کیلئے تمہید ابی شکور سالمیؒ ص ۶۸ تا ۷۲ اور (اردو) مولانا شمس الحق صاحب افغانی مدظلہم کی کتاب علوم القرآن ص ۳ تا ۱۸ مطبوعہ ادارۂ مدرسۂ فاروقیہ بہاول پور ۱۳۸۹ھ ملاحظہ فرمایئے۔

Marfat.com

چنانچہ اسی معنی میں حضرت زکریا علیہ السلام کا واقعہ بیان کرتے ہوئے قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿ فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰی اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ عَشِیًّا ﴾ (مریم:۱۱)

''چنانچہ وہ عبادت گاہ سے نکل اپنی قوم کے سامنے آئے، اوران کو اِشارے سے ہدایت دی کہ تم لوگ صبح وشام اللہ تسبیح کیا کرو۔''

پھر ظاہر ہے کہ اس قسم کے اشارے سے مقصد یہ ہی ہوتا ہے کہ مخاطب کے دل میں کوئی بات ڈال دی جائے، اس لئے لفظ ''وَحی'' اور ''اِیحَاء'' دل میں کوئی بات ڈالنے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا، چنانچہ قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں یہی معنی مراد ہیں، مثلاً:

﴿ وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا ﴾ (النحل:۶۸)

''اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دِل میں یہ بات ڈال دی کہ: ''تو پہاڑوں میں، اور درختوں میں اور لوگ جو چھتریاں اُٹھاتے ہیں، اُن میں اپنے گھر بنا۔''

یہاں تک کہ شیاطین دلوں میں جو وسوسے ڈالتے ہیں اُن کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ ﴾ (الانعام : ۱۱۲)

''اور (جس طرح یہ لوگ ہمارے نبی سے دُشمنی کر رہے ہیں) اسی طرح ہم نے ہر (پچھلے) نبی کے لئے کوئی نہ کوئی دُشمن پیدا کیا تھا، یعنی انسانوں اور جنّات میں سے شیطان قسم کے لوگ، جودھوکا دینے کی خاطر ایک دوسرے کو بڑی چکنی چپڑی باتیں سکھاتے رہتے تھے۔''

نیز ارشاد ہے:

(۱) الزّبیدیؒ : تاج العروس ۳۸۴ ج ۱ دار لیبیا بنغازی ۱۳۸۶ھ، والراغبؒ : المفردات۔

Marfat.com

﴿ وَاِنَّ الشَّيَاطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰى اَوْلِيَاءِ هِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ﴾
(الانعام:۱۲۱)

''(مسلمانو!) شیاطین اپنے دوستوں کو ورغلاتے رہتے ہیں تاکہ وہ تم سے بحث کریں۔''

اللہ تعالیٰ فرشتوں سے جو خطاب فرماتے ہیں اس کو بھی ''اِیْحَاء'' کہا گیا ہے:

﴿ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ ﴾ (الانفال:۱۲)

''وہ وقت جب تمہارا ربّ فرشتوں کو وحی کے ذریعے حکم دے رہا تھا کہ: ''میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

کسی غیر نبی کے دل میں جو بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی جاتی ہے اس کو بھی اسی لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے:

﴿ وَاَوْحَيْنَا اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ﴾ (القصص:۷)

''اور ہم نے موسیٰ کی والدہ کو الہام کیا کہ: ''تم اس (بچے) کو دودھ پلاؤ۔''

لیکن یہ سب اس لفظ کے لغوی مفہوم ہیں، شرعی اصطلاح میں ''وحی'' کی تعریف یہ ہے۔

كَلَامُ اللّٰهِ الْمُنَزَّلُ عَلٰى نَبِيٍّ مِّنْ اَنْبِيَآئِهٖ (۱)

''اللہ تعالیٰ کا وہ کلام جو اس کے کسی نبی پر نازل ہو۔''

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ لفظ ''وحی'' اپنے اصطلاحی معنی میں اتنا مشہور ہو چکا ہے کہ اب اس کا استعمال پیغمبر کے سوا کسی اور کے لئے درست نہیں، حضرت علاّمہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''وَحْی'' اور ''اِیْحَاءٌ'' دونوں الگ الگ لفظ ہیں، اور دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے، ''اِیْحَاءٌ'' کا مفہوم عام ہے، اور انبیاءؑ پر وحی نازل کرنے کے علاوہ کسی کو اشارہ کرنا اور کسی غیر نبی کے دل میں کوئی بات ڈالنا بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے، لہٰذا یہ لفظ نبی اور غیر نبی دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس کے برخلاف ''وحی'' صرف

۱؎ بدر الدین العینیؒ: عمدة القاری لشرح صحیح البخاریؒ، ص ۱۸ ج ۱ دار الطباعة العامرة، استنبول ۱۳۰۸ھ

اُس الہام کو کہتے ہیں جو انبیاء پر نازل ہو، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے لفظ ''اِیْحَاء'' کا استعمال تو انبیاء اور غیر انبیاء دونوں کے لئے کیا ہے، لیکن لفظ ''وحی'' سوائے انبیاء کے کسی اور کے لئے استعمال نہیں فرمایا۔(۱)

بہر کیف! ''وحی'' وہ ذریعہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنا کلام اپنے کسی منتخب بندے اور رسول تک پہنچاتا ہے، اور اس رسول کے ذریعہ تمام انسانوں تک! اور چونکہ ''وحی'' اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ایک مقدس تعلیمی رابطہ کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس کا مشاہدہ صرف انبیاء علیہم السلام ہی کو ہوتا ہے، اس لئے ہمارے لئے اس کی ٹھیک ٹھیک حقیقت کا ادراک بھی ممکن نہیں، البتہ اس کی اقسام اور کیفیات کے بارے میں کچھ معلومات خود قرآن و حدیث نے فراہم کی ہیں، یہاں صرف انہی کو بیان کیا جا سکتا ہے:

وحی کی تعلیمات

وحی کے ذریعہ بندوں کو اُن باتوں کی تعلیم دی جاتی ہے جو وہ محض اپنی عقل اور حواس سے معلوم نہ کر سکیں، یہ باتیں خالص مذہبی نوعیت کی بھی ہو سکتی ہیں، اور دنیا کی عام ضروریات بھی۔ انبیاء علیہم السلام کی وحی عموماً پہلی قسم کی ہوتی ہے، لیکن بوقت ضرورت دنیوی ضروریات بھی بذریعۂ وحی بتائی گئی ہیں، مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہے:

﴿وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا﴾ (ھود:۳۷)

''اور ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کی مدد سے کشتی بناؤ''

اس سے معلوم ہوا کہ انہیں کشتی کی صنعت بذریعۂ وحی سکھائی گئی، اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہ سازی کی صنعت سکھائی گئی، نیز حضرت آدم علیہ السلام کو خواصِ اشیاء کا علم بذریعہ وحی دیا گیا، بلکہ ایک روایت یہ ہے کہ علم طِب بنیادی طور پر بذریعہ وحی نازل ہوا ہے۔(۱)

---

(۱) حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ: فیض الباری ص۱۹ ج۱ مطبعہ حجازی قاہرہ ۱۳۵۷ھ

وحی کی اقسام

حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ وحی کی ابتداءً تین قسمیں ہوتی ہیں: (۲)

(۱) وحی قلبی ؛ اس قسم میں باری تعالیٰ براہِ راست نبی کے قلب کو مسخر فرما کر اس میں کوئی بات ڈال دیتا ہے، اس قسم میں نہ فرشتہ کا واسطہ ہوتا ہے، اور نہ نبی کی قوّت سامعہ اور حواس کا، لہٰذا اس میں کوئی آواز نبی کو سنائی نہیں دیتی، بلکہ کوئی بات قلب میں جاگزین ہو جاتی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے، یہ کیفیت بیداری میں بھی ہو سکتی ہے اور خواب میں بھی، چنانچہ انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بیٹے کے ذبح کرنے کا حکم اسی طرح دیا گیا تھا،

(۲) کلام الٰہی ؛ اس دوسری قسم میں باری تعالیٰ براہِ راست رسول کو اپنی ہم کلامی کا شرف عطا فرماتا ہے، اس میں بھی کسی فرشتہ کا واسطہ نہیں ہوتا، لیکن نبی کو آواز سنائی دیتی ہے، یہ آواز مخلوقات کی آواز سے بالکل جُدا ایک عجیب و غریب کیفیت کی حامل ہوتی ہے، جس کا ادراک عقل کے ذریعہ ممکن نہیں، جو انبیاء اُسے سنتے ہیں وہی اس کی کیفیت اور اس کے سرور کو پہچان سکتے ہیں،

وحی کی اس قسم میں چونکہ باری تعالیٰ سے براہِ راست ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے، اس لئے یہ قسم وحی کی تمام قسموں میں سب سے افضل اور اعلیٰ ہے (۳) اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت بیان کرتے ہوئے قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِيمًا ﴾ (النساء:۱۶۴)

---

(۱) عبد العزیز فرہاریؒ: النبراس علی شرح العقائد، ص ۴۲۷ و ۴۲۸ مطبوعہ امرتسر ۱۳۱۸ھ

(۲) یہ تین قسمیں بنیادی طور پر حضرت شاہ صاحبؒ کی فیض الباری ص ۱۴ تا ۱۸ سے ماخوذ ہیں تشریح و تفصیل اور تینوں قسموں کے نام ہمارے اپنے ہیں،

(۳) ابن القیم: مدارج السالکین، ص ۳۷ ج ۱، مطبعۃ السنۃ المحمدیہ، مکہ مکرمہ ۱۳۷۵ھ

"اور موسیٰ سے تو اللہ براہِ راست ہم کلام ہوا"

(۳) وحی ملکی: اس تیسری قسم میں اللہ تعالیٰ اپنا پیغام کسی فرشتہ کے ذریعے نبی تک بھیجتا ہے، اور وہ فرشتہ پیغام پہنچاتا ہے، پھر بعض اوقات یہ فرشتہ نظر نہیں آتا، صرف اس کی آواز سُنائی دیتی ہے، اور بعض مرتبہ وہ کسی انسان کی شکل میں سامنے آکر پیغام پہنچا دیتا ہے، اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نبی کو اپنی اصلی صورت میں نظر آجائے، لیکن ایسا شاذ ونادر ہی ہوتا ہے۔

قرآن کریم نے وحی کی انہی تین قسموں کی طرف آیتِ ذیل میں اشارہ فرمایا ہے:

﴿ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَايَشَآءُ ﴾ (الشوریٰ:۵۱)

"اور کسی انسان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اللہ اُس سے (رُوبرو) بات کرے، سوائے اس کے کہ وہ وحی کے ذریعے ہو، یا کسی پردے کے پیچھے سے یا پھر وہ کوئی پیغام لانے والا (فرشتہ) بھیج دے، اور وہ اُس کے حکم سے جو چاہے وحی کا پیغام پہنچا دے۔"

اس آیت میں وَحْيًا (دل میں بات ڈالنے) سے مراد پہلی قسم یعنی وحی قلبی ہے، اور پردے کے پیچھے سے مراد دوسری قسم یعنی کلام الٰہی اور پیغامبر بھیجنے سے مراد تیسری قسم یعنی وحی ملکی ہے،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے طریقے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی مختلف طریقوں سے وحی نازل کی جاتی تھی، صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت حارث بن (۱) ہشامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کس طرح آتی ہے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَحْيَانًا يَّاْتِيْنِيْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ وَهُوَ اَشَدُّهٗ عَلَيَّ

---

(۱) حضرت حارث بن ہشامؓ فضلائے صحابہ میں سے ہیں، فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے، اور ۱۵ھ میں شام کو فتح کرتے ہوئے شہید ہوئے (القسطلانی: ارشاد الساری، ص ۵۷ ج ۱ بولاق مصر ۱۳۲۳ھ

Marfat.com

فَيَفْصِمُ عَنِّي وَقَدْ وَعَيْتُ مَاقَالَ وَاَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ الْمَلَكُ رَجُلًا ، (۱)

"کبھی تو مجھے گھنٹی کی سی آواز سنائی دیتی ہے، اور وحی کی یہ صورت میرے لئے سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے، پھر جب یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے تو جو کچھ آواز نے کہا ہوتا ہے، مجھے یاد ہو چکا ہوتا ہے، اور کبھی فرشتہ میرے سامنے ایک مرد کی صورت میں آجاتا ہے"

اس حدیث سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کے دو طریقے معلوم ہوتے ہیں،

(۱) **صلصلة الجرس**؛ پہلا طریقہ یہ ہے کہ آپؐ کو اس قسم کی آواز آیا کرتی تھی کہ جیسی گھنٹیاں بجنے سے پیدا ہوتی ہے، حدیث میں تو صرف اتنا ہی مذکور ہے، اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس قسم کی وحی کو کس اعتبار سے گھنٹیوں کی آواز سے تشبیہ دی گئی ہے، البتہ بعض علماء نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ فرشتے کی آواز ہوتی تھی، بعض کا خیال ہے کہ فرشتہ وحی لاتے وقت اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتا تھا، اس سے یہ آواز پیدا ہوتی تھی، اور علامہ خطابیؒ نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہاں تشبیہ آواز کے ترنّم میں نہیں بلکہ اس کے تسلسل میں ہے کہ جس طرح گھنٹی کی آواز مسلسل ہوتی ہے، اور کسی جگہ ٹوٹتی نہیں، اسی طرح وحی کی آواز بھی مسلسل ہوا کرتی تھی، (۲) لیکن ظاہر ہے کہ یہ محض قیاسات ہیں، اور ان کی بناء پر کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی، البتہ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربیؒ سے نقل کر کے اس تشبیہ کا جو مطلب بیان کیا ہے وہ مذکورہ تمام توجیہات سے زیادہ لطیف ہے، اُن کا کہنا یہ ہے کہ یہ تشبیہ صرف دو اعتبار سے دی گئی ہے، ایک تو آواز کے تسلسل کے اعتبار سے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، اور دوسرے اس اعتبار سے کہ گھنٹی جب مسلسل بج رہی ہو تو عموماً سننے والے کو اس کی آواز کی سمت متعیّن کرنا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ اس کی آواز ہر جہت سے آتی ہوئی محسوس

---

(۱) صحیح بخاریؒ ص۲ ج۱، اصح المطابع کراچی۔

(۲) دیکھئے حافظ ابن حجرؒ: فتح الباری ص۱۶ ج۱، المطبعة البهية ۱۳۴۸ھ

Marfat.com

ہوتی ہے، اور باری تعالیٰ چونکہ جہت اور مکان سے منزّہ ہے، اس لئے کلام الٰہی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کی آواز کسی ایک سمت سے نہیں آتی، بلکہ ہر جہت سے آتی ہے، اس کیفیت کا صحیح ادراک تو بغیر مشاہدہ کے ممکن نہیں، لیکن اس بات کو عام ذہنوں کے قریب لانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے گھنٹیوں کی آواز سے تشبیہ دیدی ہے۔ (۱)

بہرکیف! اس کی ٹھیک ٹھیک کیفیت کا علم تو اللہ ہی کو ہے، یا اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو، حدیث سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو وحی کے اس خاص طریقے میں گھنٹیوں کی سی آواز آیا کرتی تھی، ساتھ ہی حدیث میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وحی کا یہ طریقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے زیادہ دشوار ہوتا تھا،

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ وَھُوَ اَشَدُّہٗ عَلَیَّ (یہ طریقہ میرے لئے سب سے زیادہ سخت ہوتا ہے) کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یوں تو وحی کا ہر ایک طریقہ سخت ہوتا تھا، لیکن اس گھنٹیوں کی آواز والے طریقے میں سب سے زیادہ بار ہوا کرتا تھا، وجہ یہ ہے کہ کہنے والے اور سننے والے میں کسی نہ کسی طرح مناسبت پیدا ہونی تو ضروری ہے، اب اگر فرشتہ انسانی شکل میں آجائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی غیر معمولی بار نہیں پڑتا تھا، صرف کلام الٰہی کے جلال وغیرہ کا بار ہوتا تھا، اس کے برخلاف جب فرشتہ انسانی شکل میں نہ آئے، بلکہ اس کی آواز یا براہِ راست باری تعالیٰ کا کلام سنائی دے، تو یہ ایک غیر معمولی کیفیت ہوتی تھی، اور اس سے مانوس ہونے اور استفادہ کرنے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر زیادہ بوجھ پڑتا تھا، (۲) چنانچہ حضرت عائشہؓ مذکورہ بالا حدیث کے آخر میں فرماتی ہیں:

وَلَقَدْ رَاَیْتُہٗ یَنْزِلُ عَلَیْہِ الْوَحْیُ فِی الْیَوْمِ الشَّدِیْدِ الْبَرْدِ فَیَفْصِمُ عَنْہُ وَاِنَّ جَبِیْنَہٗ لَیَتَفَصَّدُ عَرَقًا۔ (۳)

''میں نے سخت جاڑوں کے دن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل

---

(۱) فیض الباری ص۱۹و۲۰ ج ۱ قاہرہ ۱۳۵۷ھ

(۲) فتح الباری ص۱۶ ج ۱، قاہرہ ۱۳۴۸ھ (۳) صحیح بخاری ص ۲ ج ۱ حدیث نمبر ۲،

Marfat.com

ہوتے دیکھی ہے، (ایسی سردی میں بھی) جب وحی کا سلسلہ ختم ہو جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک پسینہ سے شرابور ہو چکی ہوتی تھی"

ایک اور روایت میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سانس رُکنے لگتا، چہرہ انور متغیر ہو کر کھجور کی شاخ کی طرح زرد پڑ جاتا سامنے کے دانت سردی سے کپکپانے لگتے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا پسینہ آتا کہ اس کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے۔(۱)

وحی کی اس کیفیت میں بعض اوقات اتنی شدت پیدا ہو جاتی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس جانور پر اس وقت سوار ہوتے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بوجھ سے دب کر بیٹھ جاتا، اور ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا زانوئے مبارک حضرت زید بن ثابتؓ کے زانوں پر رکھا ہوا تھا، کہ اسی حالت میں وحی نازل ہونی شروع ہوگئی، اس سے حضرت زیدؓ کی ران پر اتنا بوجھ پڑا کہ وہ ٹوٹنے لگی، (۲)

اور مسند احمد کی ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں کہ جب یہ وحی نازل ہوتی ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری رُوح کھنچ رہی ہے، (۳)

بعض اوقات اس وحی کی ہلکی ہلکی آواز دوسروں کو بھی سُنائی دیتی تھی، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انورؐ کے قریب شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آواز سُنائی دیتی تھی، (۴)

---

(۱) السیوطیؒ: الاتقان ص ۴۶ ج ۱ قاہرہ ۱۳۶۸ھ بحوالہ ابن سعدؒ

(۲) صحیح بخاری ص ۶۶۱ ج ۲، ابن القیمؒ: زاد المعاد فی ھدی خیر العبادؐ، ص ۱۸، ۱۹ ج ۱ المطبعہ المیمنیۃ مصر

(۳) الفتح الربّانی (بتویب مسند احمدؒ) بحوالہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ، ص ۲۱۱ ج ۲۰ کتاب السیرۃ النبویۃ حدیث نمبر ۴۲ قاہرہ ۱۳۷۵ھ۔ (۴) ایضاً ص ۲۱۲ ج ۲۰۔

Marfat.com

(۲) **تمثیلِ ملک**: وحی کی دوسری صورت جس کا اس حدیث میں ذکر ہے، یہ تھی کہ فرشتہ کسی انسانی شکل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر اللہ کا پیغام پہنچادیتا تھا، ایسے مواقع پر عموماً حضرت جبرئیل علیہ السلام مشہور صحابی حضرت دحیہ کلبیؓ کی صورت میں تشریف لایا کرتے تھے، علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ صحابہؓ میں سے حضرت دحیہ کلبیؓ کا انتخاب شاید اس لئے کیا گیا ہو کہ وہ اپنے وقت کے حسین ترین انسان تھے، اتنے حسین کہ اپنے چہرے کو لپیٹ کر چلا کرتے تھے،(۱) البتہ بعض مواقع پر دوسری صورتوں میں بھی حضرت جبرئیل علیہ السلام کا آنا ثابت ہے، مثلاً حضرت عمرؓ کی مشہور روایت میں وہ بالکل ایک اجنبی کی صورت میں تشریف لائے تھے،(۲) کیونکہ وہاں مقصد ہی یہ تھا کہ حاضرین ایک اجنبی کو حضور ﷺ کے ساتھ اتنی بے تکلفی سے باتیں کرتا دیکھ کر اچھنبے میں پڑ جائیں۔

بہر حال اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ جو فرشتہ آنحضرت ﷺ کے پاس وحی لاتا تھا وہ جبرئیل علیہ السلام تھے، قرآن کریم کی آیت ہے:

﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ﴾ (البقرہ: ۹۷)

"(اے پیغمبر!) کہہ دو کہ اگر کوئی شخص جبرئیل کا دشمن ہے تو (ہوا کرے) انہوں نے تو یہ کلام اللہ کی اجازت سے تمہارے دِل پر اُتارا ہے۔"

اس سے یہ بات واضح ہے کہ عموماً حضرت جبرئیل علیہ السلام ہی وحی لایا کرتے تھے، البتہ امام احمدؒ نے اپنی تاریخ میں امام شعبیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "ابتداءِ نبوت میں تین سال تک حضرت اسرافیل علیہ السلام وحی لاتے رہے ہیں،(۳) لیکن اُن کے ذریعہ قرآن کریم نازل نہیں کیا گیا، قرآن تمام تر حضرت جبرئیل علیہ السلام ہی لائے ہیں۔" مگر علامہ واقدیؒ وغیرہ نے اس روایت کو رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ آپ ﷺ کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام کے سوا کوئی فرشتہ وحی نہیں لایا، علامہ بدرالدین عینیؒ کا رجحان بھی اسی طرف معلوم

(۱) العینیؒ: عمدۃ القاری، ص۴۷ ج استنبول ۱۳۰۸ھ
(۲) دیکھئے مشکوۃ المصابیح، ص۱۱ ج۱، اصح المطابع کراچی
(۳) الاتقان، ص۴۶ ج۱ و القسطلانیؒ: ارشاد الساری، ص۵۹، ج۱،

Marfat.com

ہوتا ہے، (۱) اور کسی مرفوع حدیث یا کسی صحابی کے قول میں اس روایت کی بنیاد بھی نہیں ملتی، لیکن حافظ ابن حجرؒ اس روایت کو قبول کرنے کی طرف مائل ہیں، اور اسے زمانہ فترت کا واقعہ قرار دیتے ہیں، (۲)

بہرکیف! وحی کی اس صورت میں فرشتہ انسان کی شکل میں آیا کرتا تھا، اور وحی کے اس طریقے میں آپؐ کو کوئی خاص دشواری پیش نہیں آتی تھی، چنانچہ صحیح ابوعوانہؒ کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے وحی کی اس صورت کا ذکر کر کے فرمایا:

وَهُوَ اَهْوَنُهُ عَلَيَّ (۳)

''اور یہ صورت میرے لئے سب سے زیادہ آسان ہوتی ہے''

حضرت عائشہؓ کی مذکورہ بالا حدیث میں تو وحی کے صرف یہ دو طریقے بیان کئے گئے ہیں، لیکن دوسری احادیث سے اس کے علاوہ بھی کئی طریقے معلوم ہوتے ہیں، یہاں تک کہ علّامہ حلیمیؒ (۴) نے تو لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی چھیالیس طریقوں سے نازل ہوتی تھی (۵) لیکن حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے حاملِ وحی (یعنی جبرئیل علیہ السلام) کی مختلف صفات کو وحی کے مختلف طریقے شمار کر کے تعداد چھیالیس تک پہنچادی ہے ورنہ تعداد اتنی نہیں، (۶)

تاہم دوسری احادیث سے نزول وحی کے جو دوسرے اہم طریقے ثابت ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۳) فرشتہ کا اصلی شکل میں آنا: وحی کی تیسری صورت یہ تھی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی انسان کی شکل اختیار کئے بغیر اپنی اصلی صورت میں دکھائی دیتے تھے، لیکن ایسا آپ

---

(۱) عمدۃ القاری، ص ۴۷، ۴۸ ج ۱ (۲) فتح الباری، ص ۲۲ و ۲۳ ج ۱،

(۳) الاتقان ص ۴۶ ج ۱

(۴) یہ ابو عبداللہ حسین بن الحسن الحلیمی الجرجانی (متوفی ۴۰۳ھ) ہیں، جن کی کتاب ''المنہاج'' اصول دین پر ایک جامع کتاب ہے، (کشف الظنون نمبر ۱۸۷۱)

(۵) حافظ ابن حجرؒ: فتح الباری، ص ۱۶ ج ۱، (۶) حافظ ابن حجرؒ: فتح الباری، ص ۱۶ ج ۱،

Marfat.com

ﷺ کی تمام عمر میں صرف تین مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ اُس وقت جب آپ ﷺ نے خود حضرت جبرئیلؑ کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنے کی خواہش ظاہر فرمائی تھی، دوسری مرتبہ معراج میں، اور تیسری بار نبوت کے بالکل ابتدائی زمانے میں مکہ مکرمہ کے مقام اجیاد پر، پہلے دو واقعات تو صحیح سند کے ساتھ ثابت ہیں، البتہ یہ آخری واقعہ سنداً کمزور ہونے کی وجہ سے مشکوک ہے۔(۱)

(۴) رؤیائے صادقہ: وحی کی چوتھی صورت یہ تھی کہ آپ ﷺ کو نزولِ قرآن سے قبل سچے خواب نظر آیا کرتے تھے، جو کچھ خواب میں دیکھتے بیداری میں ویسا ہی ہو جاتا، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

اَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ فِي النَّوْمِ فَكَانَ لَا يَرٰى رُؤْيَا اِلَّا جَآءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ۔(۲)

''آپ ﷺ پر وحی کی ابتداء نیند کی حالت میں سچے خوابوں سے ہوئی، اُس وقت آپؐ جو خواب بھی دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح سچا نکلتا۔''

اس کے علاوہ مدینہ طیبہ میں ایک مرتبہ ایک منافق نے آپؐ پر سحر کر دیا تھا، اس سحر کی اطلاع اور اسے دفع کرنے کا طریقہ بھی آپ ﷺ کو خواب ہی میں بتایا گیا۔(۳)

(۵) کلامِ الٰہی: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح آپ ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ سے براہِ راست ہمکلام ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے، بیداری کی حالت میں یہ واقعہ صرف معراج کے موقعہ پر پیش آیا ہے، اس کے علاوہ ایک مرتبہ خواب میں بھی آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوئے ہیں۔(۴)

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فتح الباری، ص ۱۸ و ۱۹ ج ۱۔ (۲) صحیح البخاری ص ۲ ج ۱ حدیث نمبر ۳،
(۳) صحیح بخاری، باب السحر ابواب الطب ص ۸۵۷، ۸۵۸ ج ۲، مطبوعہ اصح المطابع کراچی،
(۴) الاتقان، ص ۴۶ ج ۱،

Marfat.com

(٦) نفث فی الروع : وحی کا چھٹا طریقہ یہ تھا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی بھی شکل میں سامنے آئے ، بغیر آپؐ کے قلب مبارک میں کوئی بات القاء فرمادیتے تھے ، چنانچہ ایک روایت میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

''اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِیْ رَوْعِیْ الخ (۱)''

''روح القدس (جبرئیل علیہ السلام) نے میرے دل میں یہ بات ڈالی، الخ''

اور مستدرک حاکم کی روایت میں الفاظ یہ ہیں:

اِنَّ جبرئیل علیہ السلام القی فی (۲) روعی ان احداً منکم لن یخرج من الدنیا حتّٰی یتکمّل رزقہٗ،

''جبرئیل علیہ السلام نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ تم میں سے کوئی دنیا سے نہیں جائے گا، تاوقتیکہ اپنا رزق پورا نہ کرلے۔''

وحی اور کشف والہام

اوپر بتایا جاچکا ہے کہ وحی صرف انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے، اور کسی بھی غیر نبی کو خواہ وہ تقدس اور ولایت کے کتنے بلند مقام پر ہو، وحی نہیں آسکتی ، البتہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے بعض خاص بندوں کو کچھ باتیں بتادیتا ہے، اسے کشف یا الہام کہا جاتا ہے، کشف اور الہام میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے یہ فرق بیان فرمایا ہے کہ کشف کا تعلق حسّیات سے ہے، یعنی اس میں کوئی چیز یا واقعہ آنکھوں سے نظر آجاتا ہے، اور الہام کا تعلق وجدانیات سے ہے، یعنی اس میں کوئی چیز نظر نہیں آتی ، صرف دل میں کوئی بات ڈال دی جاتی ہے، اسی لئے عموماً الہام کشف کی بہ نسبت زیادہ صحیح ہوتا ہے، (۳)

وحی کی آخری صورت یعنی ''نفث فی الرّوع'' بظاہر الہام سے بہت قریب ہے کیونکہ

---

(۱) الاتقان، ص ۴۶ ج ۱،

(۲) الحاکمؒ : المستدرک ، کتاب البیوع ص ۴ ج ۲، دائرۃ المعارف، دکن ۱۳۴۰ھ

(۳) فیض الباری ص ۱۹ ج ۱

دونوں کی حقیقت یہی ہے کہ دل میں کسی بات کا القاء کر دیا جاتا ہے، لیکن دونوں میں حقیقت کے اعتبار سے یہ فرق ہے کہ وحی میں...... جو صرف نبی کو ہوتی ہے...... ساتھ ساتھ یہ علم بھی ہو جاتا ہے کہ یہ بات کس نے دل میں ڈالی ہے؟ چنانچہ حاکمؒ کی مذکورہ روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحۃً بتلادیا کہ ''روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے۔'' لیکن الہام میں ڈالنے والے کی تعیین نہیں ہوتی، بس یہ محسوس ہوتا ہے کہ دل میں کوئی ایسی بات آ گئی ہے جو پہلے نہیں تھی، (۱) اسی بناء پر انبیاء علیہم السلام کی وحی سوفی صد یقینی ہوتی ہے، اور اس کی پیروی فرض ہے، لیکن اولیاء اللہ کا الہام یقینی نہیں ہوتا، چنانچہ نہ وہ دین میں حجت ہے، اور نہ اس کا اتباع فرض ہے، بلکہ اگر کشف الہام یا خواب کے ذریعہ کوئی ایسی بات معلوم ہو جو قرآن وسنت کے معروف احکام کے مطابق نہیں ہے تو اس کے تقاضے پر عمل کرنا کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے، (۲)

وحی متلو اور غیر متلو

آنحضرت ﷺ پر جو وحی نازل ہوئی وہ دو قسم کی تھی، ایک تو قرآن کریم کی آیات، جن کے الفاظ اور معنی دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھے، اور جو قرآن کریم میں ہمیشہ کے لئے اس طرح محفوظ کر دی گئیں کہ ان کا ایک نقطہ یا شوشہ بھی نہ بدلا جاسکا ہے اور نہ بدلا جاسکتا ہے، اس وحی کو علماء کی اصطلاح میں ''وحی متلو'' کہا جاتا ہے، یعنی وہ وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے دوسری قسم اُس وحی کی ہے جو قرآن کریم کا جزء نہیں بنی، لیکن اس کے ذریعہ آپ ﷺ کو بہت سے احکام عطا فرمائے گئے ہیں، اس وحی کو ''وحی غیر متلو'' کہتے ہیں، یعنی وہ وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی، عموماً وحی متلو یعنی قرآن کریم میں اسلام کے اصولی عقائد اور بنیادی تعلیمات کی تشریح پر اکتفاء کیا گیا ہے، ان تعلیمات کی تفصیل اور جزوی مسائل زیادہ تر ''وحی غیر متلو'' کے ذریعہ عطا فرمائے گئے ہیں، یہ ''وحی غیر متلو'' صحیح احادیث کی شکل میں محفوظ ہے،

(۱) رشید رضا: الوحی المحمدی، ص ۳۸، مطبعة المنار مصر ۱۳۵۴ھ

(۲) الشاطبیؒ: الاعتصام ص ۳۵۱ فما بعد ج ۱ مطبعة المنار مصر ۱۳۳۱ھ

Marfat.com

اوراس میں عموماً صرف مضامین وحی کے ذریعہ آپ ﷺ پر نازل کئے گئے ہیں، ان مضامین کو تعبیر کرنے کے لئے الفاظ کا انتخاب آپ ﷺ نے خود فرمایا ہے،(۱) ایک حدیث میں سرکار دوعالم ﷺ کا ارشاد ہے:

اُوْتِیْتُ الْقُرْاٰنَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ

''مجھے قرآن بھی دیا گیا ہے، اوراس کے ساتھ اسی جیسی دوسری تعلیمات بھی''

اس میں قرآن کریم کے ساتھ جن ''دوسری تعلیمات'' کا ذکر ہے اُن سے مراد یہی وحی غیر متلو ہے،

اسلامی احکام کی جزوی تفصیلات چونکہ اسی وحی غیر متلو کے ذریعہ بتائی گئی ہیں، اس لئے جولوگ اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے باوجود اسلامی احکام کی پابندیوں سے آزاد زندگی گذارنا چاہتے ہیں انہوں نے کچھ عرصہ سے یہ شوشہ چھوڑا ہے کہ ''وحی غیر متلو کوئی چیز نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جتنی وحی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے وہ سب قرآن کریم میں محفوظ ہے، قرآن کریم کے علاوہ جواحکام آپ ﷺ نے دیئے وہ ایک سربراہِ مملکت کی حیثیت سے دیئے جو صرف اُس زمانے کے مسلمانوں کے لئے واجب العمل تھے، آج اُن پر عمل کرنا ضروری نہیں،

لیکن یہ خیال بالکل غلط اور باطل ہے، خود قرآن کریم کی متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی الٰہی صرف قرآن کریم میں منحصر نہیں، بلکہ آیات قرآنی کے علاوہ بھی آپؐ کو بہت سی باتیں بذریعہ وحی بتائی گئی تھیں، اس بات کی تائید میں چند قرآنی دلائل ملاحظہ فرمائیے:

(۱) ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَیْهِ﴾ (البقرہ: ۱۴۳)

''اورجس قبلے پر تم پہلے کاربند تھے، اُسے ہم نے کسی اور وجہ سے نہیں،

---

(۱) الاتقان ص ۴۵ ج ۱،

Marfat.com

بلکہ صرف یہ دیکھنے کے لئے مقرر کیا تھا کہ کون رسول کا حکم مانتا ہے
اور کون اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔"

ہر مسلمان جانتا ہے کہ آنحضرت ﷺ مدینہ طیبہ میں ایک عرصہ تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے ہیں، اس کے بعد جب دوبارہ بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے بیت المقدس کی طرف مُنہ کرنے کا حکم صرف اس لئے دیا تھا تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ کون اس حکم کی تعمیل کرتا ہے اور کون انکار، یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ اس آیت میں بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کے حکم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب منسوب فرمایا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حکم بھی ہم نے ہی دیا تھا، اب قرآن کریم کو الحمد سے لے کر والناس تک پڑھ جایئے، اس میں کہیں یہ حکم نہیں ملے گا کہ "بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھو" اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے کسی ایسی وحی کے ذریعہ دیا تھا جو قرآن کریم میں کہیں مذکور نہیں، اور اسی کا نام "وحی غیر متلو" ہے۔

(۲) ﴿فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ الخ﴾ (التحریم: ۳)

"پھر جب اُس بیوی نے وہ بات کسی اور کو بتلا دی، اور اللہ نے یہ بات نبی پر ظاہر کر دی تو اُس نے اُس کا کچھ حصہ جتلا دیا، اور کچھ حصہ کو ٹال گئے۔"

اس آیت کی تشریح مختصراً یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک زوجۂ مطہرہ نے ایک بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چھپانی چاہی تھی، اللہ تعالیٰ نے بذریعۂ وحی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ بات بتلا دی، اس پر انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یہ بات آپ کو کس نے بتائی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بات مجھے علیم وخبیر یعنی اللہ تعالیٰ نے بتلا دی تھی، اس آیت میں تصریح ہے کہ وہ پوشیدہ بات اللہ تعالیٰ نے آپ کو بذریعۂ وحی بتلائی تھی، حالانکہ پورے قرآن کریم میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے، اس سے صاف ظاہر ہے

کہ یہ اطلاع آپ کو وحی غیر متلو کے ذریعہ دی گئی تھی۔

اور بھی متعدد آیات سے وحی غیر متلو کا ثبوت ملتا ہے، یہاں اختصار کے پیش نظر صرف انہی دو آیتوں پر اکتفا کیا جاتا ہے، اگر تحقیق حق مقصود ہو تو یہ دو آیتیں بھی اس بات کا ناقابل انکار ثبوت مہیا کرنے کے لئے کافی ہیں کہ وحی غیر متلو بھی وحی کی ایک قسم، اور وہ بھی وحی متلو کی طرح یقینی اور واجب الاتباع ہے۔

وحی پر عقلی شبہات

یہ وحی اور اس کی حقیقت سے متعلق وہ ضروری معلومات تھیں جو قرآن وسنت سے ثابت ہیں، ہم شروع میں لکھ چکے ہیں کہ وحی اُن معاملات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی کی ایک شکل ہے، جن کا ادراک نری عقل سے نہیں ہو سکتا، اور چونکہ وحی کا مشاہدہ انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی اور کو نہیں ہوتا، اس لئے اس کی ٹھیک ٹھیک کیفیات کا اندازہ بھی دوسروں کے لئے ممکن نہیں، یہی وجہ ہے کہ آج کی وہ دنیا جو مغربی افکار کے ہمہ گیر سیلاب سے مرعوب ہے، اسے یہ باتیں نامانوس اور اجنبی معلوم ہوتی ہیں، اور وہ انہیں شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے، پھر بعض لوگ تو کھل کر وحی والہام کا انکار کر کے اسے معاذ اللہ قصہ کہانی سے تعبیر کرتے ہیں، اور بعض وہ ہیں جو اس کا کھل کر انکار تو نہیں کرتے، لیکن ''سائنٹفک ترقیات'' کے اس دور میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے شرماتے ضرور ہیں، اس لئے یہاں مختصراً یہ بھی سمجھ لیجئے کہ خالص عقلی اعتبار سے وحی کی کیا حیثیت ہے؟

ہمارے نزدیک وحی کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے سب سے پہلے طے کرنے کی بات یہ ہے کہ اس کائنات کا کوئی خالق ومالک ہے یا یہ خود بخود بغیر کسی کے پیدا کئے ہوئے وجود میں آگئی ہے؟ جہاں تک اُن مادہ پرست لوگوں تعلق ہے جو سرے سے خدا کے وجود ہی کے منکر ہیں اُن سے تو وحی کے مسئلہ پر بات کرنا بالکل بے سود ہے، جو شخص خدا کے وجود ہی کا قائل نہ ہو اس کے لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ وحی کی حقیقت پر سنجیدگی کے ساتھ غور کر کے

Marfat.com

اُسے دل وجان سے تسلیم کرلے، اس لئے اس سے تو سب سے پہلے خدا کے وجود پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے، رہے وہ لوگ جو خدا کے وجود کے قائل ہیں سو اُن کے لئے وحی کی عقلی ضرورت، اس کے امکان اور حقیقی وجود کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔

اگر آپ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ یہ کائنات ایک قادرِ مطلق نے پیدا کی ہے وہی اس کے مربوط اور مستحکم نظام کو اپنی حکمتِ بالغہ سے چلا رہا ہے، اور اسی نے انسان کو کسی خاص مقصد کے تحت یہاں بھیجا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے انسان کو پیدا کر کے اُسے اندھیرے میں چھوڑ دیا ہو، اور اُسے یہ تک نہ بتایا ہو کہ وہ کیوں اس دنیا میں آیا ہے؟ یہاں اس کے ذمہ کیا فرائض ہیں؟ اس کی منزل مقصود کیا ہے؟ اور وہ کس طرح اپنے مقصدِ زندگی کو بروئے کار لا سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص جس کے ہوش وحواس سلامت ہوں ایسا کر سکتا ہے کہ اپنے کسی نوکر کو ایک خاص مقصد کے تحت سفر پر بھیج دے، اور اُسے نہ چلتے ہوئے اس کے سفر کا مقصد بتائے اور نہ بعد میں کسی پیغام کے ذریعہ اُس پر یہ واضح کرے کہ اُسے کس کام کے لئے بھیجا گیا ہے، اور سفر کے دوران اس کی ڈیوٹی کیا ہوگی؟ جب ایک معمولی قسم کا انسان بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا تو آخر اُس خداوندِ قدُّوس کے بارے میں یہ تصور کیسے کیا جا سکتا ہے جس کی حکمت بالغہ سے کائنات کا یہ سارا نظام چل رہا ہے؟ یہ آخر کیسے ممکن ہے کہ جس ذات نے چاند سورج آسمان، زمین، ستاروں اور سیاروں کا ایسا محیّر العقول نظام پیدا کیا ہو وہ اپنے بندوں تک پیغام رسانی کا کوئی ایسا انتظام بھی نہ کر سکے، جس کے ذریعہ انسانوں کو انکے مقصدِ زندگی سے متعلق ہدایات دی جا سکیں؟ اگر اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ پر ایمان ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اُس نے اپنے بندوں کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا ہے، بلکہ اُن کی رہنمائی کے لئے کوئی باقاعدہ نظام ضرور بنایا ہے، بس رہنمائی کے اسی باقاعدہ نظام کا نام وحی ورسالت ہے۔

اس سے صاف واضح ہے کہ ''وحی'' محض ایک دینی اعتقاد ہی نہیں ایک عقلی ضرورت ہے، جس کا انکار درحقیقت اللہ کی حکمتِ بالغہ کا انکار ہے، رہی یہ بات کہ وحی کے جو طریقے اوپر ذکر کئے گئے ہیں وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتے، سو یہ وحی کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی علمی دلیل

نہیں ہے، جس چیز کی عقلی ضرورت اور اس کا وقوع نا قابل انکار دلائل سے ثابت ہو اُسے محض اس بناء پر رَد نہیں کیا جا سکتا کہ ہم نے اس کا مشاہدہ نہیں کیا، آج سے چند سو سال پہلے اگر کسی شخص کے سامنے یہ ذکر کیا جاتا کہ عنقریب انسان ہوائی جہاز میں پرواز کر کے ہزاروں میل کا فاصلہ چند گھنٹوں میں طے کر لیا کریں گے تو وہ یقیناً اسے پریوں کا افسانہ قرار دیتا، لیکن کیا اس کے مشاہدہ نہ کرنے سے ہوائی جہاز کی حقیقت ختم ہو گئی ہے؟ آج بھی پسماندہ علاقوں کے ہزار ہا افراد ایسے ہیں جو اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ انسان چاند پر پہنچ گیا ہے، لیکن کیا ان کے انکار کرنے سے یہ واقعہ غلط ثابت ہو گیا ہے؟ دیہات میں جا کر کسی آدمی سے کمپیوٹر سسٹم کی تفصیلات بیان کیجئے اور اسے بتائیے کہ کس طرح ایک مشین انسانی دماغ کا کام کر رہی ہے، وہ آپ کے بیانات پر آخر تک شک وشبہ کا اظہار ہی کرتا رہے گا، لیکن کیا ان شکوک وشبہات سے کمپیوٹر کے وجود کا خاتمہ ہو گیا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں، تو وہ وحی جس کی عقلی ضرورت مسلّم اور نا قابل انکار ہے، اور جس کا مشاہدہ دنیا کے ایک لاکھ چوبیس ہزار صادق ترین انسانوں نے کیا ہے (علیہم السلام) اسے محض ان شکوک وشبہات کی بنا پر کیسے جھٹلایا جا سکتا ہے؟

اور آخر وحی کے ان طریقوں میں عقلی بُعد کیا ہے؟ کیا معاذ اللہ خدا تعالیٰ کو وحی کے ان طریقوں پر قدرت نہیں؟ اگر دنیا کے سائنسدان محض اپنی محدود عقل کے بل پر پیغام رسانی کے لئے ٹیلیفون، تار، ٹیلی پرنٹر، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے حیرت انگیز آلات ایجاد کر سکتے ہیں تو کیا اللہ تعالیٰ کو (نعوذ باللہ) اتنی بھی قدرت نہیں ہے کہ وہ اپنے بندوں تک پیغام رسانی کا کوئی ایسا سلسلہ قائم فرما دے جو ان تمام ذرائع مواصلات سے زیادہ مستحکم اور یقینی ہو؟

وحی کی حقیقت یہی تو ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا کلام کسی واسطے کے ذریعہ یا بلاواسطہ اپنے کسی پیغمبر پر القاء فرما دیتا ہے، سوال یہ ہے کہ اس بات کو درست تسلیم کر لینے میں عقلی قباحت کیا ہے؟ وحی کے ثبوت میں کسی انسانی ایجاد یا عمل کی مثال پیش کرتے ہوئے ہمیں تأمّل ہوتا ہے، لیکن بات کو سمجھنے کے لئے یہاں ہم ایک ایسے انسانی عمل کو بطور نظیر پیش کرتے ہیں جس

Marfat.com

میں ایک انسان دوسرے کے قلب ودماغ کو مسخر کر کے اس میں جو خیال چاہتا ہے ڈال دیتا ہے۔

اس عمل کو صوفیاء کی اصطلاح میں "تصرفِ خیالی" کہا جاتا ہے، صوفیائے کرام کے تذکروں میں اس عمل کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، جس کے ذریعہ ایک شخص اپنی خیالی قوت کے زور سے دوسرے کے دل ودماغ پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ اس سے جو چاہتا ہے کہلاتا ہے، اور جو چاہے کرواتا ہے، مادّہ پرست لوگ ایک مدّت تک اس "تصرّف" کی قوت کا بھی انکار کرتے رہے، اور انہی کی تقلید میں بہت سے مسلمانوں نے بھی اسے قصہ کہانی سے تعبیر کیا، یہاں تک کہ اٹھارہویں صدی کے وسط میں سوئٹزر لینڈ کا مشہور ماہر طبیعیات میسمر (M esmer) پیدا ہوا (۱)، اس نے انسانی دماغ کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا، اور ۱۷۷۵ء میں اپنے ایک مقالے کے ذریعے یہ انکشاف کیا کہ ایک مقناطیسی عمل کے ذریعے انسان کے دماغ کو مسخر کیا جاسکتا ہے، اس عمل کو وہ مقناطیسی عملِ تنویم (Anima M asnetism) کہتا تھا، اور فرانس میں مقیم رہ کر اس نے کامیاب عملی تجربے بھی کئے، لیکن وہ اپنے زمانے کے لوگوں کو پوری طرح مطمئن نہ کرسکا، پھر ۱۸۴۲ء میں انگلینڈ میں ایک اور شخص جیمس بریڈ (James Braid) پیدا ہوا جس نے اس عمل تسخیر کو سائنٹفک بنیادوں پر ازسرِ نو ثابت کر کے اس کا نام عمل تنویم یا ہپناٹزم (Hypnotism) تجویز کیا۔

جیمس بریڈ کے تجویز کردہ ہپناٹزم میں مختلف مدارج ہوتے ہیں، اس کا انتہائی درجہ تو یہ ہوتا ہے کہ جس شخص پر یہ عمل کیا جائے یعنی معمول (Hypnotised) اس کے جسم کے تمام عضلات واعصاب بالکل جامد اور بے حس ہو جاتے ہیں، اور اسی کے ساتھ حواسِ ظاہرہ

---

(۱) اس کا پورا نام فریڈرک انیٹون میسمر (Fredrich Anton Mesmer) ہے، یہ سوئٹزر لینڈ کی ایک جھیل کانسٹنس کے قریب مئی ۱۷۳۳ء میں پیدا ہوا، اور میر سمبرگ کے مقام پر مارچ ۱۸۱۵ء میں وفات پائی، ابتداء میں اس نے طب کو اپنا موضوع بنایا تھا، بعد میں مقناطیسی عمل تنویم کا ماہر بلکہ اس کا بانی کہلایا، اور (ورلڈ فیملی انسائیکلوپیڈیا ص ۳۴۲۵ ج ۱۲ مطبوعہ مشی گان امریکہ ۱۹۵۷ء مسمریزم کا علم اسی کی طرف منسوب ہے،

Marfat.com

وباطنہ معطّل ہوجاتے ہیں، لیکن اس کا ایک درمیانی درجہ بھی ہے، جس میں جسم بے حس وحرکت نہیں ہوتا، اس کیفیت کا حال بیان کرتے ہوئے ورلڈ فیملی انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے:

"اگر تنویم کا عمل ذرا ہلکا ہو تو معمول اس لائق رہتا ہے کہ وہ مختلف اشیاء کا تصور کر سکے، مثلاً اس حالت میں یہ ممکن ہے کہ وہ (عامل کی ہدایت کے مطابق) اپنے آپ کو کوئی اور شخصیت یقین کر لے، اُسے کچھ خاص چیزیں (جو وہاں فی الواقعہ موجود نہیں ہیں) نظر آنے لگیں، یا وہ غیر معمولی حس اپنے اندر محسوس کرنے لگے، اس لئے کہ وہ اُس وقت عامل کی ہدایت کا تابع ہوجاتا ہے۔"(۱)

جیمس بریڈ کی تحقیقات اور تجربات کے بعد ہپناٹزم کو اُن مادّہ پرست لوگوں نے بھی مان لیا جو پہلے اس کے قائل نہ تھے، اور آجکل تو یہ مغربی عوام کی دلچسپی کا بہت بڑا موضوع بنا ہوا ہے، سینکڑوں عامل اس کے ذریعہ روپیہ کمارہے ہیں، مریضوں کے علاج میں بھی اس سے کام لیا جارہا ہے، اور وہ "تصرّفِ خیالی" جس کا ذکر مسلمان صوفیاء کرام کے یہاں صدیوں سے چلا آتا تھا اور جس کو لوگ محض توہم پرستی کہہ کر ٹال دیا کرتے تھے، اب ہپناٹزم کے نام سے ایک حقیقت بن گیا ہے اور اب ہمارے زمانے کے وہ نام نہاد "عقلیت پسند" بھی اُسے تسلیم کرنے لگے ہیں جنہیں مسلمانوں کی ہر غیر معمولی بات توہّم پرستی اور مغرب کی ہر دریافت "سائنٹفک حقیقت" نظر آتی ہے۔

بہرکیف! عرض کرنا یہ تھا کہ مسمریزم ہو یا ہپناٹزم، اس کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہے کہ ایک انسان دوسرے کو مسخر کر کے اپنے خیالات اور اپنی باتیں اس کے دل ودماغ میں ڈالدیتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ جس خدا نے انسان کے تصرّفِ خیالی یا عملِ تنویم میں اتنی قوّت دی ہے کہ وہ معمولی معمولی مقاصد کے لئے بلکہ بعض اوقات بالکل بیکار دوسرے کے دماغ و دل کو مسخر کرلیتا ہے، کیا وہ خود اس بات پر قادر نہیں ہے کہ انسانیت کی ہدایت کی خاطر ایک پیغمبر کے قلب کو مسخر کر کے اپنا کلام اس میں ڈال دے؟ سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ۔

---

(۱) The World Family Encyclopeedia 1957 P.3426 V.12

Marfat.com

کیا قرآن کے صرف معنی وحی ہیں؟

اوپر ذکر آچکا ہے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں، ایک وحی متلو یعنی قرآن کریم، اور دوسری وحی غیر متلو، اس دوسری قسم میں تو عموماً یہ ہوا ہے کہ صرف مضامین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے تھے اور انہیں تعبیر کرنے کے لئے الفاظ کا انتخاب حضرت جبرئیلؑ یا آنحضرت ﷺ فرماتے تھے، لیکن قرآن کریم کا معاملہ یہ نہیں، وہ لفظاً اور معنیً پورا کا پورا اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جس طرح اس کے مضامین اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں اسی طرح اس کے الفاظ بھی مِن وعَن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں، اور ان کے انتخاب یا ترکیب وانشاء میں نہ حضرت جبرئیلؑ کا کوئی دخل ہے نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا،

جو لوگ وحی کے بارے میں مادّہ پرستوں کے اعتراضات سے مرعوب ہیں ہمارے زمانے میں اُن میں سے بعض نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن کا صرف مفہوم بذریعۂ وحی نازل ہوا تھا، اور (معاذ اللہ) اس کے الفاظ اور ترکیبیں وغیرہ سب حضرت جبرئیل علیہ السلام کی یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں، لیکن یہ خیال بالکل باطل، مہمل اور قرآن وسنت کے صریح دلائل کے بالکل خلاف ہے۔

قرآن کی بہت سی آیات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اس کے الفاظ اور معانی دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں، اس کے چند دلائل درج ذیل ہیں:

(۱) قرآن کریم نے جابجا اپنی ایک صفت ''عربی'' بیان فرمائی ہے، یعنی یہ کہ اسے عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے،(۱) اب ظاہر ہے کہ اگر قرآن کا صرف مفہوم بذریعۂ وحی نازل ہوا ہوتا تو ﴿ اِنَّـا اَنْـزَلْـنٰـهُ قُرْ اٰنًا عَرَبِیًّا ﴾ کے کوئی معنی ہی نہ تھے، کیونکہ عربیت الفاظ کی صفت ہے معانی کی نہیں۔

(۱) ملاحظہ فرمایئے سورۂ نحل: ۱۰۳، شعراء: ۱۹۵، یوسف: ۲، طٰہٰ: ۱۱۳، الرعد: ۳۹، الزمر: ۲۸ حٰمٓ السجدہ: ۳، الشوریٰ: ۷، الزخرف: ۳ وغیرہ،

Marfat.com

(۲) قرآن کریم میں کئی جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین فرائض منصبی بیان فرمائے گئے ہیں؛

﴿ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ﴾ (البقرہ:۱۲۹)

''جو ان کے سامنے تیری آیتوں کی تلاوت کرے، انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے، اور کو پاکیزہ بنائے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ کے ذمہ دو فرائض الگ الگ تھے، ایک آیات اللہ کی صرف تلاوت اور دوسرے اُن کی تعلیم، ظاہر ہے کہ تلاوت الفاظ کی ہوتی ہے معنی کی نہیں، لہٰذا آپؐ کے سب سے پہلے فریضۂ منصبی کا تعلق صرف الفاظ قرآن سے ہے معانی سے نہیں۔

(۳) قرآن کریم نے جا بجا اپنے لئے ''الکتٰب'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے، اور لفظ ''کتاب'' کا اطلاق صرف ذہنی مضامین پر نہیں ہوتا، بلکہ جب اُن مضامین کو الفاظ کے سانچے میں ڈھال لیا جاتا ہے تب اُسے کتاب کہتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کے لفظ اور معنی دونوں منزل من اللہ ہیں۔

(۴) سورۂ قیامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی لیکر آتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسے یاد کرنے کے لئے جلدی جلدی الفاظ دُہراتے تھے، اس پر باری تعالیٰ نے حکم دیا کہ:

﴿ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ o اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ o فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ o ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ o ﴾

(القیامہ:۱۶تا۱۹)

''(اے پیغمبر!) تم اس قرآن کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لئے اپنی زبان کو ہلایا نہ کرو، یقین رکھو کہ اس کو یاد کرانا اور پڑھوانا ہماری ذمہ داری ہے، پھر جب ہم اسے (جبرئیل کے واسطے سے) پڑھ رہے

Marfat.com

ہوں، تو تم اس کے پڑھنے کی پیروی کرو، پھر اُس کی وضاحت بھی

ہماری ذمہ داری ہے۔"

یہ آیت صراحۃً دلالت کر رہی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام جو الفاظ لے کر آتے تھے وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہوتا تھا، اسی لئے اس کے الفاظ یاد کرانے، اس کی تلاوت کا طریقہ سکھانے اور اس کے معانی کی تشریح کرنے کے تینوں کام اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لئے ہیں،

ان واضح دلائل کی روشنی میں یہ گمان بالکل باطل ہو جاتا ہے کہ الفاظِ قرآن وحی کے ذریعے نازل نہیں کیے گئے، اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے شیخ محمد عبدالعظیم زرقانیؒ نے بڑی اچھی بات لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

"اس مقام پر بحث کا لبِ لباب یہ ہے کہ قرآن کریم کے تو الفاظ اور معنی دونوں باتفاق بذریعۂ وحی نازل ہوئے ہیں، اور احادیثِ قدسیہ کے بارے میں بھی مشہور قول یہی ہے کہ ان کے الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، البتہ احادیثِ نبویہؐ کے صرف معنی وحی ہیں، الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے ہیں، اور جو احادیث آپؐ نے اپنے اجتہاد سے ارشاد فرمائیں اُن کے معنی اور الفاظ دونوں حضور ﷺ کے ہیں۔"(۱)

دراصل جن لوگوں نے الفاظِ قرآن کے وحی ہونے سے انکار کیا ہے اُن کے اس مغالطے کا منشاء یہی ہے کہ وحی کے ذریعے الفاظ کا نزول ان کی سمجھ میں نہ آسکا، لیکن وحی کی حقیقت اس کی عقلی ضرورت اور اس پر عقلی شبہات کے جواب میں جو باتیں اوپر لکھی گئی ہیں اُن کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ شبہ خود بخود دور ہو جاتا ہے، اگر وحی واقعۃً ایک ضرورت ہے اور باری تعالیٰ اس پر قادر ہے، تو آخر کونسی معقول وجہ ہے کہ وہ معنی تو نبی کے قلب پر اُتار سکے اور الفاظ اُتارنے پر (معاذ اللہ) قادر نہ ہو؟

---

(۱) مناهل العرفان فی علوم القرآن، ص۴۴ ج۱، عیسیٰ البابی الحلبی، مصر ۱۳۶۷ھ

یہاں یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ علامہ بدرالدین زرکشیؒ اور علامہ سیوطیؒ نے بھی بعض لوگوں کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اُن کے نزدیک صرف مضامین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، الفاظ حضرت جبرئیلؑ کے یا حضور ﷺ ہیں، (۱) لیکن آپ نے دیکھا کہ قرآن وسنت اور اجماعِ امّت کے مضبوط دلائل کی روشنی میں یہ اقوال بالکل باطل ہیں، مذکورہ بزرگوں نے بھی ان اقوال کے قائلین کا کوئی حوالہ نہیں دیا، بلکہ قال بعضھم (بعض لوگوں نے کہا ہے) کہہ کر یہ اقوال نقل کردیئے ہیں، اور علامہ سیوطیؒ نے تو اس کی صراحۃً تردید بھی کی ہے، اس لئے ان اقوال کو اس مذہب باطل کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

(۱) البرہان فی علوم القرآن، ص ۲۲۹ ج ۱ اور الاتقان، ص ۴۵ ج ۱

Marfat.com

باب دوم

تاریخِ نزولِ قرآن

قرآنِ کریم دراصل کلام الٰہی ہے، اس لئے ازل سے لوحِ محفوظ میں موجود ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ﴾ (البروج: ۲۲)

''بلکہ یہ بڑی عظمت والا قرآن ہے، جو لوح محفوظ میں درج ہے۔''

پھر قرآن مجید کا نزول دو مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ یہ پورا کا پورا آسمانِ دنیا کے ''بیتِ عزّت'' میں نازل کر دیا گیا، اُس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھوڑا تھوڑا کر کے حسبِ ضرورت نازل کیا جاتا رہا، یہاں تک کہ تیئس (۲۳) سال میں اس کی تکمیل ہوئی، قرآن کریم میں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں، ایک اِنْزَالٌ، اور دوسرے تَنْزِیْل، ''انزال'' کے معنی ہیں کسی چیز کو ایک ہی دفعہ میں مکمل نازل کر دینا، اور ''تنزیل'' کے معنی ہیں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنا، چنانچہ قرآن کریم نے اپنے لئے پہلا لفظ جہاں کہیں استعمال کیا ہے، اس سے مراد عموماً وہ نزول ہے جو لوح محفوظ سے آسمان دنیا کی طرف ہوا، ارشاد ہے:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾ (الدخان: ۲)

''ہم نے اسے ایک مبارک رات میں اُتارا ہے۔''

اور ''تنزیل'' سے مراد وہ نزول ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بتدریج ہوا، چنانچہ

Marfat.com

ارشاد ہے:

﴿ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴾ (بنی اسرائیل:۱۰۶)

''اور ہم نے قرآن کے جدا جدا حصے بنائے، تاکہ تم اُسے ٹھہر ٹھہر کو لوگوں کے سامنے پڑھو، اور ہم نے اُسے تھوڑا تھوڑا کر کے اُتارا ہے۔''

نزولِ قرآن کی یہ دو صورتیں خود قرآن کریم کے اندازِ بیان سے بھی واضح ہیں، اس کے علاوہ نسائیؒ، حاکمؒ، بیہقیؒ، ابن ابی شیبہؒ، طبرانیؒ اور ابن مردویہؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں، جن کا خلاصہ یہی ہے کہ قرآن کا پہلا نزول یکبارگی آسمانِ دنیا پر ہوا، اور دوسرا نزول بتدریج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ (۱)

پہلا نزول

حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلا نزول لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا کے ایک مقام ''بیتِ عزت'' پر ہوا، ''بیتِ عزت'' میں قرآن کا نزول کس طرح ہوا؟ اور اس نزول کی حکمت کیا تھی؟ اس بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی، البتہ بعض علماء مثلاً علامہ ابو شامہؒ نے یہ حکمت بیان فرمائی ہے کہ ''اس سے قرآن کریم کی رفعتِ شان کو واضح کرنا مقصود تھا، اور اس مقام کے ملائکہ کو یہ بات بتانی تھی کہ یہ اللہ کی آخری کتاب ہے جو اہلِ زمین کی ہدایت کے لئے اُتاری جانے والی ہے۔'' زرقانیؒ نے یہ نکتہ (۲) بھی بیان کیا کہ اس طرح دو مرتبہ اتارنے سے یہ بھی جتانا مقصود ہے کہ یہ کتاب ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے؛ حضورؐ کے قلبِ مبارک کے علاوہ یہ دو جگہ اور بھی محفوظ ہے، ایک لوحِ محفوظ میں اور دوسرے بیتِ عزت میں، واللہ اعلم۔

بہرکیف! اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا احاطہ کون کرے؟ اسی کو صحیح علم ہے کہ اس کی اور کیا کیا

---

(۱) دیکھئے الاتقان، ص ۴۱ ج ۱، النوع السادس عشر، (۲) مناهل العرفان ص ۳۹ ج ۱،

Marfat.com

حکمتیں ہوں گی، اور ہمیں اُن کی تفتیش میں پڑنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، البتہ ہمیں اتنا وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ پہلا نزول لیلۃ القدر میں ہوا تھا۔

دوسرا نزول

اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ قرآن کریم کا دوسرا تدریجی نزول اُس وقت شروع ہوا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چالیس سال تھی، اس نزول کا آغاز بھی صحیح قول کے مطابق لیلۃ القدر ہی سے ہوا ہے،(۱) اور یہی وہ تاریخ تھی جس میں گیارہ سال بعد غزوۂ بدر پیش آیا، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿ وَمَا اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعَانِ ﴾

(الانفال:۴۱)

''اگر تم اللہ پر اور اُس چیز پر ایمان رکھتے ہو جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے کے دن نازل کی تھی، جس دن دو جماعتیں باہم ٹکرائی تھیں۔''

اس طرح نزولِ قرآن کے آغاز کے بارے میں مندرجۂ ذیل باتیں تو خود قرآن کریم سے ثابت ہیں:

۱۔ اس کی ابتداء رمضان کے مہینے میں ہوئی۔

۲۔ جس رات نزولِ قرآن کا آغاز ہوا وہ شبِ قدر تھی۔

۳۔ یہ وہی تاریخ تھی جس میں بعد کو غزوہ بدر پیش آیا۔

لیکن یہ رات رمضان کی کونسی تاریخ میں تھی؟ اس کے بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی، بعض روایات سے رمضان کی سترہویں، بعض سے انیسویں اور بعض سے ستائیسویں شب معلوم ہوتی ہے،(۲)

---

(۱) مشہور یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ربیع الاول میں عطا ہوئی تھی، علامہ سیوطیؒ نے اس کا محمل یہ بتایا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ربیع الاول میں سچے خواب آنے شروع ہوئے تھے، یہ سلسلہ چھ ماہ تک جاری رہا، پھر رمضان میں قرآن نازل ہوا، (الاتقان، ص۴۲ ج۱)

(۲) دیکھئے تفسیر جامع البیان لابن جریر الطبری، ص۷ ج۱۰، مطبوعہ مصر

سب سے پہلے نازل ہونیوالی آیت

صحیح قول یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم کی سب سے پہلی جو آیتیں اُتریں وہ سورۂ علق کی ابتدائی آیات ہیں، صحیح بخاریؒ میں حضرت عائشہؓ اس کا واقعہ یہ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کی ابتداء تو سچے خوابوں سے ہوئی تھی، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خلوت میں عبادت کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور اُس دوران آپؐ غارِ حراء میں کئی کئی راتیں گذارتے اور عبادت میں مشغول رہتے تھے، یہانتک کہ ایک دن اُسی غار میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرشتہ آیا، اور اس نے سب سے پہلی بات یہ کہی کہ اِقْرَأْ (یعنی پڑھو) حضورؐ نے فرمایا کہ ''میں پڑھا ہوانہیں ہوں'' اس کے بعد خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعہ بیان کیا کہ میرے اس جواب پر فرشتےؑ نے مجھے پکڑا، اور مجھے اس زور سے بھینچا کہ مجھ پر مشقت کی انتہا ہوگئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا، اور دوبارہ کہا کہ اِقْرَأْ، میں نے جواب دیا کہ ''میں تو پڑھا ہوانہیں ہوں'' فرشتہ نے مجھے پھر پکڑا اور دوبارہ اس زور سے بھینچا کہ مجھ پر مشقت کی انتہا ہوگئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ کر کہا کہ اِقْرَأْ، میں نے جواب دیا کہ ''میں پڑھا ہوانہیں ہوں'' اس پر اُس نے مجھے تیسری مرتبہ پکڑا اور بھینچ کر چھوڑ دیا، پھر کہا:

﴿ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ، اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ﴾ (علق:۱)

''پڑھو، اپنے پروردگار کا نام لے کر جس نے سب کچھ، اُس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا ہے، پڑھو، اور تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کرم والا ہے''

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان آیات کو لے کر واپس گھر کی طرف چلے، تو آپکا مبارک دِل دھڑک رہا تھا، آپ حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچے، اور فرمایا: زَمِّلُوْنِیْ، زَمِّلُوْنِیْ (مجھے کمبل اڑھاؤ، مجھے کمبل اڑھاؤ) گھر والوں نے آپؐ کو کمبل اُڑھایا، یہاں تک کہ آپؐ سے

Marfat.com

خوف جاتا رہا، (۱)

یہ آپؐ پر نازل ہونے والی پہلی آیات تھیں، اس کے بعد تین سال تک وحی کا سلسلہ منقطع رہا، اس زمانے کو "فترتِ وحی" کا زمانہ کہتے ہیں، پھر تین سال کے بعد وہی فرشتہ جو غارِ حراء میں آیا تھا، آپؐ کو آسمان و زمین کے درمیان دکھائی دیا، اور اُس نے سورۂ مدثر کی آیات آپؐ کو سُنائیں۔

یہ واقعہ صحیح بخاریؒ اور صحیح مسلمؒ کے علاوہ تقریباً تمام کتب حدیث میں صحیح سندوں کے ساتھ منقول ہے، اسی لئے جمہور علماء کے نزدیک صحیح یہی ہے کہ قرآن کریم کی سب سے پہلی آیات جو آپؐ پر نازل ہوئیں سورۂ علق کی ابتدائی آیات ہیں، ان کے بعد سورۂ مدثر کی آیتیں نازل ہوئیں، لیکن اس سلسلے میں تین اقوال اور بھی ہیں، جن پر یہاں ایک سرسری نظر ڈال لینا مناسب ہوگا۔

ا۔ صحیح بخاریؒ کتاب التفسیر میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ پر سب سے پہلے سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں، اس بناء پر بعض علماء نے یہ کہدیا کہ نزول کے اعتبار سے سورۂ مدثر سورۂ علق سے مقدم ہے، لیکن حافظ ابن حجرؒ نے اس مغالطہ کی حقیقت واضح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ درحقیقت بخاریؒ کی کتاب التفسیر میں حضرت جابرؓ کی روایت مختصر ہے، اور اس میں دو جملے نقل نہیں کئے گئے، یہی روایت امام زہریؒ کی سند سے بخاریؒ ہی نے باب بدء الوحی میں نقل کی ہے، اس میں حضرت جابرؓ نے سورۂ مدثر کے نزول کا واقعہ بتاتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ صراحۃً نقل فرمائے ہیں کہ:

فَإِذَا الْمَلَكُ الَّذِیْ جَآءَنِیْ بِحِرَاءٍ جَالِسٌ عَلَی الْكُرْسِیِّ

"پس اچانک (میں نے دیکھا کہ) جو فرشتہ میرے پاس غارِ حراء میں آیا تھا وہ کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔"

---

(۱) صحیح بخاری، حدیث نمبر ۳ باب کیف کان بدؤ الوحی الی رسول اللہ ﷺ۔

Marfat.com

اس سے صاف واضح ہے کہ غارِ حراء میں سورۂ اقرأ کی آیتیں پہلے نازل ہوچکی تھیں، سورۂ مدثر بعد میں نازل ہوئی،(۱) البتہ یہ کہنا درست ہے کہ ''فترتِ وحی'' کے بعد سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات سورۂ مدثر کی ہیں، لہٰذا جن روایات میں حضرت جابرؓ سے یہ منقول ہے کہ پہلی نازل ہونے والی وحی یَـا أَيُّهَـا الْمُدَّثِّرُ ہے، اس سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''فترت'' کے زمانہ کے بعد پہلی وحی یہ تھی، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پہلی سورت جو مکمل نازل ہوئی وہ سورۂ مدثر تھی، کیونکہ سورۂ اقرأ پوری ایک مرتبہ نازل نہیں ہوئی۔

۲۔ امام بیہقیؒ نے دلائل النبوۃ میں حضرت عمرو بن حبیل رضی اللہ عنہ سے ایک مرسل روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نزولِ وحی سے پہلے حضرت خدیجہؓ سے فرمایا کرتے تھے کہ میں جب بھی خلوت میں جاتا ہوں تو کوئی مجھے یَـا مُحَـمَّـدُ یَـا مُحَمَّدُ کہہ کر پکارتا ہے، یہاں تک کہ ایک دن جب میں خلوت میں پہنچا تو اس نے کہا یَـا مُحَمَّدُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ o اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o الخ یہاں تک کہ پوری سورۂ فاتحہ پڑھ دی،(۲)

اس روایت کی بناء پر علامہ زمخشریؒ نے لکھا ہے کہ سب سے پہلی نازل ہونے والی سورت سورۂ فاتحہ ہے، بلکہ اسی کو انہوں نے اکثر مفسرین کا قول قرار دیا ہے،(۳) لیکن حافظ ابن حجرؒ نے ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ زمخشریؒ کا یہ کہنا درست نہیں، سورۂ فاتحہ کو پہلی وحی قرار دینے والے بہت کم ہیں، اکثر مفسرین کا قول یہی ہے کہ سورۂ اِقْرَأ سب سے پہلے نازل ہوئی۔(۴)

جہاں تک بیہقیؒ کی مذکورہ روایت کا تعلق ہے اُس کے بارے میں خود امام بیہقیؒ نے یہ

---

(۱) فتح الباری، ص ۲۳ ج ۱، اس واقعہ کی مزید تحقیق کے لئے دیکھئے فیض الباری ص ۲۵ ج ۱، و الاتقان، ص ۲۴ و ۲۵ ج ۱، (۲) الاتقان، ص ۲۵ ج ۱۔

(۳) الزمحشری : الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل ص ۷۷۵ ج ۴ مطبعۃ الاستقامۃ، قاہرہ ۱۳۶۵ھ (۴) فتح الباری ص ۵۸۰ ج ۸ کتاب التفسیر، سورۂ اِقرأ،

Marfat.com

لکھا ہے کہ اگر یہ روایت درست ہوتو یہ ممکن ہے کہ یہ واقعہ سورۂ اقرأ اور سورۂ مدثر کے نزول کے بعد کا ہو، (۱) اور حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ خیال بھی فرمایا ہے کہ ہوسکتا ہے سورۂ فاتحہ بعض دوسری آیات کی طرح دو مرتبہ نازل ہوئی ہو، ایک مرتبہ سورۂ اقرأ کے نزول سے پہلے، اور دوسری بار اس کے بعد، اس صورت میں یہ کہنا پڑے گا کہ سورۂ فاتحہ کا نزول پہلی بار قرآنیت کی صفت کے ساتھ نہیں ہوا تھا، بلکہ ایک فرشتہ نے آپؐ کو یہ سورت سُنا دی تھی، بعد میں اپنے وقت پر با قاعدہ قرآن کے جز کی حیثیت میں نازل ہوئی (۲)

بہرکیف! ان تین روایتوں کو چھوڑ کر باقی اکثر روایات اس بات پر متفق ہیں کہ سورۂ اقرأ کی ابتدائی آیات سب سے پہلے نازل ہوئی تھیں، علامہ سیوطیؒ نے اس کی تائید میں بہت سی روایتیں نقل کی ہیں۔ (۳)

مکی اور مدنی آیات

آپ نے قرآن کریم کی سورتوں کے عنوان میں دیکھا ہوگا کہ کسی سورت کے ساتھ ''مکی'' اور کسی کے ساتھ مدنی لکھا ہوتا ہے، اس کا صحیح مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے،

اکثر مفسرین کی اصطلاح کے مطابق ''مکی آیت'' کا مطلب وہ آیت ہے جو آپؐ کے بغرض ہجرت مدینہ طیبہ پہنچنے سے پہلے پہلے نازل ہوئی، بعض لوگ مکی کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شہر مکہ میں نازل ہوئی، اور مدنی کا یہ کہ وہ شہر مدینہ میں اُتری، لیکن اکثر مفسرین کی اصطلاح کے مطابق یہ مطلب سمجھنا درست نہیں، اس لئے کہ کئی آیتیں ایسی ہیں جو شہر مکہ میں نازل نہیں ہوئیں، لیکن چونکہ ہجرت سے پہلے نازل ہو چکی تھیں اس لئے انہیں مکی کہا جاتا ہے، چنانچہ منیٰ، عرفات وغیرہ اور سفرِ معراج کے دوران نازل ہونے والی آیات ایسی ہی ہیں، یہاں تک کہ سفرِ ہجرت کے دوران جو آیات راستے میں نازل ہوئیں وہ بھی مکی کہلاتی ہیں، اسی طرح بہت سی آیات ایسی ہیں جو شہر مدینہ میں نازل نہیں ہوئی مگر انہیں مدنی کہا جاتا ہے، چنانچہ ہجرت

---

(۱) الاتقان ص ۲۵ ج ۱، (۲) فیضِ الباری، ص ۲۵ ج ۱، (۳) الاتقان، ص ۲۴ ج ۱،

کے بعد آپؐ کو بہت سے سفر پیش آئے جن میں آپؐ مدینہ سے سینکڑوں میل دور بھی تشریف لے گئے، ان تمام مقامات پر نازل ہونے والی آیات مدنی ہی کہلاتی ہیں، یہاں تک کہ اُن آیتوں کو بھی مدنی کہا جاتا ہے جو فتح مکہ یا غزوۂ حدیبیہ کے موقع پر خاص شہر مکہ یا اس کے مضافات میں نازل ہوئیں (۱) چنانچہ آیت قرآنی ﴿اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا﴾ مدنی ہے، حالانکہ وہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، (۲)

اگر چہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے جس میں آپؐ نے کسی آیت یا سورت کو مکی یا مدنی قرار دیا ہو، لیکن جن حضرات صحابہؓ و تابعینؒ نے قرآن کریم کے الفاظ و معانی کی حفاظت میں اپنی عمریں کھپائی ہیں، انہوں نے ہی سورتوں اور آیات کے بارے میں یہ بھی بتایا ہے کہ ان میں سے کونسی مکی ہے اور کونسی مدنی؟ مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قسم کھا کر فرماتے ہیں: ''قسم اُس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ کی کتاب کی ہر آیت کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ وہ کس کے بارے میں نازل ہوئی؟ اور کہاں نازل ہوئی؟'' (۳) اور حضرت علیؓ فرماتے ہیں: ''خدا کی قسم! میں ہر ہر آیت کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہ رات میں نازل ہوئی یا دن کو، میدانی علاقہ میں اُتری یا پہاڑ پر؟'' (۴)

اکثر و بیشتر تو انہی حضرات صحابہؓ نے قرآن کریم کی سورتوں اور آیتوں کے بارے میں یہ بتایا ہے کہ وہ مکی ہیں یا مدنی، اس کے علاوہ بعض آیات یا سورتوں کے بارے میں دوسرے شواہد کے ذریعے بھی یہ معلوم ہو جاتا ہے، مثلاً جن آیات میں غزوۂ بدر کا ذکر ہے، ظاہر ہے کہ وہ مدنی ہی ہو سکتی ہیں، یا جن آیتوں میں خاص طور پر مشرکین مکہ سے خطاب کرنے کو کہا گیا ہے ان میں سے بیشتر کو مکی ہی سمجھا جا سکتا ہے، لہٰذا بعض مرتبہ اس قسم کے قیاسات اور شواہد کی بنیاد پر بھی

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے البرھان فی علوم القرآن، ص ۱۸۸ ج ۱، النوع التاسع۔

(۲) مناھل العرفان ص ۱۸۸ ج ۱۔ (۳) الاتقان، ص ۹ ج ۱ بحوالہ بخاریؒ،

(۴) ایضاً ص ۱۸۷ ج ۲، النوع الثمانون بحوالہ معمر،

Marfat.com

کسی آیت کو مکی یا مدنی قرار دیا جاتا ہے پھر چونکہ قیاسات مختلف ہو سکتے ہیں، اس لئے بعض آیات کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف بھی پیدا ہو گیا ہے کہ بعض کے نزدیک وہ مکی اور بعض کے نزدیک مدنی ہیں۔

پھر بعض سورتیں تو ایسی ہیں کہ وہ پوری کی پوری مکی یا پوری کی پوری مدنی ہیں، مثلاً سورۂ مدّثر پوری مکی ہے اور سورۂ آلِ عمران پوری مدنی، اور بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے کہ پوری سورت تو مکی ہے، لیکن اس میں ایک یا چند آیات مدنی آ گئی ہیں مثلاً سورۂ اعراف مکی ہے، لیکن اس میں ﴿ وَاسْأَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ﴾ سے لیکر وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ تک کی آیات مدنی ہیں، اسی طرح بعض مرتبہ اس کے برعکس بھی ہوتا ہے، مثلاً سورۂ حج مدنی ہے لیکن اس کی چار آیتیں یعنی ﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى ﴾ سے لیکر ﴿ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيمٍ ﴾ تک مکی ہیں۔

اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کسی سورت کا مکی یا مدنی ہونا عموماً اس کی آیات کی اکثریت کے اعتبار سے ہوتا ہے، اور عموماً ایسا ہوتا تھا کہ جس سورت کی ابتدائی آیات ہجرت سے قبل نازل ہو گئیں، اُسے مکی قرار دیدیا گیا، اگرچہ بعد میں اس کی بعض آیتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہوں، (۱)

مکی و مدنی آیتوں کی خصوصیات

علماءِ تفسیر نے مکی اور مدنی سورتوں کا استقراء کر کے ان کی بعض ایسی خصوصیات بیان فرمائی ہیں جن سے بادی النظر میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سورت مکی ہے یا مدنی اس سلسلے میں بعض قواعد کلّی ہیں اور بعض اکثری، قواعدِ کلّیہ یہ ہیں:

۱۔ ہر وہ سورت جس میں لفظ "کَلَّا" (ہرگز نہیں) آیا ہے، وہ مکی ہے، یہ لفظ پندرہ سورتوں میں ۳۳ مرتبہ استعمال ہوا ہے، اور یہ ساری آیتیں قرآن کریم کے آخری نصف حصہ میں ہیں،

(۱) مناهل العرفان، ص ۱۹۲ ج ۱،

Marfat.com

چنانچہ علامہ دیرینیؒ کا شعر ہے۔

وما نزلت کلا بیثرب فاعلمن ولم تأت فی القرآن فی نصفه الاعلیٰ

۲۔ ہر وہ سورت جس میں کوئی سجدے کی آیت آئی ہے مکی ہے۔ (۱)

۳۔ سورۂ بقرہ کے سوا ہر وہ سورت جس میں آدمؑ و ابلیس کا واقعہ آیا ہے وہ مکی ہے۔

۴۔ ہر وہ سورت جس میں جہاد کی اجازت یا اس کے احکام مذکور ہیں، مدنی ہے۔

۵۔ ہر وہ سورت جس میں منافقین کا ذکر آیا ہے، مدنی ہے، بعض علماء نے اس قاعدے سے سورۂ عنکبوت کو مستثنیٰ کیا ہے، لیکن تحقیق یہ ہے کہ سورۂ عنکبوت بحیثیت مجموعی تو مکی ہے، مگر جن آیات میں منافقین کا ذکر ہے وہ مدنی ہیں۔(۲)

اور سورتوں کی مندرجہ ذیل خصوصیات عمومی اور اکثری ہیں، یعنی کبھی کبھی ان کے خلاف بھی ہو جاتا ہے، لیکن اکثر و بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے۔

۱۔ مکی سورتوں میں عموماً ﴿ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ ﴾ (اے لوگو) کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے اور مدنی سورتوں میں ﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾ کے الفاظ سے۔

۲۔ مکی آیتیں اور سورتیں عموماً چھوٹی اور مختصر ہیں، اور مدنی آیات و سُور طویل اور مفصّل ہیں،

۳۔ مکی سورتیں زیادہ تر توحید، رسالت اور آخرت کے اثبات، حشر و نشر کی منظر کشی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و تسلّی کی تلقین اور پچھلی اُمتوں کے واقعات پر مشتمل ہیں، اور ان میں احکام و قوانین کم بیان ہوئے ہیں، اس کے برعکس مدنی سورتوں میں خاندانی اور تمدّنی قوانین، جہاد و قتال کے احکام اور حدود و فرائض بیان کیے گئے ہیں۔

---

(۱) مناهل العرفان، ص ۱۹۱ ج ۱،

(۲) یہ قاعدہ اتقان وغیرہ سے ماخوذ ہے، اور یہ اس قول کے مطابق تو درست ہے جس کی رو سے سورۂ حج مکی ہے، لیکن اگر اسے مدنی قرار دیا جائے جیسا کہ بعض صحابہ و تابعین سے مروی ہے تو سورۂ حج اس قاعدے سے مستثنیٰ ہوگی۔ تقی

۴۔ مکی سورتوں میں زیادہ تر مقابلہ بت پرستوں سے ہے، اور مدنی سورتوں میں اہل کتاب اور منافقین سے۔

۵۔ مکی سورتوں کا اسلوبِ بیان زیادہ پر شکوہ ہے، اس میں استعارات، تشبیہات اور تمثیلیں زیادہ ہیں، اور ذخیرۂ الفاظ بہت وسیع ہے، اس کے برخلاف مدنی سورتوں کا انداز نسبۃً سادہ ہے۔

مکی اور مدنی سورتوں کے انداز و اسلوب میں یہ فرق دراصل حالات، ماحول، اور مخاطبوں کے اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، مکی زندگی میں مسلمانوں کا واسطہ چونکہ زیادہ تر عرب کے بت پرستوں سے تھا، اور کوئی اسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی تھی، اس لئے اس دَور میں زیادہ زور عقائد کی درستی، اخلاق کی اصلاح، بُت پرستوں کی مدلّل تردید اور قرآن کریم کی شانِ اعجاز کے اظہار پر دیا گیا، اس کے برخلاف مدینہ طیبہ میں ایک اسلامی ریاست وجود میں آچکی تھی، لوگ جوق در جوق اسلام کے سائے تلے آرہے تھے، علمی سطح پر بُت پرستی کا ابطال ہو چکا تھا، اور تمام تر نظریاتی مقابلہ اہلِ کتاب سے تھا، اس لئے یہاں احکام وقوانین اور حدود وفرائض کی تعلیم اور اہل کتاب کی تردید پر زیادہ توجہ دی گئی، اور اسی کے مناسب اسلوبِ بیان اختیار کیا گیا۔

ہر منصف مزاج انسان حالات کی تدریج کی روشنی میں قرآنی مضامین واسلوب کے اس اختلاف کو بآسانی سمجھ سکتا ہے، لیکن جن مستشرقین کے دل میں اسلام دشمنی کی آگ سلگتی ہی رہتی ہے، انہوں نے مکی اور مدنی اسلوب کے اس فرق سے بھی من گھڑت نتائج نکالنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ بعض مستشرقین نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن (معاذ اللہ) خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے، اسی لئے وہ حالات اور ماحول کے اختلاف سے مختلف اسلوب اختیار کرتا رہا، اگر یہ اللہ کا کلام ہوتا تو اس کا اسلوب گردوپیش سے متاثر نہ ہوتا۔

لیکن جس شخص کے دل میں بھی انصاف اور معقولیت کی ادنیٰ رمق موجود ہو وہ اس معاندانہ اعتراض کی لغویت محسوس کر سکتا ہے، علم بلاغت کی اصل رُوح یہ ہے کہ کلام اپنے مخاطب اور ماحول کے تقاضوں کے مطابق ہو، ہر قسم کے مخاطب کے سامنے اور ہر قسم کے ماحول

میں ایک ہی انداز واسلوب پر جمے رہنا پرلے درجے کی بدمزاقی اور بلاغت کے بنیادی آداب تک سے نابلد ہونے کی دلیل ہے، اور اللہ تعالیٰ کے کلام سے اس بدمذاقی کی توقع وہی شخص کرسکتا ہے، جس نے اعتراض برائے اعتراض کی قسم ہی کھار کھی ہو، (۱)

نزول کا وقت اور مقام

آیاتِ قرآنی میں مکی اور مدنی کی تقسیم کے علاوہ نزول کے مقام اور وقت کے لحاظ سے مفسرین نے کچھ اور قسمیں بھی بیان فرمائی ہیں، مثلاً حضری آیات اُن آیتوں کو کہتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وطن میں نازل ہوئیں، اور اکثر قرآنی آیات ایسی ہی ہیں، اور سفری آیات وہ ہیں جو سفر کی حالت میں نازل ہوئیں مثلاً ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ﴾ فتح مکہ کے سفر میں اُتری، علامہ سیوطیؒ نے اس قسم کی تقریباً چالیس آیتیں شمار کی ہیں (۲) اس کے علاوہ مندرجہ ذیل قسمیں بھی انہوں نے ہی بیان فرمائی ہیں:

(۱) نہاری: یہ وہ آیات ہیں جو دن کے وقت نازل ہوئیں، بقولِ علامہ ابن حبیبؒ اکثر آیات اسی قسم سے تعلق رکھتی ہیں،

(۲) لیلی: یہ وہ آیات ہیں جو رات کے وقت نازل ہوئیں، مثلاً سورۂ آلِ عمران کی آخری آیات ﴿ اِنَّ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِى الْاَلْبَابِ ﴾ رات کے وقت نازل ہوئی تھیں، علامہ سیوطیؒ نے اس کی مزید ایک درجن مثالیں اتقان میں ذکر کی ہیں۔

(۳) صیفی: یہ وہ آیات ہیں جو گرمی کے موسم میں نازل ہوئیں، مثلاً سورۂ نساء کی آخری آیت ﴿ يَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِى الْكَلٰلَةِ ﴾ صحیح مسلم میں حضرت عمرؓ کی روایت کے مطابق گرمی میں نازل ہوئی تھی، اور دوسری روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ یہ

(۱) اس لغو اعتراض کی باقاعدہ علمی تردید کی ہم ضرورت نہیں سمجھتے، تاہم جو صاحب چاہیں اس نوعیت کے اعتراضات اور ان کے مفصل جواب کے لئے شیخ زرقانیؒ کی مناهل العرفان میں صفحہ ۱۹۸ تا ۲۳۲ ج ۱ کا مطالعہ فرمائیں۔

(۲) ملاحظہ ہو الاتقان، ص ۱۹ تا ۲۱ ج ۱،

Marfat.com

آیتیں حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی تھیں، اس سے معلوم ہوا کہ حجۃ الوداع کے موقع پر جتنی آیات نازل ہوئیں وہ سب صیفی ہیں، مثلاً ﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ﴾ وغیرہ۔

(۴) شتائی: یہ وہ آیات ہیں جو سردی کے موسم میں اُتریں، مثلاً سورۂ نور کی آیات ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْکِ الخ ﴾ جن میں حضرت عائشہؓ پر تہمت لگانے والوں کی تردید کی گئی ہے، سردی کے موسم میں نازل ہوئی تھیں، جیسا کہ صحیح بخاریؒ میں خود حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، اسی طرح غزوۂ خندق کے بارے میں سورۂ احزاب کی آیات بھی اسی قسم میں داخل ہیں، کیونکہ یہ غزوہ بھی سردی کے موسم میں ہوا تھا،

(۵) فراشی: یہ وہ آیات ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسے وقت نازل ہوئیں، جب آپ اپنے بستر پر تھے، چنانچہ آیت ﴿ وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ ﴾ (مائدہ: ۶۷) اسی حالت میں نازل ہوئی، علامہ سیوطیؒ نے اس کی دو مثالیں اور ذکر کی ہیں۔

(۶) نومی: بعض حضرات نے آیات کی ایک قسم "نومی" بھی ذکر کی ہے، یعنی وہ آیات جو نیند کی حالت میں اُتریں، اور اس کی مثال میں صحیح مسلمؒ کی وہ روایت پیش کی ہے، جس میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان تشریف فرما تھے کہ آپؐ کو نیند کا ایک جھونکا آیا، پھر آپؐ نے تبسم فرماتے ہوئے سر مبارک اٹھایا اور فرمایا کہ مجھ پر ابھی ایک سورت نازل ہوئی ہے، پھر آپؐ نے سورۂ ﴿ اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ ﴾ تلاوت فرمائی۔

لیکن محقق بات یہ ہے کہ نیند کی حالت میں آپؐ پر کوئی آیتِ قرآنی نازل نہیں ہوئی، اوپر کی روایت میں جس کیفیت کو "نیند کے جھونکے" سے تعبیر کیا گیا ہے اس کے لئے اصل حدیث میں "اغفاءۃ" کا لفظ استعمال ہوا ہے، اور امام رافعیؒ وغیرہ نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد نیند نہیں، بلکہ وہ مخصوص حالت ہے جو آپؐ پر نزولِ وحی کے وقت طاری ہو جایا کرتی تھی، اس لئے اس حدیث سے یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ نزولِ قرآن نیند میں بھی ہوا ہے، علامہ

Marfat.com

سیوطیؒ نے بھی امام رافعیؒ کی تائید کی ہے (۱)۔

(۷) سماوی: یعنی وہ آیات جو معراج کے وقت آسمان پر نازل ہوئیں، ان کے بارے میں صرف ایک صحیح مسلمؒ کی روایت ملتی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ بقرہ کی آخری آیات شبِ معراج میں سدرۃ المنتہیٰ کے قریب نازل ہوئیں (۲)۔

(۸) فضائی: علامہ ابن عربیؒ نے ایک قسم ایسی بھی ذکر کی ہے جو نہ زمین پر نازل ہوئی نہ آسمان پر، ان کا کہنا ہے کہ سورۂ صافات کی تین آیتیں ﴿ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴾ اور سورۂ زخرف کی ایک آیت ﴿ وَاسْأَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَا ﴾ اسی قسم میں داخل ہیں، لیکن علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ مجھے اس کی کوئی سند نہیں مل سکی۔

قرآن کریم کا تدریجی نزول:

پیچھے آچکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم دفعۃً اور یکبارگی نازل نہیں ہوا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کرکے تقریباً تیئس سال میں اُتارا گیا ہے، بعض اوقات جبرئیل امین علیہ السلام ایک چھوٹی سی آیت ...... بلکہ آیت کا کوئی ایک جزء لے کر بھی تشریف لے آئے، اور بعض مرتبہ کئی کئی آیتیں بیک وقت نازل ہوجاتیں، قرآن کریم کا سب سے چھوٹا حصّہ جو مستقلاً نازل ہوا وہ ﴿ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ ﴾ (نساء: ۹۴) ہے، جو ایک طویل آیت کا ٹکڑا ہے، دوسری طرف پوری سورۂ انعام ایک ہی مرتبہ نازل ہوئی ہے (۳)۔

بعض حضرات کو ابن عساکرؒ کی ایک روایت سے یہ شبہ ہوگیا ہے کہ جبرئیل امین علیہ السلام ایک مرتبہ میں پانچ سے زائد آیتیں نہیں لائے، لیکن علامہ سیوطیؒ نے خیال کی تردید کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ نازل تو اس سے زائد آیتیں بھی ہوئی ہیں، مثلاً واقعہ افک میں بیک وقت دس آیتوں کا نزول صحیح احادیث سے ثابت ہے، لیکن ہوتا یہ تھا کہ جبرئیل امین علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پانچ پانچ آیتیں یاد کرایا کرتے تھے، جب پانچ آیتیں یاد ہوجاتیں تو مزید آیتیں سُنا کر یاد کرادیتے تھے، چنانچہ امام بیہقیؒ نے حضرت ابوالعالیہؒ کا قول

(۱) الاتقان، ص: ۲۳ ج ۱ (۲) الاتقان، ص: ۲۴ ج ۱ (۳) تفسیر ابن کثیر، ص ۱۲۲ ج ۲

Marfat.com

نقل کیا ہے کہ ''قرآن کی پانچ پانچ آیتیں سیکھا کرو، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل سے پانچ پانچ آیتیں ہی یاد کیا کرتے تھے،(۱)

قرآن کریم کو یکبارگی نازل کرنے کے بجائے تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں نازل کیا گیا؟ یہ سوال خود مشرکین عرب نے آپؐ سے کیا تھا؟ کیونکہ وہ ایک قصیدہ پورا کا پورا ایک وقت میں سننے کے عادی تھے، اور یہ تدریجی نزول اُن کے لئے ایک اچنبھی سی بات تھی، اس کے علاوہ قرآن سے پہلے تورات، زبور اور انجیل تینوں ایک ہی مرتبہ نازل ہوگئی تھیں، ان میں یہ تدریج کا طریقہ نہیں تھا، باری تعالیٰ نے اس سوال کا جواب خود ان الفاظ میں دیا ہے:

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۞ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴾ (الفرقان:۳۲،۳۳)

''اور یہ کافر لوگ کہتے ہیں کہ:''ان پر سارا قرآن ایک ہی دفعہ میں کیوں نازل نہیں کر دیا گیا؟'' (اے پیغمبر!) ہم نے ایسا اس لئے کیا ہے تاکہ اس کے ذریعے تمہارا دِل مضبوط رکھیں، اور ہم نے اُسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھوایا ہے، اور جب کبھی یہ لوگ تمہارے پاس کوئی انوکھی بات لے کر آتے ہیں، ہم تمہیں (اُس کا) ٹھیک ٹھیک جواب اور زیادہ وضاحت کے ساتھ عطا کر دیتے ہیں''

امام رازیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں قرآن کریم کے تدریجی نزول کی جو حکمتیں بیان فرمائی ہیں یہاں ان کا خلاصہ سمجھ لینا کافی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس تدریجی نزول میں کئی حکمتیں تھیں۔

۱...... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے، لکھتے پڑھتے نہیں تھے، اس لئے اگر سارا قرآن ایک مرتبہ نازل ہوگیا ہوتا تو اس کا یاد رکھنا اور ضبط کرنا دشوار ہوتا، اس کے برخلاف حضرت

(۱) اس پوری بحث کے لئے ملاحظہ ہو الاتقان ص۴۴ ج۱، النوع السادس عشر، المسئلة الاولیٰ

موسیٰ علیہ السلام لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اس لئے اُن پر تورات ایک ہی مرتبہ نازل کردی گئی۔

۲......اگر پورا قرآن ایک دفعہ نازل ہو جاتا تو تمام احکام کی پابندی فوراً شروع ہو جاتی، اور یہ اس حکیمانہ تدریج کے خلاف ہوتا جو شریعت میں ملحوظ رہی ہے۔

۳......آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کی طرف سے ہر روز نئی اذیتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں، جبرئیل علیہ السلام کا بار بار قرآن کریم لے کر آنا ان اذیتوں کے مقابلہ کو سہل بنا دیتا تھا،، اور آپؐ کی تقویتِ قلب کا سبب بنتا تھا۔

۴......قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ لوگوں کے سوالات کے جواب اور مختلف واقعات سے متعلق ہے، اس لئے ان آیات کا نزول اسی وقت مناسب تھا جس وقت وہ سوالات کئے گئے، یا وہ واقعات پیش آئے، اس سے مسلمانوں کی بصیرت بھی بڑھتی تھی، اور قرآن کے غیبی خبریں بیان کرنے سے اُس کی حقانیت اور زیادہ آشکار ہو جاتی تھی۔(۱)

ترتیب نزول اور موجودہ ترتیب

یہ بتایا جاچکا ہے کہ قرآن کریم جس ترتیب کے ساتھ اس وقت موجود ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس ترتیب سے نازل نہیں ہوا تھا، بلکہ ضرورت اور حالات کے مطابق نزول کی ترتیب اس سے مختلف تھی، ہوتا یہ تھا کہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپؐ کاتبینِ وحی کو ساتھ ہی یہ بتا دیتے تھے، کہ اس آیت کو فلاں سورت میں فلاں مقام پر لکھ لیا جائے، چنانچہ وہ آپؐ کے بتائے ہوئے مقام پر درج ہو جاتی تھی، ترتیبِ نزول کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور نہ صحابہؓ نے، اس لئے جب قرآن مکمل ہوگیا، تو لوگوں کو یہ یاد بھی نہیں رہا کہ کونسی آیت کس ترتیب سے نازل ہوئی تھی؟ لہٰذا اب جزوی طور پر بعض سورتوں یا آیتوں کے بارے میں تو یہ علم ہو جاتا ہے کہ ان کی ترتیب کیا تھی؟ لیکن پورے قرآن کی ترتیبِ نزول یقین کے ساتھ بیان نہیں کی جا سکتی، علامہ

---

(۱) التفسیر الکبیر للامام الرازیؒ، ص۳۳۶ ج۶، المطبعۃ العامرہ ۱۳۲۴ھ

Marfat.com

سیوطیؒ نے الاتقان میں بعض روایات کی مدد سے سورتوں کی ترتیبِ نزول بیان کرنے کوشش کی ہے، (۱) لیکن درحقیقت ان روایتوں سے یقینی طور پر صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کونسی سورت مکّی اور کونسی مدنی ہے؟ ترتیبِ نزول کی تفصیلات ان سے معلوم نہیں ہوتیں، ماضی قریب میں بعض مستشرقین نے بھی ترتیبِ نزول معین کرنے کی کوشش کی ہے، سب سے پہلے مشہور جرمن مستشرق نولڈیکے نے اس کام کا آغاز کیا (۲)، اور اس کے بعد یہ بہت سے مغربی مصنفین کی دلچسپی کا موضوع بنا رہا، ولیم میور نے بھی اس سلسلے میں ایک جداگانہ کوشش کی ہے، (۳) بلکہ جے، ایم راڈویل نے قرآن کریم کا جو انگریزی ترجمہ شائع کیا، اس میں سورتوں کو معروف ترتیب سے ذکر کرنے کے بجائے نولڈیکے کی مزعومہ تاریخی ترتیب سے ذکر کیا، (۴) بیسویں صدی کے آغاز میں ہارٹ وگ ہرشفیلڈ نے نہ صرف سورتوں بلکہ آیتوں تک کی تاریخی ترتیب معیّن کرنے کوشش کی، (۵) اس کے علاوہ رَیجس بلاشیر نے اپنے فرانسیسی ترجمہ میں اس کام کا بیڑا اٹھایا، (۶) رچرڈ بیل نے بھی اس سلسلے میں مغربی دنیا میں کافی نام پیدا کیا، (۷) مستشرقین کی یہ کوششیں اب بھی جاری ہیں، اور شاید انہی سے متاثر

---

(۱) الاتقان، نوع نمبر ا ص ۱۰ تا ۱۲ ج ا، اندلس کے ایک نامعلوم عالم کی ایک کتاب ''کتاب المبانی فی نظم المعانی'' کا ایک مخطوطہ نسخہ آرتھر جیفر نے ''مقدمتان فی علوم القرآن'' کے نام سے شائع کیا ہے، اس میں بھی ترتیب نزول کی مختلف روایتیں بیان کی گئی ہیں (مقدمتان فی علوم القرآن، مرتبہ آرتھر جیفر، مکتبہ الخانجی مصر ۱۹۵۴ء ص ۱۲ تا ۱۶) مگر یہ روایات قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔

(۲) Noldeke, Theodor,Geschichte des Qorans, Gottingen(1860)

(۳) Muir, William, The Life of Mohammed

(۴) Rodwell,j.M.The koran(translated)London,1953

(۵) Hirschfold,Hartwig,New Researches into the composition and exegesis of the Qoran. (1902) -

(۶) Blashere Regis, Coran traduction selon unessai de reclassement des sourates.paris: 1947-51

(۷)Bell, Richard Translation of The Quran (1937-39)

Marfat.com

ہو کر بعض مسلمانوں نے بھی ترتیبِ نزول کی تحقیق کرنی شروع کی ہے۔ (۱)

لیکن ہماری نظر میں یہ ساری کوششیں ایک ایسے کام میں اپنا وقت صرف کرنے کے مرادف ہیں جس میں کبھی یقینی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی، مذکورہ بالا مستشرقین نے جو کوششیں کی ہیں وہ زیادہ تر متن کے بارے میں اُن کے ذاتی قیاسات پر مبنی ہیں، اور چونکہ ہر شخص کے قیاسات دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں، اس لئے ان کی بیان کردہ ترتیبوں میں بھی فرق ہے، لہٰذا ہزار کوشش کے باوجود ان قیاسات سے کوئی خاص علمی فائدہ حاصل کرنا مشکل ہے۔

دراصل مستشرقین کی ان کوششوں کے پیچھے ایک مخصوص ذہنیت کارفرما ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم ابھی تک غیر مرتب ہے، اس کی اصل ترتیب وہ ہے جس پر وہ نازل ہوا تھا، لیکن چونکہ نازل ہونے کے ساتھ اُسے کتابی شکل میں لکھنے کے بجائے متفرق چیزوں پر لکھا گیا اس لئے وہ ترتیب محفوظ نہ رہ سکی، راڈویل نے اپنے ترجمۂ قرآن کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ موجودہ ترتیب کی وجہ یہ ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جب متفرق تحریریں جمع کیں تو وہ انہیں جس ترتیب سے ساتھ ملتی گئیں اسی ترتیب سے وہ لکھتے چلے گئے، لہٰذا اس میں کسی تاریخی یا معنوی ترتیب کا لحاظ نہیں رہ سکا، (۲) اب قرآن کریم کی موجودہ ترتیب اُن کے خیال میں (معاذ اللہ) ایک نقص ہے جسے وہ بزعمِ خود اپنی ''تحقیق'' سے دور کرنا چاہتے ہیں، !!

حالانکہ واقعات کی یہ تصویر نہ صرف خیالی بلکہ واضح دلائل کے بالکل خلاف ہے، اس لئے کہ آیاتِ قرآنی کی ترتیب باتفاق وحی سے ثابت ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ کاتبینِ وحی کو ساتھ ہی یہ بھی بتادیتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد لکھی جائے گی، (۳) اور صحابہؓ

---

(۱) یعقوب حسن: کشاف الہدیٰ، ص ۷۵ تا ۸۲ ادفتر اشاعت مدراس ۱۳۴۳ھ

(۲) Rodwell,j.m.The koran.(translated)London 1953 P.2

(۳) فتح الباری بحوالہ سنن اربعہ مسند احمد وغیرہ، ص ۱۸ ج ۹،

Marfat.com

نے قرآن کریم کو اسی ترتیب سے یاد کیا تھا، جو حضورؐ نے بتائی تھی، یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ حضرت زیدؓ کو جس ترتیب سے آیتیں ملتی گئیں اسی ترتیب سے وہ لکھتے گئے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو موجودہ قرآن میں سب سے آخری آیت ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا الخ﴾ ہونی چاہئے تھی، کیونکہ حضرت زیدؓ کو یہ آیت سب سے آخر میں ملی، حالانکہ یہ آیت سورۂ احزاب میں درج ہے، اس سے صاف واضح ہے کہ حضرت زیدؓ اور اُن کے رفقاء کے سامنے جب کوئی آیت لائی جاتی تھی تو وہ اس کو اسی مقام پر لکھتے تھے جس مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا تھا، البتہ سورتوں کی ترتیب کے بارے میں اہلِ علم کی دو رائیں ہیں، بعض حضرات کہتے ہیں کہ وہ بھی بذریعۂ وحی بتائی گئی ہے، اور بعض حضرات کا خیال ہے کہ اسے صحابہؓ نے اپنے اجتہاد سے معیّن کیا ہے، زیادہ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ بعض سورتوں کی ترتیب تو بذریعۂ وحی ہی بتادی گئی تھی، البتہ بعض سورتوں مثلاً سورۂ توبہ کے بارے میں کوئی صریح ہدایت موجود نہ تھی، اس لئے صحابہؓ نے اپنے اجتہاد سے سورۂ انفال کے بعد رکھا ہے، (۱)

اسبابِ نزول

قرآن کریم کی آیتیں دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے از خود نازل فرمائیں، کوئی خاص واقعہ یا کسی کا کوئی سوال وغیرہ اُن کے نزول کا سبب نہیں بنا، دوسری آیات ایسی ہیں کہ جن کا نزول کسی خاص واقعہ کی وجہ سے یا کسی کے سوال کے جواب میں ہوا جسے اُن آیتوں کا پسِ منظر کہنا چاہئے، یہ پسِ منظر مفسّرین کی اصطلاح میں ''سببِ نزول'' یا ''شانِ نزول'' کہلاتا ہے۔

مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت ہے:

﴿لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ﴾ (البقرہ: ۲۲۱)

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری ص۳۲ تا ۳۵ ج۹، باب تالیف القرآن،

Marfat.com

"اور مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں، یقیناً ایک مؤمن باندی کسی بھی مشرک عورت سے بہتر ہے، خواہ وہ مشرک عورت تمہیں پسند آرہی ہو۔"

یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی تھی، زمانۂ جاہلیت میں حضرت مرثد بن ابی مرثد غنویؓ کے عناق نامی ایک عورت سے تعلقات تھے، اسلام لانے کے بعد یہ مدینہ طیبہ چلے آئے، اور وہ عورت مکہ مکرمہ میں رہ گئی، ایک مرتبہ کسی کام سے حضرت مرثدؓ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو عناق نے انہیں گناہ کی دعوت دی، حضرت مرثدؓ نے صاف انکار کرکے فرمایا کہ اسلام میرے اور تمہارے درمیان حائل ہو چکا ہے، لیکن اگر تم چاہو تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت کے بعد تم سے نکاح کر سکتا ہوں، مدینہ طیبہ تشریف لاکر حضرت مرثدؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کی اجازت طلب کی، اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور اس نے مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت کر دی،(۱)

یہ واقعہ مذکورہ بالا آیت کا "سببِ نزول" یا "شانِ نزول" ہے۔

شانِ نزول کی اہمیّت اور اس کے فوائد

بعض ایسے لوگوں نے جنہیں علم میں پختگی اور رسوخ حاصل نہیں ہے، اسبابِ نزول کی اہمیّت سے انکار کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ قرآن کریم بذاتِ خود اتنا واضح ہے کہ اس کی تشریح کے لئے اسبابِ نزول کو جاننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن یہ خیال بالکل باطل اور غلط ہے، اسبابِ نزول کا علم تفسیر قرآن کے لئے ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے، اور اس کے فوائد بے شمار ہیں، جن میں سے چند یہاں بیان کئے جاتے ہیں؛

۱......علامہ زرکشیؒ فرماتے ہیں کہ اسبابِ نزول جاننے کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ اس سے احکام کی حکمتیں معلوم ہوتی ہیں، اور پتہ چلتا ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے کن حالات میں اور

(۱) الواحدیؒ : اسباب النزول ،ص۳۸، مصطفی البابی ،مصر ۱۳۷۹ھ

Marfat.com

کیوں نازل فرمایا؟ (۱) مثلاً سورۂ نساء میں ارشاد ہے:

﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى ﴾

''اے ایمان والو! تم نماز کے پاس بھی ایسی حالت میں مت جاؤ کہ تم نشہ میں ہو'' (۲)

اگر شانِ نزول کی روایات سامنے نہ ہوں تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب شراب از روئے قرآن بالکل حرام ہے تو یہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی کہ نشے کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ، اس سوال کا جواب صرف شانِ نزول ہی سے مل سکتا ہے، چنانچہ اس کے سببِ نزول میں حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ شراب کے حرام ہونے سے پہلے ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے کچھ صحابہؓ کو کھانے پر مدعو کیا، وہاں کھانے کے بعد شراب پی گئی، اسی حالت میں نماز کا وقت آ گیا، تو ایک صحابی نے امامت کی، اور اُس میں نشے کی وجہ سے قرآنی آیات کی تلاوت میں غلطی کر گئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (۳)

۲...... بسا اوقات سببِ نزول کے بغیر آیت کا صحیح مفہوم ہی سمجھ میں نہیں آتا، اور اگر سببِ نزول سامنے نہ ہو تو انسان آیت کا بالکل غلط مطلب سمجھ سکتا ہے، یہ بات چند مثالوں سے واضح ہو گی۔

سورۂ بقرہ میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ﴾

''اور مشرق و مغرب سب اللہ ہی کی ہیں، لہٰذا جس طرف بھی تم رُخ کرو گے، وہیں اللہ کا رُخ ہے'' (۴)

اگر اس آیت کا شانِ نزول پیشِ نظر نہ ہو تو اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں کسی خاص جہت کی طرف رخ کرنا ضروری نہیں، مشرق و مغرب سب اللہ کی ملکیت میں ہیں اور وہ ہر سمت میں موجود ہے، اس لئے جس طرف بھی رُخ کر لیا جائے نماز ہو جائے گی، حالانکہ یہ

---

(۱) الزرکشیؒ: البرہان فی علوم القرآن، ص ۲۲ ج ۱ عیسی البابی ۱۳۷۶ھ　(۲) النساء: ۴۳،
(۳) تفسیر ابن کثیرؒ، ص ۵۰۰، ج ۱ مطبعہ مصطفیٰ محمد ۱۳۵۶ھ　(۴) البقرہ: ۱۱۵

Marfat.com

مفہوم بدیہی طور پر غلط ہے، خود قرآن کریم ہی نے دوسرے مقام پر کعبہ کی طرف رُخ کرنے کو ضروری قرار دیا ہے۔

یہ عُقدہ صرف شانِ نزول کو دیکھ کر ہی حل ہوتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس سے کعبہ کی طرف تبدیل ہوا تو یہودیوں نے اعتراض کیا کہ اس تبدیلی کی کیا وجہ ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، (۱) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر سمت اللہ کی بنائی ہوئی ہے، اور اللہ ہر طرف موجود ہے، لہٰذا وہ جس طرف بھی رُخ کرنے کا حکم دیدے، اُدھر رُخ کرنا واجب ہے، اس میں قیاسات کو دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اسی طرح ایک آیت میں ارشاد ہے:

﴿ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ﴾

''جو لوگ ایمان لے آئے ہیں، اور نیکی پر کاربند رہے ہیں، انہوں نے پہلے جو کچھ کھایا پیا ہے، اس کی وجہ سے ان پر کوئی گناہ نہیں ہے بشرطیکہ وہ آئندہ ان گناہوں سے بچتے رہیں، اور ایمان رکھیں'' (۲)

اگر اس آیت کے صرف ظاہری الفاظ کو دیکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے کسی بھی چیز کا کھانا پینا حرام نہیں، اگر دل میں ایمان اور خدا کا خوف ہو اور عمل نیک ہوں تو انسان جو چاہے کھا پی سکتا ہے، اور چونکہ یہ آیت تحریم شراب کے متصل بعد آئی ہیں، اس لئے کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس آیت نے ایمان دار اور نیک لوگوں کے لئے (معاذ اللہ) شراب کی بھی اجازت دیدی ہے، اور یہ صرف شبہ اور احتمال نہیں ہے بعض صحابہؓ تک کو اس آیت سے غلط فہمی ہوگئی تھی، اور انہوں نے حضرت عمرؓ کے سامنے اس آیت سے استدلال کر کے یہ خیال ظاہر کیا کہ شراب پینے والا اگر ماضی میں نکوکار رہا ہو اور اس کی عام زندگی نیکیوں میں گزری ہو تو اس پر حد (شرعی سزا) نہیں ہے بعد میں حضرت ابن عباسؓ نے اس

---

(۱) الاتقان، ص: ۳۳ ج ۱ (۲) المائدہ: ۹۳

Marfat.com

آیت کے شانِ نزول ہی کے حوالہ سے اُن کی اس غلط فہمی کو رفع کیا۔(۱)

درحقیقت آیت کا پس منظر یہ ہے کہ جب شراب اور قمار کی حرمت نازل ہوئی تو بعض صحابہؓ نے یہ سوال کیا کہ جو صحابہؓ حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے وفات پاگئے اور اپنی زندگی میں شراب نوشی اور قمار بازی کے مرتکب ہوئے اُن کا کیا انجام ہوگا؟

اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، کہ جن مؤمنوں نے حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے شراب پی یا قمار کا مال کھایا اُن پر کوئی عذاب نہیں ہوگا، بشرطیکہ وہ مؤمن ہوں اور اللہ تعالیٰ کے دوسرے احکام کے پابند رہے ہوں، (۲)

ایک اور مثال ملاحظہ فرمایئے، سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾

"بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، لہٰذا جو شخص بھی بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس کے لئے اس بات میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ ان کے درمیان چکر لگائے۔"(۳)

اس آیت کے یہ الفاظ کہ "اس پر کچھ گناہ نہیں ہے" ان سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حج یا عمرہ کے دَوران صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا صرف جائز ہے، کوئی فرض یا واجب نہیں، چنانچہ حضرت عروہ بن زبیرؒ اسی غلط فہمی میں تھے، حضرت عائشہؓ نے انہیں بتایا کہ درحقیقت زمانۂ جاہلیت سے ان پہاڑیوں پر دو بت رکھے ہوئے تھے، ایک کا نام اساف تھا، اور دوسرے کا نائلہ، اس لئے صحابہ کرامؓ کو یہ شبہ ہوا کہ کہیں ان بتوں کی وجہ سے سعی کرنا ناجائز نہ ہوگیا ہو، اُن کا یہ اشکال رفع کرنے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی، (۴)

یہ چند مثالیں محض نمونہ کے طور پر پیش کی گئی ہیں، ورنہ ایسی اور بھی مثالیں دی جا سکتی ہیں

---

(۱) القرطبیؒ: الجامع لاحکام القرآن، ص۲۹۷ ج۶، قاہرہ ۱۳۸۷ھ (۲) ایضاً ص:۲۹۴، ج۶

(۳) البقرہ: ص۱۵۸، (۴) مناھل العرفان ص:۱۰۴ ج۱ بحوالہ صحیح بخاری

Marfat.com

جن سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بہت سی آیتوں کا صحیح مفہوم سببِ علم نزول کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

۳......قرآن کریم بسا اوقات ایسے الفاظ استعمال فرماتا ہے جن کا شانِ نزول سے گہرا تعلق ہوتا ہے، اور اگر ان کا صحیح پس منظر معلوم نہ ہو تو وہ الفاظ (معاذ اللہ) بے فائدہ اور بعض اوقات بے جوڑ معلوم ہونے لگتے ہیں، جس سے قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت پر حرف آتا ہے۔

مثلاً سورۂ طلاق میں ارشاد ہے:

﴿ وَالّٰٓـئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓـئِیْ لَمْ یَحِضْنَ ﴾

''اور تمہاری عورتوں میں سے جو ماہواری آنے سے مایوس ہو چکی ہوں، اگر تمہیں (ان کی عدت کے بارے میں) شک ہو تو (یاد رکھو کہ) ان کی عدت تین مہینے ہے، اور اُن عورتوں کی (عدت) بھی (یہی ہے) جنہیں ابھی ماہواری آئی ہی نہیں''(۱)

اس آیت میں یہ الفاظ کہ ''اگر تم کو شک ہو'' ان کا بظاہر کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا، یہاں تک کہ بعض اہلِ ظاہر نے ان الفاظ کی وجہ سے یہ کہہ دیا کہ اگر سن رسیدہ عورت کو جس کا حیض بند ہو چکا ہو حمل کے بارے میں کوئی شک نہ ہو تو اس پر کوئی عدت واجب نہیں ہے۔(۲)

لیکن سبب نزول اِن الفاظ کی وجہ بتاتا ہے، حضرت اُبی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ جب سورۂ نساء میں عورتوں کی عدت بیان کی گئی تو میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کچھ عورتیں ایسی ہیں جن کی عدت قرآن کریم میں بیان نہیں ہوئی، ایک تو چھوٹی بچیاں جنہیں حیض نہیں آیا، دوسرے وہ سن رسیدہ عورتیں جن کا حیض بند ہو گیا ہے، اور تیسرے حاملہ عورتیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور اس میں تینوں قسموں کا حکم بیان کر دیا گیا۔(۳)

(۱) الطلاق:۴ (۲) الاتقان، ص۳۰، ج۱ (۳) تفسیر ابن کثیر، ص۳۸۱ ج۴،

Marfat.com

یا مثلاً سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے:

﴿فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ﴾

''پھر جب تم اپنے حج کے کام پورے کر چکو تو اللہ کا اس طرح ذکر کرو جیسے تم اپنے باپ دادوں کا ذکر کیا کرتے ہو۔'' (۱)

اگر سببِ نزول سامنے نہ ہو تو اس آیت کا یہ حصہ کہ ''جیسے اپنے آباء کو یاد کرتے ہو۔'' بے جوڑ معلوم ہوتا ہے، کیونکہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس خاص مقام پر اللہ کی یاد کو آباء واجداد کی یاد سے تشبیہ دینے کا کیا مطلب ہے؟ لیکن سببِ نزول سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، بات یہ ہے کہ یہاں مزدلفہ کے وقوف کا ذکر ہو رہا ہے، اور مشرکین عرب کا یہ معمول تھا کہ وہ ارکانِ حج سے فارغ ہونے کے بعد یہاں اپنے اپنے آباء واجداد کے مفاخر اور کارنامے بیان کیا کرتے تھے، باری تعالیٰ نے فرمایا کہ اب یہاں باپ دادوں کی شیخیاں بگھارنے کے بجائے اللہ کا ذکر کیا کرو۔ (۲)

۴..... قرآن کریم میں ایسے مقامات بھی تھوڑے نہیں ہیں جن میں کسی خاص واقعہ کی طرف مختصر اشارہ کیا گیا ہے، اور جب تک واقعہ معلوم نہ ہو اُن آیات کا مطلب سمجھا ہی نہیں جا سکتا، مثلاً ارشاد ہے:

﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ﴾

''اور (اے پیغمبر!) جب تم نے ان پر (مٹی) پھینکی تھی تو وہ تم نے نہیں، بلکہ اللہ نے پھینکی تھی'' (۳)

دراصل اس آیت میں غزوۂ بدر کے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے نرغے کے وقت خاک کی ایک مٹھی اُن کی طرف پھینکی تھی، اور اس کے بعد نرغہ ٹوٹ گیا تھا، (۴) لیکن غور فرمائیے کہ اگر یہ سببِ نزول ذہن میں نہ ہو تو آیت کا

(۱) البقرہ: ۲۰۰، (۲) ملاحظہ ہو اسباب النزول للواحدیؒ ص ۳۴،
(۳) انفال: ۱۷، (۴) اسباب النزول للواحدیؒ ص ۱۳۳،

مطلب کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟

یہاں اسباب نزول کے تمام فوائد بیان کرنے مقصود نہیں، لیکن مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی ہوگی کہ قرآن کریم کی تفسیر میں اسبابِ نزول کی کیا اہمیت ہے، اسی وجہ سے امام مہدیؒ فرماتے ہیں:

"جب تک آیت کا سببِ نزول اور متعلقہ واقعہ معلوم نہ ہو، اس وقت تک آیت کا مفہوم بیان کرنا ممکن نہیں" (۱)

لہٰذا جن لوگوں نے تفسیر قرآن کے معاملہ میں اسبابِ نزول کی اہمیت سے انکار کیا ہے وہ یا تو ناواقف ہیں یا اسبابِ نزول سے آزاد ہو کر قرآن کے مضامین کو اپنا من مانا مفہوم پہنانے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔

اسباب نزول اور شاہ ولی اللہؒ:

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "الفوز الکبیر" میں اسبابِ نزول پر جو محققانہ بحث کی ہے بعض لوگ اُسے پوری طرح سمجھ نہیں سکے، اس لئے انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے تفسیر میں اسبابِ نزول کو اہمیّت نہیں دی، یا اس کی اہمیّت کو کم کر دیا ہے، لیکن درحقیقت یہ خیال حضرت شاہ صاحبؒ کا مطلب نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ جمہورِ اُمّت کی طرح وہ بھی اسبابِ نزول کے علم کو تفسیر کے لئے لازمی شرط قرار دیتے ہیں، لیکن انہوں نے جو بات لکھی ہے وہ یہ ہے:

"ویذکر المحدثون فی ذیل ایات القراٰن کثیرا من الاشیاء لیست من قسم سبب النزول فی الحقیقة مثل استشهاد الصحابة فی مناظر اتهم باٰیة او تلاته صلی اللّٰه علیه وسلم اية للاستشهادفی کلامه الشریف

(۱) ایضاً ص ۴

اورواية حديث وافق الأية فى اصل الغرض او تعيين
موضع النزول اوتعيين اسماء المذكورين بطريق
الايهام اوبطريق التلفظ بكلمة قرانية اوفصل سور
ايات من القران او صورة امتثاله صلى الله عليه وسلم
بامرمن اوامر القران ونحو ذلك ، وليس شيء من هذا
فى الحقيقة من اسباب النزول"(۱)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تفسیر کی کتابوں میں ایک ایک آیت کے تحت بعض اوقات دسیوں روایات لکھی ہوتی ہیں، یہ تمام روایات اسبابِ نزول سے متعلق نہیں ہوتیں بلکہ اس میں مندرجہ ذیل اشیاء شامل ہو جاتی ہیں:

۱...... بعض مرتبہ کسی علمی مباحثہ میں کسی صحابی نے وہ آیت بطور دلیل پیش کردی، مفسرین یہ واقعہ اس آیت کے تحت ادنیٰ مناسبت سے ذکر کردیتے ہیں۔

۲...... بعض مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی موقع پر اس آیت سے استشہاد فرمایا مفسرین اُسے بھی آیت کے تحت نقل کردیتے ہیں۔

۳...... جو بات کسی آیت میں بیان کی گئی ہے بعض مرتبہ وہی بات کسی حدیث میں بھی آپؐ نے ارشاد فرمائی، تفسیر کی کتابوں میں وہ حدیث بھی اس آیت کے تحت روایت کردی جاتی ہے۔

۴...... بعض مرتبہ مفسرین کوئی روایت محض یہ بتانے کے لئے نقل کرتے ہیں کہ آیت کس مقام پر نازل ہوئی، یہ روایت بھی تفسیر کے ذیل میں درج ہو جاتی ہے۔

۵...... بعض دفعہ قرآن کریم کچھ لوگوں کا ذکر مبہم طور پر فرماتا ہے، اور اُن کا نام ذکر نہیں کرتا، مفسرین روایتوں کے ذریعہ اُن لوگوں کے نام متعین کردیتے ہیں۔

۶...... بعض مرتبہ کسی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے فلاں لفظ کا صحیح تلفّظ

(۱) الفوز الکبیر، ص۲۲و۲۳، مکتبۂ فخریہ مرادآباد ۱۳۵۸ھ

کیا ہے؟ تفسیر کی کتابوں میں ایسی روایات بھی درج ہوتی ہیں،

۷..... بعض احادیث اور آیات میں قرآن کریم کی مختلف سورتوں یا آیتوں کے فضائل بیان ہوئے ہیں، مفسّرین ان روایات کو بھی متعلقہ مقامات پر نقل کر دیتے ہیں،

۸..... بعض مقامات پر ایسی احادیث بھی تفسیر کے ذیل میں منقول ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے اس حکم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح عمل فرمایا؟

حضرت شاہ صاحب ؒ فرماتے ہیں کہ اس قسم کی روایات نہ سبب نزول کی تعریف میں داخل ہیں اور نہ مفسر کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس قسم کی تمام روایات سے پوری طرح واقف ہو،

البتہ جو روایات واقعۃً آیت کا سبب نزول ہیں اُن کا جاننا مفسر کے لئے نہایت ضروری ہے، اور اس کے بغیر علم تفسیر میں دخل دینا جائز نہیں، چنانچہ خود حضرت شاہ صاحب ؒ آگے لکھتے ہیں:

وانما شرط المفسر امران ، الاوّل ماتعرض به الأيات من القصص فلا يتيسر فهم الايماء بتلك الأيات الابمعرفة تلك القصص ، والثانى مايخصص العام من القصّة اومثل ذلك من وجوه صرف الكلام عن الظاهر فلايتيسر فهم المقصود من الأيات بدونها، (۱)

’’البتہ مفسر کے لئے دو باتوں کا جاننا لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے، ایک تو وہ واقعات جن کی طرف آیات میں اشارہ پایا جاتا ہے، اور جبتک وہ قصے معلوم نہ ہوں آیات کے اشاروں کو سمجھنا آسان نہیں، دوسرے کسی قصہ وغیرہ میں بعض اوقات الفاظ عام ہوتے ہیں، لیکن شانِ نزول سے اس میں تخصیص پیدا ہوتی ہے، یا کلام کا ظاہری مفہوم کچھ ہوتا ہے اور سبب نزول کوئی دوسرا مفہوم متعین کرتا ہے، اس جیسی روایات کا علم حاصل کئے بغیر آیاتِ قرآنی کو سمجھنا مشکل ہے‘‘۔

---

(۱) الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص ۲۳،

سببِ نزول اور احکام کا عموم وخصوص

کسی سببِ نزول کے تحت قرآن کریم کی جو آیات نازل ہوئی، وہ اپنے عموم وخصوص کے لحاظ سے چار قسم کی ہیں:

ا......وہ آیتیں جن میں کسی خاص شخص کا نام لے کر یہ متعین کر دیا گیا ہے کہ آیت کا مضمون اسی کے حق میں ہے، ایسی آیتوں کے بارے میں علماء کا اتفاق ہے کہ ان کا مضمون صرف اُسی معیّن شخص کے بارے میں قرار دیا جائے گا، اور وہ دوسروں کو شامل نہیں ہوگا، مثلاً

﴿ تَبَّتْ يَدَآ أَبِى لَهَبٍ ﴾ (لھب: ۱)

''ہاتھ ابولہب کے برباد ہوں''

اس آیت کا شانِ نزول معروف ہے، کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر تمام قریش کے لوگوں کو اسلام کی تبلیغ فرمائی تو اس پر ابولہب نے کہا تھا:

تَبًّا لَّكَ ، أَلِهٰذَا دَعَوْتَنَا ؟

''تمہارے لئے ہلاکت ہو، کیا تم نے ہمیں اسی لئے بلایا تھا؟

اس پر یہ آیت نازل ہوئی، (۱) اور اس میں خاص ابولہب کا نام لے کر اس کے لئے وعید بیان فرمائی گئی ہے، اس لئے یہ وعید خاص اُسی کے لئے ہے۔

۲......آیتوں کی دوسری قسم وہ ہے جن میں کسی خاص شخص یا گروہ یا چیز کا نام لئے بغیر اس کے کچھ اوصاف بیان کئے گئے ہیں اور ان اوصاف پر کوئی حکم لگایا گیا ہے، لیکن دوسرے دلائل سے یہ ثابت ہے کہ اس سے مراد فلاں معین شخص یا فلاں معین گروہ یا فلاں معین چیز ہے، اس صورت کے بارے میں بھی تمام علماء اس پر متفق ہیں کہ آیت کا مضمون یا حکم صرف اسی شخص یا گروہ یا چیز کی حد تک مخصوص رہے گا، جو قرآن کریم کی مراد ہے، اور کوئی دوسرا اس میں داخل نہیں ہوگا، خواہ وہ اوصاف اس میں بھی پائے جاتے ہوں، مثلاً سورۃ اللیل میں ارشاد ہے:

---

(۱) اسباب النزول للواحدیؒ ص۲۶۱

﴿ وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ۝ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ﴾

(اللیل: ۱۷، ۱۸)

''اور اُس سے ایسے پرہیز گار شخص کو دُور رکھا جائے گا، جو اپنا مال پاکیزگی حاصل کرنے کے لئے (اللہ کے راستے میں) دیتا ہے''۔

یہ آیت باتفاق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو مفلس غلاموں کو خرید خرید کر آزاد کیا کرتے تھے، (۱) یہاں اگر چہ حضرت ابوبکرؓ کا نام مذکور نہیں، لیکن اوصاف انہی کے بیان کئے گئے ہیں، اور روایاتِ حدیث سے ثابت ہے کہ ان سے مراد حضرت ابوبکرؓ ہیں، لہٰذا اس آیت کی فضیلت بلاشرکت غیرے انہی کو حاصل ہے، اسی لئے امام رازیؒ نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ انبیاء علیہم السلام کے بعد تمام انسانوں سے افضل ہیں، کیونکہ اس آیت میں انہیں اتقٰی (متقی ترین شخص) کہا گیا ہے۔

اور دوسری آیت میں ارشاد ہے:

﴿ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ﴾ (الحجرات: ۱۳)

''درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزّت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو'' (۲)

بہر حال! باوجودیکہ حضرت ابوبکرؓ کا یہاں نام نہیں لیا گیا، لیکن جمہور مفسرین نے آیت کو انہی کے حق میں خاص قرار دیا ہے، کیونکہ تخصیص کی دو دلیلیں موجود ہیں (ایک یہ کہ ''الاتقی'') کا لفظ (الف لام عہد کے ساتھ) صرف ایک ہی شخص کے لئے استعمال ہوسکتا ہے، دوسرے روایاتِ حدیث نے اُن کی تعیین کردی ہے، لہٰذا اگر کوئی اور شخص بھی اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرنے لگے تو وہ اس کے لئے کتنا ہی باعثِ اجر کیوں نہ ہو لیکن آیت

(۱) اسباب النزول للواحدیؒ: ص ۲۵۵،

(۲) الاتقان ص ۳۱ ج ۱

بالا کا مصداق ہونے کی فضیلت اسے حاصل نہیں ہوسکتی۔(۱)

۳...... تیسری قسم میں وہ آیتیں آتی ہیں جو نازل تو کسی خاص واقعہ میں ہوئی تھیں لیکن الفاظ عام ہیں، آیت کے صریح الفاظ یا اور کسی خارجی دلیل سے بھی یہ معلوم ہوگیا ہے، کہ آیت کا حکم اس واقعہ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اس نوعیت کے ہر واقعہ کا یہی حکم ہے، اس قسم کے بارے میں بھی تمام اہلِ علم متفق ہیں کہ اس صورت میں آیت کا حکم اس کے الفاظ کے تابع ہوکر عام رہے گا، صرف سبب نزول کے واقعہ کے ساتھ خاص نہیں ہوگا، مثلاً سورۂ مجادلہ کی ابتدائی آیات کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ وہ حضرت خولہؓ(۲) کے بارے میں نازل ہوئی تھیں، جن کے شوہر نے اُن سے یہ کہد یا تھا کہ اَنْتِ عَلَیَّ کَظَهْرِ اُمِّیْ (تم مجھ پر میری ماں کی پشت کی طرح ہو) لیکن آیت میں جن الفاظ کے ذریعہ حکم بیان کیا گیا وہ اس بات کی صراحت کررہے ہیں کہ یہ حکم صرف خولہؓ کے شوہر کے لئے نہیں، بلکہ تمام ان لوگوں کے لئے ہے جو اپنی بیوی سے ظہار کرلیں، (یعنی مذکورہ بالا الفاظ کہدیں) (ایسے تمام لوگوں پر واجب ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کرنے سے قبل ایک غلام آزاد کریں، یا ساٹھ روزے رکھیں یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائیں)

۴...... چوتھی قسم یہ ہے کہ آیت کسی خاص واقعہ کے تحت نازل ہوئی، لیکن الفاظ عام استعمال کئے گئے، اور آیت یا کسی خارجی دلیل سے یہ صراحت معلوم نہیں ہوتی کہ آیت کا حکم یا مضمون صرف اسی واقعہ کے ساتھ مخصوص ہے، یا اس نوعیت کے ہر واقعہ کے لئے عام ہے، اِس صورت میں اہل علم کا تھوڑا سا اختلاف رہا ہے، بعض حضرات کا کہنا یہ تھا کہ اس صورت میں آیت کو صرف سببِ نزول کے واقعہ کے ساتھ مخصوص رکھا جائیگا، لیکن جمہور علماء وفقہاء کی رائے اس کے برخلاف یہی ہے کہ مذکورہ شکل میں سبب نزول کے خاص واقعے کے بجائے الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوگا، اور آیت کے الفاظ جس جس صورت کو شامل ہوں اُن کا حکم بھی اُن

---

(۱) اس قسم کی مزید تفصیل اور مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو الاتقان: ص ۳۰ ج ۱

(۲) اسباب النزول للواحدیؒ ص ۲۳۱،

Marfat.com

سب پر نافذ کیا جائے گا، اس قاعدہ کے لئے علماءِ اصولِ فقہ وتفسیر میں یہ جملہ مشہور ہے کہ:

اَلْعِبْرَۃُ لِعُمُوْمِ اللَّفْظِ لَا لِخُصُوْصِ السَّبَبِ

''اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوگا نہ کہ سببِ نزول کے خاص واقعہ کا''

لیکن درحقیقت یہ اختلاف نظریاتی نوعیت کا ہے، عملاً اس سے کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا، کیونکہ جو حضرات آیاتِ قرآنی کو ان کے سببِ نزول کے ساتھ مخصوص قرار دیتے ہیں وہ بھی عملاً آیت کا حکم اُس نوعیت کے دوسرے واقعات میں جاری کردیتے ہیں، لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ جمہور علماء کے نزدیک تو اس حکم کا ماٰخذ وہی آیت ہوتی ہے، اور یہ حضرات اس کا ماٰخذ کسی دوسری دلیلِ شرعی مثلاً حدیث اجماع یا قیاس وغیرہ کو قرار دیتے ہیں۔

وضاحت کے لئے ایک مثال پر غور فرمایئے، سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے:

﴿وَاِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ﴾

''اور اگر کوئی تنگدست (قرض دار) ہوتو اس کا ہاتھ کھلنے تک مہلت دینی ہے۔''

اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ بنوعمرو بن عمیر کا کچھ قرض بنومغیرہ پر واجب تھا، جب سود کی حرمت نازل ہوئی تو بنوعمرو نے اپنے مقروض قبیلے سے کہا کہ ہم سود تو چھوڑتے ہیں لیکن اصل قرضہ واپس کرو، بنومغیرہ نے کہا کہ اس وقت ہمارا ہاتھ تنگ ہے، اس لئے ہمیں کچھ مہلت دیدو، بنوعمرو نے مہلت دینے سے انکار کیا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی،(۱)

اب آیت کا یہ حکم تو سب کے نزدیک عام ہے، ہر قرض خواہ کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ مقروض کو تنگ دست دیکھے تو اسے مہلت دیدے، لیکن فرق اتنا ہے کہ جمہور کے نزدیک یہ عام حکم اسی آیت سے ثابت ہوا ہے، اور جو لوگ آیت کو سببِ نزول کے ساتھ مخصوص مانتے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں، کہ آیت کا حکم تو صرف بنوعمرو کے لئے تھا، لیکن دوسرے مسلمانوں کے لئے یہ حکم اُن احادیث سے ثابت ہوا ہے جس میں مقروض کو مہلت دینے کی فضیلتیں بیان کی گئی ہیں۔

(۱) اسباب النزول، للواحدی، ص۸۱

اس سے واضح ہے کہ اس اختلاف کا عملی طور پر کوئی خاص اثر مرتب نہیں ہوتا(۱)

سببِ نزول اور اختلافِ روایات

اسبابِ نزول کے سلسلے میں تفسیر کے دوران ایک بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ ایک ہی آیت کے سبب نزول میں کئی کئی مختلف روایتیں ملتی ہیں، اور جو شخص تفسیر کے اصول سے واقف نہ ہو وہ اُلجھن اور طرح طرح کے شبہات میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس لئے یہاں اس اختلافِ روایت کی حقیقت سمجھ لینی ضروری ہے۔

اصول تفسیر اور اصول فقہ کے علماء نے اس سلسلے میں بڑے کارآمد قواعد بیان فرمائے ہیں، یہاں اُن کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

۱......صحابہؓ اور تابعینؒ کی یہ عادت ہے کہ وہ کسی آیت کی تفسیر میں یہ الفاظ استعمال فرماتے ہیں کہ نزلت الآية فی کذا (یہ آیت فلاں مسئلہ یا معاملہ کے بارے میں نازل ہوئی) ان الفاظ سے بظاہر یہ دھوکا ہو جاتا ہے کہ وہ آیت کا سبب نزول بیان فرما رہے ہیں، حالانکہ ان الفاظ سے اُن کا مقصد ہمیشہ سببِ نزول بیان کرنا نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فلاں مسئلہ یا معاملہ آیت کے حکم کے تحت داخل ہے،(۲) مثلاً سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ نے ابلیس کا یہ قول نقل فرمایا ہے:

﴿ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ﴾ (النساء: ۱۱۹)

"اور انہیں حکم دوں گا تو وہ اللہ تخلیق میں تبدیلی پیدا کریں گے"

اس کی تفسیر میں حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت عکرمہؒ وغیرہ سے مروی ہے کہ یہ آیت اختصاء (خصیتین نکلوادینے) کے بارے میں نازل ہوئی ہے،(۳) لیکن اس کا یہ مطلب نہیں

---

(۱) یہاں اس مسئلہ کا نہایت مختصر خلاصہ پیش کیا گیا ہے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، البرھان للزرکشیؒ ص۲۴ ج۱، والاتقان ص۳۰ ج۱ و مناھل العرفان ص۱۱۸ تا ص۱۲۷ ج۱

(۲) ابن تیمیہؒ: مقدمة فی اصول التفسیر، ص۹، المکتبة العلمیه لاہور ۱۳۸۸ھ و الاتقان،

(۳) السیوطیؒ: الدر المنثور، ص۲۲۳ ج۲،

ہے کہ عہدِ رسالت میں کسی نے خصیتین نکلوادیئے تھے، اور یہ واقعہ اس آیت کے نزول کا سبب بنا، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اختصاء کا عمل بھی اُنہی شیطانی افعال میں داخل ہے جنہیں شیطان نے اللہ کی تخلیق بدل ڈالنے سے تعبیر کیا ہے، اور نہ آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ''اللہ کی تخلیق کو بدل دینا'' اختصاء میں منحصر ہے بلکہ اس کی اور بھی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں، جن کی تفصیل کتب تفسیر میں موجود ہے،

صحابہؓ وتابعینؒ کا یہ اسلوب بیان معلوم ہونے سے شانِ نزول کے باب میں دو قاعدے واضح ہوتے ہیں:

(الف) ایک قاعدہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں دو مختلف روایتیں ہوں، دونوں میں یہ الفاظ استعمال کئے گئے ہوں کہ نزلت الآية فی کذا (یہ آیت فلاں معاملے میں نازل ہوئی) لیکن دونوں نے الگ الگ معاملات ذکر کئے ہوں تو درحقیقت دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہوتا، بلکہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہوتے ہیں، کیونکہ ان میں سے کسی کا مقصد بھی یہ نہیں ہوتا کہ یہ معاملہ آیت کا سبب نزول ہے، بلکہ منشاء یہ ہوتا ہے کہ یہ معاملہ آیت کے مفہوم اور حکم میں داخل ہے، یہ بات ایک مثال سے واضح ہوگی، باری تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ﴾ (۱)

''ان کے پہلو (رات کے وقت) اپنے بستروں سے جدا رہتے ہیں''

اس کی تفسیر میں حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اُن صحابہؓ کے بارے میں نازل ہوئی جو مغرب اور عشاء کے درمیان نفلیں پڑھتے رہتے تھے، ایک اور روایت میں انہی سے مروی ہے کہ یہ آیت اُن حضرات کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو نمازِ عشاء کے انتظار میں جاگتے رہتے تھے، اور بعض دوسرے صحابہؓ سے تہجد گزار حضرات کے بارے میں قرار دیتے ہیں، (۲) اب بظاہر یہ اختلاف شانِ نزول کا اختلاف معلوم ہوتا ہے، لیکن درحقیقت یہ

(۱) الٓمٓ سجدہ: ۱۶ (۲) ابن جریرؒ: تفسیر جامع البیان، ص ۵۷ و ۵۸ ج ۲۱، میمنیہ، مصر،

Marfat.com

آیت کے مختلف مصداق ہیں، اور یہ تمام نیک اعمال آیت کے مفہوم میں داخل ہیں،

(ب) دوسرا قاعدہ یہ معلوم ہوا کہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں دو روایتیں ہوں، ایک میں نزلت الآیة فی کذا کے الفاظ استعمال کئے گئے ہوں اور دوسری میں صراحۃً کسی واقعہ کو آیت کا سببِ نزول قرار دیا گیا ہو، تو اس دوسری روایت پر اعتماد کیا جائے گا، اور پہلی روایت چونکہ شانِ نزول کے مفہوم میں صریح نہیں ہے، اس لئے اسے راوی کے اپنے اجتہاد و استنباط پر محمول کیا جائے گا، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿نِسَآئُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ﴾

''تمہاری بیویاں تمہارے لئے کھیتیاں ہیں، لہٰذا اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو جاؤ'' (البقرہ:۲۲۳)

اس آیت کے بارے میں امام بخاریؒ نے حضرت ابن عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''اُنْزِلَتْ فِیْ اِتْیَانِ النِّسَاءِ فِیْ اَدْبَارِهِنَّ۔ (۱) (یہ آیت عورتوں کے ساتھ پشت میں صحبت کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے) لیکن حضرت جابرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ اس کا سببِ نزول صراحۃً یہ بتاتے ہیں کہ یہودیوں کا خیال یہ تھا کہ اگر مباشرت پیچھے کی جانب سے اگلے ہی حصہ میں کی جائے تو اولاد بھینگی پیدا ہوتی ہے، اس کی تردید کے لئے یہ آیت نازل ہوئی، اور اس نے یہ واضح کر دیا کہ مباشرت کی جگہ تو ایک ہی ہے، (یعنی اگلا حصہ) جس سے اولاد پیدا ہو سکے، لیکن اس کے لئے راستہ کوئی بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ (۲)

ان دونوں روایتوں میں حضرت جابرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت چونکہ مفصل اور صریح ہے اس لئے اس کو ترجیح ہوگی، اور حضرت ابن عمرؓ کے قول کو ان کا استنباط قرار دیا جائے گا، (۳) اور درحقیقت اُن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پشت میں صحبت کرنا اس آیت کی رُو سے جائز ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس آیت سے عورتوں کے ساتھ لواطت کرنے کی

(۱) الاتقان، ص۳۲ ج۱، (۲) اسباب النزول للواحدی ص۴۰ و۴۱،

(۳) مناهل العرفان، ص۱۰۸ ج۱

حرمت ثابت ہوتی ہے، (۱) (کیونکہ اس میں عورت کو کھیتی یعنی پیدائشِ اولاد کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے اور وہ لواطت میں ممکن نہیں)

۲......سببِ نزول متعین کرنے کے لئے دوسرا اصول یہ ہے کہ اگر ایک روایت صحیح سند کے ساتھ آئی ہو، اور دوسری ضعیف یا مجروح سند کے ساتھ تو صحیح روایت کو اختیار کر لیا جائے گا، اور ضعیف کو ترک کر دیا جائے گا، مثلاً سورۂ ضحیٰ کی ابتدائی آیات ہیں:

﴿ والضُّحٰی ۝ واللَّیْلِ اِذَا سَجٰی ۝ ما ودَّعَكَ ربُّكَ وما قلٰی ﴾

"(اے پیغمبر!) قسم ہے چڑھتے دن کی روشنی کی، اور رات کی جب اُس کا اندھیرا بیٹھ جائے، کہ تمہارے پروردگار نے نہ تمہیں چھوڑا ہے، اور نہ ناراض ہوا ہے"۔

اس آیت کے شانِ نزول میں بخاریؒ، مسلمؒ نے حضرت جندبؓ کی یہ روایت ذکر کی ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی تکلیف کی وجہ سے ایک یا دو راتیں (تہجد کی) نماز نہ پڑھ سکے، اس پر ایک کافر عورت نے یہ طعنہ دیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے (معاذ اللہ) شیطان نے تمہیں چھوڑ دیا ہے، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں،

دوسری طرف طبرانیؒ اور ابن ابی شیبہؒ نے حفص بن میسرہ کی نانی خولہؓ سے (جو حضورؐ کی خادمہ تھیں) یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ ایک کُتے کا پلا حضورؐ کے گھر آکر چار پائی کے نیچے بیٹھ گیا، اور وہیں اُسے موت آگئی، اس واقعہ کے بعد چار دن تک آپؐ پر وحی نازل نہ ہوئی، آپؐ نے مجھ سے پوچھا کہ رسول اللہؐ کے گھر میں ایسی کیا بات ہوگئی ہے، جو جبرئیلؑ میرے پاس نہیں آرہے، میں نے دل میں کہا کہ مجھے گھر میں جھاڑ پونچھ کرنی چاہئے، چنانچہ میں نے جھاڑو چار پائی کے نیچے مار کر صفائی کی تو پلا نکل آیا، اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں،

لیکن یہ دوسری روایت سنداً صحیح نہیں ہے، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ اس کی سند میں بعض راوی مجہول ہیں، لہٰذا قابلِ اعتماد شانِ نزول وہی ہے، جو صحیح بخاریؒ میں مروی ہے۔ (۲)

---

(۱) مناهل العرفان، ص ۱۰۸ ج ۱

(۲) الاتقان، ص ۳۳ ج ۱، اس کی مزید مثالیں بھی اسی مقام پر ملاحظہ کی جاسکتی ہیں،

۳......بعض مرتبہ شانِ نزول کی دونوں روایتیں سند کے اعتبار سے صحیح ہوتی ہیں، لیکن کسی ایک روایت کے حق میں کوئی وجہِ ترجیح پائی جاتی ہے، مثلاً یہ کہ ایک کی سند دوسری کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط ہے، یا ایک کا راوی ایسا ہے کہ جو واقعہ کے وقت موجود تھا اور دوسری روایت کا راوی واقعہ کے وقت موجود نہیں تھا، ایسی صورت میں اُس روایت کو اختیار کیا جائے گا جس کے حق میں وجہِ ترجیح موجود ہے، اس کی مثال سورۂ اسراء کی یہ آیت ہے:

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾

''اور (اے پیغمبر!) یہ لوگ تم سے رُوح کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دو کہ: ''رُوح میرے پروردگار کے حکم سے (بنی) ہے اور تمہیں جو علم دیا گیا ہے، وہ بس تھوڑا ہی سا علم ہے۔''

اس آیت کے شانِ نزول میں ایک روایت تو امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ مَیں مدینہ طیبہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہا تھا اور آپ کھجور کی ایک شاخ کا سہارا لے کر چل رہے تھے، اتنے میں آپ کا گذر کچھ یہودیوں کے پاس سے ہوا تو انہوں نے آپس میں کہا کہ اِن (حضورؐ) سے کچھ سوالات کرنے چاہئیں، چنانچہ انہوں نے آکر آپ سے کہا کہ: ''ہمیں رُوح کے بارے میں بتایئے'' اس پر آپ رُک گئے اور تھوڑی دیر بعد آپ نے سرِ اقدس اٹھایا، میں سمجھ گیا، کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے، پھر آپ نے فرمایا﴿ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ الخ ﴾

دوسری روایت امام ترمذیؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ قریش مکہ نے یہودیوں سے کہا کہ ہمیں کوئی ایسی بات بتاؤ جو ہم ان صاحب (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھ سکیں، اس پر یہودیوں نے کہا کہ ان سے رُوح کے بارے میں سوال کرو، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

پہلی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت، مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، اور دوسری روایت

Marfat.com

سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا نزول مکہ مکرمہ میں ہوا، سند کے اعتبار سے بھی دونوں روایتیں صحیح ہیں، لیکن پہلی روایت کے حق میں یہ وجہ ترجیح موجود ہے کہ اس کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس واقعہ کے وقت خود موجود تھے، اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ خود واقعہ کے وقت حاضر ہوں، اس لئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت قابلِ ترجیح ہے۔(۱)

۴......بعض مرتبہ ایک آیت کے اسبابِ نزول ایک سے زائد ہوتے ہیں، یعنی ایک جیسے کئی واقعات یکے بعد دیگرے پیش آتے ہیں، اور اُن سب کے بعد آیت نازل ہوتی ہے، اب کوئی راوی اس آیت کے شانِ نزول میں ایک واقعہ ذکر کرتا ہے، اور دوسرا کوئی اور واقعہ ذکر کر دیتا ہے، بظاہر ان میں تعارض معلوم ہوتا ہے، لیکن درحقیقت تعارض نہیں ہوتا، کیونکہ دونوں ہی واقعات سببِ نزول ہوتے ہیں،

مثلاً سورۂ نور کی آیاتِ لعان کے بارے میں امام بخاریؒ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ھلال بن اُمیہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائی تھی، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں، وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ الخ، دوسری طرف امام بخاریؒ ہی نے ایک اور روایت حضرت سہل بن سعدؓ سے نقل کی ہے کہ حضرت عویمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کرایا تھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو کسی اجنبی کے ساتھ ملوث دیکھے اور اس شخص کو قتل کر دے تو کیا اس سے قصاص لیا جائے گا؟ ایسے شخص کو کیا کرنا چاہئے؟ اس کے جواب میں حضورؐ نے فرمایا کہ تمہارے بارے میں قرآنی آیات نازل ہوئی ہیں، اور پھر یہی آیات آپؐ نے سُنائیں، تیسری طرف مسند بزارؒ میں حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے کہ اسی قسم کا سوال وجواب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے درمیان ہوا تھا اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔(۲)

واقعہ درحقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں واقعات ان آیات کے نزول سے قبل پیش آچکے تھے،

---

(۱) الاتقان، ص:۳۴ ج۱ (۲) الاتقان، ص:۳۴ ج۱

اس لئے ان میں سے ہر ایک کو سببِ نزول قرار دینا درست ہے۔

۵...... بعض اوقات اس کے برعکس ایسا ہوتا ہے کہ واقعہ ایک ہوتا ہے، مگر اس کے سبب سے کئی آیتیں نازل ہو جاتی ہیں، اب ایک راوی اس واقعہ کو نقل کر کے کہتا ہے کہ اس پر فلاں آیت نازل ہوئی، اور دوسرا اُسی واقعہ کو نقل کر کے کسی دوسری آیت کا حوالہ دیتا ہے، اس سے بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے، مگر حقیقت میں کوئی تضاد نہیں ہوتا،

اس کی مثال یہ ہے کہ امام ترمذیؒ اور حاکمؒ نے حضرت اُم سلمہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ حضورؐ سے عرض کیا کہ یارسول اللہؐ قرآن کریم میں ہجرت وغیرہ کے باب میں مجھے عورتوں کا ذکر نہیں ملتا، اُس پر یہ آیت نازل ہوئی،

﴿ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ﴾ (ال عمران: ۱۹۵)

”چنانچہ اُن کے پروردگار نے ان کی دُعا قبول کی (اور کہا) کہ: ”میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع نہیں کروں گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔“

اور امام حاکمؒ نے حضرت اُم سلمہؓ ہی سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ یارسول اللہؐ! قرآن کریم میں مردوں ہی کا ذکر ہے، عورتوں کا کہیں تذکرہ نہیں، اس پر ایک آیت تو ﴿ اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ (۱) وَالْمُسْلِمٰتِ الخ ﴾ نازل ہوئی، اور دوسری ﴿ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ﴾ (۲)

تکرارِ نزول اور اس کی حقیقت

۶...... چھٹی صورت تکرار نزول کی ہے، یعنی بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک ہی آیت ایک سے زائد مرتبہ نازل ہوئی، اور ہر مرتبہ اس کا نزول کسی نئے واقعہ کے پس منظر میں

(۱) یہ سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۳۵ ہے، اور اس میں بہت سے اعمال صالحہ کا ذکر کرتے ہوئے مردوں اور عورتوں دونوں کا الگ الگ نام لیا گیا ہے۔ (۲) اتقان، ص ۳۵ ج ۱،

Marfat.com

ہوا، اب کسی راوی نے ایک نزول کا واقعہ ذکر کر دیا، اور کسی نے دوسرے نزول کا، اس سے ظاہری طور پر تضاد معلوم ہوتا ہے، مگر حقیقت میں تضاد اس لئے نہیں ہوتا کہ آیت دونوں واقعات میں دونوں مرتبہ نازل ہوئی،

مثلاً امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے کہ جب ابوطالب کی وفات کا وقت آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا کہ چچا جان! آپ لا الٰہ الا اللہ کہہ دیجئے اس کے بعد میں اللہ تعالیٰ سے آپ کی سفارش کر دوں گا، اس وقت ابوجہل اور عبداللہ ابن امیہ بھی موجود تھے، انہوں نے ابوطالب کو ایمان کی طرف مائل ہوتے دیکھا تو فوراً بولے: ''کیا تم عبدالمطلب کے دین سے برگشتہ ہونا چاہتے ہو؟'' اس کے بعد وہ دونوں بولتے ہی رہے، یہاں تک کہ ابوطالب یہ کہہ اُٹھے کہ: ''میں عبدالمطلب ہی کے دین پر ہوں'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''میں آپ کے لئے اللہ سے مغفرت طلب کرتا رہوں گا، جب تک کہ مجھے اس سے روک نہ دیا جائے'' اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ:

﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ﴾

''یہ بات نہ تو نبی کو زیب دیتی ہے، اور نہ دوسرے مؤمنوں کو کہ وہ مشرکین کے لئے مغفرت کی دُعا کریں۔''

دوسری طرف امام ترمذیؒ نے حضرت علیؓ سے بسندِ حسن نقل کیا ہے کہ میں نے ایک شخص کو اپنے مشرک والدین کے لئے استغفار کرتے سُنا، میں نے اس سے کہا کہ تمہارے والدین تو مشرک تھے، ان کے لئے استغفار کیسے کرتے ہو؟ اس نے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے والد کے لئے استغفار کیا تھا، حالانکہ اُن کے والد بھی مشرک تھے، یہ بات میں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کی تو اُس پر یہ آیت نازل ہوئی،

تیسری طرف امام حاکمؒ وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن قبرستان تشریف لے گئے، اور ایک قبر کے پاس بیٹھ کر دیر تک مناجات کرتے اور روتے رہے، پھر فرمایا کہ جس قبر کے پاس میں بیٹھا وہ میری والدہ کی قبر

Marfat.com

تھی، میں نے اپنے پروردگار سے اُن کے لئے دعاء کرنیکی اجازت چاہی تو مجھے اجازت نہیں ملی، اور یہ آیت نازل ہوئی، ﴿ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا الخ ﴾

یہاں تینوں واقعات میں ایک ہی آیت کا نزول بیان کیا گیا ہے، چنانچہ مفسّرین نے فرمایا ہے کہ یہ آیت تینوں مرتبہ الگ الگ نازل ہوئی، (۱)

اب یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ جب ایک آیت ایک مرتبہ نازل ہوچکی، اُسے لکھ کر محفوظ کرلیا گیا، اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بہت سے صحابہؓ کو یاد ہوگئی تو پھر دوبارہ اور سہ بارہ اسے نازل کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

اس کا بہترین جواب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے، اور وہ یہ کہ ''تکرارِ نزول'' کی مذکورہ بالا صورت میں آیت کا اصلی نزول تو ایک ہی مرتبہ ہوتا ہے، لیکن وہ آیت جس واقعہ میں نازل ہوئی تھی، جب اُسی جیسا کوئی اور واقعہ پیش آتا ہے تو وہی آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں دوبارہ ڈال دی جاتی ہے، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس واقعہ میں بھی اسی آیت سے رہنمائی ملے گی، یہ آیت کا قلبِ مبارک میں متحضر ہوجانا چونکہ منجانب اللہ ہوتا ہے، اس لئے یہ وہی ''نفث فی الرّوع'' ہے جو وحی کی ایک قسم ہے، اور جس کا مفصل بیان وحی کے طریقوں میں پیچھے گذر چکا ہے، اسی کو مفسرین ''نزولِ مکرر'' سے تعبیر فرمادیتے ہیں، گویا جتنی مرتبہ وہ آیت قلب میں منجانب اللہ وارد ہوئی،

(۱) یہ مثال الاتقان ج ۱ ص ۳۴ سے ماخوذ ہے، لیکن یہ اس تقدیر پر ہے کہ تینوں روایات کو صحیح قرار دیا جائے ورنہ تیسری روایت کی صحت میں کلام ہے، چنانچہ حافظ ذہبی اس کے بارے میں لکھتے ہیں: ''قلت ایوب بن ھانی ضعفه ابن معین'' (مستدرك ص ۳۳۶ ج ۲) اور ایوب بن ہانی کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ نے ائمہ جرح وتعدیل کے مختلف اقوال نقل کئے ہیں، (تھذیب التھذیب ص ۴۱۴ ج ۱) لہٰذا نہ تو اس روایت کو موضوع کہہ سکتے ہیں اور نہ اس کو عقیدہ کے کسی نازک مسئلہ کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے، چنانچہ اہلِ سنت کی ایک بڑی جماعت بہت سے دلائل کی بنیاد پر اس بات کی قائل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین ملتِ ابراہیمی پر فوت ہونیکی بناء پر مؤمن تھے، خود علامہ سیوطیؒ نے بھی اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، واللہ اعلم،

Marfat.com

اتنی ہی مرتبہ اس کا نزول ہوا، (۱)

اسباب نزول کے سلسلے میں روایات کے اندر جو تعارض یا اختلاف ہوتا ہے وہ مذکورہ بالا چھ اصولوں کے تحت عموماً بآسانی دُور ہو جاتا ہے، اور یہ چھ اصول ذہن میں رہیں تو اختلافِ روایات کی صورت میں اُلجھن پیدا نہیں ہوتی۔

(۱) دیکھئے الفوز الکبیر، ص۲۲ فصل فی معرفۃ اسباب النزول،

Marfat.com

باب سوم

قرآن کے سات حروف

ایک صحیح حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَۃِ اَحْرُفٍ فَاقْرَءُ وْ مَاتَیَسَّرَ مِنْہُ (۱)

"یہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، پس اُس میں سے جو تمہارے لئے آسان ہو اُس طریقے سے پڑھ لو۔"

اس حدیث میں قرآن کریم کے سات حروف پر نازل ہونے سے کیا مراد ہے؟ یہ بڑی معرکۃ الآرا اور طویل الذّیل بحث ہے، اور بلاشبہ علوم قرآن کے مشکل ترین مباحث میں سے ہے، یہاں یہ پوری بحث تو نقل کرنا مشکل ہے، لیکن اس کے متعلق ضروری باتیں پیشِ خدمت ہیں:

جو حدیث اوپر نقل کی گئی ہے وہ معنی کے اعتبار سے متواتر ہے، چنانچہ مشہور محدث امام ابوعبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ نے اُس کے تواتر کی تصریح کی ہے، اور حدیث وقراآت کے معروف امام ابن الجزریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مستقل کتاب (جزء) میں اس حدیث کے تمام طرق جمع کئے ہیں، اور اُن کے مطابق یہ حدیث حضرت عمر بن خطابؓ، ہشام بن حکیم بن حزامؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، اُبی بن کعبؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، معاذ بن جبلؓ، ابوہریرہؓ، عبداللہ

(۱) صحیح بخاریؒ مع القسطلانی، ص۴۵۳ ج۷، کتاب فضائل القرآن،

بن عباسؓ، ابوسعید خدریؓ، حذیفہ بن یمانؓ، ابوبکرہؓ، عمرو بن عاصؓ، زید بن ارقمؓ، انس بن مالکؓ، سمرہ بن جندبؓ، عمر بن ابی سلمہؓ، ابوجہمؓ، ابوطلحہؓ اور امِ ایوب انصاریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے، (۱) اس کے علاوہ متعدد محدثین نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر یہ اعلان فرمایا کہ وہ تمام حضرات کھڑے ہو جائیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سُنی ہو کہ:

"قرآن کریم سات حروف پر نازل کیا گیا ہے جن میں سے ہر ایک شافی اور کافی ہے"

چنانچہ صحابۂ کرامؓ کی اتنی بڑی جماعت کھڑی ہو گئی جسے شمار نہیں کیا جاسکا۔ (۲)

حروفِ سبعہ کا مفہوم

اس حدیث میں سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ سات حروف پر قرآن کریم کے نازل ہونے سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں آراء ونظریات کا شدید اختلاف ملتا ہے، یہاں تک کہ علامہ ابن عربیؒ وغیرہ نے اس باب میں پینتیس اقوال شمار کیے ہیں، (۳) یہاں اُن میں سے چند مشہور اقوال پیشِ خدمت ہیں:

۱...... بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد سات مشہور قاریوں کی قراءتیں ہیں، لیکن یہ خیال تو بالکل غلط اور باطل ہے، کیونکہ قرآن کریم کی متواتر قراءتیں ان سات قراءتوں میں منحصر نہیں ہیں، بلکہ اور بھی متعدد قراءتیں تواتر کے ساتھ ثابت ہیں، یہ سات قراءتیں تو محض اس لئے مشہور ہو گئیں کہ علامہ ابن مجاہدؒ نے ایک کتاب میں اُن سات مشہور قراء کی قراءتیں جمع کر دی تھیں، نہ اُن کا یہ مقصد تھا کہ قراءتیں سات میں منحصر ہیں، اور نہ وہ حروف سبعہ کی تشریح ان سات قراءتوں سے کرنا چاہتے تھے، جیسا کہ اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

---

(۱) ابن الجزریؒ: النشر فی القرآت العشر، ص۲۱، ج۱ دمشق ۱۳۴۵ھ　(۲) ایضا

(۳) الزرکشیؒ: البرہان فی علوم القرآن، ص۲۱۲ ج۱،

Marfat.com

۲......اسی بناء پر بعض علماء نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حروف سے مراد تمام قراءتیں ہیں، لیکن ''سات'' کے لفظ سے سات کا مخصوص عدد مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد کثرت ہے، اورعربی زبان میں سات کا لفظ محض کسی چیز کی کثرت بیان کرنے کے لئے اکثر استعمال ہو جاتا ہے، یہاں بھی حدیث کا مقصد یہ نہیں ہے کہ قرآن کریم جن حروف پر نازل ہوا وہ مخصوص طور پر سات ہی ہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ قرآن کریم ''بہت سے'' طریقوں سے نازل ہوا ہے، علماء متقدمین میں سے قاضی عیاضؒ کا یہی مسلک ہے (۱) اور آخری دور میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے بھی یہی قول اختیار فرمایا ہے (۲)

لیکن یہ قول اس لئے درست معلوم نہیں ہوتا کہ بخاریؒ اور مسلمؒ کی ایک حدیث میں حضرت ابن عباسؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ:

اقرأنی جبریلُ علیٰ حرفٍ فراجعته ، فلم ازل استزیده ویزید نی حتّٰی انتهٰی الٰی سبعة احرفٍ (۳)

''مجھے جبرئیل علیہ السلام نے قرآن کریم ایک حرف پر پڑھایا، تو میں نے ان سے مراجعت کی اور میں زیادتی طلب کرتا رہا، اور وہ (قرآن کریم کے حروف میں) اضافہ کرتے رہے یہانتک کہ وہ سات حروف تک پہنچ گئے۔''

اس کی تفصیل صحیح مسلمؒ کی ایک روایت میں حضرت ابی بن کعبؓ سے اس طرح مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنوغِفار کے تالاب کے پاس تھے:

فأتاه جبرئیل علیه السلام فقال انّ اللّٰه یأمرك ان تقرأ امّتك القرآن علی حرف ، فقال أسأل اللّٰه معافاته ومغفرته وان

---

(۱) اوجز المسالك الیٰ مؤطاء الامام مالک ''ص ۳۵۶ ج ۲ مطبوعہ سہارنپور ۱۳۵۰ھ

(۲) مصفی شرح مؤطا ص: ۱۸۷ ج ۱ مطبع فاروقی دہلی ۱۲۹۳ھ

(۳) بحوالہ مناهل العرفان، ص ۱۳۳ ج ۱،

Marfat.com

امّتی لاتطیق ذلك، ثم اتاه الثانیة فقال انّ اللّٰه یأمرك ان تقرأ اُمّتك القراٰن علٰی حرفین فقال أسال اللّٰہ معافاته ومغفرته وانّ اُمتی لاتطیق ذلك، ثم جاءه الثالثة فقال انّ اللّٰه یأمرك ان تقرأ اُمّتك القراٰن علٰی ثلاثة أحرف فقال أسأل اللّٰه معافاته ومغفرته وانّ اُمّتی لاتطیق ذلك ثم جاءه الرابعة فقال: انّ اللّٰه یأمرك ان تقرأ اُمّتك القراٰن علٰی سبعة أحرف فأیما حرف قرءوا علیه فقد أصابوا" (۱)

"پس حضورؐ کے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے اور فرمایا کہ اللہ نے آپؐ کو یہ حکم دیا ہے کہ آپؐ کی (ساری) اُمت قرآن کریم کو ایک ہی حرف پر پڑھے، اس پر آپؐ نے فرمایا کہ میں اللہ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں، میری اُمت میں اس کی طاقت نہیں ہے، پھر جبرئیل علیہ السلام دوبارہ آپؐ کے پاس آئے، اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا ہے کہ آپؐ کی امت قرآن کریم کو دو حرفوں پر پڑھے، آپؐ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں، میری اُمت میں اس کی طاقت نہیں ہے، پھر وہ تیسری بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا ہے کہ آپؐ کی اُمت قرآن کریم کو تین حروف پر پڑھے، آپؐ نے پھر فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں، میری امت میں اس کی طاقت نہیں ہے، پھر وہ چوتھی بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا ہے کہ آپؐ کی اُمت قرآن کو سات حروف پر پڑھے، پس وہ جس حرف پر پڑھیں گے اُن کی قراءت درست ہوگی۔"

(۱) مناهل العرفان، ص۳۳ ج۱،

ان روایات کا سیاق صاف بتا رہا ہے کہ یہاں سات سے مراد محض کثرت نہیں، بلکہ سات کا مخصوص عدد ہے، اس لئے ان احادیث کی روشنی میں یہ قول قابلِ قبول معلوم نہیں ہوتا، چنانچہ جمہور نے اس کی تردید کی ہے۔

۳...... بعض دوسرے علماء مثلاً حافظ ابن جریر طبریؒ وغیرہ نے فرمایا کہ مذکورہ حدیث میں سات حروف سے مراد قبائل عرب کی سات لغات ہیں، چونکہ اہلِ عرب مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے، اور ہر قبیلہ کی زبان عربی ہونے کے باوجود دوسرے قبیلہ سے تھوڑی تھوڑی مختلف تھی، اور یہ اختلاف ایسا ہی تھا جیسے ایک بڑی زبان میں علاقائی طور پر تھوڑے تھوڑے اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان مختلف قبائل کی آسانی کے لئے قرآن کریم سات لغات پر نازل فرمایا، تاکہ ہر قبیلہ اُسے اپنی لغت کے مطابق پڑھ سکے،(۱) امام ابو حاتم سجستانیؒ نے ان قبائل کے نام بھی معین کر کے بتادیئے ہیں، اور فرمایا ہے کہ قرآن کریم ان سات قبائل کی لغات پر نازل ہوا ہے: قریش، ھذیل، تیم الرّباب، ازد، ربیعہ، ہوازن اور سعد بن بکر، اور حافظ ابن عبد البرؒ نے بعض حضرات سے نقل کر کے اُن کی جگہ یہ قبائل بتائے ہیں: (۱) ھذیل (۲) کنانہ (۳) قیس (۴) ضبہ (۵) تیم الرّباب (۶) اسد ابن خزیمہ اور (۷) قریش (۲)

لیکن بہت سے محققین مثلاً حافظ ابن عبد البرؒ، علامہ سیوطیؒ اور علامہ ابن الجزریؒ وغیرہ نے اس قول کی بھی تردید کی ہے، اوّل تو اس لئے کہ عرب کے قبائل بہت سے تھے، ان میں سے صرف ان سات کے انتخاب کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ دوسرے یہ کہ حضرت عمرؓ اور حضرت ہشام بن حکیمؓ کے درمیان قرآن کریم کی تلاوت میں اختلاف ہوا، جس کا مفصّل واقعہ صحیح بخاریؒ وغیرہ میں مروی ہے، حالانکہ یہ دونوں حضرات قریشی تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی تصدیق فرمائی، اور وجہ یہ بتائی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، اگر سات حروف سے مراد سات مختلف قبائل کی لغات ہوتیں تو حضرت عمرؓ اور حضرت ہشامؓ

---

(۱) تفسیر ابن جریرؒ، ص ۱۵ ج ۱

(۲) فتح الباری، ص ۲۲ ج ۹ و روح المعانی، ص ۲۱ ج ۱

Marfat.com

میں اختلاف کی کوئی وجہ نہیں ہونی چاہئے تھی، کیونکہ دونوں قریشی تھے، (۱) اگر چہ علامہ آلوسیؒ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ "ہوسکتا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے علاوہ کسی اور لغت پر قرآن پڑھایا ہو" (۲) لیکن یہ جواب کمزور ہے، کیونکہ مختلف لغات میں قرآن کریم کے نازل ہونے کا منشاء یہی تو تھا کہ ہر قبیلہ والا اپنی لغت کے مُطابق آسانی سے اُس کو پڑھ سکے، اس لئے یہ بات حکمت رسالتؐ سے بعید معلوم ہوتی ہے کہ ایک قریشی کو دوسری لغت پر قرآن کریم پڑھایا گیا ہو،

اس کے علاوہ اس پر امام طحاویؒ نے بھی یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ سات حروف سے مراد سات قبائل کی لغات ہیں، تو یہ اُس آیت کے خلاف ہوگا جس میں ارشاد ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ﴾

"اور ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس کی قوم کی زبان میں"

اور یہ بات طے شدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم قریش تھی، اس لئے ظاہر یہی ہے کہ قرآن صرف قریش کی لغت پر نازل ہوا ہے، (۳) امام طحاویؒ کی اس بات کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ جس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کی جمع ثانی کا ارادہ فرمایا اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں صحابہؓ کی ایک جماعت کو مصحف تیار کرنے کا حکم دیا، اس وقت انہیں یہ ہدایت فرمائی تھی:

اِذَا اخْتَلَفْتُمْ اَنْتُمْ فِیْ شَیْءٍ مِّنَ الْقُرْاٰنِ فَاكْتُبُوْهُ بِلِسَانِ قُرَیْشٍ فَاِنَّمَا نَزَلَ بِلِسَانِهِمْ

"جب قرآن (کی کتابت) میں تمہارے درمیان کوئی اختلاف

(۱) النشر فی القراآت العشر، ص۲۵، ج۱ وفتح الباری، ص۲۳ ج۹،

(۲) روح المعانی، ص۲۱ ج۱،

(۳) الطحاویؒ: مشکل الآثار، ص۱۸۵ و۱۸۶ ج۴، دائرۃ المعارف دکن ۱۳۳۳ھ

Marfat.com

ہو تو اُسے قریش کی لغت پر لکھنا، کیونکہ قرآن انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے''(۱)

اس میں حضرت عثمانؓ نے تصریح فرمادی ہے کہ قرآن صرف قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے، رہا یہ سوال کہ پھر اختلاف پیش آنے کا کیا مطلب ہے؟ سو اس کا مفصل جواب انشاء اللہ آگے آئے گا۔

اس کے علاوہ اس قول کے قائلین اس بات پر متفق ہیں کہ ''احرفِ سبعہ'' اور ''قراآت'' دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، قراآت کا اختلاف جو آج تک موجود ہے وہ صرف ایک حرف یعنی لغتِ قریش کے اندر ہے، اور باقی حروف یا منسوخ ہو گئے یا مصلحۃً انہیں ختم کر دیا گیا، اس پر دوسرے اشکالات کے علاوہ ایک اشکال یہ بھی ہوتا ہے کہ پورے ذخیرۂ احادیث میں کہیں اس بات کا ثبوت نہیں ملتا، کہ قرآن کریم کی تلاوت میں دو قسم کے اختلافات تھے، ایک ''سبعۃ احرف'' کے اور ایک قراآت کے، بلکہ احادیث میں جہاں کہیں قرآن کریم کے کسی لفظی اختلاف کا ذکر آیا ہے وہاں صرف ''احرف'' کا اختلاف ذکر کیا گیا ہے، قراآت کا کوئی جداگانہ اختلاف بیان نہیں کیا گیا، ان وجوہ کی بناء پر یہ قول بھی نہایت کمزور معلوم ہوتا ہے۔

۴..... چوتھا مشہور قول امام طحاویؒ کا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم نازل تو صرف قریش کی لغت پر ہوا تھا، لیکن چونکہ اہل عرب مختلف علاقوں اور مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے، اور ہر ایک کے لئے اس ایک لغت پر قرآن کریم کی تلاوت بہت دشوار تھی، اس لئے ابتداءِ اسلام میں یہ اجازت دیدی گئی تھی کہ وہ اپنی علاقائی زبان کے مطابق مرادف الفاظ کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کر لیا کریں، چنانچہ جن لوگوں کے لئے قرآن کریم کے اصلی الفاظ سے تلاوت مشکل تھی، اُن کے لئے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مرادفات متعین فرمادیئے تھے جن سے وہ تلاوت کر سکیں، یہ مرادفات قریش اور غیر قریش دونوں کی لغات سے منتخب کئے گئے تھے، اور یہ بالکل ایسے تھے جیسے تَعَالَ کی جگہ ھَلُمَّ یا اَقْبِلْ یا اُدْنُ پڑھ

---

(۱) صحیح بخاریؒ: باب جمع القرآن،

Marfat.com

دیا جائے، معنیٰ سب کے ایک ہی رہتے ہیں، لیکن یہ اجازت صرف اسلام کے ابتدائی دور میں تھی، جبکہ تمام اہلِ عرب قرآنی زبان کے پوری طرح عادی نہیں ہوئے تھے، پھر رفتہ رفتہ اس قرآنی زبان کا دائرہ اثر بڑھتا گیا، اہلِ عرب اس کے عادی ہو گئے، اور ان کے لئے اسی اصلی لغت پر قرآن کی تلاوت آسان ہوگئی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے پہلے رمضان میں حضرت جبرئیل علیہ السلام سے قرآن کریم کا آخری دَور کیا، جسے عرضۂ اخیرہ کہا جاتا ہے، اس موقع پر یہ مرادفات سے پڑھنے کی اجازت ختم کر دی گئی اور صرف وہی طریقہ باقی رہ گیا جس پر قرآن نازل ہوا تھا(۱)

اس قول کے مطابق ''سات حروف'' والی حدیث اُسی زمانے سے متعلق ہے، جب تلاوت میں مرادفات استعمال کرنے کی اجازت تھی، اور اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، بلکہ مطلب یہ تھا کہ وہ اس وسعت کے ساتھ نازل ہوا ہے کہ اُسے ایک مخصوص زمانے تک سات حروف پر پڑھا جا سکے گا، اور سات حروف سے بھی مراد یہ نہیں ہے کہ قرآن کریم کے ہر کلمہ میں سات مرادفات کی اجازت ہے، بلکہ مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ جتنے مرادفات استعمال کئے جا سکتے ہیں اُن کی تعداد سات ہے، اور اس اجازت کا مفہوم بھی یہ نہ تھا کہ ہر شخص اپنی مرضی سے جو الفاظ چاہے استعمال کر لے، بلکہ متبادل الفاظ کی تعیین بھی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دی تھی، اور ہر شخص کو آپؐ نے اس طرح قرآن سکھلایا تھا جو اس کے لئے آسان ہو، لہٰذا صرف اُن مرادفات کی اجازت دی گئی تھی، جو حضورؐ سے ثابت تھے(۲)

امام طحاویؒ کے علاوہ حضرت سفیان بن عیینہؒ، ابن وہبؒ اور حافظ ابن عبدالبرؒ نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے، بلکہ حافظ ابن عبدالبرؒ نے تو اس قول کو اکثر علماء کی طرف منسوب کیا ہے،(۳)

---

(۱) مشکل الآثار للطحاویؒ: ص ۱۸۶ تا ص ۱۹۱ ج ۴

(۲) فتح الباری، ص ۲۲ و ۲۳ ج ۹،

(۳) الزرقانیؒ: شرح المؤطا، ص ۱۱ ج ۲، المکتبۃ التجاریہ الکبریٰ، مصر ۱۳۵۵ھ

یہ قول پچھلے تمام اقوال کے مقابلہ میں زیادہ قرینِ قیاس ہے، اور اس کے قائلین اپنی دلیل میں مسندِ احمدؒ کی وہ روایت پیش کرتے ہیں جو حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

اِنَّ جبرئیلؑ قال یامحمدؐ اقرأ القرآن علیٰ حرف، قال میکائیل استزدہ حتّٰی بلغ سبعة أحرف، قال کُلٌّ شافٍ کافٍ مالم تخلط آیة عذاب برحمة اورحمة بعذاب، نحو قولك تعالَ واَقْبِلْ وهَلُمَّ وَاذْهَبْ واسْرِعْ وعَجِّلْ، (۱)

"جبرئیل علیہ السلام نے (حضورؐ سے) کہا کہ اے محمد! قرآن کریم کو ایک حرف پر پڑھئے، میکائیل علیہ السلام نے (حضورؐ سے) کہا اس میں اضافہ کروائیے، یہاں تک کہ معاملہ سات حروف تک پہنچ گیا، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا، ان میں سے ہر ایک شافی کافی ہے، تاوقتیکہ آپ عذاب کی آیت کو رحمت سے یا رحمت کو عذاب سے مخلوط نہ کردیں، یہ ایسا ہی ہوگا جیسے آپ تَعَالَ (آؤ) کے معنی کو اَقْبِلْ، هَلُمَّ، اِذْهَبْ، اَسْرِعْ اور عَجِّلْ کے الفاظ سے ادا کریں"

اس قول پر اور تو کوئی اشکال نہیں ہے، لیکن ایک اُلجھن اس میں بھی باقی رہتی ہے، اور وہ یہ کہ قرآن کریم کی جو مختلف قراءتیں آج تک متواتر چلی آرہی ہیں، اس قول کے مطابق ان کی حیثیت واضح نہیں ہوتی، اگر ان قراءتوں کو "سات حروف" سے الگ کوئی چیز قرار دیا جائے تو اس کے لئے دلیل کی ضرورت ہے، احادیث کے وسیع ذخیرے میں "احرف" کے اختلاف کے علاوہ قرآن کریم کے کسی اور لفظی اختلاف کا ذکر نہیں ملتا، پھر اپنی طرف سے یہ کیونکہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت میں "احرف سبعہ" کے علاوہ ایک اور قسم کا اختلاف بھی تھا، اس اُلجھن کا کوئی اطمینان بخش حل اس قول کے قائلین کے یہاں مجھے نہیں مل سکا۔

(۱) هذا للفظ روایة احمدؒ واسناد جید (اوجز المسالک ص ۳۵۷ ج ۲،)

Marfat.com

''سبعۂ احرف'' کی راجح ترین تشریح

ہمارے نزدیک قرآن کریم کے ''سات حروف'' کی سب سے بہتر تشریح اور تعبیر یہ ہے کہ حدیث میں ''حروف کے اختلاف'' سے مراد ''قراءتوں کا اختلاف'' ہے اور سات حروف سے مراد ''اختلافِ قراآت'' کی سات نوعیتیں ہیں، چنانچہ قراءتیں تو اگرچہ سات سے زائد ہیں، لیکن ان قراءتوں میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں، وہ سات اقسام میں منحصر ہیں، (ان سات اقسام کی تشریح آگے آرہی ہے)

ہمارے علم کے مطابق یہ قول متقدمین میں سے سب سے پہلے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ملتا ہے، مشہور مفسر قرآن علامہ نظام الدین قمی نیشاپوریؒ اپنی تفسیر غرائب القرآن میں لکھتے ہیں کہ احرفِ سبعہ کے بارے میں امام مالکؒ کا یہ مذہب منقول ہے کہ اس سے مراد قراآت میں مندرجہ ذیل سات قسم کے اختلافات ہیں:

۱...... مفرد اور جمع کا اختلاف، کہ ایک قراءت میں لفظ مفرد آیا ہو اور دوسری میں صیغہ جمع، مثلاً وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ، (انعام:۱۱۵) اور كَلِمٰتُ رَبِّكَ۔

۲...... تذکیر وتانیث کا اختلاف، کہ ایک میں لفظ مذکر استعمال ہوا اور دوسری میں مؤنث جیسے لَا يُقْبَلُ (بقرہ:۴۸) اور لَا تُقْبَلُ۔

۳...... وجوہِ اعراب کا اختلاف، کہ زیر زبر وغیرہ بدل جائیں، مثلاً هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ (فاطر: ۳) اور غَيْرِ اللّٰهِ۔

۴...... صرفی ہیئت کا اختلاف، جیسے يَعْرِشُوْنَ (النحل: ۶۸) اور يَعْرُشُوْنَ۔

۵...... ادوات (حروفِ نحویہ) کا اختلاف، جیسے لٰكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ (البقرہ: ۱۰۲) اور لٰكِنِ الشَّيَاطِيْنُ

۶...... لفظ کا ایسا اختلاف جس سے حروف بدل جائیں، جیسے تَعْلَمُوْنَ (البقرہ:۱۴۴) اور يَعْلَمُوْنَ اور نُنْشِزُهَا (البقرہ:۲۵۹) اور نَنْشُرُهَا۔

۷...... لہجوں کا اختلاف، جیسے تخفیف، تفخیم، امالہ، مد، قصر، اظہار اور ادغام وغیرہ، (۱)

پھر یہی قول علامہ ابن قتیبہؒ، امام ابوالفضل رازیؒ، قاضی ابوبکر بن الطیب باقلانیؒ اور محقق ابن الجزری رحمہم اللہ نے اختیار فرمایا ہے، (۲) محقق ابن الجزریؒ جو قراآت کے مشہور امام ہیں اپنا یہ قول بیان کرنے سے قبل تحریر فرماتے ہیں:

> ''میں اس حدیث کے بارے میں اشکالات میں مبتلا رہا، اور اس پر تیس سال سے زیادہ غور وفکر کرتا رہا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اس کی ایسی تشریح کھول دی جو انشاء اللہ صحیح ہوگی''۔ (۳)

یہ سب حضرات اس بات پر تو متفق ہیں کہ حدیث میں ''سات حروف'' سے مراد اختلافِ قراءت کی سات نوعیتیں ہیں، لیکن پھر ان نوعیتوں کی تعیین میں ان حضرات کے اقوال میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک نے قراآت کا استقراء اپنے طور پر الگ الگ کیا ہے، ان میں جن صاحب کا استقراء سب سے زیادہ منضبط مستحکم اور جامع ومانع ہے، وہ امام ابوالفضل رازی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، فرماتے ہیں، کہ قراآت کا اختلاف سات اقسام میں منحصر ہے:

۱...... اسماء کا اختلاف، جس میں افراد، تثنیہ وجمع اور تذکیر وتانیث دونوں کا اختلاف داخل ہے، (اس کی مثال وہی تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ (انعام: ۱۱۵) ہے، جو ایک قراءت میں تَمَّتْ كَلِمٰتُ رَبِّكَ بھی پڑھا گیا ہے)

۲...... افعال کا اختلاف، کہ کسی قراءت میں صیغہ ماضی ہے، کسی میں مضارع اور کسی میں امر مثلاً ایک قراءت میں رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا (سبا: ۱۹)، دوسری میں رَبَّنَا بَعِّدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا اور تیسری میں رَبُّنَا بٰعَدَ بَيْنَ اَسْفَارِنَا، نیز فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ

---

(۱) النیشاپوریؒ: غرائب القرآن ورغائب الفرقان، هامش ابن جرير ص ۲۱ ج ۱ المطبعة الميمنيّه مصر

(۲) ابن قتیبہؒ، ابوالفضل رازیؒ اور ابن الجزریؒ کے اقوال، فتح الباری، ص ۲۵ و ۲۶ ج ۹، اور اتقان ص ۴۷ ج ۱ میں موجود ہیں، اور قاضی ابن الطیبؒ کا قول تفسیر القرطبی ص ۴۵ ج ۱ میں دیکھا جا سکتا ہے،

(۳) النّشر فی القراآت العشر ص ۲۶ ج ۱،

Marfat.com

مَآ اُخْفِيَ (السجدہ :۱۷) میں مَآ اُخْفِي کو یاء کے سکون کے ساتھ مضارع واحد متکلم کے صیغے سے اور یاء کے فتحہ کے ساتھ مَآ اُخْفِيَ ماضی کے صیغے سے پڑھا گیا ہے۔

۳...... وجوہِ اعراب کا اختلاف، جس میں اعراب یا حرکات مختلف قراءتوں میں مختلف ہوں (اس کی مثال وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ (البقرہ: ۲۸۲) اور لَا يُضَآرُّ كَاتِبٌ اور ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ (البروج: ۱۵) اور ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدِ)

۴...... الفاظ کی کمی بیشی کا اختلاف، کہ ایک قراءت میں کوئی لفظ کم اور دوسری میں زیادہ ہو (مثلاً ایک قراءت میں تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اور دوسری میں تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ) (التوبہ: ۱۰۰) نیز وَسَارِعُوْا (آلِ عمران: ۱۳۳) اور سَارِعُوْا بغیر واو کے۔

۵...... تقدیم و تاخیر کا اختلاف، کہ ایک قراءت میں کوئی لفظ مقدم اور دوسری میں مؤخر ہے (مثلاً وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا (آلِ عمران: ۱۹۵) اور وَقُتِلُوْا وَقٰتَلُوْا نیز فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا (التوبہ: ۱۱۱) اور فَيُقْتَلُوْنَ وَيَقْتُلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا۔

۶...... بدلیّت کا اختلاف، کہ ایک قراءت میں ایک لفظ ہے، اور دوسری قراءت میں اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ (مثلاً نُنْشِزُهَا (البقرہ: ۲۵۹) اور نَنْشُرُهَا، نیز فَتَبَيَّنُوْا (الحجرات: ۶) اور، فَتَثَبَّتُوْا، بِضَنِيْنٍ (التکویر: ۲۴) اور بِظَنِيْنٍ

۷...... لہجوں کا اختلاف، جس میں تفخیم، ترقیق، امالہ، قصر، مد، ہمز، اظہار اور ادغام وغیرہ کے اختلافات شامل ہیں(۱) (مثلاً مُوْسٰى ایک قراءت میں امالہ کے ساتھ ہے، اور اُسے مُوْسٰیٰ کی طرح پڑھا جاتا ہے، اور دوسری میں بغیر امالہ کے ہے)

علامہ ابن الجزریؒ، علامہ ابن قتیبہؒ اور قاضی ابوطیبؒ کی بیان کردہ وجوہِ اختلاف بھی اس سے ملتی جلتی ہیں، البتہ امام ابوالفضل رازیؒ کا استقراء اس لئے زیادہ جامع معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا اختلاف چھوٹا نہیں ہے، اس کے برخلاف باقی تین حضرات کی بیان کردہ وجوہ میں آخری قسم یعنی لہجوں کے اختلاف کا بیان نہیں ہے، اور امام مالکؒ کی بیان کردہ وجوہ میں لہجوں کا اختلاف تو بیان کیا گیا ہے، لیکن الفاظ کی کمی بیشی، تقدیم و تاخیر اور بدلیت کے

---

(۱) فتح الباری ص۲۴ ج۹۔

اختلافات کی پوری وضاحت نہیں ہے، اس کے برخلاف امام ابوالفضل رازیؒ کے استقراء میں یہ تمام اختلافات وضاحت کے ساتھ جمع ہو گئے ہیں، محقق ابن الجزری رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے تیس سال سے زائد غور وفکر کرنے کے بعد سات احرف کو سات وجوہِ اختلاف پر محمول کیا ہے، انہوں نے بھی امام ابوالفضلؒ کا قول بڑی وقعت کے ساتھ نقل فرمایا ہے، اوراس پر کوئی اعتراض نہیں کیا، بلکہ اُن کے مجموعی کلام سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ انہیں امام ابوالفضلؒ کا استقراء خود اپنے استقراء سے بھی زیادہ پسند آیا ہے، (۱) اس کے علاوہ حافظ ابن حجرؒ کے کلام سے بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے ان تینوں اقوال میں امام ابوالفضل رازیؒ کے استقراء کو ترجیح دی ہے، کیونکہ انہوں نے علامہ ابن قتیبہؒ کا قول نقل کر کے لکھا ہے کہ ھذا وجہ حسن (یہ اچھی توجیہ ہے) پھر امام ابوالفضلؒ کی بیان کردہ سات وجوہ بیان کر کے تحریر فرمایا ہے:

قلت وقد اخذ کلام ابن قتیبة ونقّحه،

''میرا خیال ہے کہ امام ابوالفضل رازیؒ نے ابن قتیبہؒ کا قول اختیار کر کے اُسے اور نکھار دیا ہے۔'' (۲)

آخری دور میں شیخ عبدالعظیم الزرقانیؒ نے بھی انہی کے قول کو اختیار کر کے اس کی تائید میں متعلقہ دلائل پیش کئے ہیں۔ (۳)

بہرکیف! استقراء کی وجوہ میں تو اختلاف ہے لیکن اس بات پر امام مالکؒ، علامہ ابن قتیبہؒ، امام ابوالفضل رازیؒ، محقق ابن الجزریؒ اور قاضی باقلانی پانچوں حضرات متفق ہیں کہ حدیث میں سات حروف سے مراد قراءت کے وہ اختلافات ہیں جو سات نوعیتوں میں منحصر ہیں۔

احقر کی ناچیز رائے میں ''سبعۃ احرف'' کی یہ تشریح سب سے زیادہ بہتر ہے، حدیث کا منشاء یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کو مختلف طریقوں سے پڑھا جا سکتا ہے، اور یہ مختلف طریقے اپنی نوعیتوں کے لحاظ سے سات ہیں، ان سات نوعیتوں کی کوئی تعیین چونکہ

(۱) النشر فی القرآت العشر، ص ۲۷ و ۲۸ ج ۱ (۲) فتح الباری ص ۲۴ ج ۹،
(۳) مناهل العرفان فی علوم القرآن ص ۱۵۴ تا ۱۵۶ ج ۱

Marfat.com

کسی حدیث میں موجود نہیں ہے اس لئے یقین کیساتھ تو کسی کے استقراء کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ حدیث میں وہی مراد ہے، لیکن بظاہر امام ابوالفضل رازیؒ کا استقراء زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ وہ موجودہ قراآت کی تمام انواع کو جامع ہے۔

اس قول کی وجوہِ ترجیح

''سبعۃ احرف'' کی تشریح میں جتنے اقوال حدیث تفسیر اور علومِ قرآن کی کتابوں میں بیان ہوئے ہیں، ہمارے نزدیک اُن سب میں یہ قول (کہ سات حروف سے مراد اختلافِ قراءت کی سات نوعیتیں ہیں) سب سے زیادہ راجح، قابل اعتماد اور اطمینان بخش ہے، اور اس کی مندرجہ ذیل وجوہ ہیں:

۱...... اس قول کے مطابق ''حروف'' اور ''قراآت'' کو دو الگ الگ چیزیں قرار دینا نہیں پڑتا، علاّمہ ابن جریرؒ اور امام طحاویؒ کے اقوال میں ایک مشترک الجھن یہ ہے کہ ان میں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت میں دو قسم کے اختلافات تھے، ایک حروف کا اختلاف اور دوسرے قراآت کا اختلاف، حروف کا اختلاف اب ختم ہو گیا، اور قراآت کا اختلاف باقی ہے، حالانکہ احادیث کے اتنے بڑے ذخیرے میں کوئی ایک ضعیف حدیث بھی ایسی نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو کہ ''حروف'' اور ''قراآت'' دو الگ الگ چیزیں ہیں، احادیث میں صرف حروف کے اختلاف کا ذکر ملتا ہے، اور اسی کے لئے کثرت سے ''قراءۃ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اگر ''قراآت'' ان ''حروف'' سے الگ ہوتیں تو کسی نہ کسی حدیث میں اُن کی طرف کوئی اشارہ تو ہونا چاہئے تھا، آخر کیا وجہ ہے کہ ''حروف'' کے اختلاف کی احادیث تو تقریباً تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں، اور ''قراآت'' کے جداگانہ اختلاف کا ذکر کسی ایک حدیث میں بھی نہیں ہے؟ محض اپنے قیاس سے یہ کہہ دینا کیونکر ممکن ہے کہ اختلافِ حروف کے علاوہ قرآن کریم کے الفاظ میں ایک دوسری قسم کا اختلاف بھی تھا؟

مذکورہ بالا قول میں یہ اُلجھن بالکل رفع ہو جاتی ہے، اس لئے کہ اس میں ''حروف'' اور

Marfat.com

''قراآت'' کوایک ہی چیز قرار دیا گیا ہے۔

۲.....علامہ ابن جریرؒ کے قول پر یہ ماننا پڑتا ہے کہ سات حروف میں سے چھ حروف منسوخ یامتروک ہوگئے، اور صرف ایک حرفِ قریش باقی رہ گیا، (موجودہ قراآت اسی حرفِ قریش کی ادائیگی کے اختلافات ہیں) اور اس نظریہ کی قباحتیں ہم آگے تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے، مذکورہ بالا آخری قول میں یہ قباحتیں نہیں ہیں، کیونکہ اس کے مطابق ساتوں حروف آج بھی باقی اور محفوظ ہیں۔

۳.....اس قول کے مطابق ''سات حروف'' کے معنی بلا تکلف صحیح ہوجاتے ہیں جبکہ دوسرے اقوال میں یا ''حروف'' کے معنی میں تاویل کرنی پڑتی ہے یا ''سات'' کے عدد میں۔

۴.....''سبعۃ احرف'' کے باب میں جتنے علماء کے اقوال ہماری نظر سے گذرے ہیں، اُن میں سب سے زیادہ جلیل القدر اور عہدِ رسالتؐ سے قریب تر ہستی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، اور وہ علامہ نیشاپوریؒ کے بیان کے مطابق اسی قول کے قائل ہیں۔

۵.....علامہ ابن قتیبہؒ اور محقق ابن الجزریؒ دونوں علم قراآت کے مسلّم الثبوت امام ہیں، اور دونوں اسی قول کے قائل ہیں، اور مؤخر الذکر کا یہ قول پہلے گذر چکا ہے کہ انہوں نے تیس سال سے زائد اس حدیث پر غور کرنے کے بعد اس قول کو اختیار کیا ہے۔

اس قول پر وارد ہونے والے اعتراضات اور ان کا جواب

اب ایک نظر اُن اعتراضات پر بھی ڈال لیجئے جو اس قول پر وارد ہوسکتے ہیں یا وارد کئے گئے ہیں:

۱.....اس پر ایک اعتراض تو یہ کیا گیا ہے کہ اس قول میں جتنی وجوہِ اختلاف بیان کی گئی ہیں وہ زیادہ تر صرفی اور نحوی تقسیمات پر مبنی ہیں، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت یہ حدیث ارشاد فرمائی اس وقت صرف ونحو کی یہ فنی اصطلاحات اور تقسیمات رائج نہیں ہوئی تھیں، اُس وقت اکثر لوگ لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتے تھے، ایسی صورت میں ان وجوہِ

Marfat.com

اختلاف کو "سبعة احرف" قرار دینا مشکل معلوم ہوتا ہے، حافظ ابن حجرؒ نے یہ اعتراض نقل کر کے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ:

ولا یلزم من ذلك توهين ماذهب اليه ابن قتيبة لاحتمال ان يكون الانحصار المذكور فی ذلك وقع اتفاقاً وانما اطلع عليه بالاستقراء وفی ذلك من الحكمة البالغة مالايخفىٰ ،(۱)

"اس سے ابن قتیبہؒ کے قول کی کمزوری لازم نہیں آتی، اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ مذکورہ انحصار اتفاقاً ہو گیا ہو، اور اس کی اطلاع استقراء کے ذریعہ ہو گئی ہو، اور اس میں جو حکمت بالغہ ہے وہ پوشیدہ نہیں۔"

ہماری ناچیز فہم کے مطابق اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ یہ درست ہے عہد رسالتؐ میں یہ اصطلاحات رائج نہ تھیں، اور شاید یہی وجہ ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "سبعة احرف" کی تشریح اس دور میں نہیں فرمائی، لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ فنی اصطلاحات جن مفاہیم سے عبارت ہیں وہ مفاہیم تو اس دَور میں بھی موجود تھے، اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مفاہیم کے لحاظ سے وجوہِ اختلاف کو سات میں منحصر قرار دیدیا ہو، تو اس میں کیا تعجب ہے؟ ہاں اُس دَور میں اگر سات وجوہِ اختلاف کی تفصیل بیان کی جاتی، تو شاید عامة الناس کی سمجھ سے بالاتر ہوتی، اس لئے آپؐ نے اس کی تفصیل بیان فرمانے کے بجائے صرف اتنا واضح فرما دیا کہ یہ وجوہِ اختلاف کل سات میں منحصر ہیں بعد میں جب یہ اصطلاحات رائج ہو گئیں تو علماء نے استقراء تام کے ذریعہ اِن وجوہِ اختلاف کو اصطلاحی الفاظ سے تعبیر کر دیا، یہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ کسی خاص شخص کے استقراء کے بارے میں یقین کامل سے یہ کہنا تو مشکل ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہی تھی، لیکن جب مختلف لوگوں کا استقراء یہ ثابت کر رہا ہے کہ وجوہِ اختلاف کل سات ہیں، تو اس بات کا قریب قریب یقین ہو جاتا ہے کہ "سبعة احرف" سے آپؐ کی مراد سات وجوہِ اختلاف تھیں، خواہ ان کی تفصیل بعینہ وہ نہ ہو جو

---

(۱) فتح الباری، ص۲۴ ج۹۔

Marfat.com

بعد میں استقراء کے ذریعہ معیّن کی گئی ہے، بالخصوص جبکہ ''سبعۃ احرف'' کی تشریح میں کوئی اور صورت معقولیت کے ساتھ بنتی ہی نہیں ہے۔

سات حروف کے ذریعہ کیا آسانی پیدا ہوئی؟

۲......اس قول پر دوسرا اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ قرآن کریم کو سات حروف پر اس لئے نازل کیا گیا، تاکہ امّت کے لئے تلاوتِ قرآن میں آسانی پیدا کی جائے، یہ آسانی علامہ ابن جریرؒ کے قول پر تو سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ عرب میں مختلف قبائل کے لوگ تھے، اور ایک قبیلے کے لئے دوسرے قبیلے کی لغت پر قرآن پڑھنا مشکل تھا لیکن امام مالکؒ، امام رازیؒ اور ابن الجزریؒ وغیرہ کے اس قول پر تو ساتوں حروف ایک لغتِ قریش ہی سے متعلق ہیں، اس میں یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ جب قرآن کریم ایک ہی لغت پر نازل کرنا تھا تو اس میں قراآت کا اختلاف باقی رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟

اس اعتراض کی بنیاد اس بات پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت قرآن میں سات حروف کی جو سہولت امّت کے لئے مانگی تھی اس میں قبائلِ عرب کا اختلافِ لغت آپؐ کے پیش نظر تھا، حافظ ابن جریر طبریؒ نے اسی بناء پر ''سات حروف'' کو ''سات لغاتِ عرب'' کے معنیٰ پہنائے ہیں، حالانکہ یہ وہ بات ہے جس کی تائید کسی حدیث سے نہیں ہوتی، اس کے برعکس ایک حدیث میں سرکارِ دوعالمؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت ووضاحت کے ساتھ یہ بیان فرمادیا ہے کہ سات حروف کی آسانی طلب کرتے ہوئے آپؐ کے پیش نظر کیا بات تھی؟ امام ترمذیؒ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت اُبی بن کعبؓ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ:

لقی رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلّم جبریل عند احجار المرا فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم لجبریل: انی بُعثتُ اِلٰی اُمَّۃٍ اُمّیّین فیھم الشیخ الفانی والعجوز الکبیرۃ

(۱) بحوالہ النشر فی القراآت العشر، ص۲۰ ج۱

والغلام ، قال فمر هم فليقرء وا القران علیٰ سبعة احرفٍ،(۱)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات مروہ کے پتھروں کے قریب حضرت جبرئیل علیہ السلام سے ہوئی، آپؐ نے حضرت جبرئیل سے فرمایا: میں ایک ان پڑھ اُمت کی طرف بھیجا گیا ہوں جس میں لبِ گور بوڑھے بھی ہیں، سن رسیدہ بوڑھیاں بھی، اور بچے بھی، حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا کہ اُن کو حکم دیجئے کہ وہ قرآن کو سات حروف پر پڑھیں۔"

ترمذیؒ ہی کی دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ آپؐ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا:

اِنِّیْ بُعِثْتُ اِلٰی اُمَّةٍ اُمِّیِّیْنَ مِنْهُمُ الْعُجُوْزُ وَالشَّیْخُ وَالْکَبِیْرُ وَالْغُلَامُ وَالْجَارِیَةُ وَالَّذِیْ لَمْ یَقْرَأْ کِتَابًا قَطُّ،(۱)

"مجھے ایک ان پڑھ اُمت کی طرف بھیجا گیا ہے، جن میں بوڑھیاں بھی ہیں، بوڑھے بھی، سن رسیدہ بھی، لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور ایسے لوگ بھی جنہوں نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی"

اس حدیث کے الفاظ صراحت اور وضاحت کے ساتھ بتلا رہے ہیں کہ اُمت کے لئے سات حروف کی آسانی طلب کرنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر یہ بات تھی کہ آپؐ ایک اُمی اور اَن پڑھ قوم کی طرف مبعوث ہوئے ہیں، جس میں ہر طرح کے افراد ہیں، اگر قرآن کریم کی تلاوت کے لئے صرف ایک ہی طریقہ متعین کر دیا گیا تو اُمت مشکل میں مبتلا ہو جائے گی، اس کے برعکس اگر کئی طریقے رکھے گئے تو یہ ممکن ہوگا کہ کوئی شخص ایک طریقے سے تلاوت پر قادر نہیں ہے تو وہ دوسرے طریقے سے انہی الفاظ کو ادا کر دے، اس طرح اس کی نماز اور تلاوت کی عبادات درست ہو جائیں گی، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بوڑھوں،

(۱) جامع الترمذیؒ، ص ۱۳۸ ج ۲، قرآن محل کراچی

Marfat.com

بوڑھیوں یا اَن پڑھ لوگوں کی زبان پر ایک لفظ ایک طریقہ سے چڑھ جاتا ہے اور اس کے لئے زیر زبر کا معمولی فرق بھی دشوار ہوتا ہے، اس لئے آپؐ نے یہ آسانی طلب فرمائی کہ مثلاً کوئی شخص معروف کا صیغہ ادا نہیں کر سکتا تو اس کی جگہ دوسری قراءت کے مطابق مجہول کا صیغہ ادا کرلے یا کسی کی زبان پر صیغۂ مفرد نہیں چڑھتا تو وہ اسی آیت کو صغیۂ جمع سے پڑھ لے، کسی کے لئے لہجہ کا ایک طریقہ مشکل ہے تو دوسرا اختیار کرلے، اور اس طرح اس کو پورے قرآن میں سات قسم کی آسانیاں مل جائیں گی۔

آپ نے مذکورہ بالا حدیث میں ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سات حروف کی آسانی طلب کرتے وقت یہ نہیں فرمایا کہ میں جس امّت کی طرف بھیجا گیا ہوں وہ مختلف قبائل سے تعلّق رکھتی ہے، اور اُن میں سے ہر ایک کی لغت جُدا ہے، اس لئے قرآن کریم کو مختلف لغات پر پڑھنے کی اجازت دی جائے، اس کے برخلاف آپؐ نے قبائلی اختلافات سے قطع نظر ان کی عمروں کا تفاوت اور اُن کے امی ہونے کی صفت پر زور دیا، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ سات حروف کی آسانی دینے میں بنیادی عامل قبائل کا لغوی اختلاف نہ تھا، بلکہ امّت کی ناخواندگی کے پیش نظر تلاوت میں ایک عام قسم کی سہولت دینا پیش نظر تھا، جس سے اُمت کے تمام افراد فائدہ اٹھا سکیں۔

۳...... اس قول پر تیسرا اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ اختلافِ قراآت کی جو سات نوعیتیں بیان کی گئی ہیں وہ خواہ مالکؒ یا ابوالفضل رازیؒ کی بیان کی ہوئی ہوں یا علّامہ ابن قتیبہؒ، محقق ابن الجزریؒ اور قاضی ابن الطیّبؒ کی، بہرحال! ایک قیاس اور تخمینہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اسی وجہ سے ان حضرات میں سے ہر ایک نے ان سات وجوہِ اختلاف کی تفصیل الگ الگ بیان کی ہے، اُن کے بارے میں یقین کے ساتھ یہ کیونکر باور کرلیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہی تھی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ''سبعۃ احرف'' کی کوئی واضح تشریح کسی حدیث یا کسی صحابی کے قول میں نہیں ملتی، اس لئے اس باب میں جتنے اقوال ہیں، اُن سب میں روایات کو مجموعی طور

پر جمع کر کے کوئی نتیجہ نکالا گیا ہے، اس لحاظ سے یہ قول زیادہ قرینِ صحت معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس پر کوئی بنیادی اعتراض واقع نہیں ہوتا، روایات کو مجموعی طور پر دیکھنے کے بعد ہمیں اس بات کا تو قریب قریب یقین ہو جاتا ہے کہ حدیث میں سات حروف سے مراد اختلافِ قراءت کی سات نوعیتیں ہیں، رہی ان نوعیتوں کی تعیین و تشخیص، سو اس کے بارے میں ہم پہلے بھی یہ عرض کر چکے ہیں کہ اسے معلوم کرنے کا ذریعہ استقراء کے سوا کوئی اور نہیں، امام ابوالفضل رازیؒ کا استقراء ہمیں جامع و مانع ضرور معلوم ہوتا ہے، مگر یقین کے ساتھ ہم کسی کے استقراء کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے، کہ حضورؐ کی مراد یہی تھی، لیکن اس سے یہ اصولی حقیقت مجروح نہیں ہوتی کہ "سبعۃ احرف" سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اختلاف قراءت کی سات نوعیتیں تھیں، جن کی تفصیل کا یقینی علم حاصل کرنے کا نہ ہمارے پاس کوئی راستہ ہے اور نہ اُس کی چنداں ضرورت ہے۔

۴...... اس قول پر چوتھا اعتراض یہ ممکن ہے کہ اس قول میں "حروف سبعہ" سے الفاظ اور ان کی ادائیگی کے طریقوں کا اختلاف مراد لیا گیا ہے، معانی سے اس میں بحث نہیں ہے، حالانکہ ایک روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد سات قسم کے معانی ہیں، امام طحاویؒ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں:

> كان الكتاب الاول ينزل من باب واحد علىٰ حرف واحد
> ونزل القراٰن من سبعة ابواب علىٰ سبعة احرف زاجر
> واٰمر وحلال وحرام ومحكم ومتشابه وامثال، الخ
>
> "پہلے کتاب ایک باب سے ایک حرف پر نازل ہوتی تھی، اور قرآن
> سات ابواب سے سات حروف پر نازل ہوا (وہ سات حروف یہ ہیں)
> زاجر، (کسی بات سے روکنے والا) آمر (کسی چیز کا حکم دینے والا)
> حلال، حرام، محکم (جس کے معنی معلوم ہیں) متشابہ (جس کے یقینی معنی
> معلوم نہیں) اور امثال۔"

اسی بناء پر بعض علماء سے منقول ہے کہ انہوں نے سات حروف کی تفسیر سات قسم کے معانی سے کی ہے،

اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ بالا روایت سند کے اعتبار سے کمزور ہے، امام طحاویؒ اس کی سند پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اسے ابو سلمہؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے، حالانکہ ابوسلمہ کی ملاقات حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نہیں ہوئی (۱)

اس کے علاوہ قدیم زمانہ کے جن بزرگوں سے اس قسم کے اقوال منقول ہیں، ان کی تشریح کرتے ہوئے حافظ ابن جریر طبریؒ نے لکھا ہے کہ ان کا مقصد ''سبعۃ احرف'' والی حدیث کی تشریح کرنا نہیں تھا، بلکہ ''سبعۃ احرف'' کے زیر بحث مسئلہ سے بالکل الگ ہوکر یہ کہنا چاہتے تھے کہ قرآن کریم اس قسم کے مضامین پر مشتمل ہے، (۲)

رہے وہ لوگ جنہوں نے ''سبعۃ احرف'' والی حدیث کی تشریح ہی میں اس قسم کی باتیں کہی ہیں، اُن کا قول بالکل بدیہی البطلان ہے، اس لئے کہ پیچھے جتنی احادیث نقل کی گئی ہیں، اُن کو سرسری نظر ہی سے دیکھ کر ایک معمولی عقل کا انسان بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ حروف کے اختلاف سے مراد معانی اور مضامین کا نہیں، بلکہ الفاظ کا اختلاف ہے چنانچہ محقق علماء میں سے کسی ایک نے بھی اس قول کو اختیار نہیں کیا، بلکہ اس کی تردید کی ہے۔ (۳)

حروف سبعہ اب بھی محفوظ ہیں یا متروک ہوگئے؟

''سات حروف'' کے معنی متعین ہوجانے کے بعد اہم بحث یہ ہے کہ یہ ساتوں حروف آج بھی باقی ہیں یا نہیں؟ اس مسئلہ میں متقدمین سے تین قول منقول ہیں:

۱...... پہلا قول حافظ ابن جریر طبریؒ اور ان کے متبعین کا ہے، پیچھے ہم عرض کرچکے ہیں کہ ان کے نزدیک ''احرف سبعہ'' سے مراد قبائل عرب کی سات لغات ہیں اسی بناء پر وہ یہ فرماتے

---

(۱) مشکل الآثار، ص ۱۸۵ ج ۴، (۲) تفسیر ابن جریر، ص ۱۵ ج ۱

(۳) تفصیلی تردید کے لئے ملاحظہ ہو الاتقان ص ۴۹ ج ا نوع ۱۶، اور النشر فی القراآت العشر لابن الجزریؒ ص ۲۵ ج ۱،

Marfat.com

ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ تک قرآن کریم ان ساتوں حروف پر پڑھا جاتا تھا، لیکن حضرت عثمانؓ کے زمانے میں جب اسلام دور دراز ممالک تک پھیلا تو ان حروفِ سبعہ کی حقیقت نہ جاننے کی وجہ سے لوگوں میں جھگڑے ہونے لگے، مختلف لوگ مختلف حروف پر قرآن کریم کی تلاوت کرتے اور ایک دوسرے کی تلاوت کو غلط ٹھہراتے تھے، اس فتنہ کے انسداد کے لئے حضرت عثمانؓ نے صحابہ کرامؓ کے مشورے سے پوری اُمّت کو صرف ایک حرف یعنی لغتِ قریش کے مطابق سات مصاحف مرتّب فرما کر مختلف صوبوں میں بھیج دیئے اور باقی تمام مصاحف کو نذرِ آتش کرا دیا، تاکہ کوئی اختلاف پیدا نہ ہو سکے، لہٰذا اب صرف لغتِ قریش کا حرف باقی رہ گیا ہے، اور باقی چھ حروف محفوظ نہیں رہے، اور قراءتوں کا جو اختلاف آج تک باقی چلا آتا ہے وہ اسی ایک حرفِ قریش کی ادائیگی کے مختلف طریقے ہیں (۱)

حافظ ابن جریرؒ کا نظریہ اور اُس کی قباحتیں

حافظ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے چونکہ اپنا یہ نظریہ اپنی تفسیر کے مقدمہ میں بڑی تفصیل اور جزم و وثوق کے ساتھ بیان فرمایا ہے، اس لئے یہ قول بہت مشہور ہو گیا اور آجکل حروفِ سبعہ کی تشریح عموماً اسی کے مطابق کی جاتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیشتر محقق علماء (۲) نے اسے اختیار نہیں کیا، بلکہ اس کی سختی کے ساتھ تردید فرمائی ہے، کیونکہ اس قول پر متعدد اُلجھنیں ایسی کھڑی ہو جاتی ہیں جن کا کوئی حل نہیں ہے۔

اس نظریہ پر سب سے پہلا اعتراض تو وہی ہوتا ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ اس میں ''حروف'' اور ''قراآت'' کو دو الگ الگ چیزیں قرار دیا گیا ہے، حالانکہ یہ بات کسی حدیث سے ثابت نہیں۔

دوسرا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ حافظ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ ایک طرف تو یہ تسلیم فرماتے ہیں کہ ساتوں حروف منزل من اللہ تھے، دوسری طرف یہ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ

---

(۱) تفسیر ابن جریرؒ ص ۱۵ ج ۱

(۲) ان علماء کے اسماء گرامی آگے آرہے ہیں،

Marfat.com

عنہ نے صحابہؓ کے مشورے سے، چھ حروف کی تلاوت کو ختم فرمادیا حالانکہ اس بات کو باور کرنا بہت مشکل ہے کہ صحابہ کرامؓ اُن حروف کو یکسر ختم کرنے پر متفق ہو گئے ہوں جو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی فرمائش پر اُمت کی آسانی کے لئے نازل فرمائے تھے، صحابہ کرامؓ کا اجماع بیشک دین میں حجت ہے، لیکن صحابہ کرامؓ سے یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ جس چیز کا قرآن ہونا تواتر کیساتھ ثابت ہوا سے وہ صفحۂ ہستی سے مٹا دینے پر متفق ہو جائیں۔

حافظ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ دراصل امّت کو قرآن کریم کی حفاظت کا حکم ہوا تھا اور اسے ساتھ ہی یہ اختیار بھی دیدیا تھا کہ وہ سات حروف میں سے جس حرف کو چاہے اختیار کرلے، چنانچہ امّت نے اس اختیار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک اجتماعی مصلحت کی خاطر چھ حروف کی تلاوت چھوڑ دی، اور ایک حرف کی حفاظت پر متفق ہوگئی، اس اقدام کا منشاء نہ اُن حروف کو منسوخ قرار دینا تھا اور نہ اُن کی تلاوت کو حرام قرار دینا تھا، بلکہ اپنے لئے اجتماعی طور پر ایک حرف کا انتخاب تھا۔

لیکن یہ جواب بھی اس لئے کمزور معلوم ہوتا ہے کہ اگر صورت یہی تھی تو کیا یہ مناسب نہ تھا کہ اُمت اپنے عمل کے لئے خواہ ایک حرف کو اختیار کرلیتی، باقی چھ حروف کا وجود سرے سے ختم کرنے کے بجائے اُسے کم از کم کسی ایک جگہ محفوظ رکھتی، تاکہ اُن کا وجود ختم نہ ہو، قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾

”حقیقت یہ ہے کہ یہ ذکر (یعنی قرآن) ہم نے ہی اُتارا ہے، اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔“

جب ساتوں حروفِ قرآن تھے تو اس آیت کا صاف تقاضا یہ ہے کہ وہ ساتوں حروف قیامت تک محفوظ رہیں گے، اور کوئی شخص ان کی تلاوت چھوڑنا بھی چاہے تو وہ ختم نہیں ہوسکیں گے، حافظ ابن جریر طبریؒ نے اس کی نظیر میں یہ مسئلہ پیش کیا ہے کہ قرآن کریم نے جھوٹی قسم کھانے کے کفارے میں انسانوں کو تین باتوں کا اختیار دیا ہے، یا تو وہ ایک غلام آزاد کرے

Marfat.com

یادس مسکینوں کو کھانا کھلائے، یادس مسکینوں کو کپڑا دے، اب اگر اُمت باقی صورتوں کو ناجائز قرار دیئے بغیر اپنے عمل کے لئے ان میں سے کوئی ایک صورت اختیار کرلے تو یہ اُس کے لئے جائز ہے، اسی طرح قرآن کے سات حروف میں سے اُمت نے ایک حرف کو اجتماعی طور پر اختیار کرلیا، لیکن یہ مثال اس لئے درست نہیں کہ اگر اُمت کفارہ یمین کی تین صورتوں میں سے ایک صورت اس طرح اختیار کرلے کہ باقی صورتوں کو ناجائز تو نہ کہے لیکن عملاً ان کا وجود بالکل ختم ہوکر رہ جائے، اور لوگوں کو صرف اتنا معلوم رہ جائے کہ کفارۂ یمین کی دو صورتیں اور تھیں جن پر اُمت نے عمل ترک کردیا، لیکن وہ صورتیں کیا تھیں؟ اُن کا جاننے والا بھی کوئی باقی نہ رہے، تو یقیناً اُمت کے لئے ایسے اقدام کی گنجائش نہیں ہے۔

پھر سوال یہ ہے کہ باقی چھ حروف کو ترک کرنے کی ضرورت کیا پیش آئی تھی؟ حافظ ابن جریرؒ نے فرمایا کہ مسلمانوں میں ان حروف کے اختلاف کی وجہ سے شدید جھگڑے ہورہے تھے، اس لئے حضرت عثمانؓ نے صحابہؓ کے مشورہ سے یہ مناسب سمجھا کہ ان سب کو ایک حرف پر متحد کردیا جائے، لیکن یہ بھی ایسی بات ہے جسے باور کرنا بہت مشکل ہے حروف کے اختلاف کی بناء پر مسلمانوں کا اختلاف تو خود سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی پیش آیا تھا، احادیث میں ایسے متعدد واقعات مروی ہیں کہ ایک صحابی نے دوسرے صحابی کو مختلف طریقے سے قرآن کریم کی تلاوت کرتے سنا تو باہمی اختلاف کی نوبت آگئی، یہاں تک کہ صحیح بخاریؒ کی روایت کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو حضرت ہشام بن حکیم بن حزامؓ کے گلے میں چادر ڈال کر انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے تھے، اور حضرت اُبی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ حروف کا یہ اختلاف سُنکر میرے دل میں زبردست شکوک پیدا ہونے لگے تھے، لیکن اس قسم کے واقعات کی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حروفِ سبعہ کو ختم کرنے کے بجائے انہیں حروف کی رخصت سے آگاہ فرمایا، اور اس طرح کوئی فتنہ پیدا نہیں ہوسکا، صحابہ کرامؓ سے یہ بعید ہے کہ انہوں نے اس اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کے بجائے چھ حروف ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا ہو۔

پھر عجیب بات ہے کہ علّامہ ابن جریرؒ کے قول کے مطابق صحابہؓ نے چھ حروف تو اختلاف کے ڈر سے ختم فرمادیئے، اور قراءتیں (جو اُن کے قول میں حروف سے الگ ہیں) جُوں کی توں باقی رکھیں، چنانچہ وہ آج تک محفوظ چلی آتی ہیں، سوال یہ ہے کہ افتراق واختلاف کا جو اندیشہ مختلف حروف پر قرآن کی تلاوت جاری رکھنے میں تھا کیا وہی اندیشہ قراآت کے اختلاف میں نہیں تھا؟ جبکہ ان قراءتوں کی روشنی میں بعض مرتبہ ایک ایک لفظ بیس بیس مختلف طریقوں سے پڑھا جاتا ہے،؟ اگر چھ حروف ختم کرنے کا منشاء یہی تھا کہ مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو اور وہ سب ایک طریقہ سے قرآن کی تلاوت کیا کریں تو قراءتوں کے اختلاف کو آخر کیوں ختم نہیں کیا گیا؟ جب قراآت کے اختلاف کو باوجود مسلمانوں کے انتشار کو روکا جاسکتا تھا اور مسلمانوں کو یہ سمجھایا جاسکتا تھا کہ ان تمام طریقوں سے تلاوت جائز ہے تو یہی تعلیم حروفِ سبعہ کے باب میں فتنہ کا سبب کیوں سمجھ لی گئی؟ حقیقت یہ ہے کہ حافظ ابن جریرؒ کے قول پر ''حروف سبعہ'' اور ''قراآت'' کے بارے میں صحابہ کرامؓ کی طرف ایسی حیرت انگیز دو عملی منسوب کرنی پڑتی ہے، جس کی کوئی معقول توجیہہ سمجھ میں نہیں آتی۔

پھر حضرت عثمانؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ کی طرف اتنے بڑے اقدام کی نسبت کسی صریح اور صحیح روایت کی بناء پر نہیں بلکہ بعض مجمل الفاظ کی قیاسی تشریح کے ذریعہ کی گئی ہے، جن روایات میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جمع قرآن کا واقعہ بیان ہوا ہے اس میں اس بات کی کوئی صراحت نہیں ہے کہ انہوں نے چھ حروف کو ختم فرمادیا تھا بلکہ اس کے خلاف دلیلیں موجود ہیں جن کی تفصیل آگے آرہی ہے، اب کسی صحیح اور صریح روایت کے بغیر یہ کہنا کیسے ممکن ہے کہ صحابہ کرامؓ نے اُن چھ حروف کو بالکل بے نشان کردینا گوارا کرلیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بار بار فرمائش پر بذریعہ وحی نازل ہوئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جن صحابہ کرامؓ کو جمع وترتیبِ قرآن کے نیک کام میں محض اس لئے تأمل رہا ہو کہ یہ کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، جنہوں نے قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کو محفوظ رکھنے میں اپنی عمریں کھپائی ہوں، اور جنہوں نے منسوخ التلاوۃ آیات تک کو

Marfat.com

محفوظ کر کے اُمّت تک پہنچایا ہو، اُن سے یہ بات بے انتہا بعید ہے کہ وہ سب کے سب چھ حروف کو ختم کرنے پر اس طرح متفق ہو جائیں کہ آج اُن حروف کا کوئی نام ونشان تک باقی نہ رہے، جن آیات کی تلاوت منسوخ ہو چکی تھی صحابہ کرامؓ نے انہیں بھی کم از کم تاریخی حیثیت میں باقی رکھ کر ہم تک پہنچایا ہے، لیکن کیا وجہ ہے کہ وہ ''حروف'' جن کے بارے میں حافظ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ بھی تسلیم فرماتے ہیں کہ وہ منسوخ نہیں ہوئے، بلکہ محض مصلحۃً اُن کی قراءت وکتابت ختم کردی گئی، اُن کی کوئی ایک مثال کسی ضعیف روایت میں بھی محفوظ نہ رہ سکی۔

یہی وجہ ہے کہ بیشتر محقق علماء نے حافظ ابن جریر طبریؒ کے اس قول کی تردید فرمائی ہے، جن کے اقوال کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

امام طحاویؒ کا قول

۲..... دوسرا مسلک امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار فرمایا ہے پیچھے گذر چکا ہے کہ اُن کے نزدیک قرآن کریم نازل تو صرف ایک لغتِ قریش پر ہوا تھا، لیکن امّت کی آسانی کے خیال سے یہ اجازت دیدی گئی تھی کہ وہ قرآن کی تلاوت میں سات کی حد تک دوسرے مرادفات استعمال کرسکتے ہیں، اور یہ مرادفات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرمادیئے تھے، اسی اجازت کو حدیث میں قرآن کریم کے ''سات حروف'' پر نازل ہونے سے تعبیر کیا گیا ہے، لیکن یہ اجازت ابتداء اسلام میں تھی، بعد میں جب لوگ قرآنی لغت کے عادی ہو گئے تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ اجازت منسوخ ہوگئی، اور جب آپ نے اپنی وفات سے پہلے رمضان میں حضرت جبرئیلؑ سے قرآن کریم کا آخری دور کیا تو اس وقت یہ مرادفات منسوخ کردیئے گئے، اور اب صرف وہی حرف باقی ہے جس پر قرآن کریم نازل ہوا تھا، یعنی حرفِ قریش، باقی چھ مرادفات منسوخ ہو چکے۔

یہ قول حافظ ابن جریرؒ کے قول کے مقابلہ میں اس لحاظ سے بہتر ہے کہ اس میں صحابہؓ کی طرف یہ بات منسوب نہیں کی گئی کہ چھ حروف انہوں نے ترک کیے، بلکہ نسخ کی نسبت خود عہدِ

Marfat.com

رسالت کی طرف کی گئی ہے، لیکن اُس پر ایک اشکال تو یہ ہوتا ہے کہ اس قول کے مطابق چھ حروف منزل من اللہ نہیں تھے، حالانکہ حضرت عمرؓ اور حضرت ہشامؓ کے درمیان جو اختلاف پیش آیا اس میں حضرت ہشامؓ نے حضورؐ کے سامنے سورۂ فرقان اپنے طریقہ سے تلاوت فرمائی، تو اُسے سنکر آپ نے فرمایا، هٰكَذَا اُنْزِلَتْ (یہ سورت اسی طرح نازل ہوئی ہے) اور پھر حضرت عمرؓ نے اپنے طریقہ سے تلاوت فرمائی، اُسے سنکر بھی آپؐ نے فرمایا هٰكَذَا اُنْزِلَتْ (۱) (یہ سورت اسی طرح نازل ہوئی ہے) ان الفاظ کا کھلا ہوا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طریقے منزل من اللہ تھے۔

دوسرے جیسا کہ پیچھے عرض کیا گیا اس قول میں بھی قراآت کی حیثیت واضح نہیں ہوتی کہ وہ سات حروف میں داخل تھیں یا نہیں، اگر داخل تھیں تو چھ حروف کی طرح اُن کے بارے میں بھی یہ کہنا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) وہ منزل من اللہ نہیں ہیں، حالانکہ یہ اجماع کے خلاف ہے، اور اگر داخل نہیں تھیں تو ان کے علیحدہ وجود پر کوئی دلیل نہیں، اس لئے اس قول پر بھی شرحِ صدر نہیں ہوتا۔

سب سے بہتر قول

تیسرا قول جو سب سے زیادہ اطمینان بخش اور بے غبار ہے وہ یہی ہے کہ سات احرف سے مراد چونکہ اختلافِ قراءت ہی کی سات مختلف نوعیتیں ہیں جن کا ذکر پیچھے آچکا ہے، اس لئے یہ ساتوں حروف آج بھی پوری طرح محفوظ ہیں اور باقی ہیں، اور ان کی تلاوت کی جاتی ہے، البتہ اتنا فرق ضرور ہوا ہے کہ ابتدائے اسلام میں قراءتوں کے اختلافات کی تعداد بہت زیادہ تھی، اور ان میں مرادف الفاظ کے اختلاف کی کثرت تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ لغتِ قرآن کے پوری طرح عادی نہیں ہوئے انہیں زیادہ سے زیادہ سہولت دی جائے، بعد میں جب اہلِ عرب لغتِ قرآن کے عادی ہوگئے تو مرادفات وغیرہ کے بہت سے اختلافات

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الخصومات مع عمدة القاری ص ۲۵۸ ج ۱۲، میمنیہ مصر۔

Marfat.com

ختم کردیئے گئے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے جو آخری دَور کیا، (اور جسے اصطلاح میں عرضۂ اخیرہ کہا جاتا ہے) اُس وقت بہت سی قراءتیں منسوخ کردی گئیں، جس کی دلیل آگے آرہی ہے، لیکن جتنی قراءتیں اُس وقت باقی رہ گئیں وہ ساری کی ساری آج تواتر کے ساتھ چلی آتی ہیں، اوران کی تلاوت ہوتی ہے۔

''احرف سبعہ'' کی پیچیدہ بحث میں یہ وہ بے غبار راستہ ہے جس پر تمام روایاتِ حدیث بھی اپنی اپنی جگہ صحیح بیٹھ جاتی ہیں، اور نہ اُن میں کوئی تعارض یا اختلاف باقی رہتا ہے، اور نہ کوئی اور معقول اشکال پیش آتا ہے، اس سلسلے میں ممکنہ شبہات کا جواب ہم آگے تفصیل کے ساتھ دیں گے، جس سے اُس قول کی حقانیت اچھی طرح واضح ہوسکے گی، لیکن پہلے یہ سُن لیجئے کہ اِس قول کے قائل کون حضرات ہیں؟ یہاں ہم اُن حضرات کے اسمائے گرامی اور حوالے پیش کرتے ہیں، جنہوں نے اس قول کو اختیار کیا ہے یا حافظ ابن جریر طبریؒ کی تردید کی ہے۔

اس قول کے قائلین

حافظ ابوالخیر محمد بن الجزریؒ (متوفی ۸۳۳ھ) جو قراآت کے امام اعظم مشہور ہیں، اور حدیث وفقہ میں حافظ ابن کثیرؒ کے شاگرد اور حافظ ابن حجرؒ کے استاد ہیں، اپنی مشہور کتاب ''النشر فی القراآت العشر'' میں تحریر فرماتے ہیں:

" امّا کون المصاحف العثمانیة مشتملة علیٰ جمیع الاحرف السبعة فانّ ھٰذہ مسئلة کبیرة اختلف العلماء فیھا فذھب جماعات من الفقھاء والقراء والمتکلمین الیٰ انّ المصاحف العثمانیة مشتملة علیٰ جمیع الاحرف السبعة وبنوا ذٰلك علیٰ انّه لایجوز علی الامة ان تھمل نقل شیء من الحروف السبعة التی نزل القراٰن بھا وقد اجمع

Marfat.com

الصّحابة علیٰ نقل المصاحف العثمانية من الصّحف التی کتبها ابوبکرؓ وعمرؓ وارسال کل مصحف منها الیٰ مصر من امصار المسلمين واجمعو اعلیٰ ترک ماسویٰ ذٰلك ، قال هٰؤلاء ولایجوز ان اینهیٰ عن القراءة ببعض الاحرف السبعة ولا ان یجمعوا علیٰ ترک شیءٍ من القراٰن ، وذهب جماهير العلماء من السلف والخلف وائمة المسلمين الیٰ انّ هذه المصاحف العثمانية مشتملة علیٰ ما یحتمله رسمها فقط جامعة للعرضة الاخيرة التی عرضها النبی صلی الله علیه وسلم علیٰ جبرئیل علیه السلام متضمنة لها لم تترک حرفاً منها ، قلت وهذا القول هو الذی یظهر صوابه لانّ الاحادیث الصّحیحة والاحاد المشهورة المستفيضة تدلّ علیه تشهدله۔"

''رہا یہ مسئلہ کہ حضرت عثمانؓ نے جو مصاحف تیار فرمائے تھے وہ ساتوں حروف پر مشتمل ہیں یا نہیں؟ سو یہ ایک بڑا مسئلہ ہے جس میں علماء کا اختلاف ہے، چنانچہ فقہاءِ قرّاء اور متکلمین کی جماعتوں کا مذہب یہ ہے کہ عثمانی مصاحف ساتوں حروف پر مشتمل ہیں، اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اُمت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ ان سات حروف میں سے کسی حرف کو نقل کرنا ترک کردے جن پر قرآن نازل ہوا، اور صحابہؓ نے اجماعی طور پر یہ عثمانی مصاحف اُن صحیفوں سے نقل کئے تھے جو حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ نے لکھے تھے، اور اُن میں ہر ایک مصحف عالمِ اسلام کے مختلف شہروں میں بھیج دیا تھا، اور اُن کے ماسوا جتنے صحیفے تھے اُن کو چھوڑنے پر متفق ہو گئے تھے، ان حضرات کا کہنا ہے کہ نہ یہ

Marfat.com

بات جائز ہے کہ حروفِ سبعہ میں سے کسی حرف کی قراءت روک دی جائے، اور نہ یہ کہ صحابہؓ قرآن کے کسی حصہ کے چھوڑنے پر متفق ہوجائیں، اور سلف وخلف کے علماء کی اکثریت کا قول یہی ہے، کہ یہ عثمانی مصاحف اُن حروف پر مشتمل ہیں جو اُن کے رسم الخط میں سماگئے، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے قرآن کریم کا جو آخری دور کیا تھا، اُس کے تمام حروف ان مصاحف میں جمع ہیں، اُن میں سے کوئی حرف ان مصاحف میں نہیں چھوٹا، میرا خیال یہ ہے کہ یہی وہ قول ہے جس کی صحت ظاہر ہے، کیونکہ صحیح احادیث اور مشہور آثار اسی پر دلالت کرتے ہیں اور اسی کی شہادت دیتے ہیں۔" (۱)

اور علامہ بدرالدین عینیؒ نقل فرماتے ہیں:

"واختلف الاصولیون هل یقرأ الیوم علیٰ سبعة أحرف فمنعه الطبریؒ وغیره وقال انما یجوز بحرف واحد الیوم وهو حرف زیدؓ ونحیٰ الیه القاضی ابوبکرؒ، وقال ابو الحسن الاشعریؒ اجمع المسلمون علیٰ انّه لایجوز حظر ماوسعه اللّٰه تعالیٰ من القراءة بالاحرف التی انزلها اللّٰه تعالیٰ ولا یسوغ للامّة ان تمنع مایطلقه اللّٰه تعالیٰ، بل هی موجودة فی قراءتنا مفرّقة فی القرآن غیر معلومة فیجوز علیٰ هذا، وبه قال القاضی ان یقرأ بکل مانقله اهل التّواتر من غیر تمییز حرف من حرف فیحفظ حرف نافع بحرف الکسائی وحمزة ولا حرج فی ذٰلک" (۲)

(۱) ابن الجزریؒ: النشر فی القرآت العشر، ص۳۱ ج۱،

(۲) عمدة القاری، کتاب الخصومات، ص۲۵۸ ج۱۲،

''اوراس بارے میں اصولی علماء کا اختلاف ہے، کہ قرآن کریم کو آج سات حروف پر پڑھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ علامہ (ابن جریر) طبریؒ وغیرہ نے اس سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ آج قرآن کی قراءت ایک ہی حرف پر جائز ہے، اور وہ حضرت زید بن ثابتؓ کا حرف ہے، اور قاضی ابوبکرؒ بھی اسی طرف مائل ہیں، لیکن امام ابوالحسن اشعریؒ فرماتے ہیں کہ اس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حروف نازل کر کے اُمت کو سہولت عطا فرمائی تھی اسے روکنا کسی کے لئے جائز نہیں اور امت اس بات کی مجاز نہیں ہے کہ جس چیز کی اجازت اللہ نے دی ہو اُسے روک دے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ساتوں حروف ہماری موجودہ قراءت میں موجود ہیں، اور قرآن کریم میں متفرق طور سے شامل ہیں، البتہ معیّن طور سے معلوم نہیں، اس لحاظ سے اُن کی قراءت آج بھی جائز ہے، اور یہی قول قاضی (۱) صاحب کا ہے، جتنے حروف تواتر کے ساتھ منقول ہیں اُن سب کو پڑھنا جائز ہے، اور ایک حرف کو دوسرے حرف سے ممتاز کرنے کی بھی ضرورت نہیں، چنانچہ نافعؒ کی قراءت کو کسائیؒ اور حمزہؒ کی قراءت کے ساتھ (مخلوط کر کے) یاد کر لیا جائے تو اس میں کچھ حرج نہیں ہے۔'' (۲)

اور علاّمہ بدرالدین زرکشیؒ قاضی ابوبکرؒ کا قول نقل کرتے ہیں:

والسابع اختاره القاضی ابوبکر، وقال : الصحیح انّ ھذه الاحرف السبعة ظهرت واستفاضت عن رسول الله صلی الله علیه وسلم وضبطها عنه الائمة واثبتها عثمانُ

(۱) غالباً قاضی عیاضؒ مراد ہیں،

(۲) اس مسئلہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو النشر فی القراآت العشر، ص ۱۸ و ۱۹ ج ۱،

والصحابةؓ فی المصحف "(۱)

"ساتواں قول قاضی ابوبکرؒ (۲) نے اختیار کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ ساتوں حروف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شہرت کے ساتھ منقول ہیں، ائمہ نے انہیں محفوظ رکھا ہے، اور حضرت عثمانؓ اور صحابہؓ نے انہیں مصحف میں باقی رکھا ہے"

اور علاّمہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حافظ ابن جریرؒ کے قول کی بڑے سخت الفاظ میں تردید کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ چھ حروف کو ختم کرنے کا قول بالکل غلط ہے، اور اگر حضرت عثمانؓ ایسا کرنا بھی چاہتے تو نہ کرسکتے، کیونکہ عالمِ اسلام کا چپّہ چپّہ ان حروف سبعہ کے حافظوں سے بھرا ہوا تھا، وہ لکھتے ہیں:

" واما قول من قال ابطل الاحرف الستة فقد كذب من قال ذٰلك ولو فعل عثمانؓ ذلك او اراده لخرج عن الاسلام ولما مطل ساعة بل الاحرف السبعة كلها موجودة عندنا قائمة كما كانت مثبوتة فی القرا ءات المشهورة المأثورة "(۳)

"رہا یہ قول کہ حضرت عثمانؓ نے چھ حروف کو منسوخ کردیا تو جس نے یہ بات کہی ہے اس نے بالکل غلط کہا ہے، اگر حضرت عثمانؓ ایسا کرتے یا اس کا ارادہ کرتے تو ایک ساعت کے توقف کے بغیر اسلام سے خارج ہوجاتے، (۴) بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ساتوں کے ساتوں حروف

---

(۱) البرهان فی علوم القرآن، ص ۲۲۳ ج ۱

(۲) غالباً قاضی ابوبکر باقلانیؒ مراد ہیں، کیونکہ یہی عبارت علامہ نوویؒ نے قاضی باقلانیؒ کے نام سے روایت کی ہے، (نووی شرح مسلم، ص ۲۷۲ ج ۱)

(۳) ابن حزمؒ، نفصل فی الملل والاهواء والنحل، ص ۷۷ و ۷۸ ج ۲ مکتبہ المثنی بغداد،

(۴) علامہ ابن حزمؒ کا یہ قول اس صورت میں ہے جبکہ یوں کہا جائے کہ حضرت عثمانؓ نے (معاذاللہ) چھ حروف کو منسوخ کردیا، لیکن واضح رہے کہ حافظ ابن جریرؒ کے قول کے مطابق انہوں نے چھ حروف کو منسوخ نہیں کیا بلکہ انکی قراءت ترک فرمائی تھی، اس لئے اگرچہ حافظ ابن جریر طبریؒ کا قول درست نہ ہو لیکن وہ اتنے سخت الفاظ کے...... مستحق نہیں ہیں،

Marfat.com

ہمارے پاس بعینہ موجود اور مشہور اور قراءتوں میں محفوظ ہیں۔"

اور مشہور شارح موطاء علامہ ابو الولید باجی مالکی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۴۹۴ھ) "سبعۃ احرف" کی تشریح سات وجوہِ قراءت سے کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

فان قيل هل تقولون ان جميع هذه السبعة الاحرف ثابتة في المصحف فانّ القراءة بجميعها جائزة قيل لهم كذلك نقول، والدليل علىٰ صحّة ذٰلك قوله عزوجل اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ، ولايصح انفصال الذكر المنزل من قراءته فيمكن حفظه دونها ومما يدل علىٰ صحّة ماذهبنا اليه انّ ظاهر قول النبي صلى الله عليه وسلم يدل علىٰ ان القراٰن انزل علىٰ سبعة احرف تيسراً علىٰ من اراد قراءته ليقرأ كلّ رجل منهم بما تيسر عليه وبما هو اخف علىٰ طبعه واقرب الىٰ لغته لما يلحق من المشقة بذٰلك المالوف من العادة في النطق ونحن اليوم مع عجمة السنتنا وبعدنا عن فصاحة العرب احوج" (۱)

"اگر یہ پوچھا جائے کہ کیا آپ کا قول یہ ہے کہ یہ ساتوں حروف مصحف میں (آج بھی) موجود ہیں، اس لئے کہ ان سب کی قراءت (آپ کے نزدیک) جائز ہے، تو ہم یہ کہیں گے کہ جی ہاں، ہمارا قول یہی ہے، اور اس کی صحت کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ (ہم نے ہی قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) اور قرآن کریم کو اس کی قراءت سے الگ نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن تو محفوظ رہے اور اس کی

---

(۱) ابو الولید الباجیؒ: المنتقیٰ شرح المؤطا، ص ۳۴۷ ج ۱ مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۳۱ھ

Marfat.com

قراآت ختم ہو جائیں اور ہمارے قول کی صحت پر ایک دلیل یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کھلے طور پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن کو سات حروف پر اس لئے نازل کیا گیا تا کہ اس کی قراءت کرنے والے کو آسانی ہو تا کہ ہر شخص اس طریقہ سے تلاوت کر سکے جو اس کے لئے آسان ہو اس کی طبیعت کے لحاظ سے زیادہ سہل اور اس کی لغت سے زیادہ قریب ہو، کیونکہ گفتگو میں جو عادت پڑ جاتی ہے اُسے ترک کرنے میں مشقت ہوتی ہے، اور آج ہم لوگ اپنی زبان کی عجمیت اور عربی فصاحت سے دور ہونے کی بناء پر اس سہولت کے زیادہ محتاج ہیں۔''

اور حضرت امام غزالیؒ اصولِ فقہ پر اپنی مشہور کتاب ''المستصفیٰ'' میں قرآن کریم کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں:

''مانقل الینا بین دفتی المصحف علی الاحرف السبعة المشهورة نقلاً متواتراً''(۱)

''وہ کلام جو مصحف کی دو دفتیوں میں مشہور سات حروف کے مطابق متواتر طریقہ پر ہم تک پہنچا ہے''

اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام غزالیؒ بھی حروف سبعہ کے آج تک باقی رہنے کے قائل ہیں، اور ملا علی قاریؒ (متوفی ۱۰۱۴ھ) تحریر فرماتے ہیں:

''وکأنّهٗ علیه الصَّلٰوة والسّلام کشف له ان القراءة المتواترة تستقر فی امته علیٰ سبع وهی الموجودة الاٰن المتفق علیٰ تواترها والجمهور علیٰ انّ مافوقها شاذّ

(۱) المستصفیٰ، ص ۶۵ ج ۱، المکتبة التجاریه الکبریٰ، مصر ۱۳۵۶ھ

لایحملّ القراء ۃ بہ" (۱)

"اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ منکشف ہو گیا تھا، کہ متواتر قراءتیں آپ کی اُمت میں آخر کار سات رہ جائیں گی، چنانچہ وہی آج موجود ہیں اور اُن کے تواتر پر اتفاق ہے، اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ اس کے علاوہ جو قراءتیں ہیں وہ شاذ ہیں اور اُن کی تلاوت جائز نہیں۔"

اس میں ملاّ علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمانا تو درست نہیں ہے کہ سات قراءتوں کے ماسوا جتنی قراءتیں ہیں وہ سب شاذ ہیں، کیونکہ علماءِ قراءت نے اس کی سخت تردید کی ہے، (۲) لیکن اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک احرفِ سبعہ آج بھی باقی ہیں، اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلویؒ کا قول پیچھے گذر چکا ہے، کہ وہ "سبعۃ احرف" میں سات کے عدد کو کثرت کے معنی پر محمول کرتے ہیں، اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"ودلیل بر آنکہ ذکر سبعہ بجہتِ تکثیر است نہ برائے تحدید اتفاق ائمہ است بر قراآت عشر وہر قراءتے را از یں عشرہ دو راوی ست وہر یکے با دیگرے مختلف ست پس مرتقی شد عدد قراءۃ تا بیست" (۳)

"اور اس بات کی دلیل کہ سات کا عدد حدیث میں تکثیر کے لئے ہے نہ کہ تحدید کے لئے دس قراءتوں پر ائمہ کا اتفاق ہے، اور اُن دس قراءتوں میں سے ہر ایک کے دو راوی ہیں، اور ہر ایک دوسرے سے مختلف ہے، پس قراآت کی تعداد بیس تک پہنچ گئی ہے۔"

اس عبارت میں اگرچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لفظ

---

(۱) مرقاۃ المفاتیح ص ۱۶ ج ۵، مکتبہ امدادیہ ملتان، ۱۳۸۷ھ

(۲) ملاحظہ ہو النشر فی القراآت العشر، ص ۳۳ و ما بعد، ج ۱،

(۳) المصفّٰی ص ۱۸۷، مطبوعہ فاروقی دہلی،

Marfat.com

''سبعۃ'' کو جمہور کے خلاف تکثیر کیلئے قرار دیا ہے، (کیونکہ شاید بیس قراءتوں کو سات وجوہِ اختلاف میں منحصر قرار دینا ان پر واضح نہیں ہو سکا) لیکن اس سے یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جن حروف کا ذکر حدیث میں کیا گیا ہے وہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قراءتیں ہی ہیں، اور وہ منسوخ یا متروک نہیں ہوئے، بلکہ آج بھی باقی ہیں،

آخری دَور میں دینی علوم کے امام، محققِ عصر، اور حافظِ حدیث حضرت علّامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی تحقیق کرتے ہوئے مسئلہ کی حقیقت مختصر الفاظ میں اس طرح واضح فرمادی ہے کہ اُسے حرفِ آخر کہنا چاہئے، یہاں ہم اُن کی پوری تحقیق نقل کرتے ہیں:

> واعلم انهم اتفقوا علىٰ انه ليس المراد من سبعة احرف القراءة السبعة المشهورة، بان يكون كل حرف منها قراءة من تلك القراءات، اعنى انه لا انطباق بين القراآت السبع والاحرف السبعة كمايذهب اليه الوهم بالنظر الىٰ لفظ السبعة فى الموضعين، بل بين تلك الاحرف والقراءة عموم وخصوص وجهىّ، كيف، وانّ القراءات لاتنحصر فى السبعة، كما صرّح ابن الجزرىؒ فى رسالة النشر فى قراءة العشر، وانما اشتهرت السبعة على الالسنة لانها التى جمعها الشاطبىؒ ثم اعلم ان بعضهم فهم ان بين تلك الاحرف تغاير امن كل وجه، بحيث لاربط بينها وليس كذلك، بل قد يكون الفرق بالمجرد والمزيد واخرىٰ بالابواب، ومرّة باعتبار الصّيغ من الغائب والحاضر، وطور ابتحقيق الهمزة وتسهيلها، فكلّ هٰذه التغييرات يسيرة او كانت او كثيرة حرف برأسه، وغلط من

Marfat.com

فهم انّ هذه الاحرف متغايرة كلها بحيث يتعذر اجتماعها اما انه كيف عدد السبعة فتوجّه اليه ابن الجزريّ وحقق ان التصرفات كلها ترجع الى السبعة وراجع القسطلانى والزرقانيّ، بقى الكلام فى انّ تلك الاحرف كلها موجودة او رفع بعضها وبقى البعض فاعلم ان ما قرأه جبرئيل عليه السلام فى العرضة الاخيرة على النبى صلى الله عليه وسلم كلّه ثابت فى مصحف عثمانؓ، ولمّا يتعيّن معنى الاحرف عند ابن جرير ذهب الىٰ رفع الاحرف السّت منها وبقى واحدفقط"(۱)

"یہ ذہن نشین کرلیجئے کہ تمام علماء اس بات پر تو متفق ہیں کہ سات حروف سے مراد مشہور سات قراءتیں نہیں، اور یہ بات نہیں ہے کہ ہر حرف ان سات قراءتوں میں سے ایک قراءت ہو، مطلب یہ ہے کہ سات قراءتیں اور سات حروف ایک چیز نہیں جیسے کہ سات کے لفظ سے پہلی نظر میں وہم ہوتا ہے، بلکہ ان حروف اور سات قراءتوں میں عموم وخصوص من وجہ (۲) کی نسبت ہے، اور یہ دونوں ایک کیسے ہوسکتے ہیں جبکہ قراءتیں سات میں منحصر نہیں، جیسا کہ علامہ ابن الجزریؒ نے النشر فی قراءۃ العشر میں تصریح کی ہے، البتہ سات قراءتوں کا لفظ

(۱) فیض الباری، ص۳۲۱،۳۲۲ ج ۳،

(۲) مطلب یہ ہے کہ سات قراءتوں میں سے بعض قراءتیں احرفِ سبعہ میں سے ہیں، جیسے کہ تمام متواتر قراآت، اور بعض قراءتیں ایسی ہیں جو احرفِ سبعہ میں داخل نہیں،، مثلاً قراءِ سبعہ کی شاذ قراءتیں، یا وہ قراءتیں جن میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اور احرفِ سبعہ کے بعض اختلافات ایسے ہیں جو قراآت سبعہ میں شامل نہیں، مثلاً امام یعقوبؒ، امام ابو جعفرؒ اور خلفؒ کی متواتر قراءتیں کہ یہ احرفِ سبعہ میں سے ہیں، مگر معروف قراآتِ سبعہ میں سے نہیں ۱۲ محمد تقی

زبان پر اس لئے مشہور ہو گیا کہ علامہ شاطبیؒ نے انہی سات قراءتوں کو جمع کیا ہے، پھر یہ بھی یاد رکھئے کہ بعض لوگ یہ سمجھے ہیں کہ سات حروف کے درمیان کلّی تغایر ہے، اور ان میں کوئی باہم ربط نہیں ہے، حالانکہ واقعہ ایسا نہیں، بلکہ بعض اوقات دو حرفوں میں فرق صرف صیغۂ مجرد اور صیغۂ مزید کا ہوتا ہے اور بعض مرتبہ صرف (صرفی) ابواب کا، اور بعض دفعہ غائب و حاضر کے صیغوں کا اور کبھی صرف ہمزہ کو باقی رکھنے اور اس کی تسہیل کرنے کا، پس یہ تمام تغیرات خواہ معمولی ہوں یا بڑے بڑے مستقل حرف ہیں، اور جو لوگ یہ سمجھے ہیں کہ حروف کے درمیان کلّی تغایر ہے، اور اُن کا (ایک کلمہ میں) جمع ہونا ناممکن ہے، اُن سے غلطی ہوئی ہے، رہی یہ بات کہ حدیث میں سات کے عدد کا کیا مطلب ہے؟ سو اس کا جواب علامہ ابن الجزریؒ نے دیا ہے، اور تحقیق یہ بیان کی ہے کہ یہ سارے تغیرات سات قسم کے ہیں، اور اس مسئلہ میں قسطلانیؒ اور زرقانیؒ کی مراجعت بھی کر لیجئے۔

اب صرف یہ بات رہ گئی کہ یہ تمام حروف موجود ہیں، یا ان میں سے بعض ختم کر دیئے گئے، اور بعض باقی ہیں، پس یہ سمجھ لیجئے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جتنے حروف حضورؐ کے ساتھ قرآن کے دَور میں پڑھے تھے، وہ سب حضرت عثمانؓ کے مصحف میں موجود ہیں، اور چونکہ علامہ ابن جریرؒ پر حروف کے معنی واضح نہیں ہو سکے، اس لئے انہوں نے یہ مذہب اختیار کر لیا کہ چھ حروف ختم ہو گئے، اور صرف ایک باقی رہ گیا۔''

اسی طرح مصر کے علماء متاخرین میں سے مشہور محقق علامہ زاہد الکوثریؒ (متوفی ۱۳۷۱ھ) تحریر فرماتے ہیں:

Marfat.com

والاوّل رأی القائلین بان الاحرف السبعة کانت فی مبدء الامر ثم نسخت بالعرضة الاخیرة فی عهد النبی صلی اللہ علیه وسلم فلم یبق الاحرف واحد ورأی القائلین بانّ عثمان رضی اللّٰہ عنه، جمع النّاس علیٰ حرف واحد ومنع من الستة الباقیة لمصلحة، والیه نحا ابن جریرؒ وتهیّبه ناسٌ فتابعوه لکن هذا رأی خطیر قام ابن حزم باشدّ النکیر علیه فی الفصل وفی الاحکام وله الحق فی ذلك، والثانی رأی القائلین بانّها هی الاحرف السبعة المحفوظة کما هی فی العرضة الاخیرة،الخ (۱)

''پہلی رائے (کہ موجودہ قراآت ایک ہی حرف کی مختلف شکلیں ہیں) اُن حضرات کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ سات حروف ابتداء اسلام میں تھے، پھر عرضۂ اخیرہ (حضرت جبرئیلؑ سے حضورؐ کے آخری دور) سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ میں منسوخ ہوگئے، اوراب صرف ایک باقی رہ گیا، نیز یہی رائے اُن حضرات کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام لوگوں کو ایک حرف پر جمع کردیا تھا، اورایک مصلحت کی وجہ سے باقی چھ حروف کی قراءت روک دی تھی، حافظ ابن جریرؒ کا یہی مسلک ہے، اور بہت سے لوگ اس معاملہ میں اُن سے مرعوب ہوکر اُن کے پیچھے لگ گئے، لیکن درحقیقت یہ بڑی سنگین اور خطرناک رائے ہے، اورعلاّمہ ابن حزمؒ نے ''الفصل'' اور ''الاحکام'' میں اس پر سخت ترین نکیر کی ہے، جس کا انہیں حق تھا، اوردوسری رائے (کہ موجودہ قراآت ہی) احرفِ سبعہ ہیں اُن

(۱) الکوثریؒ: مقالات الکوثری، ص۲۰و۲۱ مطبعة الانوار قاهره ۱۳۷۲ھ

Marfat.com

حضرات کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہی وہ حروف ہیں جو عرضۂ اخیرہ کے
مطابق محفوظ چلے آتے ہیں۔"

ہم نے یہ تمام اقوال تفصیل کے ساتھ اس لئے پیش کئے ہیں کہ آجکل علامہ ابن جریر طبریؒ کا قول ہی زیادہ مشہور ہو گیا ہے، اور علامہ ابن جریرؒ کی جلیل القدر شخصیت کے پیش نظر اسے عموماً ہر شک و شبہ سے بالاتر سمجھا جاتا ہے، اس کی بناء پر ابن الجزریؒ کا یہ بے غبار قول یا تو لوگوں کو معلوم نہیں ہے، یا اگر معلوم ہے تو اسے ایک ضعیف قول سمجھا جاتا ہے، حالانکہ گذشتہ بحث کی روشنی میں یہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ امام مالکؒ، علامہ ابن قتیبہؒ، علامہ ابوالفضل رازیؒ، قاضی ابوبکر ابن الطیبؒ، امام ابوالحسن اشعریؒ، قاضی عیاضؒ، علامہ ابن حزمؒ، علامہ ابوالولید باجیؒ، امام غزالیؒ اور ملا علی قاریؒ جیسے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ ساتوں حروف آج بھی محفوظ اور باقی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عرضۂ اخیرہ کے وقت جتنے حروف باقی رہ گئے تھے اُن میں سے کوئی نہ منسوخ ہوا، نہ اُسے ترک کیا گیا، بلکہ محقق ابن الجزریؒ نے اپنے اس قول کو اپنے سے پہلے جمہور علماء کا مسلک قرار دیا ہے، علماء متاخرین میں سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ اور علامہ زاہد کوثریؒ کا بھی یہی قول ہے، نیز مصر کے مشہور علماء، علامہ محمد نجیت مطیعیؒ، علامہ خضری و میاطیؒ اور شیخ عبدالعظیم زرقانی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، (۱) لہٰذا دلائل سے قطع نظر، محض شخصیات کے لحاظ سے بھی یہ قول بڑا وزنی قول ہے۔

اُس قول کے دلائل

اب وہ دلائل ذیل میں پیشِ خدمت ہیں جن سے اس قول کی تائید ہوتی ہے، اس کے کچھ دلائل تو مذکورہ بالا اقوال میں آچکے ہیں، مزید مندرجہ ذیل ہیں:

۱..... قرآن کریم کی آیت "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ" (ہم نے ہی

(۱) مناهل العرفان، ص ۱۵۱ ج ۱،

Marfat.com

قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ جو آیاتِ قرآنی خود اللہ تعالیٰ نے منسوخ نہ فرمائی ہوں وہ قیامت تک باقی رہیں گی، دوسری طرف پیچھے وہ احادیث گزر چکی ہیں جن میں یہ تصریح ہے کہ قرآن کے ساتوں حروف منزل من اللہ تھے، اس لئے مذکورہ آیت کا واضح تقاضا یہی ہے کہ وہ ساتوں حروف قیامت تک محفوظ رہیں۔

۲...... اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چھ حروف کو ختم کر کے صرف ایک حرف پر مصحف تیار کیا ہوتا تو اس کی کہیں کوئی صراحت تو ملنی چاہئے تھی، حالانکہ نہ صرف اس کی کوئی صراحت موجود نہیں ہے، بلکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصحفِ عثمانی میں ساتوں حروف موجود تھے، مثلاً روایات میں یہ تصریح ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنا مصحف حضرت ابوبکرؓ کے جمع فرمودہ صحیفوں کے مطابق لکھوایا تھا، اور لکھنے کے بعد دونوں کا مقابلہ بھی کیا گیا، جس کے بارے میں خود حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں:

فعرضت المصحف علیها فلم یختلفا فی شیءٍ (۱)

"میں نے مصحف کا مقابلہ ان صحیفوں سے کیا تو دونوں میں کوئی اختلاف نہیں تھا"

اور ظاہر ہے کہ حافظ ابن جریر طبریؒ بھی تسلیم فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں ساتوں حروف موجود تھے، اس لئے حضرت ابوبکرؓ کے صحیفوں میں قرآن کریم کو یقیناً ان ساتوں حروف پر لکھا گیا ہوگا، لہٰذا اگر حضرت عثمانؓ نے چھ حروف کو ختم کردیا ہوتا تو حضرت زید بن ثابتؓ کا یہ ارشاد کیسے درست ہو سکتا ہے کہ "دونوں میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔"

۳...... علامہ ابن الانباریؒ نے کتاب المصاحف میں حضرت عبیدہ سلمانیؒ کا جو مشہور تابعی ہیں یہ قول نقل فرمایا ہے:

قراءتنا التی جمع النّاس عثمانؓ علیها هی العرضة

(۱) مشکل الآثار، ص ۱۹۳ ج ۴۔

الاخریٰ (۱)

''ہماری وہ قراءت جس پر حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو جمع فرمایا وہ عرضۂ اخیرہ کی قراءت تھی۔''

حضرت عبیدہؒ کا یہ قول اس بات پر بالکل صریح ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اُن حروف میں سے کوئی نہیں چھوڑا، جو عرضۂ اخیرہ (حضرت جبرئیلؑ کے ساتھ حضورؐ کے آخری قرآنی دور) کے وقت باقی تھے، اس پر بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ حضورؐ کا آخری دَور صرف ایک حرفِ قریش پر ہوا تھا، اور اسی پر حضرت عثمانؓ نے سب کو جمع کر دیا، لیکن یہ بات بہت بعید ہے کہ جو حروف منسوخ نہیں ہوئے تھے وہ اس دَور سے خارج رہے ہوں۔

۴..... حضرت محمد بن سیرینؒ بھی مشہور تابعی ہیں، علاّمہ ابن سعدؒ نے اُن کا یہ قول نقل فرمایا ہے:

"کان جبرئیل یعرض القرآن علی النبیّ صلی اللّٰہ علیه وسلم کلّ عام مرّة فی رمضان فلمّا کان العام الذی توفّی فیه عرضه علیه مرّتین، قال محمّد، فأنا ارجو ان تکون قراءتنا العرضة الاخیرة۔" (۲)

''حضرت جبرئیل علیہ السلام ہر سال ایک مرتبہ رمضان میں حضورؐ کے سامنے قرآن پیش کیا کرتے تھے، چنانچہ جب وہ سال آیا جس میں آپؐ کی وفات ہوئی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے دو مرتبہ قرآن پیش کیا، پس مجھے امید ہے کہ ہماری موجودہ قراءت اس عرضۂ اخیرہ کے مطابق ہے۔''

۵..... حضرت عامر شعبیؒ بھی مشہور تابعی ہیں، اور انہوں نے سات سو صحابہؓ سے استفادہ

(۱) **کنز العمال**، حدیث نمبر ۴۸۴۰ ج ۱، دائرۃ المعارف دکن ۱۳۱۲ھ، یہی روایت حافظ ابن حجرؒ نے بھی مسند احمدؒ، ابن ابی داؤدؒ اور طبریؒ کے حوالہ سے نقل کی ہے، (فتح الباری، ص ۳۶ ج ۹)

(۲) ابن سعدؒ: الطبقات الکبریٰ، ص ۱۹۵ ج ۲ جزء ۲ دار صادر بیروت ۱۳۷۶ھ

کیا ہے، علامہ ابن الجزریؒ نے ان سے بھی اسی قسم کا قول نقل کیا ہے۔(۱)

یہ تینوں حضرات تابعی ہیں اور حضرت عثمانؓ کے عہد سے نہایت قریب ہیں، اس لئے اُن کا قول اس باب میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔

۶...... پورے ذخیرۂ احادیث میں ہمیں کوئی ایک روایت بھی ایسی نہیں ملی جس سے یہ ثابت ہو کہ قرآن کریم کی تلاوت میں دو قسم کے اختلافات تھے، ایک سات حروف کا اختلاف اور دوسرے قراءتوں کا اختلاف، اس کے بجائے بہت سی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک چیز ہیں، کیونکہ ایک ہی قسم کے اختلاف پر بیک وقت ''اختلافِ قراءت'' اور ''اختلافِ احرف'' دونوں الفاظ کا اطلاق کیا گیا ہے، مثال کے طور پر حضرت اُبی بن کعبؓ فرماتے ہیں:

> كنتُ فى لمسجد فدخل رجل يصلّى فقرأ قراءة انكرتها عليه ثم دخل 'اخر فقرأ قراءة سوى قراءة صاحبه فلمّا قضينا الصلٰوة دخلنا جميعاً علىٰ رسول الله صلى الله عليه وسلم فقلت انّ هٰذا قرأ قراءة انكرتها عليه ودخل اخر فقرأ قراءة سوىٰ قراءة صاحبه فامر هما رسول الله صلى اللّٰه عليه وسلم فقرا فحسّن النّبىّ صلى اللّٰه عليه وسلم شأنهما فسقط فى نفسى من التكذيب ولا اذكنت فى الجاهلية فلمّا رأى رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم ماقدغشينى ضرب فى صدرى ففضت عرقا وكأنما انظر الىٰ اللّٰه عزّ وجلّ فرقا فقال لى يااُبىّ ارسل الىّ ان اقرأ القراٰن علىٰ حرف فرددت اليه ان

---

(۱) النشر ص ۷۸ ج:۱، (قدیم) النشر فى القراءات العشر، المكتبة العصرية بيروت، لبنان المجلد الاوّل ص:۱۴ (جديد)

Marfat.com

هَوِّنَ علیٰ اُمّتی فردّ الیّ الثانیة ان اقرأه علیٰ حرفین فرددت الیه ان هوّن علیٰ اُمّتی فردّ الیّ الثالثة اقرأه علیٰ سبعة احرف"(۱)

"یعنی میں مسجد میں تھا کہ ایک شخص داخل ہو کر نماز پڑھنے لگا، اس نے ایک ایسی قراءت پڑھی جو مجھے اجنبی معلوم ہوئی، پھر ایک دوسرا شخص آیا اُس نے پہلے شخص کی قراءت کے سوا ایک اور قراءت پڑھی، پس جب ہم نے نماز ختم کر لی تو ہم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے، میں نے عرض کیا کہ اس شخص نے ایک ایسی قراءت پڑھی ہے جو مجھے اجنبی معلوم ہوئی، پھر ایک دوسرا شخص آیا اس نے پہلے شخص کی قراءت کے سوا ایک دوسری قراءت پڑھی، اس پر آپؐ نے دونوں کو پڑھنے کا حکم دیا، ان دونوں نے قراءت کی تو حضورؐ نے دونوں کی تحسین فرمائی، اس پر میرے دل میں تکذیب کے ایسے وسوسے آنے لگے کہ جاہلیت میں بھی ایسے خیالات نہیں آئے تھے، پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری حالت دیکھی تو میرے سینے پر مارا جس سے میں پسینہ میں شرابور ہو گیا، اور خوف کی حالت میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اللہ کو دیکھ رہا ہوں، پھر آپؐ نے فرمایا کہ اے اُبی! میرے پروردگار نے میرے پاس پیغام بھیجا تھا، کہ میں قرآن کو ایک حرف پر پڑھوں، میں نے جواب میں درخواست کی کہ میری اُمّت پر آسانی فرمایئے، تو اللہ تعالیٰ نے مجھے دوبارہ پیغام بھیجا کہ میں قرآن دو حرفوں پر پڑھوں، میں نے جواب میں درخواست کی کہ میری اُمّت پر آسانی فرمایئے، تو اللہ تعالیٰ نے تیسری بار پیغام بھیجا

(۱) صحیح مسلم ص ۲۷۳ ج ۱، اصح المطابع دهلی ۱۳۴۹ھ

Marfat.com

کہ میں اسے سات حرفوں پر پڑھوں۔"

اس روایت میں حضرت اُبی بن کعبؓ دونوں اشخاص کے اختلافِ تلاوت کو بار بار اختلافِ قراءت سے تعبیر فرما رہے ہیں، اور اسی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سات حروف کے اختلاف سے تعبیر فرمایا ہے، اس سے صاف واضح ہے کہ قراءت کے اختلاف اور حروف کے اختلاف کو عہدِ رسالتؐ میں ایک ہی چیز سمجھا جاتا تھا، اور اس کے خلاف کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جو دونوں کی جداگانہ حیثیت پر دلالت کرتی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں، اور جب قراآت کا محفوظ ہونا تواتر اور اجماع سے ثابت ہے، تو اس کا مطلب یہی ہے کہ احرفِ سبعہ آج بھی محفوظ ہیں۔

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حروف سبعہ کا جتنا حصّہ عرضۂ اخیرہ کے وقت باقی رہ گیا تھا وہ سارا کا سارا عثمانی مصاحف میں محفوظ کر لیا گیا تھا، اور وہ آج تک محفوظ چلا آتا ہے، نہ اسے کسی نے منسوخ کیا اور نہ اُس کی قراءت ممنوع قرار دی گئی، لیکن ضروری ہے کہ مکمّل وضاحت کے لئے ان ممکنہ سوالات کا جواب بھی دیا جائے جو اس قول پر وارد ہو سکتے ہیں۔

اس قول پر وَارد ہونیوالے سوالات اور اُن کا جواب

۱......اس قول پر سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ساتوں حروف کو باقی رکھا ہے تو پھر اُن کا وہ امتیازی کارنامہ کیا تھا جسکی وجہ سے اُن کو "جامع قرآن" کہا جاتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ قرآن کریم بے شمار صحابہؓ کو پورا یاد تھا، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک قرآن کریم کا معیاری نسخہ صرف ایک تھا جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مرتّب فرمایا تھا، یہ نسخہ بھی مصحف کی شکل میں نہیں تھا، بلکہ ایک ایک سُورت علیحدہ علیحدہ صحیفوں میں لکھی ہوئی تھی، لیکن بعض صحابہؓ نے انفرادی طور پر اپنے اپنے مصاحف

Marfat.com

الگ الگ تیار کر رکھے تھے، اُن میں نہ رسم الخط متحد تھا، نہ سورتوں کی ترتیب یکساں تھی، اور نہ ساتوں حروف جمع تھے، بلکہ ہر شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جس حرف کے مطابق قرآن سیکھا تھا اسی کو اپنے طور پر لکھ لیا تھا، اس لئے کسی مصحف میں کوئی آیت کسی حرف کے مطابق لکھی ہوئی تھی، اور دوسرے مصحف میں کسی اور حرف کے مطابق، جب تک عہدِ رسالتؐ قریب تھا اور مسلمانوں کا تعلق مرکزِ اسلام یعنی مدینہ طیبہ سے مضبوط اور مستحکم تھا، مصاحف کے اس اختلاف سے کوئی قابل ذکر خرابی اس لئے پیدا نہ ہوسکی کہ قرآن کریم کی حفاظت میں اصل مدار مصاحف کے بجائے حافظہ پر تھا، اور صحابہؓ کی اکثریت اس بات سے باخبر تھی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، لیکن جب اسلام دور دراز ممالک تک پھیلا اور نئے نئے لوگ مسلمان ہوئے تو انہوں نے صرف ایک ایک طریقے سے قرآن سیکھا، اور یہ بات ان میں عام نہ ہوسکی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، اس لئے ان میں اختلاف پیش آنے لگا، بعض لوگ اپنی قراءت کو حق اور دوسرے کی قراءت کو باطل سمجھنے لگے، اُدھر چونکہ انفرادی طور پر تیار کئے ہوئے مصاحف بھی، حرف اور رسم الخط کے اعتبار سے مختلف تھے، اور ان میں حروفِ سبعہ یکجا کرنے کا اہتمام نہیں تھا، اس لئے کوئی ایسا معیاری نسخہ ان کے پاس موجود نہیں تھا جس کی طرف رجوع کر کے اختلاف رفع کیا جاسکے۔)

ان حالات میں حضرت عثمانؓ نے محسوس کیا کہ اگر یہ صورتِ حال برقرار رہی اور انفرادی مصاحف کو ختم کر کے قرآن کریم کے معیاری نسخ عالمِ اسلام میں نہ پھیلائے گئے تو زبردست فتنہ رُونما ہو جائے گا، اس لئے انہوں نے مندرجہ ذیل کام کئے:

۱...... قرآن کریم کے سات معیاری نسخے تیار کرائے اور انہیں مختلف اطراف میں روانہ کردیا۔

۲...... ان مصاحف کا رسم الخط ایسا رکھا، کہ اس میں ساتوں حروف سما جائیں، چنانچہ یہ مصاحف نقطوں اور حرکات سے خالی تھے، اور انہیں ہر حرف کے مطابق پڑھا جاسکتا تھا۔

۳...... جتنے انفرادی مصاحف لوگوں نے تیار کر رکھے تھے اُن سب کو نذرِ آتش کر کے

Marfat.com

دفن کر دیا۔

۴...... یہ پابندی عائد کر دی کہ آئندہ جتنے مصاحف لکھے جائیں وہ سب ان سات مصاحف کے مطابق ہونے چاہئیں۔

۵...... حضرت ابوبکرؓ کے صحیفے الگ الگ سورتوں کی شکل میں تھے، حضرت عثمانؓ نے ان سورتوں کو مرتب کر کے ایک مصحف کی شکل دیدی۔

ان اقدامات سے حضرت عثمانؓ کا مقصد یہ تھا کہ پورے عالمِ اسلام میں رسم الخط اور سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے تمام مصاحف یکساں ہو جائیں، اور ان میں حروفِ سبعہ اس طرح جمع ہو جائیں کہ بعد میں کسی شخص کو کسی صحیح قراءت سے انکار کرنے یا غلط قراءت پر اصرار کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے، اور اگر کبھی قراءت میں کوئی اختلاف رونما ہو تو مصحف کی طرف رجوع کر کے اُسے بآسانی رفع کیا جاسکے۔

یہ بات حضرت علیؓ کے ایک ارشاد سے واضح ہے جو امام ابن ابوداوٗدؒ نے کتاب المصاحف میں صحیح سند کے ساتھ نقل کی ہے:

قال علیؓ لاتقولوا فی عثمانؓ الا خیراً فو الله مافعل الذی فعل فی المصاحف الّا عن ملاٍمّنا ، قال، ماتقولون فی هذه القراءة فقد بلغنی ان بعضهم یقول ان قراءتی خیر من قراءتك ، وهذایکاد ان یکون کفرا ، قلنا فماتریٰ ؟ قال أری أن نجمع النّاس علیٰ مصحف واحد فلا تکون فرقة ولا اختلاف ، قلنا فنعم مارأیت (۱)

"حضرت علیؓ نے فرمایا کہ حضرت عثمانؓ کے بارے میں کوئی بات اُن کی بھلائی کے سوا نہ کہو، کیونکہ اللہ کی قسم انہوں نے مصاحف کے معاملے میں جو کام کیا وہ ہم سب کی موجودگی میں کیا انہوں نے ہم

(۱) کتاب المصاحف ، لابن ابی داوٗدؒ ص۲۲ مطبعہ رحمانیہ مصر ۱۳۵۵ھ وفتح الباری ص۱۵ ج۹،

سے مشورہ کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ ان قراءتوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کیونکہ مجھے یہ اطلاعات مل رہی ہیں کہ بعض لوگ دوسروں سے کہتے ہیں کہ ''میری قراءت تمہاری قراءت سے بہتر ہے۔'' حالانکہ یہ ایسی بات ہے جو کفر کے قریب تک پہنچتی ہے اس پر ہم نے حضرت عثمانؓ سے کہا: ''پھر آپ کی کیا رائے ہے؟'' انہوں نے فرمایا میری رائے یہ ہے کہ ہم سب لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دیں، تاکہ پھر کوئی افتراق و اختلاف باقی نہ رہے، ہم سب نے کہا آپ نے بڑی اچھی رائے قائم کی ہے۔''

یہ حدیث حضرت عثمانؓ کے کام کے بارے میں واضح ترین حدیث ہے، اس میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے ''نجمع النّاس علی مصحف واحد'' فرما کر یہ ارادہ ظاہر فرمایا ہے کہ ہم ایک ایسا مصحف تیار کرنا چاہتے ہیں جو پورے عالمِ اسلام کے لئے یکساں ہو، اور اس کے ذریعہ باہمی اختلاف کو ختم کیا جا سکے، اور اس کے بعد کسی صحیح قراءت کے انکار اور منسوخ یا شاذ قراءت پر اصرار کی گنجائش باقی نہ رہے۔ (۱)

نیز ابنِ اشتہؒ نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے کہ:

اختلفوا فی القراٰن علیٰ عهد عثمان حتیّٰ اقتتل الغلامان والمعلمون فبلغ ذلك عثمان بن عفان فقال عندی تكذبون و تلحنون فيه فمن نأی عنّی كان اشد تكذيباً واكثر لحناً، يااصحاب محمدٍ اجتمعو افاكتبو اللناس اماماً۔

''حضرت عثمانؓ کے عہد میں قرآن کے بارے میں اختلاف ہوا، یہاں تک کہ بچے اور معلّمین لڑنے لگے، یہ اطلاع حضرت عثمانؓ کو پہنچی

(۱) الاتقان، ص ۶۱ ج ۱،

Marfat.com

تو انہوں نے فرمایا کہ تم میرے قریب رہتے ہوئے (صحیح قراءتوں کی) تکذیب کرتے ہو اور اس میں غلطیاں کرتے ہو، لہٰذا جو لوگ مجھ سے دُور ہیں وہ تو اور بھی زیادہ تکذیب اور غلطیاں کرتے ہوں گے، پس اے اصحابِ محمدؐ جمع ہو جاؤ، اور لوگوں کے لئے ایک ایسا نسخہ تیار کرو جس کی اقتداء کی جائے۔"

اس سے صاف واضح ہے کہ حضرت عثمانؓ کا مقصد قرآن کے کسی حرف کا ختم کرنا نہیں تھا، بلکہ انہیں تو اس بات کا افسوس تھا کہ بعض لوگ صحیح حروف کا انکار کر رہے ہیں، اور بعض لوگ غلط طریقہ سے تلاوت پر اصرار کر رہے ہیں، اس لئے وہ ایک معیاری نسخہ تیار کرنا چاہتے تھے، جو پوری دنیائے اسلام کے لئے یکساں ہو۔(۱)

لغتِ قریش پر لکھنے کا مطلب

۲...... یہاں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح بخاریؒ کی روایت کے مطابق جس وقت حضرت عثمانؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ کی قیادت میں مصحفِ قرآنی مرتب کرنے کے لئے صحابہؓ کی ایک جماعت بنائی، تو ان سے فرمایا تھا:

اذا اختلفتم انتم و زید بن ثابتؓ فی شیء من القراٰن فاکتبوه بلسان قریش فانما نزل بلسانهم(۲)

"جب تمہارے اور حضرت زید بن ثابتؓ کے درمیان قرآن کے کسی حصہ میں اختلاف ہو تو اسے قریش کی زبان پر لکھنا، کیونکہ قرآن انہی

(۱) بہت سے علماء نے حضرت عثمانؓ کے عمل کی یہی تشریح فرمائی ہے، ملاحظہ ہو الفصل فی الملل والاھواء والنحل: ابن حزمؒ ص ۷۷ ج ۲ مکتبۃ المثنیٰ بغداد، اور البیان فی علوم القرآن، مولانا عبدالحق حقانی، باب نمبر ۲ فصل نمبر ۲، ص ۶۲ مطبوعہ نعیمیہ دیوبند، ومناھل العرفان: للزرقانیؒ ص ۲۴۸ تا ۲۵۶ ج ۱،

(۲) صحیح بخاری باب جمع القرآن مع فتح الباری ص ۱۶ ج ۹،

Marfat.com

کی زبان پر نازل ہوا ہے"

اگر حضرت عثمانؓ نے ساتوں حروف باقی رکھے تھے تو اس ارشاد کا کیا مطلب ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہی وہ جملہ ہے جس سے حافظ ابن جریرؒ اور بعض دوسرے علماء نے یہ سمجھا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے چھ حروف ختم کر کے صرف ایک حرفِ قریش کو مصحف میں باقی رکھا تھا، لیکن درحقیقت اگر حضرت عثمانؓ کے اس ارشاد پر اچھی طرح غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ مطلب سمجھنا درست نہیں ہے کہ انہوں نے حرفِ قریش کے علاوہ باقی چھ حروف کو ختم فرما دیا تھا بلکہ مجموعی روایات دیکھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ارشاد سے حضرت عثمانؓ کا یہ مطلب تھا کہ اگر قرآن کریم کی کتابت کے دوران رسم الخط کے طریقے میں کوئی اختلاف ہو تو قریش کے رسم الخط کو اختیار کیا جائے، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کی اس ہدایت کے بعد صحابہؓ کی جماعت نے جب کتابتِ قرآن کا کام شروع کیا تو پورے قرآن کریم میں اُن کے درمیان صرف ایک اختلاف پیش آیا، جس کا ذکر امام زہریؒ نے اس طرح فرمایا ہے:

"فاختلفوا یومئذ فی التابوت والتابوہ فقال النفر القرشیون التابوت وقال زید بن ثابتؓ التابوہ فرفع اختلافھم الیٰ عثمانؓ فقال اکتبوہ التابوت فانہ بلسان قریش نزل "(۱)

" چنانچہ اس موقع پر اُن کے درمیان " تابوت " اور " تابوہ " میں اختلاف ہوا، قریشی صحابہؓ کہتے تھے کہ تابوت (بڑی تاء سے لکھا جائے) اور حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے تھے کہ تابوۃ (گول تاء سے لکھا جائے) پس اس اختلاف کا معاملہ حضرت عثمانؓ کے سامنے پیش ہوا، جس پر انہوں نے فرمایا کہ اسے التابوت لکھو، کیونکہ قرآن قریش

---

(۱) کنز العمال، ص ۲۸۲ ج ۱ حدیث ۴۷۸۳، بحوالہ ابن سعدؒ وغیرہ وفتح الباری، ص ۱۶ ج ۹ بحوالہ ترمذی،

Marfat.com

کی زبان پر نازل ہوا ہے۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت زیدؓ اور قریشی صحابہؓ کے درمیان جس اختلاف کا ذکر فرمایا اس سے مراد رسم الخط کا اختلاف تھا نہ کہ لغات کا۔

مرادف الفاظ سے تلاوت کا مسئلہ

۳..... تیسرا سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سبعۃ احرف کے اختلاف کی جو تشریح فرمائی ہے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سات حروف مصاحفِ عثمانی میں شامل نہیں ہو سکے، کیونکہ وہ فرماتے ہیں:

انّ جبریل قال یامحمدً اقرأ القرآن علیٰ حرف ، قال میکائیل استزده حتی بلغ سبعة احرف ، قال کلّ شافٍ کافٍ مالم تخلط 'اٰیة عذاب برحمة اورحمةبعذاب نحو قولك تعال ، واَقْبِلْ وهَلُمَّ واذْهَبْ واسْرِعْ وعَجِّلْ، (۱)

"جبرئیل علیہ السلام نے (حضورؐ سے) کہا کہ اے محمدؐ! قرآن کریم کو ایک حرف پر پڑھیے، میکائیل علیہ السلام نے حضورؐ سے کہا اس میں اضافہ کروائیے، یہانتک کہ معاملہ سات حروف تک پہنچ گیا، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا ان میں سے ہر ایک شافی کافی ہے، تاوقتیکہ آپؐ عذاب کی آیت کو رحمت سے یا رحمت کو عذاب سے مخلوط نہ کردیں، یہ ایسا ہی ہوگا، جیسے آپ تَعَالَ (آؤ) کے معنی کو اَقْبِلْ، هَلُمَّ، اِذْهَبْ، اَسْرِعْ، اور عَجِّلْ کے الفاظ سے ادا کریں۔"

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبعۃ اَحرف کا اختلاف درحقیقت مرادف الفاظ کا اختلاف تھا، یعنی ایک حرف میں کوئی ایک لفظ اختیار کیا گیا تھا، اور دوسرے حرف میں اسی

---

(۱) یہ الفاظ مسندِ احمدؒ میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہیں (اوجز المسالک ص ۳۵۷ ج ۲)

Marfat.com

کا ہم معنی کوئی دوسرا لفظ، حالانکہ عثمانی مصاحف میں جو قراءتیں جمع ہیں اُن کے درمیان مرادفات کا یہ اختلاف بہت کم ہے، ان قراءتوں میں جو اختلاف ہے وہ زیادہ تر حرکات، صیغوں، تذکیر و تانیث اور لہجوں کا اختلاف ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہم نے "سات حروف" کی جس تشریح کو اختیار کیا ہے اس میں قراءتوں کے درمیان سات قسم کے اختلافات بیان کئے گئے ہیں، اُن سات اقسام میں سے ایک قسم بدلیت مرادفہ کا اختلاف ہے، حضرت ابوبکرہؓ نے یہاں سات حروف کی مکمل تشریح نہیں فرمائی، بلکہ اس کی صرف ایک مثال دی ہے، اس لئے اختلاف کی صرف ایک قسم یعنی اختلافِ الفاظ بدلیت کا ذکر فرمایا ہے۔

اب اختلافِ قراآت کی یہ قسم یعنی اختلافِ الفاظ ابتدائے اسلام میں بہت زیادہ تھی، چونکہ تمام اہلِ عرب لغتِ قریش کے پوری طرح عادی نہ تھے، اس لئے شروع میں انہیں یہ سہولت زیادہ سے زیادہ دی گئی تھی، کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنے ہوئے متبادل الفاظ میں سے جس لفظ کے ساتھ چاہیں تلاوت کرلیا کریں، چنانچہ شروع میں ایسا بکثرت تھا کہ ایک قراءت میں ایک لفظ ہو اور دوسری قراءت میں اس کا ہم معنی دوسرا لفظ، لیکن جب لوگ لغتِ قرآن سے پوری طرح مانوس ہوگئے تو اختلافِ قراءت کی یہ قسم رفتہ رفتہ کم کردی گئی، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے رمضان میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپؐ سے قرآن کریم دومرتبہ دَور فرمایا، اس وقت بہت سے الفاظ منسوخ کردیئے گئے، اور اس طرح الفاظِ مرادفہ کا اختلاف بہت کم رہ گیا۔

اب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ الفاظِ مرادفہ اپنے مصاحف میں جمع نہیں فرمائے، جو اس آخری دَور میں منسوخ ہوچکے تھے، کیونکہ اُن کی حیثیت اب منسوخ التلاوۃ آیات کی سی تھی، البتہ قراءتوں کا جو اختلاف آخری دور میں بھی باقی رکھا گیا تھا، اسے حضرت عثمانؓ نے جُوں کا توں باقی رکھا، لہٰذا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حروف کے اختلاف کی جو قسم مذکورہ حدیث میں بطورِ مثال مذکور فرمائی ہے وہ قسم ہے جس کی بیشتر جزئیات عرضۂ اخیرہ کے وقت

Marfat.com

منسوخ ہو چکی تھیں، چنانچہ وہ مصاحفِ عثمانی میں شامل نہیں ہو سکیں، اور نہ موجودہ قراآت اُن پر مشتمل ہیں۔

مذکورہ بالا نتائج تین مقدمات سے مستنبط ہوتے ہیں:

۱...... عرضۂ اخیرہ (حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ حضورؐ کے آخری قرآنی دَور) کے وقت قرآن کریم کی متعدد قراءتیں منسوخ کی گئی تھیں۔

۲...... حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحفِ عثمانی کو عرضۂ اخیرہ کے مطابق ترتیب دیا۔

۳...... حضرت عثمانؓ کے مصحف میں مرادف الفاظ کا وہ اختلاف موجود نہیں ہے جو حضرت ابوبکرہؓ نے بیان فرمایا ہے۔

جہاں تک تیسرے مقدمہ کا تعلق ہے وہ تو بالکل ظاہر ہے، اور دوسرے مقدمہ کے دلائل ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں، جن میں سے صریح ترین دلیل حضرت عبیدہ سلمانیؒ کا یہ ارشاد ہے کہ ''حضرت عثمانؓ نے ہمیں جس قراءت پر جمع کیا وہ عرضۂ اخیرہ کے مطابق تھی''۔(۱)

اب پہلا مقدمہ باقی رہ جاتا ہے، اور وہ یہ کہ عرضۂ اخیرہ کے وقت متعدد قراءتیں منسوخ ہو گئی تھیں، اس کی دلیل محقق ابن الجزریؒ کا یہ ارشاد ہے:

> ولا شك انّ القراٰن نسخ منه وغيّر فيه فى العرضة الاخيرة فقد صح النص بذلك عن غير واحد من الصّحابة وروينا باسناد صحيح عن زرّ ابن جبيش ؓ قال قال لى ابن عبّاس ؓ ایّ القراء تين تقرأ قلت الاخيرة قال فانّ النبیّ صلّى الله عليه وسلم كان يعرض القراٰن علىٰ جبرئيل عليه السلام فى كلّ عام مرّة قال فعرض عليه القراٰن فى العام الذى قبض فيه النبى صلى الله عليه وسلم مرّتين فشهد عبدالله يعنى ابن مسعودؓ مانسخ منه وما بدّل ،(۲)

(۱) كنز العمال ، حديث ۴۸۴۰ ص ۲۸۶ ج ۱، (۲) النشر في القرآت العشر، ص ۳۲ ج ۱،

Marfat.com

"اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عرضۂ اخیرہ کے موقع پر قرآن کریم میں بہت کچھ منسوخ کیا گیا اور بدلا گیا ہے، کیونکہ اس کی تصریح متعدد صحابہؓ سے منقول ہے، ہم تک صحیح سند کے ساتھ حضرت زر بن حبیشؒ کا یہ قول پہنچا ہے کہ مجھ سے ابن عباسؓ نے پوچھا تم کونسی قراءت پڑھتے ہو؟ میں نے کہا کہ آخری قراءت، انہوں نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو قرآن سنایا کرتے تھے، پس جس سال آپؐ کی وفات ہوئی اُس سال آپؐ نے دو مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو قرآن سُنایا، اس موقع پر جو کچھ منسوخ ہوا اور جس قدر تبدیلی کی گئی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس کے شاہد تھے۔"(۱)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ عرضۂ اخیرہ کے وقت بہت سی قراءتیں خود اللہ تعالیٰ کی جانب سے منسوخ قرار دیدی گئی تھیں، حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے مرادف الفاظ کے جس اختلاف کا ذکر فرمایا ہے اُس کی بہت سی جزئیات بھی یقیناً اسی وقت منسوخ ہوگئی ہوں گی، کیونکہ حضرت عثمانؓ نے عرضۂ اخیرہ کے مطابق مصحف تیار کرائے ہیں، ان میں الفاظ مرادفہ کا اختلاف بہت شاذ و نادر ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور اُن کا مصحف

۴...... مذکورہ بالا تحقیق پر چوتھا اشکال یہ ہوسکتا ہے کہ متعدد روایات سے ثابت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جمعِ قرآن کا جو کارنامہ انجام دیا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس سے خوش نہیں تھے، اور انہوں نے اپنا مصحف بھی نذرِ آتش نہیں ہونے دیا، اگر حضرت عثمانؓ

---

(۱) حافظ ابن حجرؒ نے بھی اس مضمون کی متعدد روایات مختلف محدثین کے حوالوں سے نقل کی ہیں، (فتح الباری، ص ۳۶ ج ۹)

Marfat.com

نے چھ حروف ختم نہیں فرمائے تھے تو پھر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی وجہِ اعتراض کیا تھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ در حقیقت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو حضرت عثمانؓ کے کام پر دو اعتراض تھے، ایک یہ کہ کتابتِ قرآن کے کام میں انہیں کیوں شریک نہیں کیا گیا؟ دوسرے یہ کہ دوسرے مصاحف کو نذرِ آتش کیوں کیا گیا؟

پہلے اعتراض کا ذکر صحیح ترمذی کی ایک روایت میں امام زہریؒ نے فرمایا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو یہ شکایت تھی کہ کتابت قرآن کا کام اُن کے حوالے کیوں نہیں کیا گیا، جبکہ انہوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کے مقابلہ میں زیادہ طویل عرصہ تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے استفادہ کیا تھا، حافظ ابن حجرؒ اس اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس معاملہ میں حضرت عثمانؓ کا عذر یہ تھا کہ انہوں نے یہ کام مدینہ طیبہ میں شروع کیا تھا اور حضرت ابن مسعودؓ اُس وقت کوفہ میں تھے، اور حضرت عثمانؓ اُن کے انتظار میں یہ کارِ خیر مؤخر فرمانا نہیں چاہتے تھے، اس کے علاوہ حضرت ابوبکرؓ نے بھی حضرت زید بن ثابتؓ ہی کو یہ کام سونپا تھا، اس لئے انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ جمع وترتیبِ قرآن کا مرحلہ بھی انہی کے ہاتھوں انجام پائے۔(۱)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو دوسرا اعتراض یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ نے یہ نئے مصاحف تیار کرنے کے بعد باقی تمام انفرادی مصاحف کو نذرِ آتش کرنے کا حکم دیدیا تھا، اور وہ اپنا مصحف نذرِ آتش کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت حذیفہ بن یمانؓ انہیں سمجھانے کے لئے تشریف لے گئے، لیکن انہوں نے فرمایا کہ:

والله لاادفعه اليهم ، اقرأني رسول الله صلّى الله عليه وسلم بضعاوسبعين سورة ثم ادفعه اليهم ، والله لاادفعه اليهم .(۲)

---

(۱) فتح الباری ، ص۱٦ ج۹ ، (۲) مستدرك حاكم " ص۲۲۸ ج۲ ، دائرة المعارف دکن ۱۳۴۰ھ قال الحاكم " هذا حديث صحيح الاسناد واقرّه الذهبی ،

Marfat.com

”خدا کی قسم میں یہ مصحف ان کے حوالہ نہیں کروں گا، مجھے رسول اللہ علیہ وسلم نے ستر سے زیادہ سورتیں سکھائی ہیں، پھر میں یہ مصحف انہیں دیدوں؟ خدا کی قسم میں انہیں نہیں دوں گا“

جن حضرات نے کوفہ میں حضرت ابن مسعودؓ کے مصحف کے مطابق اپنے مصاحف لکھ رکھے تھے، حضرت ابن مسعودؓ نے انہیں بھی یہی ترغیب دی کہ وہ اپنے مصاحف حوالہ نہ کریں، حضرت خُمیر بن مالکؒ فرماتے ہیں:

" امر بالمصاحف ان تغیرّ، قال قال ابن مسعودؓ من استطاع منکم ان یغُلّ مصحفه فلیغلُلْه .... ثم قال قرأت من فم رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم سبعین سورة ، أفأترك ما اخذت من فی رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم وعلیٰ اله وصحبه وسلّم" (۱)

”مصاحف میں تبدیلی کا حکم دیا گیا تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے (لوگوں سے) فرمایا کہ تم میں سے جو شخص اپنے مصحف کو چھپا سکے وہ ضرور چھپالے .... پھر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے ستر سورتیں پڑھی ہیں تو کیا میں وہ چیز چھوڑ دوں جو میں نے براہ راست آنحضرت ﷺ کے دہنِ مبارک سے حاصل کی ہے؟“

اس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مصحف عثمانی مصاحف سے کچھ مختلف تھا، اور آپ اسے محفوظ رکھنا چاہتے تھے، لیکن اس میں کیا چیزیں عثمانی مصاحف سے مختلف تھیں؟ اس کی صراحت صحیح روایات میں نہیں ملتی، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے مصحف میں بنیادی فرق سورتوں کی ترتیب کا تھا، یہ بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے جن صحف میں قرآن کریم کو جمع فرمایا تھا ان میں سورتیں الگ الگ لکھی ہوئی تھیں، اور ان

(۱) الفتح الربانی (تبویب مسند احمد) ص ۳۵ ج ۱۸ مطبوعہ مصر ۱۳۷۳ھ

Marfat.com

میں ترتیب نہیں تھی، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو مصاحف لکھوائے اُن میں سورتوں کو ایک خاص ترتیب سے جمع کر دیا گیا تھا،

امام حاکم تحریر فرماتے ہیں:

أنّ جمع القرآن لم یکن مرة واحدة فقد جمع بعضه بحضرة رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ثم جمع بعضه بحضرة ابی بکر الصدیق ، والجمع الثالث هو فی ترتیب السورة، کان فی خلافة امیر المؤمنین عثمان بن عفان رضی اللّٰه عنهم "(۱)

"جمع قرآن کا کام ایک ہی مرتبہ میں مکمل نہیں ہوا، بلکہ قرآن کریم کا کچھ حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں جمع ہو گیا تھا، پھر کچھ حصہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں ہوا، اور جمعِ قرآن کا تیسرا مرحلہ وہ تھا جن میں سورتوں کو مرتّب کیا گیا، یہ کام امیر المؤمنین حضرت عثمان بن عفانؓ کے عہدِ خلافت میں ہوا۔"

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مصحف حضرت عثمانؓ کے مصاحف سے ترتیب میں بہت مختلف تھا، مثلاً اس میں سورۂ نساء پہلے اور سورۂ آلِ عمران بعد میں تھی، (۲) اور حضرت ابن مسعودؓ نے شاید اسی ترتیب کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سیکھا ہوگا، اس لئے اُن کی خواہش تھی کہ یہ مصحف اسی ترتیب پر باقی رہے اس کی تائید صحیح بخاریؒ کی ایک روایت سے ہوتی ہے، کہ عراق کا ایک باشندہ ایک دن حضرت عائشہؓ کے پاس آیا اور:

قال یاامّ المؤمنین اَرینی مصحفكِ ، قالت لِمَ؟ قال لعلّی اُؤَلّف القرآنَ علیه ، فانّه یُقرأُ غَیرَ مؤلفٍ، قالت وما یَضُرُّكَ

---

(۱) المستدرك للحاکمؒ ص ۲۲۹ ج ۲، (۲) علامہ سیوطیؒ نے ابن اشتہؒ کے حوالہ سے حضرت ابن مسعودؓ کے مصحف کی پوری ترتیب نقل کی ہے، جو مصاحفِ عثمانی سے بہت مختلف ہے (الاتقان ص ۶۲ ج ۱)

ایَـــۃٗ قَــرَاْتَ قَبْـلُ،(۱)

''اس نے کہا کہ اُمّ المؤمنین! مجھے اپنا مصحف دکھایئے، حضرت عائشہؓ نے پوچھا کیوں؟ کہنے لگا تا کہ میں (اپنے) قرآنی مصحف کو اس کے مطابق ترتیب دے لوں، اس لئے کہ وہ (ہمارے علاقہ میں) غیر مرتب طریقہ سے پڑھا جاتا ہے، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ قرآن کا جو حصہ بھی تم پہلے پڑھ لو تمہارے لئے مضر نہیں۔''

اِس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ یہ عراقی شخص حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت پر کار بند تھا، اور چونکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنا مصحف نہ بدلا تھا اور نہ اُسے نابود کیا تھا، اس لئے اس کی ترتیب عثمانی مصاحف سے مختلف تھی، اور ظاہر ہے کہ عثمانی مصاحف کی ترتیب میں مناسبتوں کی رعایت دوسرے مصاحف کے مقابلہ میں زیادہ تھی، اس لئے اس عراقی شخص نے اپنے مصحف کو عثمانی مصحف کے مقابلہ میں غیر مرتب قرار دیا،(۲)

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف میں بنیادی فرق سورتوں کی ترتیب کا تھا، اس کے علاوہ ہوسکتا ہے کہ رسم الخط کا فرق بھی ہو، اور اس میں ایسا رسم الخط اختیار کیا گیا ہو جس میں عثمانی مصاحف کی طرح تمام قراءتوں کی گنجائش نہ ہو، ورنہ اگر حافظ ابن جریرؒ کے بیان کے مطابق یہ کہا جائے کہ حضرت عثمانؓ نے چھ حروف کو ختم کر کے صرف ایک حرف پر قرآن لکھوایا تھا اور عبداللہ بن مسعودؓ کا مصحف انہی متروک حروف میں سے کسی حرف پر لکھا ہوا تھا، تو اس پر مندرجہ ذیل اعتراضات واقع ہوتے ہیں:

۱......صحیح بخاریؒ کی مذکورہ بالا حدیث میں عراقی باشندے نے صرف سورتوں کی ترتیب کا اختلاف کا ذکر کیا ہے، ورنہ اگر حرف کا اختلاف بھی ہوتا تو وہ زیادہ اہم تھا، اسے زیادہ اہتمام سے ذکر کیا جاتا۔

۲......حافظ ابن جریرؒ وغیرہ کے قول کے مطابق سات حروف سے مراد سات مختلف قبائل

---

(۱) صحیح بخاریؒ: باب تالیف القرآن، (۲) فتح الباری، ص۳۲ ج۹،

Marfat.com

کی لغات ہیں، اگر یہ بات صحیح ہوتی تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف میں اور عثمانی مصاحف میں کوئی فرق نہ ہونا چاہئے تھا، کیونکہ اس قول کے مطابق حضرت عثمانؓ نے سب کو حرفِ قریش پر جمع کر کے اسی کے مطابق مصاحف لکھوائے تھے، اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی قریشی تھے۔

۳...... حافظ ابن جریرؒ اور اُن کے متبعین نے چھ حروف کو ختم کرنے پر سب سے بڑی دلیل اجماعِ صحابہؓ پیش کی ہے، لیکن اگر حضرت ابن مسعودؓ کسی اور حرف پر پڑھتے اور اس کی کتابت کو جائز سمجھتے تھے تو یہ اجماع کیسے متحقق ہوسکتا ہے، جس اجماع میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے فقیہ صحابی شامل نہ ہوں وہ اجماع کہلانے کا مستحق ہی کہاں ہے؟ بعض حضرات نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے بعد میں حضرت عثمانؓ کی رائے کو قبول کرلیا تھا، لیکن اس بارے میں کوئی صریح روایت موجود نہیں ہے، حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

> ''ابن ابی داؤدؒ نے ایک باب اس عنوان سے قائم کیا ہے کہ ''ابن مسعودؓ کا بعد میں حضرت عثمانؓ کے عمل پر راضی ہوجانا'' لیکن اس باب کے تحت کوئی ایسی صریح روایت نہیں لاسکے جو اس عنوان کے مطابق ہو'' (۱)

حافظ ابن جریرؒ وغیرہ کے قول پر ان اعتراضات کا کوئی جواب نہیں ملتا، لہٰذا صحیح یہی ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ساتوں حروف عثمانی مصاحف میں باقی رکھے ہیں، اور حضرت ابن مسعودؓ کا اعتراض یہ نہیں تھا کہ چھ حروف کیوں ختم کردیئے گئے؟ (۲) کیونکہ فی الواقع ایسا ہوا ہی نہیں تھا، بلکہ اعتراض یہ تھا کہ جو مصاحف پہلے سے لکھے ہوئے موجود ہیں اور جن کی ترتیب اور رسم الخط عثمانی مصاحف کے مطابق نہیں ہے اُنہیں ضائع کیوں کیا جارہا ہے جبکہ وہ بھی درست ہیں،

---

(۱) فتح الباری، ص ۴۰ ج ۹۔

(۲) صرف ایک روایت مسند احمدؒ میں ایسی ملتی ہے جس سے بظاہر یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے چھ حروف ختم فرمائے تھے، اور حضرت ابن مسعودؓ کو اس پر اعتراض تھا (دیکھئے الفتح الربانی، ص ۳۶ ج ۱۸) لیکن وہ ایک مجہول شخص سے مروی ہے، اس لئے مستند نہیں ہے،

Marfat.com

نتائجِ بحث

''حروف سبعہ'' کی یہ بحث اندازے سے زیادہ طویل ہوگئی، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے حاصل ہونے والے نتائج کا خلاصہ آخر میں پیش کردیا جائے، تاکہ اسے یاد رکھنا آسان ہو:

۱...... امت کی آسانی کی خاطر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے یہ فرمائش کی کہ قرآن کریم کی تلاوت کو صرف ایک ہی طریقے میں منحصر نہ رکھا جائے، بلکہ اُسے مختلف طریقوں سے پڑھنے کی اجازت دی جائے، چنانچہ قرآن کریم سات حروف پر نازل کردیا گیا،

۲...... سات حروف پر نازل کرنے کا راجح ترین مطلب یہ ہے کہ اس کی قراءت میں سات نوعیتوں کے اختلافات رکھے گئے، جن کے تحت بہت سی قراءتیں وجود میں آگئیں،

۳...... شروع شروع میں ان سات وجوہِ اختلاف میں سے اختلافِ الفاظ ومرادفات کی قسم بہت عام تھی، یعنی ایسا بکثرت تھا کہ ایک قراءت میں ایک لفظ ہوتا تھا اور دوسری قراءت میں اس کا ہم معنی کوئی دوسرا لفظ، لیکن رفتہ رفتہ جب اہلِ عرب قرآنی زبان سے پوری طرح مانوس ہوگئے تو یہ قسم کم ہوتی گئی، یہانتک کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے پہلے رمضان میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم کا آخری دَور کیا، (جسے اصطلاح میں عرضۂ اخیرہ کہتے ہیں) تو اس میں اس قسم کے اختلافات بہت کم کردیئے گئے، اور زیادہ تر صیغوں کی بناوٹ، تذکیر وتانیث، افراد وجمع، معروف ومجہول اور لہجوں کے اختلافات باقی رہے۔

۴...... جتنے اختلافات عرضۂ اخیرہ کے وقت باقی رہ گئے تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سب کو اپنے مصاحف میں اس طرح جمع فرمادیا کہ ان کو نقطوں اور حرکات سے خالی رکھا، لہٰذا قراءتوں کے بیشتر اختلافات اس میں سماگئے، اور جو قراءتیں اس طرح ایک مصحف

میں نہیں سما سکیں انہیں دوسرے مصاحف میں ظاہر کر دیا، اسی بناء پر عثمانی مصاحف میں کہیں کہیں ایک ایک دو دو لفظ کا اختلاف پیدا ہوا،

۵ ...... حضرت عثمانؓ نے اس طرح سات مصاحف لکھوائے، اور ان میں سورتوں کو بھی مرتب فرما دیا جبکہ حضرت ابوبکرؓ کے صحیفوں میں سورتیں غیر مرتب تھیں، نیز قرآن کریم کے لئے ایک رسم الخط متعین کر دیا، اور جو مصاحف اس ترتیب اور اس رسم الخط کے خلاف تھے انہیں نذرِ آتش کر دیا،

۶ ...... حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف کی ترتیب عثمانی مصاحف سے مختلف تھی، اور وہ اس ترتیب کو باقی رکھنا چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے اپنا مصحف نذرِ آتش کرنے کے لئے حضرت عثمانؓ کے حوالے نہیں کیا،

سات حروف کے بارے میں اختلاف آراء کی حقیقت

ایک غلط فہمی کا ازالہ

آخر میں ایک اور بنیادی غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری ہے، اور وہ یہ ہے کہ ''سبعۃ احرف'' کی مذکورہ بحث کو پڑھنے والا سرسری طور پر اس شبہ میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم جیسی بنیادی کتاب کے بارے میں جو حفاظتِ خداوندی کے تحت آج تک بغیر کسی ادنیٰ تغیر کے محفوظ چلی آ رہی ہے مسلمانوں میں اتنا زبردست اختلافِ آراء کیسے پیدا ہو گیا؟

لیکن ''سبعۃ احرف'' کی بحث میں جو اقوال ہم نے پیچھے نقل کئے ہیں اگر ان کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو اس شبہ کا جواب بآسانی معلوم ہو جاتا ہے، جو شخص بھی اس اختلافِ آراء کی حقیقت پر غور کرے گا اس پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ سارا اختلاف محض نظریاتی نوعیت کا ہے، اور عملی اعتبار سے قرآن کریم کی حقانیت و صداقت اور اس کے بعینہٖ محفوظ رہنے پر اس اختلاف کا کوئی ادنیٰ اثر بھی مرتب نہیں ہوتا، کیونکہ اس بات پر سب کا بلا استثناء اتفاق ہے کہ

Marfat.com

قرآن کریم جس شکل میں آج ہمارے پاس موجود ہے وہ تواتر کے ساتھ چلا آرہا ہے، اس میں کوئی ادنیٰ تغیر نہیں ہوا، اس بات پر بھی تمام اہلِ علم متفق ہیں کہ قرآن کریم کی جتنی قراءتیں تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچی ہیں وہ سب صحیح ہیں، اور قرآن کریم کی تلاوت اُن میں سے ہر ایک کے مطابق کی جاسکتی ہے، اس بات پر بھی پوری امت کا اجماع ہے کہ متواتر قراءتوں کے علاوہ جوشاذ قراءتیں مروی ہیں انہیں قرآن کریم کا جزء قرار نہیں دیا جاسکتا، یہ بات بھی متفق علیہ ہے کہ ''عرضۂ اخیرہ'' یا اس سے پہلے جو قراءتیں منسوخ کردی گئیں، وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بموجب قرآن کا جزء نہیں رہیں، یہ بات بھی سب کے نزدیک ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ قرآن کے سات حروف میں جو اختلاف تھا وہ صرف لفظی تھا، مفہوم کے اعتبار سے تمام حروف بالکل متحد تھے، لہٰذا اگر کسی شخص نے قرآن کریم صرف ایک قراءت یا حرف کے مطابق پڑھا ہو تو اسے قرآنی مضامین حاصل ہوجائیں گے، اور قرآن کی ہدایات حاصل کرنے کے لئے اسے کسی دوسرے حرف کو معلوم کرنے کی احتیاج نہیں ہوگی، اس میں بھی کوئی ادنیٰ اختلاف نہیں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو مصاحف تیار کرائے وہ کامل احتیاط، سینکڑوں صحابۂ کرامؓ کی گواہی اور پوری امّت مسلمہ کی تصدیق کے ساتھ تیار ہوئے تھے، اور ان میں قرآن کریم ٹھیک اس طرح لکھدیا گیا تھا جس طرح وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، اور اس میں کسی ایک متنفس کو بھی اختلاف نہیں ہوا، (۱)

لہٰذا جس اختلاف کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا گیا ہے وہ صرف اتنی بات میں ہے کہ حدیث میں ''سات حروف'' سے کیا مراد تھی؟ اب جتنی متواتر قراءتیں موجود ہیں، وہ ''سات حروف'' پر مشتمل ہیں یا صرف ایک حرف پر؟ یہ محض ایک علمی نظریاتی اختلاف ہے، جس سے کوئی عملی فرق واقع نہیں ہوتا، اس لئے اس سے یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ ان اختلافات کی بناء پر قرآن کریم معاذ اللہ مختلف فیہ ہوگیا ہے، اس کی مثال کچھ ایسی ہے جیسے ایک کتاب کے

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اپنے مصحف کو باقی رکھنے پر تو مصر رہے، لیکن مصاحف عثمانیؓ کی کسی بات پر انہوں نے ادنیٰ اختلاف نہیں فرمایا،

Marfat.com

بارے میں ساری دنیا اس بات پر متفق ہو کہ یہ فلاں مصنف کی لکھی ہوئی ہے، اس مصنف کی طرف اس کی نسبت قابلِ اعتماد ہے اور خود اُس نے اُسے چھاپ کر تصدیق کر دی کہ یہ میری لکھی ہوئی کتاب ہے، اور اس نسخے کے مطابق قیامت تک اسے شائع کیا جا سکتا ہے، لیکن بعد میں لوگوں کے درمیان یہ اختلاف پیدا ہو جائے کہ مصنف نے اپنے مسودے میں طباعت سے قبل کوئی لفظی ترمیم کی تھی یا جیسا شروع میں لکھا تھا ویسا ہی شائع کر دیا، ظاہر ہے کہ محض اتنے سے نظری اختلاف کی بناء پر وہ روشن حقیقت مختلف فیہ نہیں بنجاتی جس پر سب کا اتفاق ہے، یعنی یہ کہ وہ کتاب اُسی مصنف نے اپنی ذمہ داری پر طبع کی ہے، اُسے اپنی طرف منسوب کیا ہے، اور قیامت تک اپنی طرف منسوب کر کے شائع کرنے کی اجازت دی ہے، اسی طرح جب پوری اُمت اس بات پر متفق ہے کہ قرآن کریم کو مصاحفِ عثمانی میں ٹھیک اُسی طرح لکھا گیا ہے جس طرح وہ نازل ہوا تھا، اور اس کی تمام متواتر قراءتیں صحیح اور منزل من اللہ ہیں، تو یہ حقائق اُن نظری اختلافات کی بناء پر مختلف فیہ نہیں بن سکتے، جو حروفِ سبعہ کی تشریح میں پیش آئے ہیں، واللہ سُبحانہٗ تعالیٰ اعلم

❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁

Marfat.com

باب چہارم

ناسخ و منسوخ

نسخ کی حقیقت

علوم القرآن میں ایک اور اہم بحث ناسخ و منسوخ کی ہے، یہ بحث بڑی پہلو دار اور طویل الذیل ہے، لیکن یہاں اس کی تمام تفصیلات بیان کرنے کے بجائے اس کے متعلق صرف بنیادی معلومات پیش خدمت ہیں، ''نسخ'' کے لغوی معنی ہیں ''مٹانا''، ''ازالہ کرنا'' اور اصطلاح میں اس کی تعریف یہ ہے:

رَفْعُ الْحُكْمِ الشَّرْعِيِّ بِدَلِيلٍ شَرْعِيٍّ

''کسی حکم شرعی کو کسی شرعی دلیل سے ختم کردینا''

مطلب یہ ہے کہ بعض مرتبہ اللہ تعالیٰ کسی زمانے کے حالات کے مناسب ایک شرعی حکم نافذ فرماتا ہے، پھر کسی دوسرے زمانے میں اپنی حکمتِ بالغہ کے پیش نظر اس حکم کو ختم کرکے اس کی جگہ کوئی نیا حکم عطا فرمادیتا ہے، اس عمل کو ''نسخ'' کہا جاتا ہے، اور اس طرح جو پُرانا حکم ختم کیا جاتا ہے اسے ''منسوخ'' اور جو نیا حکم آتا ہے اُسے ''ناسخ'' کہتے ہیں۔

نسخ کا عقلی و نقلی ثبوت

یہودیوں کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں ''نسخ'' نہیں ہوسکتا، کیونکہ ان کے خیال

Marfat.com

کے مطابق اگر ''نسخ'' کو تسلیم کرلیا جائے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ بھی اپنی رائے میں تبدیلی کرلیتا ہے، اُن کا یہ کہنا ہے کہ اگر احکام الٰہی میں ناسخ و منسوخ کو تسلیم کرلیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے ایک حکم کو مناسب سمجھا تھا بعد میں (معاذ اللہ) اپنی غلطی واضح ہونے پر اسے واپس لے لیا جسے اصطلاح میں ''بداء'' کہتے ہیں۔

لیکن یہودیوں کا یہ اعتراض بہت سطحی نوعیت کا ہے، اور ذرا سا بھی غور کیا جائے تو اس کی غلطی واضح ہو جاتی ہے، اس لئے کہ ''نسخ'' کا مطلب رائے کی تبدیلی نہیں ہوتا، بلکہ ہر زمانے میں اُس دَور کے مناسب احکام دینا ہوتا ہے، ناسخ کا کام یہ نہیں ہوتا کہ وہ منسوخ کو غلط قرار دے، بلکہ اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے حکم کی مدّتِ نفاذ متعیّن کردے، اور یہ بتادے کہ پہلا حکم جتنے زمانے تک نافذ رہا اس زمانے کے لحاظ سے تو وہی مناسب تھا، لیکن اب حالات کی تبدیلی کی بناء پر ایک نئے حکم کی ضرورت ہے، جو شخص بھی سلامتِ فکر کے ساتھ غور کریگا وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ تبدیلی حکمتِ الٰہیہ کے عین مطابق ہے، اور اسے کسی بھی اعتبار سے کوئی عیب نہیں کہا جاسکتا، حکیم وہ نہیں ہے جو ہر قسم کے حالات میں ایک ہی نسخہ پلاتا رہے، بلکہ حکیم وہ ہے جو مریض اور مرض کے بدلتے ہوئے حالات پر بالغ نظری کے ساتھ غور کرکے نسخہ میں اُن کے مطابق تبدیلیاں کرتا رہے۔

اور یہ بات صرف شرعی احکام ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، کائنات کا سارا کارخانہ اسی اصول پر چل رہا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی حکمتِ بالغہ سے موسموں میں تبدیلیاں پیدا کرتا رہتا ہے، کبھی سردی، کبھی گرمی، کبھی بہار، کبھی خزاں، کبھی برسات، کبھی خشک سالی، یہ سارے تغیرات اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کے عین مطابق ہے، اور اگر کوئی شخص اسے ''بداء'' قرار دے کر اس پر یہ اعتراض کرنے لگے کہ اس سے معاذ اللہ خدا کی رائے میں تبدیلی لازم آتی ہے کہ اس نے ایک وقت سردی کو پسند کیا تھا، بعد میں غلطی واضح ہوئی، اور اس کی جگہ گرمی بھیج دی تو اُسے احمق کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے، بعینہٖ یہی معاملہ شرعی احکام کے نسخ کا ہے کہ اُسے ''بداء'' قرار دیکر کوئی عیب سمجھنا انتہا درجہ کی کوتاہ نظری اور حقائق سے بیگانگی ہے، چنانچہ ''نسخ'' صرف

امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا السلام کی خصوصیت نہیں، بلکہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں بھی ناسخ ومنسوخ کا سلسلہ جاری رہا ہے، جس کی بہت سی مثالیں موجودہ بائبل میں بھی ملتی ہیں، مثلاً بائبل میں ہے کہ "حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا جائز تھا، اور خود حضرت یعقوب علیہ السلام کی دو بیویاں لیّاہ اور راخیل آپس میں بہنیں تھیں (۱)، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں اسے ناجائز قرار دیدیا گیا، (۲) حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت میں ہر چلتا پھرتا جاندار حلال تھا، (۳) لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بہت سے جانور حرام کردیئے گئے، (۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں طلاق کی عام اجازت تھی (۵) لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں عورت کے زناکار ہونے کے سوا اُسے طلاق دینے کی کسی حالت میں اجازت نہیں دی گئی" (۶) غرض بائبل کے عہد نامۂ جدید وقدیم میں ایسی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں جن میں کسی پُرانے حکم کو نئے حکم کے ذریعہ منسوخ کردیا گیا۔

نسخ کے بارے میں متقدمین اور متأخرین کی اصطلاحات کا فرق

لفظ "نسخ" کے استعمال میں علماء متقدمین اور علماء متأخرین کے درمیان اصطلاح کا ایک فرق رہا ہے، جسے سمجھ لینا ضروری ہے،

متقدمین کی اصطلاح میں لفظ "نسخ" ایک وسیع مفہوم کا حامل تھا، اور اس میں بہت سی وہ صورتیں داخل تھیں جو بعد کے علماء کی اصطلاح میں "نسخ" نہیں کہلاتیں، مثلاً متقدمین کے نزدیک عام کی تخصیص اور مطلق کی تقلید وغیرہ بھی "نسخ" کے مفہوم میں داخل تھیں، چنانچہ اگر ایک آیت میں عام الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور دوسری میں انہیں کسی خاص صورت سے مخصوص کردیا گیا ہے، تو علماء متقدمین پہلی کو منسوخ اور دوسری کو ناسخ قرار دیتے ہیں جس کا

(۱) بائبل، کتاب پیدائش ۲۹: ۲۳ تا ۳۰، (۲) احبار ۱۸: ۱۸،
(۳) پیدائش ۹: ۳، (۴) احبار ۱۱: ۷ اور استثناء ۱۴: ۷
(۵) استثناء ۲۴: ۱ و ۲ (۶) انجیل متی ۱۹: ۱۵،

Marfat.com

مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ پہلا حکم بالکلیہ ختم ہو گیا، بلکہ مطلب یہ ہوتا تھا کہ پہلی آیت سے جو عموم سمجھ میں آتا تھا دوسری آیت نے اس کو ختم کر دیا ہے۔

مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ﴾

''مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرو، جب تک کہ وہ ایمان لے آئیں''

اس میں ''مشرک عورتوں'' کا لفظ عام ہے، اور اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کی مشرک عورتوں سے نکاح حرام ہے، خواہ وہ بت پرست ہوں یا اہلِ کتاب، لیکن ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے:

﴿وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾

''اور (تمہارے لئے حلال ہیں) اہلِ کتاب میں سے باعفت عورتیں''

اس سے معلوم ہوا کہ پہلی آیت میں ''مشرک عورتوں'' سے مراد وہ مشرک عورتیں تھیں جو اہلِ کتاب نہ ہوں، لہٰذا اس دوسری آیت نے پہلی آیت کے عام الفاظ میں تخصیص پیدا کر دی ہے، اور بتا دیا ہے کہ ان الفاظ سے مراد مخصوص قسم کی مشرک عورتیں ہیں، متقدمین اس کو بھی ''نسخ'' کہتے ہیں، اور پہلی آیت کو منسوخ اور دوسری کو ناسخ قرار دیتے ہیں۔

اس کے برخلاف متاخرین کے نزدیک ''نسخ'' کا مفہوم اتنا وسیع نہیں، وہ صرف اس صورت کو ''نسخ'' قرار دیتے ہیں، جس میں سابقہ حکم کو بالکلیہ ختم کر دیا گیا ہو محض عام میں تخصیص یا مطلق میں تقیید پیدا ہو جائے تو اُسے وہ ''نسخ'' نہیں کہتے، چنانچہ مذکورہ بالا مثال میں متاخرین یہ کہتے ہیں کہ اس میں نسخ نہیں ہوا، کیونکہ اصل حکم (یعنی مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت) بدستور باقی ہے، صرف اتنا ہوا ہے کہ دوسری آیت سے یہ واضح ہو گیا کہ پہلی آیت کا مفہوم اتنا عام نہیں تھا کہ اس میں اہلِ کتاب عورتیں بھی داخل ہو جائیں، بلکہ وہ صرف غیر اہلِ کتاب کے ساتھ مخصوص تھی۔

Marfat.com

اصطلاح کے اس فرقِ وجہ سے متقدمین کے نزدیک قرآن کریم میں منسوخ آیات کی تعداد بہت زیادہ تھی، اور وہ معمولی فرق کی وجہ سے ایک آیت کو منسوخ اور دوسری کو ناسخ قرار دیتے تھے، لیکن متأخرین کی اصطلاح کے مطابق منسوخ آیات کی تعداد بہت کم ہے، (۱)

قرآن کریم میں نسخ کی بحث

اس بات میں تو اُمّت کے کسی فرد کا اختلاف ہمیں معلوم نہیں ہے کہ شرعی احکام نسخ کا سلسلہ پچھلی اُمّتوں کے وقت سے جاری رہا ہے، اور امتِ محمدیہ علٰی صاحبہا السّلام میں بہت سے احکام منسوخ ہوئے ہیں، مثلاً پہلے حکم یہ تھا کہ نماز میں بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھی جائے، بعد میں اس حکم کو منسوخ کرکے کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیدیا گیا، اس میں مسلمانوں میں سے کسی کا اختلاف نہیں ہے، (۲)

لیکن اس میں آراء کا کچھ اختلاف ہے کہ قرآن کریم میں نسخ ہوا ہے یا نہیں؟ دوسرے الفاظ میں یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا ہے کہ کیا قرآن کریم میں کوئی ایسی آیت موجود ہے جس کا حکم منسوخ ہوچکا ہو اور اس کی تلاوت اب بھی کی جاتی ہو؟ جمہور اہلِ سنت کا مسلک یہ ہے کہ قرآن کریم میں ایسی آیات موجود ہیں جن کا حکم منسوخ ہوچکا ہے، لیکن معتزلہ میں سے ابو مسلم اصفہانی کا کہنا یہ ہے کہ قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہوئی، بلکہ تمام آیات اب بھی واجب العمل ہیں، ابو مسلم اصفہانی کی اتباع میں بعض دوسرے حضرات نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے، اور ہمارے زمانے میں اکثر تجدّد پسند حضرات اسی کے قائل ہیں، چنانچہ جن آیتوں میں نسخ معلوم ہوتا ہے یہ حضرات ان کی ایسی تشریح کرتے ہیں جس سے نسخ تسلیم نہ کرنا پڑے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ موقف دلائل کے لحاظ سے کمزور ہے، اور اسے اختیار کرنے کے بعد بعض قرآنی آیات کی تفسیر میں ایسی کھینچ تان کرنی پڑتی ہے جو اصولِ تفسیر کے بالکل خلاف ہے،

جو حضرات قرآن کریم میں نسخ کے وجود کے قائل نہیں ہیں، دراصل اُن کے ذہن میں یہ

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الاتقان، ص۲۲ ج ۲

(۲) جمال الدین القاسمیؒ: تفسیر القاسمی، ص۳۲ ج۱، عیسیٰ البابی الحلبی مصر ۱۳۷۶ھ

Marfat.com

بات بیٹھ گئی ہے کہ ''نسخ'' ایک عیب ہے جس سے قرآن کریم کو خالی ہونا چاہئے، حالانکہ آپ پیچھے دیکھ چکے ہیں کہ ''نسخ'' کو عیب سمجھنا کتنی کوتاہ نظری کی بات ہے، پھر عجیب بات یہ ہے کہ ابومسلم اصفہانی اور ان کے متبعین عموماً یہود ونصاریٰ کی طرح اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے احکام میں نسخ ہوا ہے بلکہ وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں نسخ نہیں ہے، اب اگر ''نسخ'' کوئی عیب ہے تو غیر قرآنی احکام میں یہ عیب کیسے پیدا ہوگیا؟ جبکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے احکام ہیں، اور اگر یہ کوئی عیب نہیں ہے تو جو چیز غیر قرآنی احکام میں عیب نہیں تھی وہ قرآنی احکام میں عیب کیونکر قرار دیگئی؟ کہا جاتا ہے کہ یہ بات حکمتِ الٰہی کے خلاف معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کریم میں کوئی آیت محض تبرّکاً تلاوت کے لئے باقی رہ جاوے اور اس پر عمل کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہو، (۱)

لیکن نہ جانے اس بات کو حکمتِ الٰہی کے خلاف کس بناء پر قرار دیدیا گیا ہے، حالانکہ قرآن کریم منسوخ الحکم آیات کے باقی رہنے میں بہت سی مصلحتیں ہوسکتی ہیں، مثلاً اس سے احکام شرعیہ میں تدریج کی حکمت واضح ہوتی ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنے احکام کا پابند بنانے میں کس حکیمانہ طریقے سے کام لیا ہے؟ نیز اس سے شرعی احکام کی تاریخ کا علم ہوتا ہے، اور یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر کب اور کیا حکم نافذ کیا گیا تھا؟ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی مقامات پر پچھلی اُمتوں کے اُن احکام کا ذکر فرمایا ہے جو اُمّتِ محمدیہؐ (علیٰ صاحبہا السلام) میں منسوخ ہوگئے، مثلاً ارشاد ہے:

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ﴾ (انعام: ۱۴۶)

''اور یہودیوں پر ہم نے ہر ناخن والے جانور کو حرام کر دیا تھا، اور گائے اور بکری کے اجزاء میں سے ان کی چربیاں ہم نے حرام کی تھیں، البتہ

(۱) قرآنِ محکم از مولانا عبدالصمد رحمانی صفحہ ۱۲۰ مجلس معارف القرآن، دیوبند ۱۳۸۶ھ

Marfat.com

جو چربی ان کی پشت پر یا آنتوں پر لگی ہو، یا جو کسی ہڈی سے ملی ہوئی ہو وہ مستثنیٰ تھی۔“

ظاہر ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک منسوخ حکم کا تذکرہ اسی لئے فرمایا ہے کہ اس سے عبرت وموعظت حاصل کی جائے، اگر قرآن کریم میں بعض منسوخ الحکم آیات کی تلاوت اسی مقصد کے لئے باقی رکھی گئی ہو تو اس میں کونسی بات حکمتِ الٰہیہ کے خلاف ہے؟ پھر یہ دعویٰ کون کرسکتا ہے کہ اُسے اللہ تعالیٰ کے ہر کام کی حکمت معلوم ہے؟ یا وہ ہر آیتِ قرآنی کے بارے میں جانتا ہے کہ اُس کے نزول میں کیا کیا حکمتیں تھیں؟ اگر کسی شخص کا یہ دعویٰ درست نہیں ہوسکتا، اور یقیناً نہیں ہوسکتا، تو پھر اللہ تعالیٰ کے کسی کام سے محض اس بناء پر کیسے انکار کیا جاسکتا ہے کہ اس کی حکمت ہمیں معلوم نہیں ہوسکی، جبکہ اس کام کا وقوع شرعی دلائل سے ثابت ہو چکا ہو،

لہٰذا حقیقت یہ ہے کہ جو حضرات قرآن کریم میں نسخ کے قائل نہیں ہیں، اُن کا وہ بنیادی مفروضہ ہی سرے سے غلط ہے، جس پر انہوں نے اپنے نظریئے کی ساری عمارت کھڑی کی ہے، انہوں نے بعض قرآنی آیات کو دور دراز کے معانی صرف اس لئے پہنائے ہیں کہ اُن کی نظر میں ”نسخ“ ایک عیب ہے، جس سے وہ قرآن کریم کو خالی دیکھنا اور دکھانا چاہتے تھے، اور اگر اُن پر یہ بات واضح ہو جائے کہ نسخ کوئی عیب نہیں بلکہ حکمتِ الٰہی کا عین تقاضا ہے تو وہ ایسی آیتوں کی تفسیر وہی کریں گے جو عام طور سے کی جاتی ہے، کیونکہ ظاہر اور متبادر تفسیر وہی ہے،

قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ، اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ (البقرہ: ۱۰۶)

”ہم جب بھی کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں یا اسے بھلا دیتے ہیں تو اُس سے بہتر یا اُسی جیسی (آیت) لے آتے ہیں، کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے؟“

Marfat.com

اس آیت کو جو شخص بھی غیر جانب داری کے ساتھ خالی الذہن ہو کر پڑھے گا وہ اس سے یہ نتیجہ نکالے بغیر نہیں رہ سکتا کہ قرآن کریم کی آیات میں نسخ کا سلسلہ خود قرآن کریم کی تصریح کے مطابق جاری رہا ہے، لیکن ابو مسلم اصفہانی اور اُن کے ہمنوا جو نسخ کو شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک عیب سمجھ کر قرآن کریم کو اس سے خالی قرار دینا چاہتے ہیں، وہ مذکورہ آیت میں دُور از کار تاویلات کرتے ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ اس آیت میں ایک فرضی صورت کا بیان کیا گیا ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض ہم نے کسی آیت کو منسوخ کیا تو اُس سے بہتر یا اس جیسی آیت نازل کردیں گے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعہ میں بھی کوئی آیت ضرور منسوخ کی جائے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسا ایک آیت میں ارشاد ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ط

(اے پیغمبر!) کہہ دو کہ: ''اگر خدائے رحمٰن کی کوئی اولاد ہوتی تو سب سے پہلا عبادت کرنے والا میں ہوتا۔''

منکرینِ نسخ کہتے ہیں کہ جس طرح یہاں ایک فرضی صورت کا بیان ہے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعہ میں بھی اللہ تعالیٰ کا کوئی لڑکا ہوگا، اسی طرح مذکورہ بالا آیت میں نسخ کا ذکر صرف ایک فرضی صورت کے طور پر کیا گیا ہے جس کا واقعہ میں موجود ہونا ضروری نہیں، (۱)

لیکن آیت مذکورہ کی یہ تشریح ایک دوراز کار تاویل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اس لئے کہ اگر قرآن کریم کی آیات میں کبھی نسخ واقع نہیں ہونا تھا تو اللہ تعالیٰ کو بطور فرض ہی سہی، اس کا ذکر فرمانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ قرآن کریم کا یہ منصب ہرگز نہیں ہے کہ جو واقعات کبھی پیش نہ آنے والے ہوں، انہیں بلاوجہ فرض کر کے اُن پر کوئی حکم لگائے، رہی اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ الخ والی آیت، سو اس میں اور نسخ کی مذکورہ آیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اللہ تعالیٰ کے (معاذ اللہ) کسی لڑکے کی پیدائش ایک بالکل ناممکن چیز ہے، لہٰذا اس آیت کو پڑھنے والا ہر شخص فوراً یہ سمجھ لیگا کہ یہ بات محض ایک مفروضہ کے طور پر کہی گئی ہے، جس کا اصل

---

(۱) قرآنِ محکم از مولانا عبدالصمد رحمانی ص ۲۱ مجلس معارف القرآن، دیوبند،

Marfat.com

مقصد یہ ہے کہ اگر بالفرض اللہ تعالیٰ کے اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرتا، لیکن چونکہ اس کی اولاد نہیں ہو سکتی اس لئے اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کا سوال ہی نہیں ہے، اس کے برعکس "نسخ" کا وقوع خود ابو مسلم اصفہانی کے نزدیک عقلی طور پر ناممکن نہیں ہے اس لئے اُسے محض ایک فرضی صورت قرار دینے کے کوئی معنیٰ نہیں ہیں،

یہ بات مذکورہ آیت کے شانِ نزول سے اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے، کتب تفسیر میں مروی ہے کہ بعض کفار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض کیا تھا کہ آپ اپنے متبعین کو ایک بات کا حکم دیتے ہیں پھر اس کی ممانعت کر دیتے ہیں اور کوئی نیا حکم لے آتے ہیں، اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی،(۱) اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس آیت میں نسخ کو تسلیم کر کے اس کی حکمت بیان کی گئی ہے، نسخ کا انکار نہیں کیا گیا،

منسوخ آیاتِ قرآنی کی تعداد

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں متقدمین کی اصطلاح میں نسخ کا مفہوم بہت وسیع تھا، اسی لئے انہوں نے منسوخ آیات کی تعداد بہت زیادہ بتائی ہے، لیکن علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے متاخرین کی اصطلاح کے مطابق لکھا ہے کہ پورے قرآن میں کل اُنیس آیتیں منسوخ ہیں،(۲) پھر آخری دَور میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان انیس آیتوں پر مفصل تبصرہ کر کے صرف پانچ آیتوں میں نسخ تسلیم کیا ہے، اور باقی آیات میں اُن تفسیروں کو ترجیح دی ہے جن کے مطابق انہیں منسوخ ماننا نہیں پڑتا، ان میں سے اکثر آیتوں کے بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ کی توجیہات نہایت معقول اور قابل قبول ہیں، لیکن بعض توجیہات سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے، بہر حال! جن پانچ آیتوں کو انہوں نے منسوخ تسلیم کیا ہے وہ یہ ہیں:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَ نِ

---

(۱) روح المعانی، علامہ آلوسیؒ ص۳۵۱ ج۱، (۲) الاتقان، علامہ سیوطیؒ ص۲۲ ج۲،

Marfat.com

الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴾

(البقرہ:۱۸۰)

”تم پر فرض کیا گیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی اپنے پیچھے مال چھوڑ کر جانے والا ہو تو جب اس کی موت کا وقت قریب آجائے وہ اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے حق میں دستور کے مطابق وصیت کرے، یہ متقی لوگوں کے ذمے ایک لازمی حق ہے۔“

یہ آیت اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب میراث کے احکام نہیں آئے تھے، اور اس میں ہر شخص کے ذمہ یہ فرض قرار دیا گیا تھا کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے ترکہ کے بارے میں وصیّت کر کے جائے کہ اس کے والدین یا دوسرے رشتہ داروں کو کتنا کتنا مال تقسیم کیا جائے؟ بعد میں آیتِ میراث یعنی يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْ أَوْلَادِكُمْ نے اس کو منسوخ کر دیا، اور اللہ تعالیٰ نے تمام رشتہ داروں میں ترکہ کی تقسیم کا ایک ضابطہ خود متعیّن کر دیا، اب کسی شخص پر مرنے سے پہلے وصیّت کرنا فرض نہیں رہا۔

۲.....سورۂ انفال میں ارشاد ہے:

﴿ إِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْا أَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴾ (الانفال: ۶۵)

”اگر تمہارے بیس آدمی ایسے ہوں گے جو ثابت قدم رہنے والے ہوں تو وہ دو سو پر غالب آجائیں گے، اور اگر تمہارے سو آدمی ہوں گے تو وہ کافروں کے ایک ہزار پر غالب آجائیں گے، کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔“

یہ آیت اگرچہ بظاہر ایک خبر ہے، لیکن معنیٰ کے لحاظ سے ایک حکم ہے، اور وہ یہ کہ مسلمانوں کو اپنے سے دس گنا زائد دشمن کے مقابلہ سے بھاگنا جائز نہیں، یہ حکم اگلی آیت کے ذریعہ

Marfat.com

منسوخ کردیا گیا:

﴿اَلْاٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ، فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصَّابِرِيْنَ﴾ (الانفال: ٦٦)

''لواَب اللہ نے تم سے بوجھ ہلکا کردیا، اوراُس کے علم میں ہے کہ تمہارے اندر کچھ کمزوری ہے، لہٰذا (اب حکم یہ ہے کہ) اگر تمہارے ثابت قدم رہنے والے سو آدمی ہوں تو وہ دوسو پر غالب آجائیں گے، اور اگر تمہارے ایک ہزار آدمی ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے دوہزار پر غالب آجائیں گے، اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے۔''

اس آیت نے پہلی آیت کے حکم میں تخفیف پیدا کردی، اور دس گنے دشمن کے بجائے دوگنے کی حد مقرر کردی، کہ اس حد تک راہ فرار اختیار کرنا جائز نہیں،

۳...... تیسری آیت جسے حضرت شاہ صاحبؒ نے منسوخ قرار دیا ہے، سورۂ احزاب کی یہ آیت ہے:

﴿لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ﴾ (الاحزاب: ۵۱)

''اس کے بعد دوسری عورتیں تمہارے لئے حلال نہیں ہیں، اور نہ یہ جائز ہے کہ تم ان کے بدلے کوئی دوسری بیویاں لے آؤ چاہے اُن کی خوبی تمہیں پسند آئی ہو۔''

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید نکاح کرنے سے منع فرمادیا گیا تھا، بعد میں یہ حکم منسوخ کردیا گیا اور اس کی ناسخ آیت وہ ہے، جو قرآن کریم کی موجودہ ترتیب میں مذکورہ بالا آیت سے پہلے مذکور ہے، یعنی:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْۤ اٰتَيْتَ

اُجُورَهُنَّ الخ ﴾ (الاحزاب: ۵۰)

"اے نبی! ہم نے تمہارے لئے تمہاری وہ بیویاں حلال کردی ہیں جن کو تم نے اُن کا مہر ادا کردیا ہے ......"

حضرت شاہ صاحبؒ وغیرہ کا کہنا ہے کہ اس کے ذریعہ سابقہ ممانعت منسوخ ہوگئی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں نسخ یقینی نہیں ہے، بلکہ اس کی وہ تفسیر بھی بڑی حد تک بے تکلف اور سادہ ہے، جو حافظ ابن جریر طبریؒ نے اختیار کی ہے، یعنی یہ کہ یہ دونوں آیتیں اپنی موجودہ ترتیب کے مطابق ہی نازل ہوئی ہیں، یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَکَ اَزْوَاجَکَ الخ والی آیت میں اللہ تعالیٰ نے کچھ مخصوص عورتوں کا ذکر فرمایا ہے کہ اُن کے ساتھ نکاح آپؐ کے لئے حلال ہے، پھر اگلی آیت لَایَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ میں ارشاد فرمایا ہے کہ ان کے علاوہ دوسری عورتیں آپؐ کے لئے حلال نہیں۔(۱)

۴...... چوتھی آیت جو حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک منسوخ ہے، سورۂ مجادلہ کی یہ آیت:

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىکُمْ صَدَقَةً ذٰلِکَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَاَطْهَرُ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴾ (المجادلہ: ۱۲)

"اے ایمان والو! جب تم رسول سے تنہائی میں کوئی بات کرنا چاہو تو اپنی اس تنہائی کی بات سے پہلے کچھ صدقہ کردیا کرو، یہ طریقہ تمہارے حق میں بہتر اور زیادہ ستھرا طریقہ ہے، ہاں اگر تمہارے پاس (صدقہ کرنے کے لئے) کچھ نہ ہو تو اللہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے"

یہ آیت اگلی آیت سے منسوخ ہوگئی:

﴿ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىکُمْ صَدَقٰتٍ فَاِذْلَمْ

(۱) تفسیر ابن جریر،

Marfat.com

تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ﴾ (المجادلہ:۱۳)

''کیا تم اس بات سے ڈر گئے کہ اپنی تنہائی کی بات سے پہلے صدقات دیا کرو؟ اب جبکہ تم ایسا نہیں کر سکے، اور اللہ نے تمہیں معاف کر دیا تو تم نماز قائم کرتے رہو، اور زکوٰۃ دیتے رہو، اور اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرتے رہو۔''

اس طرح سرگوشی سے پہلے صدقہ کرنے کا حکم منسوخ کر دیا گیا،

۵..... پانچویں آیت سورۂ مزمّل کی مندرجہ ذیل آیت ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ﴾

''اے چادر میں لپٹنے والے! رات کا تھوڑا حصہ چھوڑ کر باقی رات میں (عبادت کے لئے) کھڑے ہو جایا کرو، رات کا آدھا حصہ یا آدھے سے کچھ کم کرلو۔'' (المزمل:۱)

اس آیت میں رات کے کم از کم آدھے حصہ میں تہجد کی نماز کا حکم دیا گیا تھا، بعد میں اگلی آیتوں نے اس میں آسانی پیدا کر کے سابقہ حکم کو منسوخ کر دیا، وہ آیتیں یہ ہیں:

﴿ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ﴾ (المزمل : ۲۰)

''اللہ کو معلوم ہے کہ تم اُس کا ٹھیک حساب نہیں رکھ سکو گے، اس لئے اُس نے تم پر عنایت فرما دی ہے، اب تم اتنا قرآن پڑھ لیا کرو جتنا آسان ہو۔''

حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق یہ ہے کہ تہجد کا حکم واجب تو پہلے بھی نہیں تھا، لیکن پہلے اس میں زیادہ تاکید بھی تھی اور اس کا وقت بھی زیادہ وسیع تھا، بعد میں تاکید بھی کم ہو گئی، اور وقت کی

Marfat.com

اتنی پابندی بھی نہ رہی۔

یہ ہیں وہ پانچ آیتیں جن میں حضرت شاہ صاحبؒ کے قول کے مطابق نسخ ہوا ہے، لیکن یہ واضح رہے کہ یہ پانچ مثالیں صرف اس صورت کی ہیں جس میں ناسخ اور منسوخ دونوں قرآن کریم کے اندر موجود ہیں، اوراس کے علاوہ ایسی مثالیں قرآن کریم میں باتفاق بہت سی ہیں جن میں ناسخ تو قرآن میں موجود ہے، لیکن منسوخ موجود نہیں مثلاً تحویل قبلہ کی آیات وغیرہ،

نتیجہ بحث

مذکورہ بالا بحث سے ہمارا مقصد دراصل یہ بتانا ہے کہ قرآن کریم کی آیتوں میں نسخ کا وجود (معاذ اللہ) کوئی عیب نہیں ہے، جس سے قرآن کریم کو خالی دکھانے کی کوشش کی جائے، بلکہ یہ حکمتِ الٰہی کا عین تقاضا ہے، لہٰذا کسی آیت کی کسی تفسیر کو محض اس بناء پر رَد نہیں کرنا چاہئے کہ اس کے مطابق قرآن میں نسخ لازم آتا ہے، بلکہ اصولِ تفسیر کے مطابق جو تفسیر راجح ہوائسے اختیار کر لینے میں کوئی قباحت نہیں، خواہ اس میں آیت کو منسوخ قرار دینا پڑتا ہو، واللہ سبحانہ اعلم

Marfat.com

باب پنجم

تاریخ حفاظتِ قرآن

نزولِ قرآن کی تاریخ اوراس کے متعلقہ مباحث سے ضروری حد تک فارغ ہونے کے بعداب "تاریخِ حفاظتِ قرآن" کے موضوع پر گفتگو پیش نظر ہے، جس میں یہ بتایا جائے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد کے زمانوں میں قرآنِ کریم کی حفاظت کس طرح کی گئی؟ اُسے کس طرح لکھا گیا؟ اور یہ کوششیں کتنے مراحل سے گذری ہیں؟ نیز اس سلسلے میں غیر مسلموں اور ملحدوں کی طرف سے جو شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اُن کا انشاءاللہ مکمل اور اطمینان بخش جواب دیا جائیگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حفاظتِ قرآن

قرآن کریم چونکہ ایک ہی دفعہ پورا کا پورا نازل نہیں ہوا، بلکہ اس کی مختلف آیات ضرورت اور حالات کی مناسبت سے نازل کی جاتی رہی ہیں، اس لئے عہدِ رسالتؐ میں یہ ممکن نہیں تھا کہ شروع ہی سے اُسے کتابی شکل میں لکھکر محفوظ کرلیا جائے، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو دوسری آسمانی کتابوں کے مقابلہ میں یہ امتیاز عطا فرمایا تھا کہ اس کی حفاظت قلم اور کاغذ سے زیادہ حفّاظ کے سینوں سے کرائی چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ سے فرمایا:

Marfat.com

ومنزل علیک کتاباً لایغسلہ الماءُ

''یعنی میں تم پر ایک ایسی کتاب نازل کرنے والا ہوں جسے پانی نہیں دھو سکے گا۔''

مطلب یہ ہے کہ دنیا کی عام کتابوں کا حال تو یہ ہے کہ وہ دنیوی آفات کی وجہ سے ضائع ہو جاتی ہیں، چنانچہ تورات، انجیل، اور دوسرے آسمانی صحیفے اسی طرح نابود ہو گئے لیکن قرآن کریم کو سینوں میں اس طرح محفوظ کر دیا جائے گا کہ اس کے ضائع ہونیکا کوئی خطرہ باقی نہ رہے،(۱) چنانچہ ابتدائے اسلام میں قرآن کریم کی حفاظت کے لئے سب سے زیادہ زور حافظہ پہ دیا گیا، شروع شروع میں جب وحی نازل ہوتی تو آپؐ اس کے الفاظ کو اسی وقت دُہرانے لگتے تھے، تاکہ وہ اچھی طرح یاد ہو جائیں، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ﴾

''(اے پیغمبر!) تم اس قرآن کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لئے اپنی زبان کو ہلایا نہ کرو، یقین رکھو کہ اس کو یاد کرانا اور پڑھوانا ہماری ذمہ داری ہے۔'' (القیٰمہ:۱۶،۱۷)

اس آیت میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ قرآن کریم کو یاد رکھنے کے لئے آپؐ کو عین نزولِ وحی کے وقت جلدی جلدی الفاظ دُہرانے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ خود آپؐ میں ایسا حافظہ پیدا فرمادے گا کہ ایک مرتبہ نزولِ وحی کے بعد آپؐ اُسے بھول نہیں سکیں گے، چنانچہ یہی ہوا کہ اِدھر آپؐ پر آیاتِ قرآنی نازل ہوتیں اور اُدھر وہ آپؐ کو یاد ہو جاتیں، اس طرح سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سینۂ مبارک قرآن کریم کا سب سے زیادہ محفوظ گنجینہ تھا، جس میں کسی ادنیٰ غلطی یا ترمیم و تغیر کا امکان نہیں تھا، پھر آپؐ مزید احتیاط کے طور پر ہر سال رمضان کے مہینے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کو قرآن سُنایا کرتے تھے، اور جس سال آپؐ کی وفات ہوئی اس سال آپؐ نے دو مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ دَور کیا،(۲)

(۱) النشر فی القراآت العشر لابن الجزریؒ، ص۶ ج۱،
(۲) صحیح بخاریؒ مع فتح الباری، ص۳۶ ج۹،

Marfat.com

پھر آپ صحابہ کرامؓ کو قران کریم کے صِرف معانی کی تعلیم ہی نہیں دیتے تھے، بلکہ انہیں اُس کے الفاظ بھی یاد کراتے تھے، اور خود صحابہ کرامؓ کو قرآن کریم سیکھنے اور اسے یاد رکھنے کا اتنا شوق تھا کہ ہر شخص اس معاملہ میں دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا تھا، بعض عورتوں نے اپنے شوہروں سے سوائے اس کے کوئی مہر طلب نہیں کیا کہ وہ انہیں قرآن کریم کی تعلیم دیں گے، سینکڑوں صحابہؓ نے اپنے آپ کو ہرِ غم ماسواسے آزاد کر کے اپنی زندگی اسی کام کے لئے وقف کر دی تھی، وہ قرآن کریم کو نہ صرف یاد کرتے بلکہ راتوں کو نماز میں اُسے دُہراتے رہتے تھے، حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص ہجرت کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ آتا تو آپؐ اُسے ہم انصاریوں میں سے کسی کے حوالے فرما دیتے تا کہ وہ اسے قرآن سکھائے، اور مسجد نبویؐ میں قرآن سیکھنے اور سکھانے والوں کی آوازوں کا اتنا شور ہونے لگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تاکید فرمانی پڑی کہ اپنی آوازیں پست کرو، تا کہ کوئی مغالطہ پیش نہ آئے، (۱)

اہلِ عرب اپنی حیرت انگیز قوّتِ حافظہ کی وجہ سے دنیا بھر میں ممتاز تھے، اور انہیں صدیوں تک گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکنے کے بعد قرآن کریم کی وہ منزلِ ہدایت نصیب ہوئی تھی جسے وہ اپنی زندگی کی سب سے عزیز پونجی تصور کرتے تھے، اس لئے انہوں نے اسے یاد رکھنے کے لئے کیا کچھ اہتمام کیا ہوگا؟ اس کا اندازہ ہر وہ شخص کرسکتا ہے جو اُن کے مزاج اور افتادِ طبع سے واقف ہے، چنانچہ تھوڑی ہی مدّت میں صحابہ کرامؓ کی ایک ایسی بڑی تعداد تیار ہوگئی جسے قرآن کریم ازبر یاد تھا، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حفاظِ قرآن کی اس جماعت میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت سعدؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت حذیفہ بن یمانؓ، حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عمرو بن عاصؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن السائبؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت اُمِ

(۱) مناھل العرفان، ص ۲۳۴ ج ۱،

Marfat.com

سلمہؓ، حضرت امِّ ورقہؓ، حضرت اُبی بن کعبؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت، ابوحلیمہ معاذؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابوالدرداءؓ، حضرت مجمع بن جاریہؓ، حضرت مسلمہ بن مخلدؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عقبہ بن عامرؓ، حضرت تمیم دارمیؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، اور حضرت ابوزید رضی اللہ عنہم جیسے حضرات شامل تھے، (۱)

پھر یہ تو صرف اُن صحابہؓ کرامؓ کے اسماء گرامی ہیں جن کا نام "حافظِ قرآن" کی حیثیت سے روایات میں محفوظ رہ گیا، ورنہ ایسے صحابہؓ تو بے شمار ہوں گے جنہوں نے پورا قرآن کریم یاد کیا تھا، لیکن اس حیثیت سے اُن کا نام روایات میں محفوظ نہیں رہ سکا، اس کی شہادت اس بات سے ملتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اوقات ایک قبیلے میں ستر قاری قرآن کی تعلیم کے لئے بھیجے ہیں، چنانچہ صرف غزوۂ بیر معونہ کے موقع پر ستر قراء صحابہؓ کے شہید ہونے کا ذکر روایات میں موجود ہے، اور حفاظ صحابہؓ کی تقریباً اتنی ہی تعداد آپؐ کے بعد جنگِ یمامہ میں شہید ہوئی، (۲) بلکہ ایک روایت تو یہ ہے کہ جنگ یمامہ کے موقع پر سات سو قراء اصحابہؓ شہید ہوئے تھے، (۳)

اس کے علاوہ یہ تو صرف اُن صحابہؓ کا ذکر ہے جن کو پورا قرآن کریم یاد تھا، اور ایسے صحابہؓ کا تو کوئی شمار ہی نہیں ہے جنہوں نے قرآن کریم کے متفرق حصے یاد کر رکھے تھے۔ (۴)

غرض ابتدائے اسلام میں قرآن کریم کی حفاظت کے لئے بنیادی طریقہ یہی اختیار کیا گیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ صحابہؓ کو یاد کرا دیا گیا، اس دَور کے حالات کے پیشِ نظر یہی طریقہ سب سے زیادہ محفوظ اور قابلِ اعتماد تھا، اس لئے کہ اُس زمانے میں لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی، کتابوں کو شائع کرنے کے لئے پریس وغیرہ کے ذرائع موجود نہ تھے، اس لئے اگر صرف لکھنے پر اعتماد کیا جاتا تو نہ قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہو سکتی، اور نہ اُس کی قابلِ

(۱) النشر فی القرآت العشر، ص۶ ج۱، الاتقان، ص۷۳ ۲۰ ج او تاریخ القرآن للکردی، ص۶۰،

(۲) الاتقان، ص۷۳ ج۱ (۳) عمدۃ القاری ص۱۶ و۱۷ ج۲۰ مطبوعہ دمشق،

(۴) البرهان فی علوم القرآن للزرکشی ص۲۴۱ تا ۲۴۳، ج۱،

Marfat.com

اعتماد حفاظت، اس کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اہلِ عرب کو حافظہ کی ایسی قوت عطا فرمادی تھی، کہ ایک ایک شخص ہزاروں اشعار کا حافظ ہوتا تھا، اور معمولی معمولی دیہاتیوں کو اپنے اور اپنے خاندان ہی کے نہیں، اُن کے گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد ہوتے تھے، اس لئے قرآن کریم کی حفاظت میں اس قوتِ حافظہ سے کام لیا گیا، اور اسی کے ذریعہ قرآن کریم کی آیات اور سورتیں عرب کے گوشے گوشے میں پہونچ گئیں،

اس طریقہ سے قرآن کریم کی نشر واشاعت کس تیزی کے ساتھ ہوئی؟ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ حضرت عمرو بن سلمہؓ عہدِ رسالتؐ کے ایک کمسن صحابی تھے، ان کا گھر ایک چشمہ کے کنارے واقع تھا، جہاں آنے جانے والے مسافر آرام کیا کرتے تھے، اُن کی عمر سات سال تھی اور ابھی مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے، لیکن آنے جانے والوں سے قرآن کریم کی مختلف آیتیں اور سورتیں سُن سُن کر انہیں مسلمان ہونے سے پہلے ہی قرآن کریم کا ایک اچھا خاصا حصہ یاد ہوگیا تھا، (۱)

عہدِ رسالتؐ میں کتابتِ قرآن

پہلا مرحلہ

حفاظتِ قرآن کا اصل مدار تو اگرچہ حافظہ پر تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی کتابت کا بھی خاص اہتمام فرمایا، کتابت کا طریقِ کار حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث میں یہ بیان فرمایا ہے کہ:

كنت اكتب الوحي لرسول الله صلى الله عليه وسلم وكان اذا نزل عليه الوحي اخذته برحاء شديدة وعرقا مثل الجمان ثم سرّى عنه ، فكنت ادخل عليه بقطعة الكتف او

---

(۱) صحیح بخاریؒ ،

کسرۃ فاکتب وھو یُملی علیّ فما افرغ حتی تکاد رجلی تنکسر من نقل القرآن حتّٰی اقول لاامشی علیٰ رِجلی ابدا فاذا فرغت قال اقرأ فأقرہ فان کان فیہ سقط اقامہ ثم اخرج بہ الی الناس، (۱)

''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وحی کی کتابت کرتا تھا، جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تو آپؐ کو سخت گرمی لگتی تھی، اور آپؐ کے جسم اطہر پر پسینہ کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے، پھر آپؐ سے یہ کیفیت ختم ہو جاتی، تو میں مونڈھے کی کوئی ہڈی (یا کسی اور چیز کا) ٹکڑا لے کر خدمت میں حاضر ہوتا آپؐ لکھواتے رہتے اور میں لکھتا جاتا، یہاں تک کہ جب میں لکھکر فارغ ہوتا تو قرآن کو نقل کرنے کے بوجھ سے مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میری ٹانگ ٹوٹنے والی ہے، اور میں کبھی چل نہیں سکوں گا، بہر حال! جب میں فارغ ہوتا تو آپؐ فرماتے: ''پڑھو!'' میں پڑھ کر سُناتا، اگر اس میں کوئی فروگذاشت ہوتی تو آپؐ اس کی اصلاح فرمادیتے، اور پھر اسے لوگوں کے سامنے لے آتے۔''

کتابتِ وحی کا کام صرف حضرت زید بن ثابتؓ ہی کے سپرد نہ تھا، بلکہ آپؐ نے بہت سے صحابہؓ کو اس مقصد کے لئے مقرر فرمایا تھا، جو حسبِ ضرورت کتابتِ وحی کے فرائض انجام دیتے تھے، کاتبینِ وحی کی تعداد چالیس تک شمار کی گئی ہے، (۲) لیکن ان میں سے زیادہ مشہور یہ

---

(۱) رواہ الطبرانیؒ فی الاوسط ورجالہ موثقون الدّان فیہ وجدت فی کتاب خالی فھو رجالہ (مجمع الزوائد نور الدین الھیثمیؒ ص۱۵۲ ج۱، باب عرض الکتاب بعد املائہ، دارالکتاب العربی، بیروت ۱۹۶۷ء (۲) علوم القرآن، صبحی صالح، ترجمہ اردو غلام احمد حریری، ص۱۰۱ بحوالہ مستشرق بلد شیر وغیر ملک برادرز لائل پور ۱۹۶۸ء،

حضرات ہیں:

میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت عبداللہ بن ابی سرح، حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت خالد بن سعید بن العاصؓ، حضرت ابان بن سعید بن العاصؓ، حضرت حنظلہ ابن الربیعؓ، حضرت معقیب بن ابی فاطمہؓ، حضرت عبداللہ بن ارقم الزہریؓ، حضرت شرحبیل بن حسنہؓ، حضرت عبداللہ (۱) بن رواحہؓ، حضرت عامر بن فہیرۃؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت ثابت بن قیس بن شماسؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، (۲)

حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپؐ کاتبِ وحی کو یہ ہدایت بھی فرمادیتے تھے کہ اسے فلاں سورۃ میں فلاں فلاں آیات کے بعد لکھا جائے، (۳) چنانچہ اُسے آپؐ کی ہدایت کے مطابق لکھ لیا جاتا تھا، اس زمانہ میں چونکہ عرب میں کاغذ کمیاب تھا، اس لئے یہ قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سِلوں، اور چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں، درخت کے پتّوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں، البتہ کبھی کبھی کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال کئے گئے ہیں، (۴)

اس طرح عہدِ رسالتؐ میں قرآن کریم کا ایک نسخہ تو وہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں لکھوایا تھا، اگرچہ وہ کتابی شکل میں نہ تھا بلکہ متفرق پارچوں کی شکل میں تھا، اس کے ساتھ ہی بعض صحابۂ کرامؓ بھی اپنی یادداشت کے لئے قرآن کریم کی آیات اپنے پاس لکھ لیتے تھے، اور یہ سلسلہ اسلام کے بالکل ابتدائی دَور سے جاری تھا جس کی شہادت اس بات سے ملتی ہے کہ حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہ بنت الخطابؓ اور بہنوئی حضرت سعید بن زیدؓ حضرت عمرؓ سے

(۱) یہاں تک کے نام فتح الباری، ص ۱۸ ج ۹ سے ماخوذ ہیں،

(۲) ان حضرات کے اسمائے گرامی کے لئے دیکھئے زاد المعاد لابن قیمؒ ص ۳۰ ج ۱ مطبعۃ میمنیہ، مصر،

(۳) فتح الباری، ص ۱۸ ج ۹ بحوالہ مسند احمدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، ابوداؤدؒ، ابن حبانؒ وحاکمؒ وصححہٗ ابن حبانؒ والحاکمؒ،

(۴) ایضاً ص ۱۱ ج ۹ وعمدۃ القاری، ص ۱۷ ج ۲۰، ادارۃ الطباعۃ المنیریہ دمشق،

Marfat.com

پہلے مسلمان ہو چکے تھے، اور جب حضرت عمرؓ انکے مسلمان ہونے کی خبر سُنکر غصہ میں بھرے ہوئے گھر میں داخل ہوئے، تو ان کے سامنے ایک صحیفہ رکھا ہوا تھا، جس میں سورۂ طٰہٰ کی آیات درج تھیں، اور حضرت خباب بن ارتؓ انہیں پڑھا رہے تھے، (۱)

اس کے علاوہ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام نے انفرادی طور پر اپنے پاس قرآن کریم کے مکمّل یا نامکمّل نسخے لکھ رکھے تھے، مثلاً صحیح بخاریؒ میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ:

انّ رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم نھٰی ان یسافر بالقران الیٰ ارض العدوّ، (۲)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کو لے کر دشمن کی زمین میں سفر کرنے سے منع فرمایا۔"

نیز معجم طبرانیؒ میں ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

قرأۃ الرجل فی غیر المصحف الف درجۃ و قرأءتہ فی المصحف تضاعف علیٰ ذلك الفی درجۃ، (۳)

"کوئی شخص قرآن کریم کے نسخہ میں دیکھے بغیر تلاوت کرے تو اس کا ثواب ایک ہزار درجہ ہے، اور اگر قرآن کے نسخہ میں دیکھ کر تلاوت کرے تو دو ہزار درجے ہے۔"

---

(۱) سنن دار قطنی ص۱۲۳ ج ۱ طبع مدینہ طیبہ، باب نہی المحدث عن مس القرآن ومجمع الزوائد، للھیثمیؒ ص۶۱ ج۹ طبع بیروت، مناقبِ عمرؓ وسیرت ابن ہشام بہامش، زاد المعاد ص۱۸۶ و ۱۸۷ ج۱، حافظ زیلعیؒ نے اس واقعہ کو سنداً جید قرار دیا ہے، (نصب الرایہ)

(۲) صحیح بخاریؒ، کتاب الجهاد، ص۴۱۹ و ۴۲۰ ج۱، اصح المطابع،

(۳) مجمع الزوائد، ص۱۶۵ ج۷ مطبوعہ بیروت، قال الهیثمیؒ رواہ الطبرانی وفیہ ابو سعید عون وثقہ ابن معد فی روایۃ وضعفہ فی اُخریٰ وبقیۃ رجالہ ثقات،

ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرامؓ کے پاس عہدِ رسالت ہی میں قرآن کریم کے لکھے ہوئے صحیفے موجود تھے، ورنہ اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن کو دیکھکر تلاوت کرنے یا اسے لے کر دشمن کے علاقہ میں جانے کا سوال ہی نہیں تھا،

حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جمعِ قرآن

دوسرا مرحلہ

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن کریم کے جتنے نسخے لکھے گئے تھے اُن کی کیفیت یہ تھی کہ یا تو وہ متفرق اشیاء پر لکھے ہوئے تھے، کوئی آیۃ چمڑے پر، کوئی درخت کے پتے پر، کوئی ہڈی پر، زیادہ مکمل نسخے نہیں تھے، کسی صحابی کے پاس ایک سورت لکھی ہوئی تھی، کسی کے پاس دس پانچ سُورتیں، اور کسی کے پاس صرف چند آیات، اور بعض صحابہؓ کے پاس آیات کے ساتھ تفسیری جملے بھی لکھے ہوئے تھے،

اس بناء پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں یہ ضروری سمجھا کہ قرآن کریم کے ان منتشر حصوں کو یکجا کر کے محفوظ کر دیا جائے، انہوں نے یہ کارنامہ جن محرّکات کے تحت اور جس طرح انجام دیا اس کی تفصیل حضرت زید بن ثابتؓ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جنگِ یمامہ کے فوراً بعد حضرت ابوبکرؓ نے ایک روز مجھے پیغام بھیج کر بُلوایا، میں اُن کے پاس پہنچا، تو وہاں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ "عمرؓ نے ابھی آکر مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ جنگِ یمامہ میں قرآن کریم کے حفاظ کی ایک بڑی جماعت شہید ہوگئی، اور اگر مختلف مقامات پر قرآن کریم کے حافظ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ ناپید نہ ہو جائے، لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ آپ اپنے حکم سے قرآن کریم کو جمع کروانے کا کام شروع کر دیں" میں نے عمرؓ سے کہا، کہ جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ ہم کیسے کریں؟ عمرؓ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے،

Marfat.com

اس کے بعد عمرؓ مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے یہاں تک کہ مجھے بھی اس پر شرح صدر ہوگیا، اوراب میری رائے بھی وہی ہے جو عمرؓ کی ہے'' اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ:

''تم نوجوان اور سمجھدار آدمی ہو، ہمیں تمہارے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں ہے، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کتابتِ وحی کا کام بھی کرتے رہے ہو، لہٰذا تم قرآن کریم کی آیتوں کو تلاش کر کے انہیں جمع کرو۔''

حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم! اگر یہ حضرات مجھے کوئی پہاڑ ڈھونے کا حکم دیتے تو مجھ پر اس کا اتنا بوجھ نہ ہوتا جتنا جمعِ قرآن کے کام کا ہوا، میں نے اُن سے کہا کہ آپ وہ کام کیسے کر رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ...... مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ اسی رائے کے لئے کھول دیا جو حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کی رائے تھی، چنانچہ میں نے قرآنی آیات کو تلاش کرنا شروع کیا، اور کھجور کی شاخوں، پتھر کی تختیوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآن کریم کو جمع کیا، (۱)

اس موقع پر جمعِ قرآن کے سلسلے میں حضرت زید بن ثابتؓ کے طریقِ کار کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے، جیسا کہ پیچھے ذکر آچکا ہے وہ خود حافظِ قرآن تھے، لہٰذا وہ اپنی یادداشت سے پورا قرآن لکھ سکتے تھے، ان کے علاوہ بھی سینکڑوں حفاظ اس وقت موجود تھے، ان کی ایک جماعت بنا کر بھی قرآن کریم لکھا جا سکتا تھا، نیز قرآن کریم کے جو مکمل نسخے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لکھ لئے گئے تھے، حضرت زیدؓ ان سے بھی قرآن کریم نقل فرما سکتے تھے، لیکن انہوں نے احتیاط کے پیش نظر ان میں سے صرف کسی ایک طریقہ پر اکتفاء نہیں فرمایا، بلکہ ان تمام ذرائع سے بیک وقت کام لے کر اُس وقت تک کوئی آیت اپنے صحیفوں میں درج نہیں کی جب تک اس کے متواتر ہونے کی تحریری اور زبانی شہادتیں نہیں مل گئیں، اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی جو آیات اپنی نگرانی میں لکھوائی

(۱) صحیح بخاریؒ مع فتح الباری، ص ۸ تا ۱۱ ج ۹،

Marfat.com

تھیں، وہ مختلف صحابہ کے پاس محفوظ تھیں حضرت زیدؓ نے اُنہیں یک جا فرمایا تاکہ نیا نسخہ ان سے ہی نقل کیا جائے، چنانچہ یہ اعلان عام کردیا گیا کہ جس شخص کے پاس قرآن کریم کی کوئی آیات لکھی ہوئی موجود ہوں وہ حضرت زیدؓ کے پاس لے آئے (۱) اور جب کوئی شخص اُن کے پاس قرآن کریم کی کوئی لکھی ہوئی آیت لے کر آتا تو وہ مندرجہ ذیل چار طریقوں سے اس کی تصدیق کرتے تھے:

۱......سب سے پہلے اپنی یادداشت سے اس کی توثیق کرتے تھے،

۲......پھر حضرت عمرؓ بھی حافظِ قرآن تھے، اور روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اُن کو بھی اس کام میں حضرت زیدؓ کے ساتھ لگا دیا تھا، اور جب کوئی شخص کوئی آیت لے کر آتا تھا تو حضرت زیدؓ اور حضرت عمرؓ دونوں مشترک طور پر اُسے وصول کرتے تھے، (۲) لہٰذا حضرت زیدؓ کے علاوہ حضرت عمرؓ بھی اپنے حافظہ سے اس کی توثیق فرماتے تھے،

۳......کوئی لکھی ہوئی آیت اُس وقت تک قبول نہ کی جاتی تھی جب تک دو قابلِ اعتبار گواہوں نے اس بات کی گواہی نہ دیدی ہو کہ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھی، علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ بظاہر یہ گواہیاں اس بات پر بھی لی جاتی تھیں کہ یہ لکھی ہوئی آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے سال آپؐ پر پیش کردی گئی تھی، اور آپؐ نے اس بات کی تصدیق فرمادی تھی کہ یہ اُن حروفِ سبعہ کے مطابق ہے جن پر قرآن کریم نازل ہوا ہے (۳) علامہ سیوطیؒ کی اس بات کی تائید متعدد روایات سے بھی ہوتی ہے،

۴......اس کے بعد اُن لکھی ہوئی آیتوں کا اُن مجموعوں کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا تھا جو مختلف صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے، (۴) امام ابوشامہؒ فرماتے ہیں کہ اس طریق کار کا مقصد یہ تھا کہ

---

(۱) فتح الباری ص۱۱ ج۹ بحوالہ ابن ابی داؤد فی کتاب المصاحف ، (۲) ایضاً بحوالۂ مذکور،
(۳) الاتقان، ص۶۰ ج۱، (۴) وانما طلب القرآن متفرقا ليعارض بالمجتمع عند من بقی ممن جمع القرآن ليشترك الجميع فی علم ماجمع (البرهان فی علوم القرآن، ص۲۳۸ ج۱)

قرآن کریم کی کتابت میں زیادہ سے زیادہ احتیاط سے کام لیا جائے، اور صرف حافظہ پر اکتفاء کرنے کے بجائے بعینہٖ اُن آیات سے نقل کیا جائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھیں، (۱)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جمع قرآن کا یہ طریق کار ذہن میں رہے تو حضرت زید بن ثابتؓ کے اس ارشاد کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ "سورۂ براءۃ کی آخری آیات لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ الخ مجھے صرف حضرت ابوخزیمہ کے پاس ملیں، اُن کے سوا کسی اور کے پاس نہیں ملیں۔" اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ یہ آیتیں سوائے حضرت ابوخزیمہؓ کے کسی اور کو یاد نہیں تھیں، یا کسی اور کے پاس لکھی ہوئی نہ تھیں، اور اُن کے سوا کسی کو اُن کا جزوِ قرآن ہونا معلوم نہ تھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھوائی ہوئی قرآن کریم کی متفرق آیتیں لے لے کر آرہے تھے اُن میں سے یہ آیتیں سوائے حضرت خزیمہؓ کے کسی کے پاس نہیں ملیں، ورنہ جہاں تک ان آیات کے جزوِ قرآن ہونے کا تعلق ہے یہ بات تواتر کے ساتھ سب کو معلوم تھی، اوّل تو جن سینکڑوں حفاظ کو پورا قرآن کریم یاد تھا، انہیں یہ آیات بھی یاد تھیں، دوسرے آیاتِ قرآنی کے جو مکمل مجموعے مختلف صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے ان میں بھی یہ آیت لکھی ہوئی تھی، لیکن چونکہ حضرت زید بن ثابتؓ نے مزید احتیاط کے لئے مذکورہ بالا ذرائع پر اکتفاء کرنے کے بجائے متفرق طور سے لکھی ہوئی آیتوں کو جمع کرنے کا بیڑا بھی اُٹھایا تھا، اس لئے انہوں نے یہ آیت اس وقت تک اس نئے مجموعے میں درج نہیں کی، جب تک اس تیسرے طریقہ سے بھی وہ آپ کو دستیاب نہیں ہوگئی، دوسری آیات کا معاملہ تو یہ تھا کہ وہ حفاظ صحابہؓ کو یاد ہونے اور عہدِ رسالتؐ کے مکمل مجموعوں میں محفوظ ہونے کے علاوہ کئی کئی صحابہؓ کے پاس الگ سے لکھی ہوئی بھی تھیں، چنانچہ ایک ایک آیت کئی کئی صحابہؓ لے کر آرہے تھے، اس کے برعکس سورۂ براءت کی یہ آخری آیات سینکڑوں صحابہؓ کو یاد تو تھیں، اور جن حضرات کے پاس آیاتِ قرآنی کے مکمل مجموعے تھے اُن کے پاس

(۱) الاتقان، ص ۶۰ ج ۱۔

لکھی ہوئی بھی تھیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں الگ لکھی ہوئی صرف حضرت ابوخزیمہؓ کے پاس ملیں کسی اور کے پاس نہیں۔(۱)

بہر حال! حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس زبردست احتیاط کے ساتھ آیاتِ قرآنی کو جمع کر کے انہیں کاغذ کے صحیفوں پر مرتّب شکل میں تحریر فرمایا، (۲) لیکن ہر سورۃ علیحدہ صحیفے میں لکھی گئی، اس لئے یہ نسخہ بہت سے صحیفوں میں مشتمل تھا، اصطلاح میں اس نسخہ کو ''اُمّ'' کہا جاتا ہے، اور اس کی خصوصیات یہ تھیں:

۱......اس نسخہ میں آیاتِ قرآنی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق مرتّب تھیں، لیکن سورتیں مرتّب نہ تھیں، ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی، (۳)

۲......اس نسخہ میں ساتوں حروف جمع تھے، (۴)

۳......یہ نسخہ خطِ حیری میں لکھا گیا تھا، (۵)

۴......اس میں صرف وہ آیتیں درج کی گئی تھیں جنکی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی تھی،

۵......اس کو لکھوانے کا مقصد یہ تھا کہ ایک مرتّب نسخہ تمام امّت کی اجماعی تصدیق کے ساتھ تیار ہو جائے، تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی طرف رجوع کیا جا سکے،

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے جمع قرآن سے متعلق یہ تفصیلات ذہن میں رہیں تو اس روایت کا مطلب بھی اچھی طرح سمجھ میں آ جاتا ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد حضرت علیؓ نے قرآن کریم جمع کر لیا تھا، اس لئے کہ جہاں تک آیاتِ قرآنی کے انفرادی مجموعوں کا تعلق ہے وہ صرف حضرت علیؓ نے ہی نہیں اور بھی متعدد صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے، لیکن ایسا معیاری نسخہ جو پوری امّت کی اجماعی تصدیق سے مرتّب

---

(۱) البرهان فی علوم القرآن، ص ۲۳۴ و ۲۳۵ ج ۱،

(۲) عن سالم قال جمع ابوبکر القرآن فی قراطیس (الاتقان ص ۶۰ ج ۱) ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ نسخہ بھی چمڑے کے پارچوں پر لکھا گیا تھا لیکن حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تردید کی ہے، (ایضاً)

(۳) الاتقان ۶۰ ج ۱، (۴) مناهل العرفان، ص ۲۴۶ ج ۱ و تاریخ القرآن للکردی ص ۲۸ (۲)

(۵) تاریخ القرآن از عبدالصمد صارم، ص ۴۳ مطبوعہ لاہور ۱۹۶۳ء

Marfat.com

کیا گیا ہو سب سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تیار کروایا،

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لکھوائے ہوئے یہ صحیفے آپ کی حیات میں آپ کے پاس رہے، پھر حضرت عمرؓ کے پاس رہے، حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد اُن کی وصیت کے مطابق انہیں اُمُ المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس منتقل کر دیا گیا،(۱) پھر مروان بن حکم نے اپنے عہدِ حکومت میں حضرت حفصہؓ سے یہ صحیفے طلب کیے تو انہوں نے دینے سے انکار کر دیا، یہاں تک کہ جب حضرت حفصہؓ کی وفات ہوگئی تو مروان نے وہ صحیفے منگوائے اور انہیں اس خیال سے نذر آتش کر دیا کہ اب اس بات پر اجماع منعقد ہو چکا تھا کہ رسم الخط اور ترتیبِ سوَر کے لحاظ سے حضرت عثمانؓ کے تیار کرائے ہوئے مصاحف کی اتباع لازمی ہے، اور کوئی ایسا نسخہ باقی نہ رہنا چاہئے جو اُن کے رسم الخط اور ترتیب کے خلاف ہو،(۲)

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جمع قرآن

تیسرا مرحلہ

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اسلام عرب سے نکل کر روم اور ایران کے دور دراز علاقوں تک پہنچ چکا تھا، ہر نئے علاقہ کے لوگ جب مسلمان ہوتے تو وہ اُن مجاہدین اسلام یا اُن تاجروں سے قرآن کریم سیکھتے جن کی بدولت انہیں اسلام کی نعمت حاصل ہوئی تھی، اُدھر آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا تھا، اور مختلف صحابۂ کرامؓ نے اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف قراءتوں کے مطابق سیکھا تھا، اس لئے ہر صحابی نے اپنے شاگردوں کو اسی قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا، جس کے مطابق خود اُس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا تھا، اس طرح قراءتوں کا یہ اختلاف دور دراز ممالک تک پہنچ گیا، جب تک لوگ اس حقیقت سے واقف تھے کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، اس

(۱) فتح الباری، ص ۱۲ و ۱۳ ج ۹، (۲) ایضاً ص ۱۶،

Marfat.com

وقت تک اس اختلاف سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی، لیکن جب یہ اختلاف دور دراز ممالک میں پہنچا، اور یہ بات اُن میں پوری طرح مشہور نہ ہوسکی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، تو اُس وقت لوگوں میں جھگڑے پیش آنے لگے، بعض لوگ اپنی قراءت کو صحیح اور دوسرے کی قراءت کو غلط قرار دینے لگے، ان جھگڑوں سے ایک طرف تو یہ خطرہ تھا کہ لوگ قرآن کریم کی متواتر قراءتوں کو غلط قرار دینے کی سنگین غلطی میں مبتلا ہوں گے، دوسرے سوائے حضرت زیدؓ کے لکھے ہوئے ایک نسخہ کے جو مدینہ طیبہ میں موجود تھا، پورے عالم اسلام میں کوئی ایسا معیاری نسخہ موجود نہ تھا جو پوری امت کے لئے حجت بن سکے، کیونکہ دوسرے نسخے انفرادی طور پر لکھے ہوئے تھے، اور ان میں ساتوں حروف کو جمع کرنے کا کوئی اہتمام نہیں تھا، اس لئے اُن جھگڑوں کے تصفیہ کی کوئی قابلِ اعتماد صورت یہی تھی کہ ایسے نسخے پورے عالم اسلام میں پھیلا دیئے جائیں جن میں ساتوں حروف جمع ہوں اور انہیں دیکھکر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ کونسی قرأت صحیح اور کونسی غلط ہے؟ حضرت عثمانؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں یہی عظیم الشان کارنامہ انجام دیا،

اس کارنامہ کی تفصیل روایاتِ حدیث کے ذریعہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ آرمینیا اور آذربائیجان کے محاذ پر جہاد میں مشغول تھے، وہاں انہوں نے دیکھا کہ لوگوں میں قرآن کریم کی قراءتوں کے بارے میں اختلاف ہو رہا ہے، چنانچہ مدینہ طیبہ واپس آتے ہی وہ سیدھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہونچے، اور جا کر عرض کیا کہ امیر المؤمنین! قبل اس کے کہ یہ امت اللہ کی کتاب کے بارے میں یہود و نصاریٰ کی طرح اختلافات کا شکار ہو آپ اس کا علاج کیجئے، حضرت عثمانؓ نے پوچھا بات کیا ہے؟ حضرت حذیفہؓ نے جواب میں کہا کہ میں آرمینیہ کے محاذ پر جہاد میں مشغول تھا، وہاں میں نے دیکھا کہ شام کے لوگ اُبی بن کعبؓ کی قراءت پڑھتے ہیں جو اہلِ عراق نے نہیں سُنی ہوتی، اور اہلِ عراق عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت پڑھتے ہیں جو اہلِ شام نے نہیں سُنی ہوتی، اس کے نتیجہ میں ایک دوسرے کو کافر قرار دے رہے ہیں،

Marfat.com

حضرت عثمانؓ خود بھی اس خطرے کا احساس پہلے ہی کر چکے تھے، انہیں یہ اطلاع ملی تھی کہ خود مدینۂ طیبہ میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں، کہ قرآن کریم کے ایک معلم نے اپنے شاگردوں کو ایک قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا اور دوسرے معلّم نے دوسری قراءت کے مطابق، اس طرح مختلف اساتذہ کے شاگرد جب باہم ملتے تو ان میں اختلاف ہوتا، اور بعض مرتبہ یہ اختلاف اساتذہ تک پہنچ جاتا، اور وہ بھی ایک دوسرے کی قراءت کو غلط قرار دیتے، جب حضرت حذیفہ بن یمانؓ نے بھی اس خطرے کی طرف توجہ دلائی تو حضرت عثمانؓ نے جلیل القدر صحابہؓ کو جمع کر کے اُن سے مشورہ کیا، اور فرمایا کہ "مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ بعض لوگ ایک دوسرے سے اس قسم کی باتیں کہتے ہیں کہ میری قراءت تمہاری قراءت سے بہتر ہے، اور یہ بات کفر کی حد تک پہنچ سکتی ہے، لہٰذا آپ لوگوں کی اس بارے میں کیا رائے ہے،؟" صحابہؓ نے خود حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ "آپ نے کیا سوچا ہے؟" حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ "میری رائے یہ ہے کہ ہم تمام لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دیں، تاکہ کوئی اختلاف اور افتراق پیش نہ آئے" صحابہؓ نے اس رائے کو پسند کر کے حضرت عثمانؓ کی تائید فرمائی،

چنانچہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ "تم لوگ مدینہ طیبہ میں میرے قریب ہوتے ہوئے قرآن کریم کی قراءتوں کے بارے میں ایک دوسرے کی تکذیب اور ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہو، اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ مجھ سے دور ہیں وہ تو اور بھی زیادہ تکذیب اور اختلاف کرتے ہوں گے، لہٰذا تمام لوگ مل کر قرآن کریم کا ایسا نسخہ تیار کریں جو سب کے لئے واجب الاقتداء ہو۔"

اس غرض کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ کے پاس (حضرت ابوبکرؓ کے زمانے کے) جو صحیفے موجود ہیں وہ ہمارے پاس بھیج دیجئے، ہم اُن کو مصاحف میں نقل کر کے آپ کو واپس کر دیں گے، حضرت حفصہؓ نے وہ صحیفے حضرت عثمانؓ کے پاس بھیج دیئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چار صحابہؓ کی ایک جماعت

Marfat.com

بنائی، جو حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سعید بن العاصؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشامؓ پر مشتمل تھی، اس جماعت کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے صحیفوں سے نقل کر کے کئی ایسے مصاحف تیار کرے جن میں سورتیں بھی مرتب ہوں، ان چار صحابہؓ میں سے حضرت زیدؓ انصاری تھے، اور باقی تینوں حضرات قریشی تھے، اس لئے حضرت عثمانؓ نے اُن سے فرمایا کہ ''جب تمہارا اور زیدؓ کا قرآن کے کسی حصہ میں اختلاف ہو (یعنی اس میں اختلاف ہو کہ کونسا لفظ کس طرح لکھا جائے؟) تو اسے قریش کی زبان کے مطابق لکھنا، اس لئے کہ قرآن کریم انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔''

بنیادی طور پر یہ کام مذکورہ چار حضرات ہی کے سپرد کیا گیا تھا، لیکن پھر دوسرے صحابہؓ کو بھی ان کی مدد کے لئے ساتھ لگا دیا گیا، یہاں تک کہ ابن ابی داؤدؒ کی روایت کے مطابق ان حضرات کی تعداد بارہ تک پہنچ گئی، جن میں حضرت اُبی بن کعبؓ، حضرت کثیر بن افلحؓ، حضرت مالک بن ابی عامرؓ، حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی شامل تھے، (۱) ان حضرات نے کتابتِ قرآن کے سلسلے میں مندرجہ ذیل کام انجام دیئے:

۱...... حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جو نسخہ تیار ہوا تھا اس میں سورتیں مرتب نہیں تھیں، بلکہ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی، ان حضرات نے تمام سورتوں کو ترتیب کے ساتھ ایک ہی مصحف میں لکھا۔ (۲)

۲...... قرآن کریم کی آیات اس طرح لکھیں کہ ان کے رسم الخط میں تمام متواتر قراءتیں سما جائیں، اسی لئے اُن پر نہ نقطے لگائے گئے اور نہ حرکات (زبر، زیر، پیش) تا کہ اسے تمام متواتر قراءتوں کے مطابق پڑھا جا سکے، مثلاً ''ننشرها'' لکھا، تا کہ اسے نَنشُرُهَا اور نُنشِزُهَا دونوں طرح پڑھا جا سکے، کیونکہ یہ دونوں قراءتیں درست ہیں، (۳)

۳...... اب تک قرآن کریم کا مکمل معیاری نسخہ جو پوری امت کی اجتماعی تصدیق سے

(۱) یہ پوری تفصیل فتح الباری ص ۱۳ تا ۱۵ ج ۹ سے ماخوذ ہے، (۲) مستدرك حاكم ص ۲۲۹ ج ۲،
(۳) مناهل العرفان ص ۲۵۳ و ۲۵۴ ج ۱،

Marfat.com

مرتّب کیا گیا ہو صرف ایک تھا، ان حضرات نے اس نئے مرتّب مصحف کی ایک سے زائد نقلیں تیار کیں، عام طور سے مشہور یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے پانچ مصحف تیار کرائے تھے، لیکن ابو حاتم بجستانی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ کل سات نسخے تیار کیے گئے تھے، جن میں سے ایک مکہ مکرمہ، ایک شام، ایک یمن، ایک بحرین، ایک بصرہ اور ایک کوفہ بھیج دیا گیا، اور ایک مدینہ طیبہ میں محفوظ رکھا گیا،(۱)

۴...... مذکورہ بالا کام کرنے کے لئے ان حضرات نے بنیادی طور پر توانہی صحیفوں کو سامنے رکھا جو حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں لکھے گئے تھے، اس کے ساتھ ہی مزید احتیاط کے لئے وہی طریق کار اختیار فرمایا، جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اختیار کیا گیا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی جو متفرق تحریریں مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں، انہیں دوبارہ طلب کیا گیا اور اُن کے ساتھ ازسرِ نو مقابلہ کر کے یہ نئے نسخے تیار کئے گئے، اس مرتبہ سورۂ احزاب کی ایک آیت ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾ علیحدہ لکھی ہوئی صرف حضرت خزیمہ بن ثابت انصاریؓ کے پاس ملی، پیچھے ہم لکھ چکے ہیں کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ آیت کسی اور شخص کو یاد نہیں تھی، کیونکہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

فقدت اٰية من الاحزاب حين نسخنا المصحف قد كنت اسمعُ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقرأ بها، فالتمسناها فوجدناها مع خزيمة بن ثابت الانصاريؓ،

"مجھے مصحف لکھتے وقت سورۂ احزاب کی آیت نہ ملی جو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سُنا کرتا تھا، ہم نے اسے تلاش کیا تو وہ خزیمہ بن ثابت انصاریؓ کے پاس ملی"(۲)

اس سے صاف واضح ہے کہ یہ آیت حضرت زیدؓ اور دوسرے صحابہؓ کو اچھی طرح یاد تھی،

(۱) صحیح بخاری فتح الباری، ص ۱۷، ج ۹، (۲) صحیح بخاری مع فتح الباری، ص ۱۷، ج ۹،

Marfat.com

اسی طرح اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ یہ آیت کہیں اور لکھی ہوئی نہ تھی، کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جو صحیفے لکھے گئے ظاہر ہے کہ یہ آیت ان میں موجود تھی، نیز دوسرے صحابہؓ کے پاس قرآن کریم کے جو انفرادی طور پر لکھے ہوئے نسخے موجود تھے اُن میں یہ آیت بھی شامل تھی، لیکن چونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے کی طرح اس مرتبہ بھی اُن تمام متفرق تحریروں کو جمع کیا گیا تھا جو صحابۂ کرامؓ کے پاس لکھی ہوئی تھیں، اس لئے حضرت زیدؓ وغیرہ نے کوئی آیت اُن مصاحف میں اُس وقت تک نہیں لکھی جب تک اُن تحریروں میں بھی وہ نہ مل گئی، اس طرح دوسری آیتیں تو متعدد صحابہؓ کے پاس علیحدہ لکھی ہوئی بھی ملیں، لیکن سورۂ احزاب کی یہ آیت سوائے حضرت خزیمہ بن ثابتؓ کے کسی اور کے پاس الگ لکھی ہوئی دستیاب نہیں ہوئی۔

۵...... قرآن کریم کے یہ متعدد معیاری نسخے تیار فرمانے کے بعد حضرت عثمانؓ رضی اللہ عنہ نے وہ تمام انفرادی نسخے نذرِ آتش کر دیئے جو مختلف صحابہؓ کے پاس موجود تھے، تاکہ رسم الخط، مسلّمہ قراءتوں کے اجتماع اور سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے تمام مصاحف یکساں ہو جائیں، اور ان میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے،

حضرت عثمانؓ رضی اللہ عنہ کے اس کارنامہ کو پوری امت نے بہ نظر استحسان دیکھا، اور تمام صحابہؓ نے اس کام میں اُن کی تائید اور حمایت فرمائی، صرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اس معاملہ میں کچھ رنجش ہوئی تھی، جس کے اسباب ''سبعۃ احرف'' کی بحث میں گزر چکے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

> لا تقولوا فی عثمانؓ الّا خیراً فو اللّٰہ مافعل الذی فعل فی المصاحف الّا عن ملّا منّا، (۱)
>
> ''عثمانؓ کے بارے میں کوئی بات اُن کی بھلائی کے سوا نہ کہو، کیونکہ اللہ کی قسم انہوں نے مصاحف کے معاملہ میں جو کام کیا وہ ہم سب کی موجودگی میں (اور مشورہ سے) کیا''

(۱) فتح الباری، ص ۱۵ ج ۹، بحوالہ ابن ابی داؤدؒ بسند صحیح،

Marfat.com

تسہیلِ تلاوت کے اقدامات

چوتھا مرحلہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا کارنامے کے بعد اُمّت کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن کریم کو رسمِ عثمانی کے خلاف کسی اور طریقے سے لکھنا جائز نہیں، چنانچہ اس کے بعد تمام مصاحف اسی طریقہ کے مطابق لکھے گئے، اور صحابہؓ وتابعینؒ نے مصاحفِ عثمانی کی نقول تیار کرکر کے قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی،

لیکن ابھی تک قرآن کریم کے نسخے چونکہ نقطوں اور زیر زبر پیش سے خالی تھے، اس لئے اہلِ عجم کو اُن کی تلاوت میں دشواری ہوتی تھی، چنانچہ جب اسلام عجمی ممالک میں اور زیادہ پھیلا تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس میں نقطوں اور حرکات کا اضافہ کیا جائے، تاکہ تمام لوگ آسانی سے اس کی تلاوت کرسکیں، اس مقصد کے لئے مختلف اقدامات کئے گئے جن کی مختصر تاریخ درجِ ذیل ہے،

نقطے

اہلِ عرب میں ابتداءً حروف پر نقطے لگانے کا رواج نہیں تھا، بلکہ لکھنے والا خالی حروف لکھنے پر اکتفاء کرتا تھا، اور پڑھنے والے اس طرز کے اتنے عادی تھے کہ انہیں بغیر نقطوں کی تحریر پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی، سیاق وسباق کی مدد سے مشتبہ حروف میں امتیاز بھی بآسانی ہوجاتا تھا، بلکہ بسا اوقات نقطے ڈالنے کو معیوب سمجھا جاتا تھا، مؤرخ مدائنیؒ نے ایک ادیب کا مقولہ نقل کیا ہے کہ:

كثرة النّقط فى الكتاب سوء ظن بالمكتوب اليه (۱)

''خط میں کثرت سے نقطے ڈالنا مکتوب الیہ (کی فہم) سے بدگمانی کے

(۱) صبح الاعشیٰ للقلقشندی، ص۱۵۴ ج۳ مطبعة امیریه، قاهره ۱۳۳۲ھ،

Marfat.com

مرادف ہے۔"

چنانچہ مصاحفِ عثمانی بھی نقطوں سے خالی تھے، اور عمومی رواج کے علاوہ اس کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ اس رسم الخط میں تمام متواتر قراءتیں سما سکیں، لیکن بعد میں عجمی اور کم پڑھے لکھے مسلمانوں کی سہولت کے لئے قرآن کریم پر نقطے ڈالے گئے؟ اس میں روایات مختلف ہیں کہ قرآن کریم کے نسخے پر سب سے پہلے کس نے نقطے ڈالے بعض روایتیں یہ کہتی ہیں کہ یہ کارنامہ سب سے پہلے ابوالاسود دؤلیؒ نے انجام دیا، (۱) بعض کا کہنا ہے کہ انہوں نے یہ کام حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلقین کے تحت کیا (۲) اور بعض نے کہا ہے کہ کوفہ کے گورنر زیاد بن ابی سفیانؒ نے ان سے یہ کام کرایا، (۳) اور بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے عبدالملک بن مروان کی فرمائش پر یہ کام کیا، (۴) ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ کارنامہ حجاج بن یوسف (۴) نے حسن بصریؒ، یحیٰ بن یعمرؒ اور نصر بن عاصم لیثیؒ کے ذریعہ انجام دیا، (۵) بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جس شخص نے قرآن کریم پر نقطے ڈالے وہی نقطوں کا موجد بھی ہے، اس سے پہلے نقطوں کا کوئی تصور نہیں تھا، لیکن علّامہ قلقشندیؒ نے (جو رسم الخط اور فنِ انشاء کے محقق ترین عالم ہیں) اس کی تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ نقطوں کی ایجاد اس سے بہت پہلے ہو چکی تھی، ایک روایت کے مطابق عربی رسم الخط کے موجد قبیلۂ بولان مرامر بن مرّہ، اسلم بن سدرہ اور عامر بن جَدَرہ ہیں، مُرامر نے حروف کی صورتیں ایجاد کیں، اسلم نے فصل و وصل کے طریقے وضع کئے، اور عامر نے نقطے بنائے، (۶) اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ نقطوں کے سب سے پہلے استعمال کا سہرا حضرت ابوسفیان بن حربؓ کے دادا ابوسفیان ابن امیہ کے سر ہے، انہوں نے یہ حیرہ کے باشندوں سے سیکھے تھے، اور حیرہ کے باشندوں نے اہلِ انبار سے، (۷) لہٰذا نقطے ایجاد تو بہت پہلے ہو چکے تھے، لیکن قرآن کریم کو متعدد مصلحتوں کے تحت

(۱) البرھان فی علوم القرآن ص ۲۵۰ ج ۱، و الاتقان ص ۱۷۱ ج ۲ نوع ۷۶،

(۲) صبح الاعشیٰ ص ۱۵۵ ج ۳، (۳) البرھان ص ۲۵۰ و ۲۵۱ نوع ۱۴،

(۴) الاتقان ص ۱۷۱ ج ۲ (۵) تفسیر القرطبی ص ۶۳ ج ۱ و تاریخ القرآن للکردی ص ۱۸۱،

(۶) صبح الاعشیٰ ص ۱۲ ج ۲، (۷) صبح الاعشیٰ ص ۱۳ ج ۳،

Marfat.com

اُن سے خالی رکھا گیا تھا، بعد میں جس نے بھی قرآن کریم پر نقطے ڈالے وہ نقطوں کا موجد نہیں ہے، بلکہ صرف قرآن کریم میں ان کا استعمال سب سے پہلے اس نے کیا،(۱)

حرکات

نقطوں کی طرح شروع میں قرآن کریم پر حرکات (زیر زبر پیش) بھی نہیں تھیں، اور اس میں بھی روایات کا بڑا اختلاف ہے، کہ سب سے پہلے کس نے حرکات لگائیں؟ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ کام سب سے پہلے ابوالاسود دُوَلی ؒ نے انجام دیا، بعض کہتے ہیں کہ یہ کام حجاج بن یوسف نے یحیٰ بن یعمرؒ اور نصر بن عاصم لیثیؒ سے کرایا،(۲) اس سلسلے میں تمام روایات کو پیش نظر رکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حرکات سب سے پہلے ابوالاسود دُوَلی ؒ نے وضع کیں، لیکن یہ حرکات اس طرح کی نہ تھیں جیسی آجکل معروف ہیں، بلکہ زبر کے لئے حرف کے اوپر ایک نقطہ (ـٖ) زیر کے لئے حرف کے نیچے ایک نقطہ (ٻ) پیش کے لئے حرف کے سامنے ایک نقطہ (ـ•) اور تنوین کے لئے دو نقطے (•• یا •• یا ـ••) مقرر کئے گئے،(۳) بعد میں خلیل بن احمدؒ نے ہمزہ اور تشدید کی علامتیں وضع کیں،(۴) اس کے بعد حجاج بن یوسف نے یحیٰ بن یعمرؒ، نصر بن عاصمؒ اور حسن بصری رحمہم اللہ سے بیک وقت قرآن کریم پر نقطے اور حرکات دونوں لگانے کی فرمائش کی اس موقع پر حرکات کے اظہار کے لئے نقطوں کے بجائے زیر زبر پیش کی موجودہ صورتیں (ـَ ـِ ـُ) مقرر کی گئیں، تاکہ حروف کے ذاتی نقطوں سے ان کا التباس پیش نہ آئے، واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم،

احزاب یا منزلیں

صحابہؓ اور تابعینؒ کا معمول تھا کہ وہ ہر ہفتے ایک قرآن کریم ختم کرلیتے تھے، اس

(۱) صبح الاعشیٰ ص۱۵۵ ج۳، (۲) تفسیر القرطبی، ص۶۳ ج۱،

(۳) صبح الاعشیٰ ص۱۶۰ ج۳ و تاریخ القرآن للکردی، ص۱۸۰،

(۴) الاتقان ص۱۷۱ ج۲ و صبح الاعشیٰ ص۱۶۱ ج۳،

Marfat.com

مقصد کے لئے انہوں نے روزانہ تلاوت کی ایک مقدار مقرر کی ہوئی تھی جسے "حزب" یا "منزل" کہا جاتا ہے، اس طرح قرآن کریم کو کل سات احزاب پر تقسیم کیا گیا تھا، حضرت اوس بن حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے صحابہؓ سے پوچھا آپ نے قرآن کے کتنے حزب بنائے ہوئے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ایک حزب تین سورتوں کا، دوسرا پانچ سورتوں کا، تیسرا سات سورتوں کا، چوتھا نو سورتوں کا، پانچواں گیارہ سورتوں کا، چھٹا تیرہ سورتوں کا، اور آخری حزب مفصّل میں قٓ سے آخر تک کا، (۱)

اجزاء یا پارے

آجکل قرآن کریم تیس اجزاء پر منقسم ہے جنہیں تیس پارے کہا جاتا ہے، یہ پاروں کی تقسیم معنی کے اعتبار سے نہیں، بلکہ بچوں کو پڑھانے کے لئے آسانی کے خیال سے تیس مساوی حصوں پر تقسیم کردیا گیا ہے، چنانچہ بعض اوقات بالکل ادھوری بات پر پارہ ختم ہوجاتا ہے، یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ تیس پاروں کی تقسیم کس نے کی ہے؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت عثمانؓ رضی اللہ عنہ نے مصاحف نقل کراتے وقت انہیں تیس مختلف صحیفوں لکھوایا تھا، لہٰذا یہ تقسیم آپ ہی کے زمانے کی ہے (۲) لیکن متقدمین کی کتابوں میں اس کی کوئی دلیل احقر کو نہیں مل سکی، البتہ علامہ بدرالدین زرکشیؒ نے لکھا ہے کہ قرآن کے تیس پارے مشہور چلے آتے ہیں اور مدارس کے قرآنی نسخوں میں ان کا رواج ہے، (۳) بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقسیم عہدِ صحابہؓ کے بعد تعلیم کی سہولت کے لئے کی گئی ہے، واللہ اعلم

اخماس اور اعشار

قرونِ اُولیٰ کے قرآنی نسخوں میں ایک اور علامت کا رواج تھا، اور وہ یہ کہ ہر پانچ آیتوں کے بعد (حاشیہ پر) لفظ "خمس" یا "خ" اور ہر دس آیتوں کے بعد لفظ "عشر" یا "ع" لکھدیتے

(۱) البرھان فی علوم القرآن، ص ۲۵۰ ج ۱، (۲) تاریخ القرآن از مولانا عبدالصمد صارم، ص ۸۱، (۳) البرھان، ص ۲۵۰ ج ۱، مزید دیکھئے مناھل العرفان، ص ۴۰۲ ج ۱،

تھے، پہلی قسم کی علامتوں کو "اخماس" اور دوسری قسم کی علامتوں کو "اعشار" کہا جاتا تھا(۱) علماء متقدمین میں یہ اختلاف بھی رہا ہے کہ بعض حضرات ان علامتوں کو جائز اور بعض مکروہ سمجھتے (۲) ایک قول یہ ہے کہ اس کا موجد حجاج بن یوسف تھا، اور دوسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے عباسی خلیفہ مامون نے اس کا حکم دیا تھا، (۳) لیکن یہ دونوں اقوال اس لئے درست معلوم نہیں ہوتے کہ خود صحابہؓ کے زمانے میں "اعشار" کا تصور ملتا ہے، مصنف ابن ابی شیبہؒ میں روایت ہے:

عن مسروق عن عبداللهؓ انه کره التعشیر فی المصحف

"مسروقؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مصحف میں اعشار کا نشان ڈالنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔" (۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "اعشار" کا تصور صحابہؓ کے زمانے ہی میں پیدا ہو چکا تھا،

رکوع

ایک اور علامت جس کا رواج بعد میں ہوا، اور آج تک جاری ہے رکوع کی علامت ہے، اور اس کی تعیین معنی کے لحاظ سے کی گئی ہے، یعنی جہاں ایک سلسلۂ کلام ختم ہوا وہاں رکوع کی علامت (حاشیہ پر حرف "ع") بنا دی گئی، احقر کو جستجو کے باوجود مستند طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ رکوع کی ابتداء کس نے اور کس دَور میں کی؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ ان رکوعات کی تعیین بھی حضرت عثمانؓ ہی کے زمانے میں ہو چکی تھی (۵) لیکن روایات سے اس دعوے کی کوئی دلیل احقر کو نہیں مل سکی، البتہ یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ اس علامت کا مقصد آیات کی ایسی متوسط مقدار کی تعین ہے جو ایک رکعت میں پڑھی جا سکے، اور اس کو "رکوع" اسی لئے کہتے ہیں کہ نماز میں اس جگہ پہنچ کر رکوع کیا جائے، چنانچہ فتاوٰی عالمگیریہ میں ہے:

ان المشائخ رحمهم الله جعلوا القرآن علیٰ خمسمائة

---

(۱) مناهل العرفان، ص ۴۰۳ ج ۱، (۲) الاتقان، ص ۱۷۱ ج ۲ نوع ۷۶، (۳) البرهان ص ۲۵۱ ج ۱،

(۴) مصنف ابن ابی شیبہؒ ص ۴۹۷ ج ۲ کتاب الصلوٰة، مطبعة العلوم الشرقیة دکن ۱۳۸۷ھ

(۵) تاریخ القرآن از مولانا عبدالصمد صارم ص ۸۱،

Marfat.com

واربعین رکوعاً واعلموا ذلک فی المصاحف حتی یحصل الختم فی لیلة السابع والعشرون، (۱)

''مشائخ نے قرآن کریم کو پانچ سو چالیس (۲) رکوعوں پر تقسیم کیا ہے، اور مصاحف میں اس کی علامتیں بنادی ہیں، تاکہ (تراویح میں) قرآن کا ختم ستائیسویں شب میں ہوسکے۔''

رُموزِ اَوقاف

تلاوت اور تجوید کی سہولت کے لئے ایک اور مفید کام یہ کیا گیا کہ مختلف قرآنی جملوں پر ایسے اشارات لکھدیئے گئے جن سے یہ معلوم ہوسکے کہ اس جگہ وقف کرنا (سانس لینا) کیسا ہے؟ ان اشارات کو ''رموزِ اوقاف'' کہتے ہیں، اوران کا مقصد یہ ہے کہ ایک غیر عربی داں انسان بھی جب تلاوت کرے تو صحیح مقام پر وقف کرسکے، اور غلط جگہ سانس توڑنے سے معنی میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو، ان میں اکثر رموز سب سے پہلے علامہ ابوعبداللہ محمد بن طیفور سجاوندی رحمۃ اللہ علیہ نے وضع فرمائے (۳) ہیں، اُن رموز کی تفصیل یہ ہے:

ط...... یہ ''وقفِ مطلق'' کا مخفف ہے، اوراس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں بات پوری ہوگئی ہے، اس لئے یہاں وقف کرنا بہتر ہے۔

ج...... یہ ''وقفِ جائز'' کا مخفف ہے، اوراس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں وقف کرنا جائز ہے،

ز...... یہ ''وقف مجوّز'' کا مخفف ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وقف کرنا تو درست ہے،

---

(۱) فتاویٰ عالمگیریہ، فصل التراویح ص۹۴ ج۱ مطبوعہ نولکشور،

(۲) فتاویٰ عالمگیریہ میں مشائخ بخاریٰ کے حوالے سے رکوعات کی تعداد ۵۴۰ ہی بیان کی گئی ہے لیکن جب ہم نے قرآن کریم کے مروجہ نسخوں میں خود گنتی کی تو رکوعات کی تعداد ۵۵۸ پائی، اور بعض اصحاب نے ہمیں خط میں لکھا کہ ان کی گنتی کے مطابق رکوعات کی کل تعداد ۵۶۷ ہے، ہوسکتا ہے کہ رکوع کی علامت لگانے میں مختلف نسخوں میں کچھ اختلاف رہا ہو، واللہ اعلم، از ناشر ۹۲/۱۲/۱۶ھ

(۳) النشر فی القراآت العشر لابن الجزریؒ ص۲۲۵ ج۱،

Marfat.com

لیکن بہتر یہ ہے کہ وقف نہ کیا جائے،

ص...... "وقفِ مرخص" کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس جگہ بات تو پوری نہیں ہوئی، لیکن جملہ چونکہ طویل ہو گیا ہے، اس لئے سانس لینے کے لئے دوسرے مقامات کے بجائے یہاں وقف کرنا چاہئے (۱)

م...... یہ "وقفِ لازم" کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف نہ کیا جائے تو آیت کے معنیٰ میں فحش غلطی کا امکان ہے، لہٰذا یہاں وقف کرنا زیادہ بہتر ہے، بعض حضرات اسے "وقفِ واجب" بھی کہتے ہیں، لیکن اس سے مراد فقہی واجب نہیں جس کے ترک سے گناہ ہو، بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ تمام اوقاف میں اس جگہ وقف کرنا زیادہ بہتر ہے، (۲)

لا...... یہ "لَا تَقِفْ" کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ "یہاں نہ ٹھہرو" لیکن اس کا منشاء یہ نہیں کہ یہاں وقف کرنا ناجائز ہے، بلکہ اس میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں وقف کرنے میں کوئی حرج نہیں، اور اس کے بعد والے لفظ سے ابتداء کرنا بھی جائز ہے، لہٰذا اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف کیا جائے تو بہتر یہ ہے کہ اسے دوبارہ لوٹا کر پڑھا جائے، اگلے لفظ سے ابتداء کرنا مستحسن نہیں، (۳)

ان رموز کے بارے میں تو یقینی طور پر ثابت ہے کہ یہ علامہ سجاوندیؒ کے وضع کئے ہوئے ہیں، ان کے علاوہ بھی بعض رموز قرآن کریم کے نسخوں میں موجود ہیں، مثلاً:

مع...... یہ "معانقہ" کا مخفف ہے، یہ علامت اُس جگہ لکھی جاتی ہے جہاں ایک ہی آیت کی دو تفسیریں ممکن ہیں، ایک تفسیر کے مطابق وقف ایک جگہ ہوگا، اور دوسری تفسیر کے مطابق دوسری جگہ، لہٰذا ان میں سے کسی ایک جگہ وقف کیا جا سکتا ہے، لیکن ایک جگہ وقف کرنے کے بعد دوسری جگہ وقف کرنا درست نہیں، مثلاً ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۛ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۛ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ الخ﴾ اس میں اگر التَّوْرٰىةِ پر وقف کر لیا تو الْاِنْجِيْلِ پر

(۱) ان چاروں رموز کی تشریح کے لئے دیکھئے المنح الفکریہ شرح المقدمۃ الجزریہ للملّا علی القاری، ص ۶۳، مطبوعہ ابناء غلام رسول، (۲) النشر، ص ۲۳۱ ج ۱، (۳) النشر ۲۳۳،

وقف درست نہیں، اور اگر الْاِنْجِيْلَ پر وقف کرنا ہے تو التَّوْرٰيةَ پر درست نہیں، ہاں دونوں جگہ وقف نہ کریں، تو درست ہے، اس کا ایک نام ”مقابلہ“ بھی ہے، اور اس کی سب سے پہلے نشاں دہی امام ابوالفضل رازیؒ نے فرمائی ہے، (۱)

سکتہ...... یہ ”سکتہ“ کی علامت ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس جگہ رُکنا چاہئے لیکن سانس نہ ٹوٹنے پائے، یہ عموماً اس جگہ لایا جاتا ہے جہاں ملا کر پڑھنے سے معنی میں غلط فہمی کا اندیشہ ہو،

وقفہ...... اس جگہ ”سکتہ“ سے قدرے زیادہ دیر تک رُکنا چاہئے، لیکن سانس یہاں بھی نہ ٹوٹے،

ق...... یہ ”قيل عليه الوقف“ کا مخفف ہے، مطلب یہ ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک یہاں وقف ہے اور بعض کے نزدیک نہیں ہے،

قف...... یہ لفظ ”قف“ ہے، جس کے معنی ہیں ٹھہر جاؤ، اور یہ اُس جگہ لایا جاتا ہے جہاں پڑھنے والے کو یہ خیال ہو سکتا ہو کہ یہاں وقف درست نہیں،

صلے...... ”الوصل اولیٰ“ کا مخفف ہے، جس کے معنی ہیں کہ ”ملا کر پڑھنا بہتر ہے“

صل...... ”قد یوصل“ کا مخفف ہے، یعنی یہاں بعض لوگ ٹھہرتے ہیں اور بعض ملا کر پڑھنے کو پسند کرتے ہیں،

یہ رموز کافی مشہور ہیں، لیکن احقر کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کا واضع و موجد کون ہے؟

قرآن کریم کی طباعت

پانچواں مرحلہ

جب تک پریس ایجاد نہیں ہوا تھا قرآن کریم کے تمام نسخے قلم سے لکھے جاتے تھے، اور ہر دَور میں ایسے کاتبوں کی ایک بڑی جماعت موجود رہی ہے جس کا کتابتِ قرآن کے سوا کوئی مشغلہ نہیں

(۱) النشر، ص ۲۳۷ ج ۱ والاتقان، ص ۸۸ ج ۱،

Marfat.com

تھا، قرآن کریم کے حروف کو بہتر سے بہتر انداز میں لکھنے کے لئے مسلمانوں نے جو محنتیں کیں اور جس طرح اس عظیم کتاب کے ساتھ اپنے والہانہ شغف کا اظہار کیا، اس کی ایک بڑی مفصل اور دلچسپ تاریخ ہے، جس کے لئے مستقل تصنیف چاہئے، یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں،

پھر جب پریس ایجاد ہوا تو سب سے پہلے ہیمبرگ کے مقام پر ۱۱۱۳ھ میں قرآن کریم طبع ہوا، جس کا ایک نسخہ ابتک دار الکتب المصریہ میں موجود ہے، اس کے بعد متعدد مستشرقین نے قرآن کریم کے نسخے طبع کرائے، لیکن اسلامی دنیا میں ان کو قبولیت حاصل نہ ہو سکی، اس کے بعد مسلمانوں میں سب سے پہلے مولائے عثمان نے روس کے شہر سینٹ پیٹرس برگ میں ۱۷۸۷ء میں قرآن کریم کا ایک نسخہ طبع کرایا، اسی طرح قازان میں بھی ایک نسخہ چھاپا گیا، ۱۸۲۸ء میں ایران کے شہر تہران میں قرآن کریم کو پتھر پر چھاپا گیا، پھر اس کے مطبوعہ نسخے دنیا بھر میں عام ہو گئے، (۱)

قراآت اور اُن کی تدوین

''سبعۃ احرف'' کی بحث میں گذر چکا ہے کہ تلاوت کی سہولت کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو متعدد قراءتوں میں نازل فرمایا تھا، قراءتوں کے اس اختلاف سے آیات کے مجموعی معنی میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، لیکن تلاوت اور ادائیگی کے طریقوں میں فرق ہو جاتا ہے، اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے لئے آسانی پیدا ہو گئی ہے،

امّت مسلمہ نے قرآن کریم کی ان قراءتوں کو بھی ہر دَور میں محفوظ رکھا ہے، اور اس غرض کے لئے بے مثال خدمات انجام دی ہیں، یہاں ان جلیل القدر خدمات کا مختصر تذکرہ بھی ممکن نہیں، البتہ چند اشارات ضروری ہیں،

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ قرآن کریم کی اشاعت کا اصل مدار کتابت کے بجائے حافظہ اور نقل و روایت پر ہے، اُدھر یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ مصاحفِ عثمانی کو نقطوں اور حرکات سے

(۱) طباعت کی تاریخ کے لئے دیکھئے تاریخ القرآن للکردیؒ ص۱۸۶ و علوم القرآن ڈاکٹر صبحی صالح اردو ترجمہ از غلام احمد حریری، ص ۱۴۲،

اسی لئے خالی رکھا گیا تھا، تاکہ اس میں تمام مسلّم قراءتیں سما سکیں، چنانچہ جب عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ مصاحف عالم اسلام کے مختلف خطوں میں روانہ کئے تو اُن کے ساتھ ایسے قرّاء کو بھی بھیجا جو اُن کی تلاوت سکھا سکیں، چنانچہ یہ قاری حضرات جب مختلف علاقوں میں پہنچے تو انہوں نے اپنی اپنی قراءت کے مطابق لوگوں کو قرآن کریم کی تعلیم دی، اور یہ مختلف قراءتیں لوگوں میں پھیل گئیں، اس موقع پر بعض حضرات نے ان مختلف قراءتوں کو یاد کرنے اور دوسروں کو سکھانے ہی کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردیں، اور اس طرح ''علم قراآت'' کی بنیاد پڑ گئی، اور ہر خطّے کے لوگ اس علم میں کمال حاصل کرنے کے لئے ائمہٗ قراءت سے رجوع کرنے لگے، کسی نے صرف ایک قراءت یاد کی، کسی نے دو، کسی نے تین، کسی نے سات اور کسی نے اس سے بھی زیادہ، اس سلسلے میں ایک اصولی ضابطہ پوری اُمت میں مسلّم تھا، اور ہر جگہ اسی کے مطابق عمل ہوتا تھا، اور وہ یہ کہ صرف وہ ''قراءت'' قرآن ہونے کی حیثیت سے قبول کی جائے گی جس میں تین شرائط پائی جاتی ہوں:

۱......مصاحفِ عثمانی کے رسم الخط میں اس کی گنجائش ہو،

۲......عربی صرف ونحو کے قواعد کے مطابق ہو،

۳......آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو، اور ائمہٗ قرّاء میں مشہور ہو،

جس قراءت میں ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو، اسے قرآن ہونے کی حیثیت سے قبول نہیں کیا جاتا، اس طرح متواتر قراءتوں کی ایک بڑی تعداد نسلاً بعد نسل نقل ہوتی رہی، اور سہولت کے لئے ایسا بھی ہوا کہ ایک امام نے ایک یا چند قراءتوں کو اختیار کر کے انہی کی تعلیم دینی شروع کردی، اور وہ قراءت اُس امام کے نام سے مشہور ہوگئی، پھر علماء نے ان قراءتوں کو جمع کرنے کے لئے کتابیں لکھنی شروع کیں، چنانچہ سب سے پہلے امام ابوعبیدہ قاسم ابن سلامؒ، امام ابوحاتم بجستانیؒ، قاضی اسمٰعیلؒ اور امام ابوجعفر طبریؒ نے اس فن پر کتابیں مرتب کیں، جن میں بیس سے زیادہ قراءتیں جمع تھیں، پھر علامہ ابوبکر احمد بن موسیٰ بن عباس ابن مجاہدؒ (متوفی ۳۲۴ھ) نے ایک کتاب لکھی جس میں صرف سات قرّاء کی قراءتیں جمع کی گئی تھیں ان

Marfat.com

کی یہ تصنیف اس قدر مقبول ہوئی کہ یہ سات قراء کی قراءتیں دوسرے قرّاء کے مقابلہ میں بہت زیادہ مشہور ہوگئیں، بلکہ بعض لوگ یہ سمجھنے لگے کہ صحیح اور متواتر قراءتیں یہی ہیں، باقی قاریوں کی قراءتیں صحیح یا متواتر نہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ علامہ ابن مجاہدؒ نے محض اتفاقاً اِن سات قراءتوں کو جمع کر دیا تھا، ان کا منشاء یہ ہرگز نہیں تھا کہ ان کے سوا اور دوسری قراءتیں غلط یا ناقابلِ قبول ہیں، علامہ ابن مجاہدؒ کے اس عمل سے دوسری غلط فہمی یہ بھی پیدا ہوئی کہ بعض لوگ "سبعۃ احرف" کا مطلب یہ سمجھنے لگے کہ ان سے یہی سات قراءتیں مراد ہیں جنہیں ابن مجاہدؒ نے جمع کیا ہے، حالانکہ "سبعۃ احرف" کی صحیح تشریح وہ ہے جو پیچھے ایک مستقل عنوان کے تحت گزر چکی ہے،

بہر حال! علامہ ابن مجاہدؒ کے اس عمل سے جو سات قاری سب سے زیادہ مشہور ہوئے وہ یہ ہیں:

۱...... عبداللہ بن کثیر الداریؒ (متوفی ۱۲۰ھ) آپ نے صحابہؓ میں سے حضرت انس بن مالکؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، اور ابو ایوب انصاریؓ کی زیارت کی تھی، اور آپ کی قراءت مکہ مکرمہ میں زیادہ مشہور ہوئی، اور آپ کی قراءت کے راویوں میں بزّی اور قنبل زیادہ مشہور ہیں،

۲...... نافع بن عبدالرحمٰن بن ابی نعیمؒ (متوفی ۱۶۹ھ) آپ نے ستر ایسے تابعین سے استفادہ کیا تھا، جو براہِ راست حضرت ابی بن کعبؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کے شاگرد تھے، آپ کی قراءت مدینہ طیبہ میں زیادہ مشہور ہوئی، اور آپ کے راویوں میں ابو موسیٰ قالونؒ (متوفی ۲۲۰ھ) اور ابو سعید ورش (م ۱۹۷ھ) مشہور ہوئے،

۳...... عبداللہ الیحصبی جو ابن عامرؒ کے نام سے معروف ہیں، (متوفی ۱۱۸ھ) آپ نے صحابہؓ میں سے حضرت نعمان بن بشیرؓ اور حضرت واثلہ بن اسقعؓ کی زیارت کی تھی، اور قراءت کا فن حضرت مغیرہ بن شہاب مخزومیؒ سے حاصل کیا، جو حضرت عثمانؓ کے شاگرد تھے، آپ کی قراءت کا زیادہ رواج شام میں رہا، اور ان کی قراءت کے راویوں میں ہشام اور ذکوان زیادہ مشہور ہیں،

۴...... ابو عمرہ زبّان بن العلاء بن عمارؒ (متوفی ۱۵۴ھ) آپ نے حضرت مجاہدؒ اور سعید بن

جبیرؒ کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ اور اُبی بن کعبؓ سے روایت کی ہے، اور آپ کی قراءت بصرہ میں کافی مشہور ہوئی، آپ کی قراءت کے راویوں میں ابو عمر الدّوری (متوفی ۲۴۲ھ) اور ابو شعیب سوسیؒ (متوفی ۲۶۱ھ) زیادہ مشہور ہیں،

۵...... حمزہ بن حبیب الزّیاتؒ مولیٰ عکرمۃ بن ربیع التیمی (متوفی ۱۸۸ھ) آپ سلیمان اعمشؒ کے شاگرد ہیں، وہ یحییٰ بن وثابؒ کے وہ زرّ بن حبیشؒ کے، اور انہوں نے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے استفادہ کیا تھا، آپ کے راویوں میں خلف بن ہشامؒ (م ۱۸۸ھ) اور خلّاد بن خالدؒ (م ۲۲۰ھ) زیادہ مشہور ہیں،

۶...... عاصم ابن ابی النجود الاسدی (متوفی ۱۲۷ھ) آپ حضرت زرّ بن حبیشؒ کے واسطہ سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اور ابو عبدالرحمٰن سلمیؒ کے واسطہ سے حضرت علیؓ کے شاگرد ہیں، آپ کی قراءت کے راویوں میں شعبہ بن عیّاش (متوفی ۱۹۳ھ) اور حفص بن سلیمانؒ (متوفی ۱۸۰ھ) زیادہ مشہور ہیں، آجکل عموماً تلاوت حفصؒ کی روایت کے مطابق ہوتی ہے،

۷...... ابوالحسن علی بن حمزۃ الکسائی النحویؒ (متوفی ۱۸۹ھ) ان کے راویوں میں ابوالحارث مروزیؒ (متوفی ۲۴۰ھ) اور ابو عمر الدّوریؒ (جو ابو عمروؒ کے بھی راوی ہیں) زیادہ مشہور ہیں، مؤخر الذکر تینوں حضرات کی قراءتیں زیادہ تر کوفہ میں رائج ہوئیں،

لیکن جیسا کہ پیچھے عرض کیا جاچکا ہے کہ اِن سات کے علاوہ اور بھی کئی قراءتیں متواتر اور صحیح ہیں، چنانچہ بعد میں جب یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ صحیح قراءتیں ان سات ہی میں منحصر ہیں، تو متعدد علماء نے (مثلاً علّامہ شذائیؒ اور ابوبکر بن مہرانؒ نے) سات کے بجائے دس قراءتیں ایک کتاب میں جمع فرمائیں، چنانچہ "قراآتِ عشرہ" کی اصطلاح مشہور ہوگئی، (۱) ان دس قراءتوں میں مندرجہ بالا سات قرّاء کے علاوہ اِن تین حضرات کی قراءتیں بھی شامل کی گئیں،

۱...... یعقوب بن اسحاق حضرمیؒ (متوفی ۲۲۵ھ) آپ نے سلام بن سلیمان الطّویل سے استفادہ کیا اور انہوں نے عاصمؒ اور ابو عمروؒ سے، آپ کی قراءت زیادہ تر بصرہ میں مشہور ہوئی،

---

(۱) النشر فی القراآت العشر، ص ۳۴ ج ۱،

Marfat.com

۲...... خلف بن ہشامؒ (متوفی ۲۰۵ھ) آپ نے سلیم بن عیسیٰ بن حمزہ بن حبیب زیات سے استفادہ کیا تھا، چنانچہ آپ حمزہؒ کی قراءت کے بھی روای ہیں، آپ کی قراءت کوفہ میں زیادہ رائج تھی،

۳...... ابوجعفر یزید بن القعقاعؒ (متوفی ۱۳۰ھ) آپ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابوہریرہؓ، اور حضرت اُبَیّ بن کعبؓ سے استفادہ کیا تھا، اور آپ کی قراءت مدینہ طیبہ میں رائج رہی،

اس کے علاوہ بعض حضرات نے چودہ (۱۴) قاریوں کی قراءتیں جمع کیں، اور مذکورہ دس حضرات پر مندرجہ ذیل قراء کی قراءتوں کا اضافہ کیا:

۱...... حسن بصریؒ: (متوفی ۱۱۰ھ) آپ کبار تابعین میں سے ہیں، اور آپ کی قراءت کا مرکز بصرہ میں تھا،

۲...... محمد بن عبدالرحمٰن ابن محیصنؒ: (متوفی ۱۲۳ھ) آپ حضرت مجاہدؒ کے شاگرد اور ابوعمروؒ کے استاذ ہیں، اور آپ کا مرکز مکہ مکرمہ میں تھا،

۳...... یحیٰی بن مبارک یزیدی: (متوفی ۲۰۲ھ) آپ بصرہ کے باشندے تھے، اور ابوعمروؒ اور حمزہؒ سے استفادہ کیا تھا،

۴...... ابوالفرج محمد بن احمد شنبوزیؒ: (متوفی ۳۸۸) آپ بغداد کے باشندے تھے، اور اپنے استاذ ابن شنبوزؒ کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے شنبوزی کہلاتے تھے،

بعض حضرات نے چودہ قاریوں میں حضرت شنبوزیؒ کے بجائے حضرت سلیمان اعمشؒ کا نام شمار کیا ہے،

ان میں سے پہلی دس قراءتیں صحیح قول کے مطابق متواتر ہیں، اور ان کے علاوہ شاذ ہیں (۱)

ہمارے زمانے کے مشہور مستشرق منٹگمری واٹ (Montgomery watt) نے اپنے استاذ بیل (Bell) کی متابعت میں علامہ ابن مجاہدؒ کے عمل کی جو غلط تشریح کی ہے یہاں

---

(۱) مناهل العرفان بحوالہ منجد المقرئین لابن الجزریؒ، ص۶۰ ج۱،

Marfat.com

اس کی نشان دہی بھی مناسب ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ ابن مجاہدؒ نے سات قراءتیں جمع کر کے ایک طرف تو یہ واضح کیا کہ حدیث میں قرآن کریم کے جن ''سات حروف'' کا تذکرہ ہے اُن سے یہی ''سات قراءتیں'' مراد ہیں، دوسری طرف ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ان سات قراءتوں کے علاوہ دوسری کوئی قراءت قابلِ اعتماد نہیں، چنانچہ دوسرے علماء نے بھی اُن کے اس نظریہ کو قبول کرلیا، اور اسی بناء پر علماء نے ابن مقسمؒ اور ابن شنبوذؒ کو اپنے نظریات سے رجوع کرنے پر مجبور کیا، کیونکہ وہ دوسری قراءتوں کو بھی قابلِ اعتماد سمجھتے تھے'' (۱)

واقعہ یہ ہے کہ واٹ کے مذکورہ بالا بیان میں ایک بات بھی درست نہیں، ہم پیچھے بتا چکے ہیں کہ اس زمانے میں مختلف علماء اور قرّاء نے اپنی اپنی سہولت کے لحاظ سے کئی کئی قراءتیں ایک ایک کتاب میں جمع کر رکھی تھیں، اُن میں سے کسی کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ان کے علاوہ دوسری قراءتیں نا قابلِ اعتماد ہیں، خود امام ابنِ مجاہدؒ نے بھی ان سات قراءتوں کو جمع کرتے وقت کہیں یہ نہیں لکھا کہ یہ ''سات حروف'' کی تشریح ہے، اور نہ یہ دعویٰ کیا کہ صحیح قراءتیں انہی سات میں منحصر ہیں، دوسرے علماء نے بھی اُن کے عمل سے کبھی یہ نہیں سمجھا کہ وہ دوسری قراءتوں کو نا قابل اعتماد قرار دینا چاہتے ہیں، اس کے بجائے تمام محقق علماء اس خیال کی ہمیشہ تردید کرتے آئے ہیں، علمِ قراءت کے مستند ترین عالم علامہ ابن الجزریؒ نے جو ''محقق'' کے لقب سے مشہور ہیں اپنی کتابوں میں اس خیال کی سخت تردید کی ہے، ایک جگہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''ہم نے اس بحث کو اس لئے طول دیا ہے کہ ہمیں یہ اطلاع ملی ہے کہ بعض بے علم لوگ صرف انہی سات قراءتوں کو صحیح سمجھتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ حدیث میں سات حروف سے مراد صرف یہی سات قراءتیں ہیں...... اسی بناء پر بہت سے ائمۂ متقدمین نے ابن مجاہدؒ پر یہ تنقید کی ہے کہ انہیں سات قراءتیں جمع کرنے کے بجائے سات سے کم یا سات سے زائد قراءتیں ذکر کرنی چاہئے تھی، یا اپنی مراد واضح

(۱) W.M. Watt, Bell s Introduction to the Quran (Islamic Surveys Series 8) Edinburgh 1970 PP48,49

Marfat.com

کردینی چاہئے تھی تاکہ بے علم لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے'' (۱)

حافظ ابن حجرؒ اور علاّمہ سیوطیؒ نے بہت سے ائمۂ قراءت کے اقوال نقل کئے ہیں، جن میں یہ واضح کردیا گیا ہے کہ ابن مجاہدؒ نے صرف ''مصاحفِ سبعہ'' کے عدد کی رعایت سے ''سات قراءتیں'' جمع کردیں، ورنہ اُن کا مقصد باقی قراءتوں کو غلط یا ناقابلِ اعتماد قرار دینا نہیں تھا، (۲)

رہا ابن مقسمؒ اور ابن شنبوذؒ کا قصہ، تو دراصل علماء نے جواُن کی تردید کی، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ان سات قراءتوں کے علاوہ دوسری قراءتوں کو کیوں صحیح سمجھتے ہیں؟ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُمّت کے تمام علماء اس بات پر متفق رہے ہیں کہ کسی قراءت کے صحیح ہونے کے لئے تین باتوں کا پایا جانا ضروری ہے، ایک یہ کہ مصحفِ عثمانی کے رسم الخط میں اس کی گنجائش ہو، دوسرے یہ کہ عربی صرف ونحو کے قواعد کے مطابق ہو، تیسرے یہ کہ وہ صحیح سند کے ساتھ منقول اور ائمہ قراءت میں مشہور ہو، یہ شرائط جس قراءت میں بھی پائی جائیں وہ قابلِ قبول ہے، خواہ وہ سات قراءتوں میں شامل ہو یا نہ ہو، اور جہاں ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو وہ ناقابلِ اعتماد ہے، خواہ وہ ان سات قراءتوں میں شامل ہی کیوں نہ ہو، لیکن ابنِ مقسمؒ (۳) اور ابن شنبوذؒ نے اس اجماعی اصول کی خلاف ورزی کی تھی، ابوبکر محمد بن مقسمؒ کا کہنا یہ تھا کہ قراءت کے صحیح ہونے کے لئے صرف پہلی دو شرطیں کافی ہیں، لہٰذا اگر کوئی قراءت مصحفِ عثمانی کے رسم الخط کے مطابق ہو اور عربیت کے لحاظ سے بھی صحیح ہو تو اسے قبول کرلیا جائے گا، خواہ اس کی کوئی سند موجود نہ ہو، اور ابن شنبوذؒ نے اس کے برعکس یہ کہا تھا کہ اگر کوئی قراءت صحیح سند سے منقول ہو تو خواہ رسمِ عثمانی میں اس کی گنجائش نہ نکلتی ہو، اسے پھر بھی قبول کرلیا جائیگا، اس بناء پر اُمت کے تمام علماء نے ان دونوں کی تردید کی، اس مقصد کے لئے مباحثہ کی مجلسیں بھی ہوئیں، اور بالآخر ان دونوں نے جمہور کے قول کی طرف رجوع کرلیا، (۴)

---

(۱) النشر فی القراآت العشر ص۳۵و۳۶ ج۱،

(۲) فتح الباری، ص۲۵ تا ۲۷ ج۹ والاتقان ص۸۲و۸۳ ج۱، نوع ۲۲،

(۳) ابن مقسمؒ کا پورا نام ابوبکر محمد بن الحسن بن یعقوب اور ابن شنبوذؒ کا پورا نام محمد بن احمد ابن ایوب ہے،

(۴) النشر فی القراآت العشر ص۱۷و۳۵ ج۱ والاتقان ص۱۹ ج۱ و تاریخ بغداد، للخطیب ص۲۸۰ ج۱ طبع بیروت و وفیات الاعیان، لابن خلکانؒ ص۴۹۰ ج۲ طبع مصر،

Marfat.com

باب ششم

حفاظتِ قرآن

سے متعلق شُبہات اور اُن کا جواب

قرآن کریم نے ارشاد فرمایا تھا:

﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ﴾

''حقیقت یہ ہے کہ یہ ذکر (یعنی قرآن) ہم نے ہی اُتارا ہے، اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

اس میں یہ پیشنگوئی کردی گئی تھی کہ قرآن کریم قیامت تک اپنی اصلی شکل میں محفوظ رہے گا، اور دنیا کی کوئی طاقت اسے مٹانے یا اس میں تحریف وترمیم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے گی، گزشتہ صفحات میں آپ یہ دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس پیشنگوئی کو عملی طور پر کس طرح سچا کرکے دکھایا، اور ہر دَور میں اس کی کس طرح حفاظت کی گئی، چنانچہ آج یہ بات پورے وثوق اور دعوے کے ساتھ بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ قرآن کریم ہمارے پاس اسی شکل میں محفوظ ہے جس شکل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعلیم دی تھی، اور اس میں آج تک کسی ایک نقطے یا شوشے کا بھی فرق نہیں ہوسکا،

یہ بات صرف مسلمانوں ہی کا عقیدہ نہیں بلکہ منصف مزاج غیر مسلموں نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے، اور اس سے انکار کی جرأت نہیں کی، لیکن جب نگاہوں پر تعصب یا عناد

کا پردہ پڑ جائے تو ایک شفاف چشمہ بھی گدلا نظر آنے لگتا ہے، چنانچہ بعض غیر مسلم مصنفین نے قرآنِ کریم کی حفاظت کے معاملہ میں بھی کچھ شبہات و اعتراضات اٹھائے ہیں، یہاں ہم اُن شبہات کی حقیقت اختصار کے ساتھ واضح کرنا چاہتے ہیں،

ابتدائی زمانہ کی کچھ آیات محفوظ نہیں رہیں

پہلا اعتراض

مشہور مستشرق الیف، بہل (Buhl) نے دعویٰ کیا ہے کہ عہدِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتداء میں قرآن کریم کی آیات لکھی نہیں جاتی تھیں، بلکہ اُن کی حفاظت کا سارا دارومدار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کے حافظہ پر تھا، چنانچہ یہ عین ممکن ہے کہ ابتدائی زمانہ کی قرآنی آیات محفوظ نہ رہی ہوں، اس دعوے کی دلیل میں بہل نے قرآن کریم کی دو آیتیں پیش کی ہیں:(۱)

۱...... ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ﴾ (سورۂ اعلیٰ:۶)

"(اے پیغمبر!) ہم تمہیں پڑھائیں گے، پھر تم بھولو گے نہیں، سوائے اس کے جسے اللہ چاہے۔"

۲...... ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا﴾

(بقرہ ۱۰۶)

"ہم جب بھی کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں یا اسے بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اسی جیسی (آیت) لے آتے ہیں۔"

لیکن جو شخص بھی قرآن کریم اور اس کی تفسیر سے ادنیٰ واقفیت رکھتا ہو وہ اس اعتراض کی لغویت محسوس کرسکتا ہے، اس لئے کہ ان دونوں آیتوں میں قرآن کریم کی منسوخ آیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے،

پہلی آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ جب جبرئیل علیہ السلام قرآن کریم کی کچھ آیات لے کر

(۱) Buhl : Encyclopaedia of Islam P.1067 V.3 KORAN

نازل ہوتے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں بھول جانے کے خوف سے بار بار دُہراتے رہتے تھے، اور اس میں آپؐ کو شدید تعب ہوتا تھا، اس آیت میں آپؐ کو یہ اطمینان دلایا گیا کہ آپ کو یاد کرنے کی مشقت برداشت کرنے کی ضرورت نہیں اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے (۱) لہٰذا آپؐ ان آیات کو بھول نہیں سکیں گے، لیکن اس پر یہ اشکال ہوسکتا تھا کہ قرآن کریم کی بعض آیات تو بعد میں منسوخ ہونے کے سبب حافظے سے محو ہوگئیں، اس کا جواب دینے کے لئے اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰہُ (مگر جو کچھ اللہ چاہے) کے الفاظ بڑھا دیئے گئے، جن کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی آیت کو منسوخ کرے گا تو صرف اُسی وقت وہ آیت آپؐ کے حافظے سے محو ہوسکے گی اس کے بغیر نہیں، اسی طرح دوسری آیت میں بھی زیادہ سے زیادہ اتنا بیان کیا گیا ہے کہ بعض آیات منسوخ ہونے کی بناء پر آپؐ کے اور صحابہؓ کے حافظوں سے محو ہوجائیں گی،

لہٰذا ان دو آیتوں سے زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض آیات کو جب اللہ تعالیٰ نے منسوخ فرمادیا تو اُن کی کتابت کو مٹانے کا حکم تو دیا ہی گیا، مگر ساتھ ساتھ انہیں لوگوں کے حافظے سے بھی محو کردیا گیا، ورنہ جہانتک غیر منسوخ آیتوں کا تعلق ہے اُن کے بارے میں تو صراحۃً کہا جارہا ہے کہ آپؐ انہیں کبھی نہیں بھول سکیں گے، اس سے یہ بات آخر کیسے نکل آئی کہ جو آیتیں منسوخ نہیں ہوئیں، ان کے فراموش ہوجانے کا بھی کوئی امکان ہے؟

رہا ان آیتوں سے اس بات پر استدلال کہ اسلام کے ابتدائی دور میں قرآن کریم لکھا نہیں جاتا تھا، سو یہ ایک قطعی بے بنیاد اور لغو استدلال ہے، ہم پیچھے بتا چکے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے پہلے قرآن کریم کی آیتوں کا صحابہؓ کے پاس لکھا ہوا ہونا مستند روایات سے ثابت ہے، لہٰذا پہلی آیت میں صرف ''نسیان'' (بھول جانے) کے ذکر پر اکتفاء کا منشاء یہ نہیں ہے کہ اس وقت قرآن کریم مکتوب شکل میں نہیں تھا، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہاں ذکر ہی صرف ''نسیان'' کا چل رہا ہے، اس لئے اس مقام پر لکھی ہوئی آیتوں کو مٹانے کا ذکر

(۱) تفسیر القرطبی ص ۱۸ ج ۲۰،

Marfat.com

کیا جاتا تو وہ قطعی بے موقع اور بے محل بات ہوتی ، یہی وجہ ہے کہ دوسری آیت میں چونکہ ''نسخ'' ہی موضوع گفتگو ہے اس لئے اس میں ''نسخ'' (لکھے ہوئے کو مٹانے) اور ''انساء'' (بھلا دینے) دونوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، ''نسخ'' کے لغوی معنی زائل کرنے اور مٹانے کے آتے ہیں ، لہٰذا یہ لفظ صراحۃً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن کریم مکتوب شکل میں موجود تھا، اور اس کی بعض آیتوں کو منسوخ ہونے کی بناء پر مٹایا گیا ہے ، حیرت ہے کہ یہ آیت جو صراحۃً قرآن کریم کے مکتوب ہونے پر دلالت کررہی ہے اُس کو بُھل قرآن کے غیر مکتوب ہونے کی تائید میں پیش کررہا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مرتبہ ایک آیت یاد نہیں رہی تھی،

دوسرا اعتراض

مستشرق ڈی، ایس، مار گولیوتھ نے صحیحین کی ایک حدیث کی بناء پر قرآن کریم کی حفاظت کو مشکوک بنانے کی کوشش کی ہے ، (۱) صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابیؓ کو مسجد میں قرآن کریم پڑھتے ہوئے سُنا تو آپؐ نے فرمایا کہ:

رَحِمَهُ اللّٰهُ ، لَقَدْ اَذْكَرَنِىْ آيَةً كُنْتُ اَنْسَيْتُهَا ،

''اللہ اُن پر رحم کرے، انہوں نے مجھے ایک ایسی آیت یاد دلادی جو مجھ سے بُھول گئی تھی ،(۲)

اس روایت کو ذکر کرنے سے مار گولیوتھ کا مقصد یہ ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک آیت کسی وقت بُھول سکتے ہیں تو (معاذ اللہ) دوسری آیات میں بھی یہ امکان ہے، نیز وہ

---

(۱) Margoliouth, D.S. Encyclopaedia of Religion and Ethics P. 543

(۲) صحیح بخاری'' ، کتاب فضائل القرآن ،ص ۷۵۳ ج ۲ وصحیح مسلم'' کتاب فضائل القرآن ص ۲۶۷ ج ۱،

Marfat.com

اس روایت سے غالباً یہ بھی ثابت کرنا چاہتا ہے کہ قرآن کریم لکھا ہوا نہیں تھا، ورنہ آپؐ یہ آیت نہ بھولتے، لیکن یہ اعتراض اس قدر لچر اور بے بنیاد ہے کہ ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی اسے درست تسلیم نہیں کر سکتا، کیونکہ مذکورہ بالا واقعہ کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ بسا اوقات ایک بات انسان کو یاد تو ہوتی ہے، مگر چونکہ عرصۂ دراز تک اس کا کوئی ذکر نہیں ہوتا، نہ اُس کی طرف خیال جاتا ہے، اس لئے وہ ذہن میں مستحضر نہیں رہتی، اور جب کوئی شخص اس کا ذکر چھیڑتا ہے تو وہ فوراً حافظے میں تازہ ہو جاتی ہے، یہ حقیقت میں بُھول نہیں ہوتی، بلکہ عارضی طور پر خیال سے نکل جانا ہوتا ہے، یہی صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئی، اس لئے ایسے واقعے کو بنیاد بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسیان کی...... نسبت کرنا انتہا درجے کی بے انصافی ہے، جس کا منشاء تعصب کے سوا کچھ نہیں، بلکہ اگر مسٹر مار گولیوتھ بصیرت اور انصاف کی نگاہ سے دیکھتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ اس واقعے سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اس غیر معمولی طریقے سے فرمائی ہے کہ اس کے کسی حصے کے گم ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے، کیونکہ اس واقعے سے اگر کوئی حقیقت ثابت ہوتی ہے تو وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی ایک ایک آیت اتنے بے شمار افراد کو یاد کرا دی گئی تھی کہ اگر کوئی آیت کسی وقت اتفاقاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عارضی طور پر مستحضر نہ رہے تب بھی اس کے ضائع ہونے کا دُور دُور کوئی امکان نہیں تھا،

رہی یہ بات کہ اُس واقعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم مکتوب شکل میں موجود نہیں تھا، سو یہ پہلی بات سے زیادہ بے بنیاد اور مضحکہ خیز ہے، ہم عرض کر چکے ہیں کہ واقعہ کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ ایک آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عارضی طور پر مستحضر نہیں رہی تھی، جو ایک صحابی کی تلاوت سے فوراً ذہن میں تازہ ہو گئی، اس سے یہ کہاں ثابت ہو گیا کہ قرآن کریم مکتوب شکل میں موجود نہیں تھا، کیا مستشرق موصوف یہ سمجھتے ہیں کہ جو بات ایک مرتبہ لکھ لی گئی وہ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی ذہن سے اوجھل نہیں ہو سکتی؟ پھر دنیا جانتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے، لکھتے پڑھتے نہیں تھے، اس لئے آپؐ کے قرآن کریم کو یاد رکھنے کا کتابت سے کوئی تعلق

Marfat.com

ہی نہیں تھا، لہٰذا مذکورہ واقعے سے قرآن کریم کے غیر مکتوب ہونے پر استدلال وہی شخص کر سکتا ہے جس نے اپنے اوپر انصاف اور بصیرت کے سارے دروازے بند کر لئے ہوں،

سورۂ نساء میں سورۂ انعام کا حوالہ

تیسرا اعتراض

پروفیسر مار گولیوتھ نے قرآن کریم کے غیر مکتوب ہونے پر ایک اور عجیب و غریب استدلال یہ کیا ہے کہ سورۂ نساء میں قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ﴾ (النسآء : ۱۴۰)

''اور اُس نے کتاب میں تم پر یہ حکم نازل کیا ہے کہ جب تم اللہ کی آیتوں کو سنو کہ ان کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے تو ایسے لوگوں کے ساتھ اس وقت تک مت بیٹھو جب تک وہ کسی اور بات میں مشغول نہ ہو جائیں۔''

یہ آیت مدنی ہے اور اس میں سورۂ انعام کی جس مکی آیت کا حوالہ دیا گیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہے:

﴿ وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ؕ ﴾ (الانعام : ۶۸)

''اور جب تم اُن لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں کو برا بھلا کہنے میں لگے ہوئے ہیں تو اُن سے اُس وقت تک کے لئے الگ ہو جاؤ جب تک وہ کسی اور بات میں مشغول نہ ہو جائیں۔''

پہلی آیت میں دوسری آیت کا حوالہ دیا گیا ہے، لیکن دونوں کے الفاظ مختلف ہیں،

Marfat.com

مار گولیوتھ نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن کریم کی آیات لکھی ہوئی نہیں تھیں، ورنہ اگر قرآن لکھا ہوا ہوتا تو پہلی آیت میں بعینہٖ وہی الفاظ ذکر کیے جاتے جو دوسری آیت میں مذکور ہیں، الفاظ کے اس اختلاف سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت کے نزول کے وقت دوسری آیت کے الفاظ (معاذ اللہ) محفوظ نہیں رہے تھے،(۱)

لیکن مار گولیوتھ کا یہ استدلال اس قدر بدیہی طور پر غلط ہے کہ اس کا جواب دیتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، سوال یہ ہے کہ اگر سورۂ نساء کے نزول کے وقت سورۂ انعام کی مذکورہ آیت کے الفاظ (معاذ اللہ) محفوظ نہیں رہے تھے تو پھر بعد میں وہ کیسے قرآن کریم میں لکھے گئے؟ اگر سورۂ انعام کے اصل الفاظ محفوظ نہ ہوتے تو قاعدے کا تقاضا یہ تھا کہ بعد میں لکھنے والے سورۂ انعام میں بھی بعینہٖ وہ الفاظ لکھتے جو سورۂ نساء میں مذکور ہیں، ان دونوں آیتوں کا لفظی اختلاف تو درحقیقت اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دونوں آیتوں کے الفاظ ہمیشہ سے پوری طرح محفوظ اور غیر متبدّل تھے، اور ان میں کسی کے قیاس وگمان کو کوئی دخل نہیں رہا، کیونکہ اگر قرآن کریم کی کتابت قیاس اور اندازے سے ہوئی ہوتی تو ان دو آیتوں کے الفاظ میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہئے تھا،

واقعہ یہ ہے کہ ہر زبان کے محاورات میں جب کسی سابقہ گفتگو کا حوالہ دیا جاتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں، بعض مرتبہ سابقہ گفتگو کے بعینہٖ الفاظ دُہرا دیئے جاتے ہیں (جسے انگریزی میں Direct Narration کہتے ہیں) اور بعض اوقات الفاظ بعینہٖ وہی نہیں ہوتے صرف سابقہ گفتگو کے بنیادی مفہوم کو دوسرے الفاظ میں بیان کر دیا جاتا ہے (جسے انگریزی میں Indirect Narration کہا جاتا ہے) ان دونوں صورتوں میں سے پہلی صورت بہت کم استعمال ہوتی ہے، یعنی ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ جس سابقہ گفتگو کا حوالہ دیا جا رہا ہو اس کے پورے پورے الفاظ دُہرائے جائیں، اس کے بجائے ادبی محاورات میں زیادہ تر دوسری صورت اختیار کی جاتی ہے، یعنی اس گفتگو کے مفہوم کو دوسرے الفاظ میں ادا

(۱) انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس ص ۵۴۲ ج ۱۰،

کر دیا جاتا ہے، سورۂ نساء میں بھی یہی دوسری صورت اختیار کی گئی ہے، اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن کریم کی ہر سورۃ بسا اوقات اپنے جملوں کی ساخت کے اعتبار سے جداگانہ اُسلوب رکھتی ہے، لہٰذا اگر ایک سورت کے جملوں کے درمیان کسی دوسری سورت کا جملہ بعینہٖ جوڑ دیا جائے تو آیتوں کے تسلسل (Sequence) میں فرق پڑ جاتا ہے، اور جملوں کی وہ روانی (Flow) برقرار نہیں رہتی جس کی اثر انگیزی سب کے نزدیک مسلّم ہے، چنانچہ جس شخص کو بھی ادبی ذوق کا کچھ حصہ ملا ہو وہ دیکھ سکتا ہے کہ اگر سورۂ نساء کی مذکورہ آیت میں سورۂ انعام کے بعینہٖ الفاظ نقل کر دیئے جائیں تو عبارت کا زور اور تسلسل ٹوٹ جائے گا۔

اس کے علاوہ سورۂ انعام جس کی مذکورہ آیت کے بارے میں مارگولیوتھ کا دعویٰ ہے کہ وہ لکھی ہوئی نہیں تھی، پوری کی پوری ایک مرتبہ نازل ہوئی ہے،(۱) اور اس میں یہ آیت بھی موجود ہے:

﴿ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ ﴾

(الانعام:۹۲)

''اور (اسی طرح) یہ بڑی برکت والی کتاب ہے جو ہم نے اُتاری ہے، پچھلی آسمانی ہدایات کی تصدیق کرنے والی ہے''

اس میں قرآن کے لئے لفظ ''کتاب'' استعمال کیا گیا ہے، اگر سورۂ انعام کے نزول کے وقت تک قرآن کریم کو لکھنے کا معمول نہیں تھا تو اسے ''کتاب'' کہنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ غرض جس پہلو سے دیکھئے، مارگولیوتھ کا یہ اعتراض بالکل بے بنیاد، لغو اور محض تعصب و عناد کی پیداوار معلوم ہوتا ہے،

امام بخاریؒ پر مارگولیوتھ کا ایک بُہتان

چوتھا اعتراض

مارگولیوتھ نے قرآن کریم کی حفاظت پر ایک چوتھا اعتراض ان الفاظ میں کیا ہے:

---

(۱) تفسیر ابن کثیر، ص۱۲۲ ج۲،

Marfat.com

"بخاریؒ کا کہنا ہے کہ ایک جملہ اِلَّآ اَنۡ تَصِلُوۡا مَابَیۡنِیۡ وَبَیۡنَکُمۡ مِنَ الۡقَرَابَةِ (مگر یہ کہ تم اُس رشتہ داری کا پاس کرو جو میرے اور تمہارے درمیان موجود ہے) بذریعۂ وحی نازل ہوا تھا، لیکن شرّاح کا کہنا ہے کہ یہ جملہ قرآن میں نہیں ملتا، اس لئے وہ اس جملے کو سورۂ نمبر ۴۲ آیت نمبر ۲۲ یعنی ﴿اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِی الۡقُرۡبٰی﴾ کی تشریح قرار دیتے ہیں۔"(۱)

لیکن، ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ ان الفاظ کے ذریعہ مارگولیوتھ جیسے عالمی شہرت کے مستشرق نے امام بخاریؒ پر ایسا شرمناک بہتان باندھا ہے جس کی متعصّبانہ بددیانتی یا افسوسناک جہالت کے سوا کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی، اس عبارت سے مارگولیوتھ نے یہ تأثر دینے کی کوشش کی ہے کہ امام بخاریؒ ایک ایسے جملے کو قرآن کریم کا جُزء مانتے ہیں جو اس وقت قرآن میں موجود نہیں ہے، حالانکہ ہر شخص صحیح بخاری اٹھا کر دیکھ سکتا ہے کہ امام بخاریؒ نے آیت کے الفاظ بعینہٖ وہی نقل کئے ہیں جو قرآن کریم موجود ہیں، اور اِلَّآ اَنۡ تَصِلُوۡا الخ والا جملہ اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے، امام بخاریؒ کی پوری عبارت یہ ہے:

باب قوله اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِی الۡقُرۡبٰی حدثنا محمد بن بشّار ......
عن ابن عباسؓ انّه سُئِلَ عن قوله اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِی الۡقُرۡبٰی فقال سعید بن جبیرؓ قربیٰ آل محمّد صلی اللّٰه علیه وسلم فقال ابن عباسؓ عجلتَ، انّ النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم لم یکن بطن من قریش الّا کان له فیهم قرابة فقال الّا ان تصلوا مابینی وبینکم من القرابة،(۲)

---

(۱) انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس ص ۵۴۳ ج ۱۰،

(۲) صحیح بخاریؒ کتاب التفسیر سورۂ حٰم عسق، ص ۷۱۳ ج ۲، طبع کراچی، وفتح الباری، ص ۴۵۷ ج ۸ وعمدة القاری، ص ۱۵۷ ج ۱۹، (یہی روایت بخاری کی کتاب المناقب میں ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے: فنزلت علیه الّا ان تصلوا قرابة بینی وبینکم، لیکن کتاب التفسیر کی اس روایت کی روشنی میں اس کا واضح مطلب بھی یہی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے "الا المودّة فی القربیٰ" کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے بھی فتح الباری میں اس کی یہی تشریح کی ہے (فتح الباری ج ۶ ص ۵۳۱)

Marfat.com

ملاحظہ فرمائیے، یہاں امام بخاریؒ نے باب کے عنوان میں آیت کا وہی جملہ نقل کیا ہے، جو قرآن کریم میں موجود ہے، پھر اس کی تشریح میں حضرت ابن عباسؓ سے آیت ﴿اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ کی تفسیر پوچھی گئی تھی جس کے جواب میں آپ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ الا ان تصلوا ما بینی و بینکم من القرابة لیکن مارگولیوتھ صاحب پوری ڈھٹائی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ اس جملے کو بذریعۂ وحی نازل شدہ مانتے ہیں، اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ تحقیق وانصاف کے یہ دعویدار قرآن کریم کے خلاف تعصب کے کس دائمی روگ میں مبتلا ہیں ،اور اسلام کے خلاف بغض وعناد نے انہیں کس بُری طرح جکڑا ہوا ہے، ﴿فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾

حضرت عائشہؓ سے کچھ آیتیں گم ہوگئی تھیں

پانچواں اعتراض

مارگولیوتھ نے پانچواں اعتراض یہ کیا ہے کہ مسند احمدؒ کی ایک روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ سے کچھ آیتیں گم ہوگئی تھیں، (۱)

یہاں مارگولیوتھ نے جس روایت کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے:

عن عائشة زوج النبیّ صلی اللّٰہ علیه وسلم قالت لقد انزلت اٰیة الرّجم ورضعات الکبیر عشراً فکانت فی ورقة تحت سریر فی بیتی فلمّا اشتکیٰ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم تشاغلنا بامرہ ودخلت دویبة لنا فاکلتها، (۲)

''حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رجم کی آیت اور بڑے آدمی کے دس رضعات کی آیت نازل ہوئی تھیں، یہ آیتیں میرے گھر میں ایک تخت

---

(۱) انسائیکلو پیڈیا آف ریلجین اینڈ ایتھکس ص ۵۴۳ ج ۱۰،

(۲) مسند احمدؒ ، حصہ زوائد ، مسندات عائشہؓ ص ۲۶۹ ج ۶ دار صادر بیروت ،

Marfat.com

کے نیچے کاغذ پر لکھی ہوئی تھیں، جب آنحضرت ﷺ کو (مرض وفات کی) تکلیف شروع ہوئی تو ہم آپ کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے، ہمارا ایک پالتو جانور تھا وہ آیا اور اس نے وہ کاغذ کھالیا۔‘‘

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس روایت میں حضرت عائشہؓ نے جن آیتوں کا ذکر فرمایا ہے یہ باجماعِ امت وہ آیتیں ہیں جن کی تلاوت منسوخ ہو چکی تھی، خود حضرت عائشہؓ بھی ان آیتوں کے منسوخ التلاوۃ ہونے کی قائل ہیں، لہٰذا اگر انہوں نے یہ آیات کسی کاغذ پر لکھ کر رکھی ہوئی تھیں تو اس کا منشاء سوائے ایک یادگار کے تحفظ کے کچھ نہ تھا، ورنہ اگر یہ آیات حضرت عائشہؓ کے نزدیک قرآن کریم کا جُزو ہوتیں تو وہ کم از کم ان کو تو یاد تھیں، وہ اُن کو قرآن کریم کے نسخوں میں درج کراتیں، لیکن انہوں نے ساری عمر ایسی کوشش نہیں کی، اس سے صاف واضح ہے کہ خود حضرت عائشہؓ کے نزدیک یہ آیات محض ایک علمی یادگار کی حیثیت رکھتی تھیں، اور قرآن کریم کی دوسری آیات کی طرح اس کو مصحف میں درج کرانے کا کوئی اہتمام ان کے پیشِ نظر بھی نہیں تھا، لہٰذا اس واقعہ سے قرآن کریم کی حفاظت پر کوئی حرف نہیں آتا۔

عہدِ رسالتؐ میں حُفّاظ کی تعداد

چھٹا اعتراض

بعض حضرات کو حفاظتِ قرآن سے متعلق حضرت قتادہؒ کی ایک اور روایت سے شبہ ہوتا ہے، یہ روایت صحیح بخاریؒ میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے:

سألتُ انس بن مالك رضى الله عنه من جمع القرآن على عهد النبى صلّى الله عليه وسلم، قال اربعة كلهم من الانصار، اُبی بن کعبؓ ومُعاذ بن جبلؓ وزید بن ثابتؓ وابوزیدؓ،

Marfat.com

''میں نے حضرت انس بن مالکؓ سے پوچھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن کریم کس نے جمع کیا تھا؟ انہوں نے فرمایا چار افراد نے جن میں سے ہر ایک انصار میں سے تھا، حضرت اُبیؓ بن کعبؓ، حضرت مُعاذ ابن جبلؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت ابوزید رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔''

اس روایت سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں قرآن کریم کے حافظ بس یہی چار حضرات تھے، حالانکہ یہ خیال درست نہیں، ہم پیچھے ان حضراتِ صحابہؓ کے اسماء گرامی شمار کرا چکے ہیں جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہی قرآن کریم حفظ کرلیا تھا، لہٰذا حضرت انسؓ کی مذکورہ بالا روایت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ صحابہؓ کی پوری جماعت میں ان چار حضرات کے سوا کوئی اور قرآن کریم کا حافظ نہیں تھا، بلکہ مذکورہ بالا حدیث میں ''قرآن کریم کو جمع کرنے'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، اور اس لفظ کا صحیح مفہوم قرآن کریم کو لکھنا ہے، اور حضرت انسؓ کا مطلب یہ ہے کہ یہ چار حضرات وہ ہیں جن کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک ہی میں قرآن کریم پورا پورا لکھا ہوا موجود تھا۔

اس کے علاوہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے طبری کی ایک روایت کے حوالے سے حضرت انسؓ کے اِس ارشاد کا پورا قصہ یہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ اوسؔ اور خزرجؔ کے قبیلوں میں باہمی مفاخرت کا سلسلہ چلا، قبیلۂ اوسؔ کے حضرات نے اپنے قبیلے کے اُن افراد کے نام شمار کرائے جنہیں اسلام میں خصوصی مقام حاصل ہوا، اس کے جواب میں قبیلۂ خزرج کے حضرات (جن میں حضرت انسؓ بھی شامل تھے) یہ فرمایا کہ ہم میں چار حضرات ایسے ہیں جنھوں نے پورا قرآن کریم جمع کیا تھا، لہٰذا اس ارشاد کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اوسؔ اور خزرجؔ کے قبیلوں میں قرآن کریم کو جمع کرنے والے یہی چار حضرات تھے۔(۱)

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فتح الباری ص ۴۱،۴۲ ج ۹ باب القراء من اصحاب النبی ﷺ۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور معوّذتین

ساتواں اعتراض

بعض لوگ مُسند احمدؒ کی اُس روایت کو بہت اُچھالتے ہیں جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ معوذتین (سورۂ فلق اور سورۂ ناس) کو قرآن کریم کا جزء نہیں مانتے تھے،(۱)

حالانکہ یہ واقعہ بالکل غلط ہے، حقیقت یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی پوری اُمت کی طرح معوذتین کو قرآن کریم کا جزء قرار دیتے تھے، اور جن روایتوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ ان دو سورتوں کے قرآن ہونے کے قائل نہ تھے وہ درست نہیں ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے قرآن کریم کی جو متواتر قراءتیں منقول ہیں اُن میں معوذتین شامل ہیں، قراآتِ عشرہ میں سے حضرت عاصمؒ کی قراءت حضرت ابوعبدالرحمٰن سُلمیؒ، حضرت زر بن حبیشؒ اور حضرت ابوعمر والشیبانیؒ سے منقول ہے، اور یہ تینوں حضرات اسے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں،(۲) اسی طرح حضرت حمزہؒ کی قراءت علقمہؒ، اسودؒ، ابن وہبؒ، مسروقؒ، عاصم بن ضمرہؒ اور حارثؒ سے منقول ہے، اور یہ تمام حضرات اسے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں،(۳) اس کے علاوہ قراآتِ عشرہ میں سے کسائیؒ اور خلفؒ کی قراءتیں بھی بالآخر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر ختم ہوتی ہیں، کیونکہ کسائیؒ حمزہؒ کے شاگرد ہیں، اور خلفؒ اُن کے شاگرد کے شاگرد ہیں، اور اس بات پر اُمت کا اجماع ہے کہ قراآتِ عشرہ کی ساری اسانید ساری دنیا میں سب سے زیادہ قوی اور صحیح اسانید ہیں اور نسلاً بعد نسلٍ تواتر سے نقل ہوتی چلی آرہی ہیں(۴) اس لئے اگر کوئی خبر واحد ان متواتر قراءتوں کے

(۱) Watt: W.Montgomery ; Bell,s Introduction to the Quran PP.46

(۲) النشر فی القراآت العشر ، لابن الجزریؒ ص۱۵۶ ج۱،

(۳) النشر فی القراآت العشر ، لابن الجزریؒ ص۱۶۶ ج۱، (۴) فیض الباری، ص۲۶۲ ج۱،

Marfat.com

خلاف ہو تو وہ یقیناً واجب الرّد ہے، اور اسے قبول نہیں کیا جاسکتا،

اسی بناء پر محقق علماء اور محدّثین کی اکثریت نے ان روایتوں کو ضعیف، موضوع یا کم از کم ناقابل قبول بتایا ہے، جو حضرت ابن مسعودؓ کی طرف یہ باطل مذہب منسوب کرتی ہیں، ان علماء میں شیخ الاسلام علاّمہ نوویؒ، علاّمہ ابن حزمؒ، امام رازیؒ قاضی ابوبکر بن عربیؒ، علاّمہ بحر العلومؒ اور آخری دَور کے مشہور محقق عالم علاّمہ زاہد کوثریؒ رحمہم اللہ شامل ہیں۔(۱)

اس پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ حافظ ابن حجرؒ اور علاّمہ نور الدین ہیثمیؒ نے تصریح کی ہے کہ ان روایتوں کے تمام راوی ثقہ ہیں (۲) پھر ان روایتوں کو غیر صحیح کیسے کہا جاسکتا ہے؟ لیکن جو حضرات علم حدیث سے واقف ہیں اُن پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ صرف راویوں کا ثقہ ہونا کسی روایت کے صحیح ہونے کے لئے کافی نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں کوئی علّت یا شذوذ نہ پایا جائے، تمام محدّثین نے ''حدیثِ صحیح'' کی تعریف میں یہ بات لکھی ہے کہ وہ روایت ہر قسم کی علّت اور شذوذ سے خالی ہو، چنانچہ اگر کسی روایت میں کوئی علّت یا شذوذ پایا جاتا ہو تو راویوں کے ثقہ ہونے کے باوجود اس کو صحیح قرار نہیں دیا جاتا، حافظ ابن الصّلاح رحمۃ اللہ علیہ اپنے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''پس حدیثِ معلّل وہ حدیث ہے جس میں کوئی علّت معلوم ہوئی ہو جو اس حدیث کی صحت کو مجروح کرتی ہو، باوجودیکہ ظاہری نظر میں وہ حدیث صحیح سالم معلوم ہوتی ہو، اور یہ ''علت'' اُس سَند میں بھی واقع ہوجاتی ہے جس کے راوی ثقہ ہوتے ہیں، اور جس میں بظاہر صحت کی تمام شرائط موجود ہوتی ہیں اور اس علّت کا ادراک علم حدیث میں بصیرت رکھنے والوں کو مختلف طریقوں سے ہوتا ہے، کبھی راوی کو منفرد دیکھ کر اور کبھی یہ دیکھ کر کہ وہ راوی کسی دوسرے

---

(۱) دیکھئے علی الترتیب اتقان ص۸۱ ج۱، المحلّیٰ، لابن حزمؒ ص۱۳ ج۱، فواتح الرحموت شرح مسلّم الثبوت از بحر العلوم، ص۱۲ ج۲، مقالات الکوثریؒ ص۱۶، تفصیلی عبارتوں کے لئے ملاحظہ ہو احقر کا مضمون ''حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور معوّذتین'' ماہنامہ البلاغ شعبان ۱۳۹۳ھ

(۲) فتح الباری، ص۶۰۳ ج۸ ومجمع الزوائد للھیثمیؒ، ص۱۴۹ ج۷،

Marfat.com

راوی کی مخالفت کر رہا ہے، اور اس کے ساتھ کبھی دوسرے قرائن بھی مل جاتے ہیں۔"(۱)

اسی طرح حدیث کی ایک قسم "شاذ" ہے، اس کے راوی بھی ثقہ ہوتے ہیں، لیکن چونکہ وہ اپنے سے زیادہ ثقہ راویوں کی مخالفت کرتے ہیں، اس لئے اُن کی حدیث قبول نہیں کی جاتی، لہٰذا جن روایتوں میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے، کہ وہ معوذتین کو قرآن کریم کا جزء نہیں مانتے تھے علامہ نوویؒ اور ابن حزمؒ وغیرہ نے اُن کو راویوں کے ثقہ ہونے کے باوجود مندرجہ ذیل تین وجوہ سے قابلِ قبول نہیں سمجھا:

۱...... یہ روایتیں معلول ہیں، اور ان کی سب سے بڑی علّت یہ ہے کہ وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اُن قراءتوں کے خلاف ہیں جو اُن سے بہ طریق تواتر منقول ہیں،

۲...... مسندِ احمدؒ کی وہ روایت جس میں حضرت ابن مسعودؓ کا یہ صریح قول نقل کیا گیا ہے کہ اَنَّهُمَا لَيْسَتَا مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ (معوذتین اللہ کی کتاب کا جزء نہیں ہیں) صرف عبدالرحمٰن بن یزید نخعیؒ سے منقول ہے، اور کسی نے صراحۃً اُن کا یہ جملہ نقل نہیں کیا(۲) اور متواترات کے خلاف ہونے کی وجہ سے یہ جملہ یقیناً شاذ ہے، اور محدثین کے اصول کے مطابق "حدیثِ شاذ" مقبول نہیں ہوتی،

۳...... اگر بالفرض ان روایتوں کو صحیح بھی مان لیا جائے تب بھی بہر حال یہ اخبار احاد ہیں، اور اس بات پر اُمّت کا اجماع ہے کہ جو خبر واحد متواترات اور قطعیات کے خلاف ہو وہ مقبول نہیں ہوتی، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جو قراءتیں تواتر کے ساتھ ثابت ہیں اُن کی صحت قطعی ہے، لہٰذا ان کے مقابلے میں یہ اخبارِ آحاد یقیناً واجب الرّد ہیں،

اب صرف ایک سوال رہ جاتا ہے، اور وہ یہ کہ اگر یہ روایتیں صحیح نہیں ہیں تو ان ثقہ راویوں نے ایسی بے اصل بات کیونکر روایت کر دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان روایتوں کی حقیقت یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ معوذتین کو قرآن کریم کا جزء مانتے ہیں، لیکن

(۱) مقدمہ فتح الملہم، ص ۵۴ ج ۱،

(۲) دیکھئے مجمع الزوائد، للہیثمیؒ ص ۱۴۹ ج ۷ والفتح الربانی ص ۳۵۱ و ۳۵۲ ج ۱۸،

Marfat.com

کسی وجہ سے انہوں نے اپنے مصحف میں اُن کو لکھا نہ ہو، اس واقعہ کو روایت کرتے ہوئے کسی راوی کو وہم ہوا، اور اس نے اسے اس طرح روایت کردیا، گویا وہ انہیں سرے سے جزءِ قرآن ہی نہ مانتے تھے، حالانکہ حقیقت صرف اتنی تھی کہ معوذتین کو جزءِ قرآن ماننے کے باوجود انہوں نے اپنے مصحف میں اُن کو نہیں لکھا تھا، اور نہ لکھنے کی وجوہ بہت سی ہوسکتی ہیں، مثلاً علامہ زاہد کوثری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ انہوں نے معوذتین کو اس لئے نہیں لکھا کہ اُن کے بھولنے کا کوئی ڈر نہ تھا، کیونکہ یہ ہر مسلمان کو یاد ہوتی ہیں، (۱)

اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے مصحف میں سورۂ فاتحہ بھی نہیں لکھی تھی، اور امام ابوبکر الانباریؒ نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ اُن سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اگر میں سورۂ فاتحہ لکھتا تو اسے ہر سورت کے ساتھ لکھتا۔" امام ابوبکرؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں ہر سورت سے پہلے سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے، اس لئے میں نے اسے نہ لکھکر اختصار سے کام لیا، اور مسلمانوں کے حافظے پر اعتماد کیا، (۲)

بہرکیف! اگر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے مصحف میں سورۂ فاتحہ اور معوّذتین تحریر نہ فرمائی ہوں تو اس کی بہت معقول توجیہات ہوسکتی ہیں، اور اُن سے یہ سمجھنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ وہ اُن کو قرآن کریم کا جزء ہی نہیں مانتے تھے، جبکہ اُن سے تواتر کے ساتھ پورا قرآن ثابت ہے، جس میں معوّذتین بھی شامل ہیں،

خلافتِ صدیقی میں جمعِ قرآن کی روایت پر مستشرقین کا آٹھواں اعتراض

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قرآن کریم کو جمع کرنے کا جو کارنامہ انجام دیا گیا، اس کی تفصیل ہم پیچھے ذکر کرچکے ہیں، بعض مستشرقین نے اس واقعے ہی کو صحیح

(۱) مقالات الکوثریؒ ص ۱۶،   (۲) تفسیر القرطبیؒ ص ۱۱۴ و ۱۱۵، ج ۱،

Marfat.com

تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سرکاری سطح پر...... قرآن کریم کی جمع وترتیب کی کوشش نہیں ہوئی، بلکہ سرکاری سطح پر اس نوعیت کا پہلا کارنامہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انجام دیا، انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے جس نسخے سے استفادہ کیا تھا وہ حضرت حفصہؓ کا ذاتی نسخہ تھا، کوئی سرکاری طور پر تیار کیا ہوا نسخہ نہیں تھا، اپنے اس دعوے کے ثبوت میں انہوں نے صحیح بخاریؒ کی اُس روایت پر متعدد اعتراضات کئے ہیں جو حضرت زید بن ثابتؓ سے مروی ہے، اور جس میں حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جمعِ قرآن کا واقعہ بیان کیا ہے، (۱) ان تمام اعتراضات کا خلاصہ پروفیسر منٹگمری واٹ نے بیان کیا ہے (۲) یہاں اُن تمام اعتراضات کو بیان کرکے جواب دینا اس لئے غیر ضروری ہے کہ ان میں سے اکثر اعتراضات ایسے ہیں جن کا جواب ایک معمولی واقفیت کا انسان خود سمجھ سکتا ہے، البتہ اُن میں سے چند اہم اعتراضات کا جواب یہاں پیشِ خدمت ہے،

مثلاً ایک اہم اعتراض یہ ہے کہ صحیح بخاریؒ کی روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جمعِ قرآن کا محرّک یہ تھا کہ یمامہ کی جنگ میں حفّاظ وقرّاء کی ایک بڑی تعداد شہید ہوگئی تھی، حالانکہ تاریخی طور پر یہ محرک صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ جنگ یمامہ کے شہداء کی فہرست میں ایسے لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی، جو قرآن کریم کے حافظ ہوں کیونکہ شہداء زیادہ تر نومسلم تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتراض قطعی بے بنیاد اور لغو ہے اسے سب سے پہلے فریڈرک شالے (Fredrich Schwally) نے کیا تھا اس کے بعد کے مستشرقین بھی آنکھیں بند کرکے اس کی تقلید کرتے چلے گئے، (۳) اور کسی نے یہ زحمت گوارا نہیں کی، کہ یمامہ کے شہداء کی فہرست دیکھ کر اس بات کی تحقیق کرتا، کہ یہ اعتراض کس حد تک صحیح ہے؟ واقعہ

---

(۱) یہ روایت پیچھے صفحہ پر گذر چکی ہے،

(۲) Watt: Bell's Introduction to the Quran 40,42 Edinburgh 1970

(۳) ایضاً ص ۱۹۲،

Marfat.com

یہ ہے کہ یمامہ کی جنگ میں مدینہ طیبہ کے رہنے والے مہاجرین وانصار کی تعداد تین سو ساٹھ اور مدینہ طیبہ کے علاوہ دوسرے مقامات کے رہنے والے مہاجرین کی تعداد تین سو تھی، (۱) ظاہر ہے کہ ان چھ سو ساٹھ افراد کے پورے نام تو تاریخ میں محفوظ نہیں رہے، البتہ ان میں سے اٹھاون مہاجرین وانصار کے نام حافظ ابن کثیرؒ نے نقل فرمائے ہیں (۲)

ان اٹھاون افراد میں سے ایک حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ ہیں، جو حافظ اور قاری ہونے کے اعتبار سے صحابہؓ میں ممتاز ترین مقام کے حامل تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چار حضرات سے بطور خاص قرآن کریم سیکھنے کا حکم دیا تھا ان میں سے ایک یہ بھی تھے، آپ کی ہجرت سے پہلے مسجدِ قباء میں امام یہی تھے، اور حضرت عمرؓ بھی ان کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، سفر میں بھی اکثر صحابہؓ کی امامت یہی فرماتے کیونکہ انہیں، اقرأ (قرآن کریم کا سب سے بڑا عالم) سمجھا جاتا تھا، (۳)

دوسرے بزرگ حضرت ابوحذیفہؓ ہیں جو حضرت سالمؓ کے مولیٰ تھے، اور تاریخ اسلام میں چوالیسویں مسلمان ہیں (۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طویل صحبت کے علاوہ حضرت سالمؓ سے خصوصی تعلّق کی بناء پر علم قرآن کریم کے معاملہ میں اُن کے مقامِ بلند کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے،

تیسرے بزرگ حضرت زید بن الخطابؓ ہیں، جو حضرت عمرؓ کے بڑے بھائی ہیں، اور بالکل ابتداء میں اسلام لے آئے تھے، حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ ہوا کا جو بھی جھونکا چلتا ہے وہ مجھے زید بن الخطابؓ کی یاد دلاتا ہے، (۵)

چوتھے بزرگ حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ ہیں، جن کے بارے میں

---

(۱) تاریخ الطبری، ص ۵۱۶، ج ۲، (۲) البدایہ و النہایہ ص ۳۴۰ ج ۶

(۳) دیکھئے الاستیعاب، لابن عبدالبرؒ، علی ھامش الاصابہ ص ۶۸، ۶۹ ج ۲،

(۴) الاصابہ، للحافظ ابن حجرؒ، ص ۴۳ ج ۴،

(۵) البدایہ و النہایہ، لابن کثیرؒ، ص ۳۳۶ ج ۶ مطبعۃ السعادۃ مصر،

پیچھے گذر چکا ہے کہ وہ کاتبینِ وحی میں سے تھے، (۱) قرآن کریم سے ان کا خصوصی تعلق بالکل ظاہر اور واضح ہے،

ایک اور بزرگ حضرت عبّاد بن بشرؓ ہیں، جو بدری صحابی ہیں، اور حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے کہ انصاری صحابہ میں تین حضرات ایسے تھے جو اپنے علم و فضل کے اعتبار سے تمام دوسرے صحابہؓ پر فائق تھے، اِن تین حضرات میں سے ایک حضرت عبّاد بن بشرؓ بھی تھے، (۲)

نیز حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ بھی یمامہ کی جنگ میں شہید ہوئے، جو مشہور صحابی ہیں، اور قرآن کریم کی تعلیم میں حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ جیسے اقرء الصحابہؓ کے شاگرد ہیں، (۳) حضرت زید بن ثابتؓ کے بھائی حضرت یزید بن ثابتؓ، حضرت براء بن عازبؓ کے چچا حضرت قیس بن الحارثؓ، حضرت معاذؓ کے بھائی عائذ بن ماعضؓ، حضرت زبیرؓ کے بھائی سائب بن عوّام اور حضرت عثمان بن مظعونؓ کے صاحبزادے حضرت سائب بن عثمانؓ بھی اسی فہرست میں شامل ہیں،

پھر مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ اٹھارہ مہاجرین تھے، اور انصار میں سے تقریباً بیس حضرات ایسے تھے جو غزوۂ بدر سے پہلے مسلمان ہوئے، اور اُن کے علاوہ تقریباً دس ایسے تھے جو غزوۂ احد میں شریک تھے، (۴) اور یہ تفصیل صرف اُن شہداء کی ہے، جن کے نام تاریخ میں محفوظ رہ سکے ہیں، باقی سینکڑوں نامعلوم افراد میں سے کتنے حافظ قاری ہوں گے؟ اس کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، لیکن فریڈرک شالے (Schwally) جارج بیل اور منٹگمری واٹ ہیں کہ انہیں اس فہرست میں نہ صرف یہ کہ کوئی قاری نظر نہیں آتا بلکہ وہ ان سب کو "نومسلم" (Recently Converts) قرار دے کر دنیا پر اپنی تحقیق کا رُعب جمانا چاہتے ہیں، غور

(۱) زاد المعاد، لابن القیمؒ ص۳۰ ج۱ معینیہ مصر،
(۲) الاصابہ، ص۲۵۵ ج۲، و الاستیعاب علی ہامش الصحابہ ص۴۴۴ تا ۴۴۶ ج۳،
(۳) الاصابہ ص۲۱۷ ج۲،
(۴) اس فہرست کے لئے دیکھئے الکامل، لابن اثیر الجزریؒ، ص۱۴۰ ج۲ و البدایہ و النہایہ ص۳۴۰ ج۶،

Marfat.com

فرمایئے کہ جس جنگ میں مہاجرین وانصار کی اتنی بڑی جماعت شہید ہوگئی ہواس کے بارے میں یہ کہنا کہ اس میں سب نومسلم شہید ہوئے تھے لہٰذا صحیح بخاریؒ کی جمعِ قرآن والی روایت غلط ہے علم وتحقیق پر کتنا بڑا ظلم ہے، اور انصاف ودیانت کے ساتھ کتنا بڑا فریب ہے؟ پھر بات یہ نہیں ہے کہ جنگِ یمامہ میں تمام حفاظِ صحابہؓ شہید ہوگئے تھے، بلکہ بات یہ ہے کہ جنگِ یمامہ تو صرف ایک لڑائی تھی، یہ زمانہ وہ تھا جبکہ اس طرح کی جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہورہا تھا، اور علماءِ صحابہؓ میں سے کتنے جانباز ایسے تھے جو یمامہ سے کہیں زیادہ خوں ریز معرکوں میں اپنی جان قربان کرنے کے لئے بے چین تھے، اس ماحول میں اگر حضرت عمرؓ کے دل میں قرآن کریم جمع کرنے کا داعیہ پیدا ہوگیا تو اس میں کونسی ایسی غیر معقول بات ہے، جس کی بناء پر صحیح بخاریؒ کی ایسی قوی روایت کو غلط قرار دیدیا جائے؟

منٹگمری واٹ نے اس روایت پر دوسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ اگر حضرت ابوبکرؓ نے سرکاری سطح پر کوئی نسخہ تیار کیا ہوتا تو اسے ایک ''حجت'' کی حیثیت حاصل ہوتی، حالانکہ اس زمانے کی روایتوں میں اس بات کا کوئی نشان نہیں ملتا، کہ حضرت ابوبکرؓ کے اس سرکاری نسخے کے حوالے دیئے جاتے ہوں...... لیکن اس اعتراض کی لغویت بھی محتاجِ بیان نہیں کیونکہ اس نسخے کو ''حجت'' قرار دینے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ جب حضرت عثمانؓ نے عالم اسلام کے مختلف حصوں میں قرآن کریم کے نسخے نقل کرا کر بھیجنے کا ارادہ کیا تو سب سے پہلے حضرت حفصہؓ سے وہی نسخہ طلب فرمایا جو حضرت ابوبکرؓ نے تیار فرمایا تھا،

واٹ نے ایک اعتراض یہ بھی کیا ہے کہ اگر یہ کوئی سرکاری نسخہ تھا تو حضرت عمرؓ کے بعد یہ نسخہ خلیفۂ وقت کے بجائے حضرت حفصہؓ کے پاس کیوں رہا؟ اس کا جواب بھی بالکل واضح ہے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت کے وقت کوئی خلیفہ معیّن نہیں تھا، اس لئے حضرت عمرؓ کے دوسرے سامان کے ساتھ یہ نسخہ بھی حضرت حفصہؓ کے پاس منتقل ہوگیا، کون ایسا صاحبِ عقل انسان ہوسکتا ہے جو محض اتنی سی بات کی وجہ سے ایسی مستند روایت ہی کو دریا برد کرڈالے،

Marfat.com

خلافتِ صدیقی تک پورا قرآن لکھا نہیں گیا تھا:

نواں اعتراض

پیچھے بتایا جا چکا ہے کہ جب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی آیت نازل ہوتی تو آپؐ کاتبین وحی کو بلا کر اُس کو لکھوا دیتے تھے، اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تک پورا قرآن لکھا تو جا چکا تھا، لیکن وہ کتابی شکل میں مرتب نہیں تھا، بلکہ مختلف آیتیں مختلف چیزوں پر لکھی ہوئی موجود تھیں، حضرت ابوبکرؓ نے ان مختلف اشیاء کو جمع کر کے آیاتِ قرآنی کو یکجا صحیفوں کی شکل میں لکھوایا،

اس کے برخلاف مستشرقین میں سے نولڈیکی اور آرتھر جیفرے وغیرہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پورا قرآن لکھا نہیں گیا تھا، بلکہ اس کے صرف کچھ حصے لکھے گئے تھے، انہوں نے صحیح بخاریؒ کی اس روایت سے استدلال کیا ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جنگِ یمامہ کے بعد حضرت عمرؓ نے جمعِ قرآن کا مشورہ دیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ اگر حُفّاظ صحابہؓ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو قرآن کریم کے بہت سے حصوں کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے، آرتھر جیفرے لکھتا ہے:

> ''اس سے واضح ہے کہ اندیشے کی وجہ اُن حفاظ کا قتل ہو جانا تھا جنہوں نے قرآن کریم یاد کر رکھا تھا، اگر قرآن کریم پورا کا پورا (عہدِ رسالتؐ میں) لکھا جا چکا تھا تو اس اندیشے کے کوئی معنی نہ تھے'' (۱)

لیکن اوّل تو یہ بات انتہائی حیرت انگیز اور افسوسناک ہے کہ بعض دوسرے مستشرقین کی طرح آرتھر جیفرے نے بھی صحیح بخاریؒ کی اس روایت کو درست ماننے سے انکار کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے سرکاری سطح پر کوئی نسخہ تیار فرمایا تھا، (۲) اب اس دو عملی

(۱) عربی مقدمہ، کتاب المصاحف لابن ابی داؤد : آرتھر جیفرے، ص۵ مطبعہ رحمانیہ مصر ۱۳۵۵ھ

(۲) Arthur jeffery; Materials for the History of the text of the Quran, Leiden 1937 P.6

Marfat.com

کو انصاف اور دیانت کے کونسے خانے میں فِٹ کیا جائے کہ حضرت زید بن ثابتؓ کی اس روایت میں وہ ساری باتیں تو جیفر ے صاحب کی نگاہ میں جھوٹی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں سرکاری سطح پر قرآن کریم کی حفاظت کا اہتمام کیا گیا تھا، لیکن اسی روایت کا وہ حصہ اُن کی نظر میں بالکل صحیح ہے جس میں حضرت عمرؓ کا وہ جملہ نقل کیا گیا ہے کہ ''اگر صحابہؓ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو خطرہ ہے کہ کہیں قرآن کا بڑا حصہ ضائع نہ ہو جائے'' ایک طرف تو وہ یہ پوری روایت نقل کر کے اسے من گھڑت (fl ctitions) بتاتے ہیں، اور دوسری طرف اسی روایت سے قرآن کریم کے غیر مکتوب ہونے پر استدلال بھی فرماتے ہیں، اُس کے باوجود ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ''مستشرقین کا انصاف، نیک نیتی، اور غیر جانب داری بالکل واضح ہے، ان کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سوائے حقیقت کی نقاب کشائی کے کچھ اور نہیں چاہتے۔''

بہر کیف! حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں قرآنِ کریم کو جمع کرنے کا جو طریق کار اختیار کیا گیا تھا، اور جسے ہم پچھلے باب میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں، اگر اُسے ذہن میں رکھا جائے تو حضرت عمرؓ کے اس جملے سے جیفر ے کا یہ استدلال خود بخود باطل ہو جاتا ہے، ہم عرض کر چکے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جمعِ قرآن کا جو طریقہ اختیار کیا گیا اس میں یادداشت اور کتابت دونوں ذرائع سے بیک وقت کام لیا جاتا تھا، اسی لئے کوئی آیت اُس وقت تک نہیں لکھی جاتی تھی، جب تک تمام موجودہ ذرائع سے اس کا جزوِ قرآن ہونا ثابت نہ ہو جائے، یہ محتاط طریق کار اسی وقت ممکن ہوا جب آیاتِ قرآنی کے مکتوب شکل میں محفوظ ہونے کے علاوہ حفاظ کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی، اس کے برخلاف اگر حفاظ صحابہؓ کی اتنی بڑی جماعت اس وقت موجود نہ ہوتی تو جمعِ قرآن کا یہ کارنامہ اس مکمل احتیاط کے ساتھ انجام نہیں پا سکتا تھا، جس کا وہ مستحق تھا،

(۱) Arthur jeffery; Materials for the History of the text of the Quran, Leiden 1937 P.6

Marfat.com

اس کے علاوہ قرآن کریم کے ثبوت کے لئے تواتر کی ضرورت تھی، اور محض دو چار نسخے اس ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے تھے، اس لئے جمعِ قرآن کے وقت حُفّاظِ قرآن کی ایک بڑی جماعت ناگزیر تھی، لہٰذا حضرت عمرؓ کے اندیشے کی وجہ یہی تھی کہ اگر حُفّاظِ قرآن شہید ہوتے گئے اور جمعِ قرآن کا کام مؤخر ہوتا رہا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ قرآن کریم کا تواتر منقطع ہو جائے اور لکھے ہوئے مواد کی تصدیق صحابہؓ کے متواتر حافظوں سے نہ کی جا سکے، لہٰذا حضرت عمرؓ کے اس اندیشے سے یہ استدلال بالکل باطل ہے کہ اُس وقت تک پورا قرآن کہیں بھی لکھا ہوا موجود نہیں تھا،

مختلف قراءتیں کس طرح وجود میں آئیں؛

دسواں شبہ

قرآن کریم کی مختلف قراءتوں کی حقیقت ہم پیچھے تفصیل کے ساتھ ذکر کر چکے ہیں، لیکن مستشرقین کی ایک بڑی جماعت نے اس معاملے میں ایک دوسرا گمراہ کن نظریہ پیش کیا ہے، نولدیکی، گولڈ زیہر اور آرتھر جیفرے وغیرہ نے لکھا ہے کہ قراءتوں کا اختلاف درحقیقت سماعی نہیں تھا، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمانؓ نے جو نسخے تیار کرائے تھے اُن پر نقطے اور حرکات نہیں تھے، اس لئے اسے مختلف طریقوں سے پڑھا جا سکتا تھا، چنانچہ جس شخص نے جس طرح چاہا اپنے اجتہاد سے پڑھ لیا، اور وہ اس کی قراءت بن گئی، (۱)

مستشرقین کے اس دعوے کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی جو مختلف قراءتیں معروف ہیں، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، بلکہ مصاحفِ عثمانی کو پڑھنے میں لوگوں کا جو اختلاف ہوا اس کی بناء پر پیدا ہوئی ہیں، حالانکہ یہ دعویٰ صراحۃً بے بنیاد اور بالکل غلط ہے، واقعہ یہ ہے کہ مصاحفِ عثمانی کا نقطوں اور حرکات سے خالی ہونا قراءتوں کے وجود میں آنے کا

(۱) دیکھئے "مذاهب التفسير الاسلامی، گولڈ زیہر، ترجمہ عربی ڈاکٹر عبدالحلیم نجار، ص ۸، مکتبة الخانجی، قاہرہ ۱۳۷۴ھ اور مقدمۃ کتاب المصاحف، آرتھر جیفرے، ص ۷ المطبعة الرحمانیہ، مصر ۱۳۵۵ھ

Marfat.com

سبب نہیں بنا، بلکہ ان مصاحفِ عثمانی کو نقطوں اور حرکات سے جان بوجھ کر اسی لئے خالی رکھا گیا تھا کہ قرآن کریم کی جتنی قراءتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں وہ سب اس رسم الخط میں سما سکیں،

ہم پیچھے عرض کر چکے ہیں کہ ہر دور میں قرآن کریم کی کسی قراءت کو قبول کرنے کے لئے تین شرائط کو لازمی سمجھا گیا ہے، ایک یہ کہ مصاحفِ عثمانیؓ کے رسم الخط میں اس کی گنجائش ہو، دوسرے یہ کہ وہ عربی زبان کے قواعد مطابق ہو، اور تیسرے یہ کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو، لہٰذا کوئی قراءت اُس وقت تک صحیح تسلیم نہیں کی گئی، جب تک صحیح سند کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ثبوت نہیں مل گیا، اگر قراءتوں کے وجود میں آنے کا سبب محض عثمانی رسم الخط ہوتا تو ہر اُس قراءت کو درست مان لیا جاتا جو رسم الخط میں سما جاتی، اور اسے قبول کرنے کے لئے یہ تیسری شرط عائد نہ کی جاتی، چنانچہ جو شخص بھی قرآن کریم کی مختلف قراءتوں پر غور کرے گا اُسے کھلی آنکھوں نظر آجائے گا کہ عثمانی رسم الخط میں ایک لفظ کو مختلف طریقوں سے پڑھنے کی گنجائش موجود تھی، لیکن چونکہ وہ طریقے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں تھے، اس لئے اُنہیں اختیار نہیں کیا گیا، یہ بات دو مثالوں سے واضح ہوگی،

سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے:

﴿ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴾

یہاں ایک قراءت میں لَا يُقْبَلُ (یا کے ساتھ) ہے، اور ایک قراءت میں لَا تُقْبَلُ (تا کے ساتھ) ہے لیکن اسی قسم کی ایک آیت سورۂ بقرہ میں ایک دوسری جگہ ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے ﴿ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴾ یہاں لَا تَنْفَعُهَا صرف تاء کے ساتھ آیا ہے، لَا يَنْفَعُهَا (یاء کے ساتھ) کوئی قراءت نہیں ہے، حالانکہ رسمِ عثمانی میں لَا يَنْفَعُهَا کی بھی گنجائش ہے، کیونکہ عثمانی مصاحف میں یہ جملہ اس طرح لکھا ہوا تھا: ''لاتـنـفعهـا'' اور عربی زبان کے قواعد میں بھی یاء اور تاء دونوں کی گنجائش موجود تھی، لیکن چونکہ یہ قراءت آنحضرت

Marfat.com

صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں تھی، اس لئے اس کو کسی نے بھی اختیار نہیں کیا،

اسی طرح سورۂ یٰسٓ میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ یہاں ایک قراءت میں فَيَكُوْنُ (نون پر پیش کے ساتھ) آیا ہے، اور دوسری قراءت میں فَيَكُوْنَ (نون پر زبر کے ساتھ) لیکن اسی طرح کی ایک آیت سورۂ آلِ عمران میں ہے: ﴿اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ یہاں صرف ایک ہی قراءت ہے (یعنی نون پر پیش) دوسری قراءت رسم الخط کی گنجائش کے باوجود کسی نے اختیار نہیں کی، (۱)

اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں قراآت کے مجموعوں میں موجود ہیں، جن سے صاف ظاہر ہے کہ قراءتیں رسم الخط سے وجود میں نہیں آئیں، بلکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت تھیں، اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اُن کو محفوظ رکھنے کے لئے مصاحف کو نقطوں اور حرکات سے خالی رکھا تھا،

یہی وجہ ہے کہ پوری اُمت میں صرف ایک صاحب (یعنی ابوبکر بن مقسم) (۲) ایسے گزرے ہیں جنہوں نے یہ مسلک اختیار کیا تھا کہ عثمانی مصاحف سے اپنے اجتہاد کے مطابق قراءتیں ایجاد کی جاسکتی ہیں، اور ان کا سند کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہونا ضروری نہیں، لیکن جس وقت انہوں نے اپنا یہ گمراہانہ نظریہ پیش کیا، تو پورے عالمِ اسلام نے اُن پر شدید نکیر کی، خلیفۂ وقت نے انہیں قرّاء اور فقہاء کی ایک مجلس میں طلب کر کے اُن سے توبہ کرنے کا مطالبہ کیا، چنانچہ انہوں نے توبہ کی، اور اپنے نظریئے سے رجوع کا تحریری اعلان لکھ کر دیا، (۳)

---

(۱) یہ دونوں مثلیں علامہ طاہر کردیؒ کی تاریخ القرآن، ص ۱۲۸ و ۱۲۹ سے ماخوذ ہیں،

(۲) ان کا پورا نام محمد بن الحسن بن یعقوب ابنِ مقسم ہے، ولادت ۲۶۵ھ اور وفات ۳۵۴ھ

(۳) تفصیلات کے لئے دیکھئے تاریخ بغداد، للخطیب، ص ۲۰۶ تا ۲۰۸ ج ۲ طبع بیروت، خطیب بغدادیؒ نے ان کا یہ لطیفہ بھی نقل کیا ہے کہ ان کی وفات کے بعد ابواحمد الفرضیؒ نے انہیں خواب میں دیکھا کہ وہ قبلہ کی طرف پشت کر کے نماز پڑھ رہے ہیں، فرضیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کی یہ تعبیر لی کہ انہوں نے قراآت قرآن میں ائمہ کی مخالفت کی ہے،

اس واقعہ سے صاف واضح ہے کہ عثمانی مصاحف سے اپنے اجتہاد کے مطابق قراءتیں مستنبط کرنے کو اُمّتِ مسلمہ میں ہمیشہ ایک گمراہی سمجھا گیا ہے، اور اس بات پر ہر دور میں مسلمانوں کا اجماع رہا ہے کہ قرآن کریم کی صرف وہی قراءت معتبر ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو، اگر قراءتوں کا وجود محض عثمانی رسم الخط کے پڑھنے میں اجتہادی اختلافات کی وجہ سے ہوا ہوتا تو ابن مقسم پر اتنی شدید نکیر کیوں کی جاتی؟ لہٰذا مستشرقین کا یہ دعویٰ بالکل بے اصل اور بے بنیاد ہے کہ قراءتیں عثمانی مصاحف میں نقطوں اور حرکات کی غیر موجودگی سے پیدا ہوئی ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ قراءتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر طریقے پر ثابت ہیں، اور اُن کو محفوظ کرنے کے لئے ہی حضرت عثمانؓ نے اپنے مصاحف کو نقطوں اور حرکات سے خالی رکھا تھا، تاکہ یہ تمام قراءتیں اُن کے رسم الخط میں سما سکیں،

قرآن کریم کی شاذ قراءتیں اور ان کی حقیقت

گیارہواں شبہ

بعض مستشرقین نے قرآن کریم کی شاذ قراءتوں کو بنیاد بنا کر غلط مفروضات کا ایک قلعہ تعمیر کر لیا ہے، اور رائی کا پہاڑ اور سُوئی کا بھالا بنانے کی کوشش کی ہے، خاص طور سے گولڈ زیہر اور آرتھر جیفرے نے ان قراءتوں کی بہت سی مثالیں پیش کر کے اُن سے مَن مانے نتائج نکالے ہیں (۱) یہاں اُن تمام مثالوں کو پیش کر کے اُن کی حقیقت واضح کرنا تو مشکل ہے، اس لئے کہ اس کام کے لئے ایک پوری کتاب درکار ہوگی (۲) اس کے علاوہ ہماری رائے میں اس کی ضرورت بھی

---

(۱) دیکھئے مذاهب التفسير الاسلامی: گولڈ زیہر، ترجمہ عربی ڈاکٹر عبدالحلیم النجار، اور
Arthur Jeffery ; Materials for the History of the text of the Quran Leiden 1937 P. 6

(۲) گولڈ زیہر کے نظریات پر ڈاکٹر عبدالحلیم النجار نے بھی مذاهب التفسير الاسلامی کے حاشیہ پر مختصر مگر اچھا تبصرہ کیا ہے۔

Marfat.com

نہیں ہے، لیکن ہم یہاں شاذ قراءتوں کے بارے میں چند اصولی باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں، امید ہے کہ ان اصولی حقائق کو مدِ نظر رکھنے کے بعد مستشرقین کے اُن تمام باطل نظریات کی تردید اچھی طرح سمجھ میں آسکے گی جو انہوں نے شاذ قراءتوں کی بنیاد پر قائم کئے ہیں،

جیسا کہ ہم پیچھے عرض کرچکے ہیں پوری اُمتِ مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن کریم کی صرف وہ قراءتیں معتبر ہیں جن میں تین شرائط پائی جائیں:

۱......وہ قراءت عثمانی مصاحف کے رسم الخط میں سما سکتی ہو،

۲......عربی قواعد کے مطابق ہو،

۳......آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس کا پڑھنا متواتر طریقے سے ثابت ہو، یا کم از کم علماءِ قراءت میں مشہور و معروف ہو،

جس قراءت میں ان تین شرائط میں سے کوئی ایک مفقود ہو، وہ شاذ قراءت کہلائی ہے، اور پوری امّت میں سے کسی نے اسے معتبر نہیں مانا، ان شاذ قراءتوں پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں مندرجہ ذیل باتوں میں سے کوئی ایک بات پائی جاتی ہے:

بعض اوقات وہ قراءت بالکل موضوع ہوتی ہے، جیسے کہ ابوالفضل محمد بن جعفر خزاعی کی قراءتیں، جنکو انہوں نے امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب کیا ہے، امام دارقطنیؒ اور تمام علماء نے تحقیق کر کے بتایا ہے کہ یہ تمام قراءتیں موضوع ہیں، (۱)

۲......بعض اوقات اُن کی سند ضعیف ہوتی ہے، جیسے ابن السمیفع اور ابوالسمال کی قراءتیں (۲) یا بہت سی وہ قراءتیں جو ابن ابی داؤدؒ نے کتاب المصاحف میں مختلف صحابہؓ و تابعینؒ سے منسوب کی ہیں،

۳......بعض اوقات سند صحیح ہوتی ہے، لیکن درحقیقت وہ قرآن کریم کی قراءت نہیں ہوتی، بلکہ کوئی صحابی یا تابعی عام گفتگو میں قرآن کریم کے کسی لفظ کی تشریح کے لئے اس کے ساتھ

(۱) النشر فی القرآءت العشر، لابن الجزریؒ، ص ۱۶ ج ۱ والاتقان، ص ۷۸ و ۷۹ ج ۱،

(۲) النشر، ص ۱۶ ج ۱،

Marfat.com

دو ایک لفظ بڑھا دیتے تھے، قرآن کریم چونکہ پورا کا پورا متواتر تھا، اور ہر دور میں اس کے ہزاروں حفاظ موجود تھے، اس لئے ان الفاظ کے اضافہ سے قرآن کریم کے متن میں اضافے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا، لہٰذا اس قسم کی تشریحات میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا، (۱) مثلاً حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ مِّنْ أُمٍّ پڑھا، اس میں مِنْ أُمٍّ کا لفظ تفسیری اضافہ تھا، اسی طرح حضرت عثمانؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک آیت اس طرح پڑھی ﴿ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيَسْتَعِيْنُوْنَ اللّٰهَ عَلٰى مَا أَصَابَهُمْ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ (۲) اس میں وَيَسْتَعِيْنُوْنَ اللّٰهَ عَلٰى مَا أَصَابَهُمْ بلا شبہ تفسیری اضافہ ہے، کیونکہ اگر یہ جملہ حضرت عثمانؓ کی قراءت میں واقعۃً قرآن کا جزء ہوتا تو اُن کے مرتب کردہ مصحف میں ضرور موجود ہوتا، حالانکہ اُن کے مرتب فرمائے ہوئے سات مصاحف میں سے کسی میں یہ جملہ منقول نہیں، شاذ قراءتوں میں اس طرح کی بہت سی مثالیں موجود ہیں،

۴...... بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے کہ قرانِ کریم کی بعض قراءتیں آخر میں منسوخ ہوگئیں لیکن کسی صحابی کو ان کے منسوخ ہونے کا علم نہ ہوسکا اس لئے وہ قدیم قراءت کے مطابق پڑھتے رہے (۳) لیکن چونکہ دوسرے تمام صحابہؓ جانتے تھے کہ یہ قراءت منسوخ ہوچکی ہے اس لئے وہ نہ اُسے پڑھتے تھے، اور نہ قرآن کریم کی صحیح قراءتوں میں شمار کرتے تھے،

۵...... بعض شاذ قراءتوں کو دیکھکر ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ کسی وقت کسی تابعیؒ وغیرہ سے قرآن کریم کی تلاوت میں کوئی بھول چوک ہوگئی، جیسا کہ اکثر بڑے بڑے حافظوں سے ہوجاتی ہے، اُس وقت کسی سننے والے نے سُنکر اسے روایت کردیا، (۴)

---

(۱) النشر لابن الجزریؒ، ص ۳۱ و ۳۲ ج ۱، والاتقان، ص ۷۹ ج ۱ نوع ۲۲ تا ۲۷ و شرح الموطأ، للزرقانیؒ، ص ۲۵۵ ج ۱۔ (۲) کنز العمال لعلی المتقیؒ ص ۲۸۶ ج ۱، بحوالہ عبد بن حمید و ابن جریرؒ وغیرہ۔ (۳) مشکل الآثار، للطحاویؒ، ص ۱۹۶ تا ۲۰۲ ج ۴۔

(۴) النشر، لابن الجزریؒ، ص ۱۶ ج ۱، والمبانی فی نظم المعانی: مقدمتان فی علوم القرآن ص ۱۷۰ مکتبۃ الخانجی، مصر، ۱۹۵۴ء۔

قرآن کریم کی جتنی شاذ قراءتیں منقول ہیں وہ زیادہ تر انہی پانچ صورتوں میں دائر ہیں، ظاہر ہے کہ ان صورتوں میں ان قراءتوں کو معتبر قرار دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، چنانچہ اُمّت نے کسی بھی دَور میں انہیں قابلِ اعتبار نہیں سمجھا، اور اسی لئے یہ قراءتیں متواتر تو کیا ہوتیں مشہور بھی نہ ہوسکیں، لہٰذا ان کو بنیاد بنا کر مستشرقین نے جو یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ (معاذ اللہ) قرآن کریم کے متن میں کچھ اختلافات پائے جاتے تھے یہ ایسا بے بنیاد اور لغو خیال ہے جو علم و تحقیق کے اعتبار سے قابلِ غور بھی نہیں ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

Marfat.com

باب ہفتم

حقانیتِ قرآن

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسی حیرت انگیز تاثیر رکھی ہے کہ ہٹ دھرمی اور عناد کی بات تو اور ہے، لیکن جو شخص بھی غیر جانبداری اور اخلاص کے ساتھ اس کو پڑھے گا وہ بیساختہ پکار اُٹھے گا کہ یہ یقیناً اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، قرآن کریم بیک وقت عقل اور دل دونوں پر اثر انداز ہوتا ہے، اور اس کی صداقت وحقانیت دل میں اُترتی چلی جاتی ہے، لہٰذا قرآن کی حقانیت پر دلائل پیش کرنے کی مثال کچھ ایسی ہے جیسے سورج کے روشن ہونے پر دلائل قائم کرنا، لیکن ذیل میں ہم مختصراً چند وہ باتیں پیش کرتے ہیں جن پر غور کرنے سے ایک غیر مسلم کے لئے بھی قرآن کریم کی حقانیت تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت

سب سے پہلے اُس بات کو ذہن میں تازہ کرنے کی ضرورت ہے جو ہم نے ''وحی کی ضرورت'' کے عنوان کے تحت پیچھے لکھی ہے، اُس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ''وحی'' انسان کی ایک فطری ضرورت ہے، جس کے بغیر انسان کے لئے دنیا میں ایک اچھی زندگی گذارنا ممکن نہیں، جو لوگ اللہ تعالیٰ کے وجود ہی کے منکر ہیں اُن سے تو وحی ورسالت کے موضوع پر بات کرنا ہی فضول ہے، اُن سے پہلے وجودِ باری تعالیٰ کے...... مسئلہ پر گفتگو کی ضرورت ہے، لیکن جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے وجود کا قائل ہے وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کرسکتا کہ

Marfat.com

''وحی'' اللہ تعالیٰ کی رحمت اور قدرت کا ایسا ناگزیر تقاضا ہے جس پر ایمان لائے بغیر ایمان باللہ کی تکمیل نہیں ہوسکتی، جس ذات نے انسان کو پیدا کیا اور اُس کے لئے یہ کائنات بنائی اس سے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ انسان کو شر و فساد کے تقاضوں سے بھری ہوئی اس دنیا میں بے یارو مددگار چھوڑ دے اور اس کی رہنمائی کے لئے کوئی ہدایت نامہ نہ بھیجے،

ہدایت کے اسی سلسلے کا نام ''وحی'' اور ''رسالت'' ہے، اور یہ سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع نہیں ہوا، بلکہ آپؐ پر اس کی تکمیل ہوئی ہے، آپؐ سے پہلے ہزاروں انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کا پیغامِ ہدایت لے کر دنیا میں تشریف لاچکے تھے اور ان میں سے تقریباً ہر ایک نے یہ بشارت دی تھی کہ آخری دَور میں ایک ایسے پیغمبرؐ تشریف لائیں گے جن پر نبوّت کے مقدس سلسلے کی تکمیل ہوجائے گی، بعض انبیاء علیہم السلام نے آپؐ کی متعدد علامتیں بھی پہلے سے بیان کردی تھیں، بلکہ بعض نے تو صراحۃً آپؐ کا نامِ نامی بھی بتادیا تھا، پچھلے انبیاء علیہم السلام کے صحیفوں میں اگرچہ آج بہت کچھ تحریف و ترمیم ہوچکی ہے، لیکن آج بھی اُن میں آپؐ کی تشریف آوری کی بہت سی بشارتیں اور بہت سی علامتیں محفوظ ہیں،

کتُبِ مقدسہ میں آپؐ کی بشارتیں

مثلاً بائبل کی کتاب استثناء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب ہے:

''اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں، میں اُن کے لئے اُنہی کے بھائیوں میں سے تیرے مانند ایک نبی برپا کروں گا، اور اپنا کلام اس کے مُنہ میں ڈالوں گا، اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ اُن سے کہے گا، اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سُنے تو میں ان کا حساب اُس سے لوں گا، لیکن جو نبی گستاخ بن کر کوئی ایسی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اس کو حکم نہیں دیا، اور معبودوں کے نام سے کچھ کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے، اور اگر تو اپنے دل میں کہے کہ جو بات خداوند نے نہیں کہی ہے اسے ہم کیونکر پہچانیں؟ تو پہچان یہ ہے کہ جب وہ نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے اور اس کے

Marfat.com

کہے کے مطابق کچھ واقع یا پورا نہ ہو تو وہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں، بلکہ اس نبی نے وہ بات خود گستاخ بنکر کہی ہے تو اس سے خوف نہ کرنا۔" (استثناء ۱۸: ۱۷ تا ۲۲)

اس عبارت میں بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے یہ صراحت کی گئی ہے کہ جس نبی کی بشارت دی گئی ہے، وہ ان میں سے نہیں بلکہ اُن کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں مبعوث ہوگا، اور حضرت شعیاء علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد موجودہ بائبل میں منقول ہے کہ:

"دیکھو! میرا خادم جس کو میں سنبھالتا ہوں، میرا برگزیدہ جس سے میرا دل خوش ہے، میں نے اپنی رُوح اس پر ڈالی، وہ قوموں میں عدالت جاری کرے گا، وہ نہ چلاّئے گا اور نہ شور کرے گا، اور نہ بازاروں میں اس کی آواز سُنائی دیگی، وہ مسلے ہوئے سرکنڈوں کو نہ توڑے گا، اور ٹمٹماتی بتّی کو نہ بُجھائے گا، وہ راستی سے عدالت کریگا، اور ماندہ نہ ہوگا، اور ہمت نہ ہارے گا، جب تک عدالت کو زمین پر قائم نہ کرلے، جزیرے اس کی شریعت کا انتظار کریں گے ....

میں ہی تیرا ہاتھ پکڑوں گا، اور تیری حفاظت کروں گا، اور لوگوں کے عہد اور قوموں کے نور کے لئے تجھے دوں گا، کہ تو اندھوں کی آنکھیں کھولے اور اسیروں کو قید سے نکالے، اور اُن کو جو اندھیرے میں بیٹھے ہیں قید خانے سے چھڑائے، یہوداہ میں ہی ہوں، یہی میرا نام ہے، میں اپنا جلال کسی دوسرے کے لئے اور اپنی حمد کھودی ہوئی مورتوں کے لئے روانہ رکھوں گا، ....

اے سمندر پر گزرنے والو! اور اس میں بسنے والو! اے جزیرو! اور ان کے باشندو! خداوند کے لئے نیا گیت گاؤ، زمین پر سرتاسر اسی کی ستائش کرو، بیابان اور اسی کی بستیاں، قیدار کے آباد گاؤں اپنی آوازیں

Marfat.com

بلند کریں، سلع کے بسنے والے گیت گائیں، پہاڑوں کی چوٹیوں پر
سے للکاریں (۱) وہ خداوند کا جلال ظاہر کریں، اور جزیروں میں اس کی
ثناء خوانی کریں، خداوند بہادر کی مانند نکلے گا، وہ جنگی مرد کی مانند اپنی
غیرت دکھائے گا...... جو کھودی ہوئی مورتوں پر بھروسہ کرتے
اور ڈھالے ہوئے بتوں سے کہتے ہیں تم ہمارے معبود ہو وہ پیچھے ہٹیں
گے، اور بہت شرمندہ ہوں گے۔" (یسعیاہ ۴۲: ۱ تا ۱۷)

اس عبارت میں یہ واضح کردیا گیا ہے کہ جس نبی کی بشارت دی جارہی ہے وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوگا، (کیونکہ قیدار انہی کے صاحبزادے کا نام ہے) اور سلع (مدینہ طیبہ کے مشہور پہاڑ) کے بسنے والے اس کی آمد پر خوشیاں منائیں گے، اس کا خاص مقابلہ بُت پرستوں سے ہوگا، اور وہ اپنے حلقۂ اثر میں بُت پرستی کا خاتمہ کردے گا، اُسے متعدد اقوام سے جنگیں بھی پیش آئیں گی، اور بالآخر وہ غالب آکر اُن اقوام میں عدالت نافذ کرے گا،

موجودہ بائبل کے عہد نامۂ قدیم میں اس قسم کی اور بھی بہت سی بشارتیں ابتک موجود ہیں، اور انہی کی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کے وقت تک لوگوں میں یہ بات مشہور و معروف تھی کہ مسیح علیہ السلام کے علاوہ ایک اور عظیم الشان نبیؐ دنیا میں تشریف لانے

---

(۱) اس بشارت کا ایک ایک لفظ صرف اور صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتا ہے، اس کی پوری تفصیل تو احقر نے "بائبل سے قرآن تک" ص ۲۸۱ ج ۳ کے مفصل حواشی میں بیان کی ہے، یہاں مختصراً اتنا سمجھ لیجئے کہ قیدار خود بائبل کی تصریح کے مطابق حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے صاحبزادے کا نام تھا، (۱۔ تواریخ ۱: ۳۰) اور اُن کی اولاد عرب کے بیابان میں آباد تھی، جیسا کہ بائبل ہی کی کتاب یسعیاہ (۲۱: ۱۳ تا ۱۷) سے واضح ہے، لہٰذا اس عبارت میں قیدار کا نام لیکر صاف طور سے یہ کہا گیا ہے کہ جس نبیؐ کی بشارت دی جارہی ہے وہ اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوگا، اور عرب میں مبعوث ہوگا، اس کے علاوہ اس عبارت میں "سلع" کے بسنے والوں سے کہا گیا ہے کہ وہ گیت گائیں، سلع مدینہ طیبہ کا مشہور پہاڑ ہے، اور اسی کے ایک حصہ میں "ثنیات الوداع" واقع ہیں، جن پر کھڑے ہوکر مدینے کی بچیوں نے 'طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا' کے گیت گاتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کیا تھا۔

Marfat.com

والے ہیں، چنانچہ انجیل یوحنا میں مذکور ہے کہ جب حضرت یحییٰ علیہ السلام تشریف لائے تو لوگوں نے اُن سے پوچھا کہ کیا آپ وہی نبیؑ ہیں جن کی بشارت پچھلے انبیاء علیہم السلام دیتے آرہے ہیں؟ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے اس کا انکار کیا، انجیل یوحنا کی عبارت یہ ہے:

''اور یوحنا کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کے لئے اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے اقرار کیا اور اس نے انکار نہ کیا، بلکہ یہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں، انہوں نے اس سے پوچھا پھر تو کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں ...... کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں، الخ۔'' (دیکھئے انجیل یوحنا ۱:۱۹ تا ۲۶)

اس سے واضح ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے زمانے میں بھی لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کے علاوہ ایک اور نبیؑ کے منتظر تھے، اور وہ نبیؑ اُن کے درمیان اس قدر مشہور ومعروف تھے کہ اُن کا نام لینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی، بلکہ ''وہ نبیؑ'' کہنا کافی ہوتا تھا،

پھر جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو انہوں نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح اسمِ گرامی لوگوں کو بتا کر آپ کی تشریف آوری کی بشارت دی، انجیل یوحنا میں مسیح علیہ السلام کا یہ ارشاد منقول ہے کہ:

''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لے فائدہ مند ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ (فارقلیط)(۱) تمہارے پاس نہ آئے گا، لیکن اگر جاؤں گا تو اُسے تمہارے پاس بھیجدوں گا اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔'' (یوحنا ۱۶:۷)

---

(۱) انجیل کے یونانی نسخوں میں یہ لفظ ''پیرکلوطوس'' تھا، جو ''محمدؐ'' کا ترجمہ ہے، یہاں ہم نے صرف نمونہ کے لئے چند بشارتیں ذکر کی ہیں، اس موضوع پر مبسوط مباحث کے لئے دیکھئے ''بائبل سے قرآن تک'' جلد سوم باب ششم مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴۔

Marfat.com

ان بشارتوں کو ذہن میں رکھ کر اُس زمانے کا تصور کیجیے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، یہ وہ زمانہ تھا جب سینکڑوں سال سے یہ دنیا کسی نبی کے وجود سے محروم تھی، گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات مٹ رہی تھیں، تحریف و ترمیم کرنے والوں نے پچھلی شریعتوں کو بُری طرح مسخ کر ڈالا تھا، شرک کی وباء عالمگیر ہو چکی تھی، ظلم و بربریت کا دَور دورہ تھا، اور گزشتہ آسمانی کتابوں کا...... علم رکھنے والے نبی آخر الزمان کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے، ان حالات میں آپ مکہ مکرمہ میں پیدا ہوتے ہیں، اور چالیس سال تک اس چھوٹی سی بستی میں اس طرح رہتے ہیں کہ اس کا بچہ بچہ آپ کی سچائی، آپ کی دیانتداری، آپؐ کے عدل وانصاف اور آپؐ کے حُسنِ اخلاق کا معترف ہے، مکہ مکرمہ آجکل کے شہروں کی طرح کوئی بڑا شہر نہیں تھا، بلکہ ایک ایسی بستی تھی جس میں ہر شخص کی زندگی دوسروں کے سامنے ایک کھلی کتاب کی مانند ہوتی ہے، اس بستی میں آپؐ چالیس سال بسر کرتے ہیں، مکہ کے باشندے آپؐ کے بچپن اور آپؐ کی جوانی کا اچھی طرح مشاہدہ کرتے ہیں، اور اس پورے عرصہ میں کسی شخص کو آپؐ کے ذاتی کردار پر کوئی اُنگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ملتی، کوئی متنفس ایسا نہیں پایا جاتا جو کبھی ساری عمر آپؐ کی کسی ادنیٰ غلط بیانی کی مثال پیش کر سکے اس کی بجائے پوری بستی میں آپؐ ''صادق'' اور ''امین'' کے لقب سے مشہور ہوتے ہیں، ایسا بھی نہیں ہے کہ آپؐ نے یہ چالیس سالہ زندگی لوگوں سے الگ تھلگ رہ کر گزاری ہو، بلکہ آپؐ اُن کے تمام امورِ زندگی میں قوم کے ایک باشعور اور مدبّر فرد کی طرح دخیل رہتے ہیں، آپؐ اُن کے ساتھ تجارت کرتے ہیں، اُجرت پر کام کرتے ہیں، اُن کے باہمی جھگڑے نپٹاتے ہیں، اُن کے ساتھ سفر کرتے ہیں، ازدواجی زندگی گذارتے ہیں، غرض زندگی کے جتنے مراحل کا اُس دَور میں تصور کیا جا سکتا ہے اُن سب سے گزرتے ہیں، اور پوری قوم ان تمام مراحل میں آپؐ کے بلند کردار کا اعتراف کرتی ہے،

پھر چالیس سال کی اس طویل مدت میں آپؐ کسی درسگاہ میں تعلیم حاصل نہیں کرتے، اہلِ کتاب کے علماء سے آپؐ کا کوئی میل جول نہیں رہتا، کسی سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھتے، عام اہلِ عرب کے برخلاف کبھی کوئی شعر نہیں کہتے، نہ مشاعروں سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے، کبھی کسی

Marfat.com

کاہن، جادوگر یا نجومی کی صحبت میں نہیں بیٹھتے؛؛ اس کے بعد اچانک آپ کی زبانِ مبارک پر ایک ایسا کلام جاری ہوتا ہے جس کے آگے عرب کے بڑے بڑے ادباء و شعراء گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، ایسے ایسے علوم و معارف بیان فرماتے ہیں، جس کے سامنے دنیا بھر کے حکماء کی گردنیں خم ہو جاتی ہیں، ایسی ایسی پیشگی خبریں سُناتے ہیں جو کبھی کسی کاہن یا نجومی کے تصوّر میں بھی نہیں آئیں، اور پھر یہ خبریں سوفی صد درست ثابت ہوتی ہیں، آپؐ کے دستِ مبارک پر بہت سے ایسے معجزات ظاہر ہوتے ہیں جن کے آگے بڑے بڑے جادوگر عاجز ہو کر رہ جاتے ہیں، اور پھر تیئیس سال کی مختصر مدّت میں آپؐ پورے جزیرۂ عرب میں ایسا محیّر العقول انقلاب برپا کر دیتے ہیں کہ صحرائے عرب کے جو وحشی علم و معرفت اور تہذیب و تمدّن سے بالکل کورے تھے وہ پوری دنیا میں علم و حکمت اور تہذیب و شائستگی کے چراغ روشن کرتے ہیں، جو لوگ کل تک ایک دوسرے کے خون سے اپنی پیاس بجھا رہے تھے وہ آپس میں بھائی بھائی بنجاتے ہیں، جہاں ہر طرف قتل و غارت گری کی آگ بھڑک رہی تھی وہاں امن و آتشی کے گلاب کھل اُٹھتے ہیں، جہاں ظلم و بربریت کا دَور دورہ تھا، وہاں عدل و انصاف کی حکمرانی قائم ہو جاتی ہے، اور بالآخر عرب کے یہی صحراء نشین جو اپنی جہالت کی وجہ سے دنیا بھر میں ذلیل و خوار تھے، ایران اور روم کی عظیم سلطنتوں کے وارث بن جاتے ہیں، اور ساری دنیا اُن کے عدل و انصاف، اُن کی رحم دلی، اور ان کی شرافتِ نفس کے گُن گانے پر مجبور ہو جاتی ہے،

ان حقائق پر جو شخص بھی ٹھنڈے دل و دماغ اود خلوص و غیر جانب داری سے غور کرے گا وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول تھے، آپؐ ''وہی نبیؐ'' تھے جن کی بشارت صدیوں پہلے سے دی جا رہی تھی، اور جن کا انسانیت کو انتظار تھا، لہٰذا آپ کا یہ ارشاد کہ ''قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے'' سوفی صد برحق اور بلاخوفِ تردید درست ہے،

Marfat.com

اعجازِ قرآن

قرآن کریم کی حقانیت کی ایک اور واضح دلیل اس کا اعجاز ہے، یعنی ایک ایسا کلام ہے جس کی نظیر پیش کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے، اسی وجہ سے اس کو سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ کہا جاتا ہے، یہاں ہم مختصراً قرآن کریم کی اُن وجوہِ اعجاز کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جن پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ یقیناً اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے، اور کسی بشری ذہن کا اس میں کوئی دخل نہیں،

آگے بڑھنے سے پہلے بنیادی طور پر دو باتیں سامنے رکھنی ضروری ہیں، ایک تو یہ کہ فصاحت و بلاغت اور کلام کی سحر انگیزی ایک ایسی صفت ہے جس کا تعلق سمجھنے اور محسوس کرنے سے ہے، اور پوری حقیقت و ماہیت کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں، آپ تلاش و جستجو اور استقراء کے ذریعہ فصاحت و بلاغت کے اصول و قواعد مقرر فرما سکتے ہیں، لیکن درحقیقت ان اصول و قواعد کی حیثیت فیصلہ کن نہیں ہوتی، کسی کلام کے حُسن و قبح کا آخری فیصلہ ذوق اور وِجدان ہی کرتا ہے، جس طرح ایک حسین چہرے کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں کی جا سکتی، جس طرح ایک خوش رنگ پھول کی رعنائیوں کو الفاظ میں محدود نہیں کیا جا سکتا، جس طرح مہکتی ہوئی مُشک کی پوری کیفیت بیان کرنا ممکن نہیں، جس طرح ایک خوش ذائقہ پھل کی لذّت و حلاوت الفاظ میں نہیں سما سکتی، اسی طرح کسی کلام کی فصاحت و بلاغت کو تمام و کمال بیان کر دینا بھی ممکن نہیں، لیکن جب کوئی صاحبِ ذوق انسان اسے سُنے گا، تو اس کے محاسن و اوصاف کا خود بخود پتہ چل جائے گا،

دوسرے یہ کہ فصاحت و بلاغت کے معاملے میں ذوق بھی صرف اہلِ زبان کا معتبر ہے، کوئی شخص کسی غیر زبان میں خواہ کتنی مہارت حاصل کرلے، لیکن ذوقِ سلیم کے معاملے میں وہ اہلِ زبان کا کبھی ہمسر نہیں ہو سکتا،

اب ذرا زمانۂ جاہلیت کے اہلِ عرب کا تصوّر کیجئے، خطابت اور شاعری اُن کے معاشرے

Marfat.com

کی رُوحِ رواں تھی، عربی شعروادب کا فطری ذوق اُن کے بچّے بچّے میں سمایا ہوا تھا، فصاحت وبلاغت اُن کی رگوں میں خونِ حیات بن کر دوڑتی تھی، ان کی مجلسوں کی رونق، اُن کے میلوں کی رنگینی، اُن کے فخر وناز کا سرمایہ اوران کی نشر واشاعت کا ذریعہ سب کچھ شعروادب تھا، اورانہیں اس پر اتنا غرور تھا کہ وہ اپنے سوا تمام قوموں کو''عجم''یعنی گونگا کہا کرتے تھے،

ایسے ماحول میں ایک اُمّی (جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک کلام پیش کیا، اوراعلان فرمایا کہ یہ اللہ کا کلام ہے، کیونکہ:

﴿لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا﴾ (الاسراء:۸۸)

''اگر تمام انسان اور جنات اس کام پر اکٹھے بھی ہوجائیں کہ اس قرآن جیسا کلام بنا کر لے آئیں، تب بھی وہ اس جیسا نہیں لاسکیں گے، چاہے وہ ایک دوسرے کی کتنی مدد کرلیں''

یہ اعلان کوئی معمولی بات نہ تھی، یہ دعویٰ اُس ذات ؐ کی طرف سے تھا جس نے کبھی وقت کے مشہور اُدباء اور شعراء سے کوئی علم حاصل نہ کیا تھا، کبھی مشاعرے کی محفلوں میں کوئی ایک شعر بھی نہیں پڑھا تھا، اور کبھی کاہنوں کی صحبت بھی نہ اُٹھائی تھی، خود شعر کہنا تو درکنار، آپؐ کو دوسرے شعراء کے اشعار تک یاد نہیں تھے، پھر یہی وہ ذات تھی جسے میدانِ فصاحت کے یہ سُور ما ایک نئے دین کا بانی کہا کرتے تھے، اگر یہ اعلان سچا ثابت ہوجائے تو ان کے آبائی دین کی ساری عمارت مُنہ کے بَل گر پڑتی، اوراُن کی صدیوں پُرانی رسوم وروایات کا سارا پلندہ پیوندِ زمین ہوجاتا تھا، اس لئے یہ اعلان درحقیقت اُن کی ادبی صلاحیتوں کو ایک زبردست چیلنج تھا، یہ اُن کے دین ومذہب پر ایک کاری وار تھا، یہ اُن کی قومی حمیّت کے نام مبارزت کا ایک پیغام تھا، یہ اُن کی غیرت کو ایک للکار تھی، جس کا جواب دیئے بغیر کسی غیور عرب کے لئے چین سے بیٹھنا ممکن نہیں تھا،

لیکن ہوا کیا؟......اس اعلان کے بعد اُن آتش بیان خطیبوں اور شعلہ نوا شاعروں کی محفل

میں سناٹا چھا گیا، کوئی شخص اس چیلنج کو قبول کرنے کے لئے آگے نہ بڑھا، کچھ عرصہ کے بعد قرآن کریم نے پھر اعلان فرمایا کہ:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ (البقرہ: ۲۳)

''اور اگر تم اس (قرآن) کے بارے میں ذرا بھی شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر اُتارا ہے، تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا لاؤ، اور اگر سچے ہو تو اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو، پھر بھی اگر تم یہ کام نہ کر سکو، اور یقیناً کبھی نہیں کر سکو گے، تو ڈرو اُس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، وہ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔''

اس پر بھی بدستور سکوت طاری رہا، اور کوئی شخص اس کلام کے مقابلے میں چند جملے بھی بنا کر نہ لا سکا، سوچنے کی بات ہے کہ جس قوم کی کیفیت بقول علامہ جُرجانی ''(۱) یہ ہو کہ اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ دنیا کے آخری سرے پر کوئی شخص اپنی فصاحت و بلاغت پر غیر معمولی گھمنڈ رکھتا ہے، تو وہ اس پر تنقید کرنے اور اپنے اشعار میں اس پر چوٹیں کسنے سے باز نہ رہ سکتی تھی، اس بات کا کیسے تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن کے ان مکرّر سہ کرّر اعلانات کے بعد بھی چپکی بیٹھی رہے، اور اُسے دَم مارنے کی جرأت نہ ہو؟ اس بات کی کوئی تاویل اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ فصاحت و بلاغت کے سورما قرآن کریم کا مقابلہ کرنے سے عاجز آ چکے تھے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زک پہنچانے کے لئے ظلم و ستم کا کوئی طریقہ نہیں چھوڑا، آپ کو ستایا، مجنون کہا، جادوگر کہا، شاعر اور کاہن کہا، لیکن ان سے اتنا نہیں ہو سکا کہ قرآن کے مقابلے میں چند

---

(۱) الرسالة الشافعية، لعبدالقاهر الجرجانی'' ، المطبوعة فی ثلاث رسائل فی اعجاز القرآن ص ۱۰۹، دار المعارف مصر۔

Marfat.com

جملے پیش کردیتے،

پھر صرف یہی نہیں کہ یہ شعلہ بیان خطیب اور آتش نوا شاعر قرآن کریم کا مقابلہ نہیں کرسکے، بلکہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے اس کلام کی حیرت انگیز تاثیر کا کھل کر اعتراف کیا، امام حاکمؒ اور بیہقیؒ نے قرآن کریم کے بارے میں ولید بن مغیرہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

واللّٰہِ انّ لقوله الذی یقول حلاوۃً وانّ علیه لطلاوۃ ...... وانّہ لیعلو وما یُعلیٰ،

''خدا کی قسم! جو یہ کلام بولتے ہیں اس میں بلا کی شیرینی اور رونق ہے یہ کلام غالب ہی رہتا ہے، مغلوب نہیں ہوتا۔'' (۱)

یہ ولید بن مغیرہ ابوجہل کا بھتیجا تھا، ابوجہل کو جب یہ پتہ چلا کہ میرا بھتیجا اس کلام سے متاثر ہورہا ہے تو وہ اسے تنبیہ کرنے کے لئے اس کے پاس آیا، اُس پر ولید نے جواب دیا کہ خدا کی قسم! تم میں کوئی شخص شعر کے حُسن و قبح کو مجھ سے زیادہ جاننے والا نہیں، خدا کی قسم! محمدؐ جو کہتے ہیں شعر کو اس کے ساتھ کوئی مناسبت اور مشابہت نہیں ہے۔ (۲)

اسی ولید بن مغیرہ کا واقعہ حضرت ابن عباسؓ نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد جب موسمِ حج آیا تو اس نے قریش کو جمع کر کے کہا کہ موسمِ حج میں عرب کے مختلف قبائل یہاں آئیں گے، اس لئے محمدؐ کے بارے میں کوئی ایسی بات طے کرلو کہ پھر باہم کوئی اختلاف نہ ہو، قریش نے کہا کہ ہم لوگوں سے یہ کہیں گے کہ محمدؐ کاہن ہیں، ولید نے کہا، خدا کی قسم! ان کا کلام کاہنوں جیسا نہیں ہے، قریش نے کہا کہ پھر ہم انہیں مجنون کہیں گے، ولید بولا کہ ان میں جنون کا شائبہ تک نہیں، قریش کہنے لگے کہ پھر ہم کہیں گے کہ وہ شاعر ہیں، ولید نے کہا کہ شعر کی تمام اصناف سے میں واقف ہوں، یہ کلام شعر ہرگز نہیں ہے، قریش نے کہا کہ ''پھر ہم انہیں جادوگر کہدیں؟'' ولید نے پہلے اس کا بھی انکار کیا، مگر عاجز آکر اسی پر فیصلہ

---

(۱) الخصائص الکبریٰ، للسیوطیؒ، ص ۱۱۳ ج ا و الاتقان، ص ۱۱۷ ج ۲۔

(۲) اخرجه الحاکمؒ والبیهقیؒ عن ابن عباسؓ (الخصائص الکبریٰ ۱/۱۱۳)

ہوا کہ جادوگر کہا جائے، کیونکہ یہ ایسا جادو ہے جو باپ بیٹے اور بھائی بھائی میں تفریق کرادیتا ہے، (۱)

اسی طرح عتبہ بن ربیعہ قریش کے سر برآوردہ لوگوں میں سے تھا، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مصالحت کی گفتگو کرنے آیا، آپؐ نے سورۂ حٰمٓ السجدہ کی ابتدائی آیات اس کے سامنے تلاوت فرمائیں، وہ ہمہ تن گوش سنتا رہا، یہاں تک کہ آپؐ نے آیتِ سجدہ پر سجدہ کیا، تو وہ بدحواسی کے عالم میں اُٹھ کر سیدھا گھر چلا گیا، لوگ اس کے پاس گفتگو کا نتیجہ معلوم کرنے آئے، تو اس نے کہا ''خدا کی قسم! محمدؐ نے مجھ کو ایسا کلام سنایا کہ میرے کانوں نے تمام عمر ایسا کلام نہیں سنا، میری سمجھ میں نہ آسکا کہ میں کیا جواب دوں؟ (۲)

اس قسم کے اور بھی بہت سے واقعات تاریخ میں محفوظ ہیں، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے بڑے بڑے فصیح و بلیغ اُدباء و شعراء نہ صرف یہ کہ قرآن کریم کا معارضہ نہیں کر سکے، بلکہ قرآن کریم کی اثر انگیزی کا قولی یا عملی طور سے اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے،

بعض غیر مسلم مصنفین یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کسی نے قرآن کریم کے مقابلے پر کوئی کلام پیش کیا ہو، لیکن ہم تک اس کا کلام نہ پہونچ سکا ہو، علامہ ابو سلیمان خطابیؒ (متوفی ۳۸۸ھ) نے جو بڑے پایہ کے محدّث ہونے کے علاوہ لغت اور ادب کے بھی امام ہیں، اس خیال پر تبصرہ کرتے ہوئے، بڑی اچھی بات لکھی ہے، فرماتے ہیں کہ:

> ''یہ خیال بالکل غلط ہے، اس لئے کہ ابتداء سے عام اور خاص لوگوں کی یہ عادت چلی آتی ہے کہ وہ اہم واقعات کو ضرور نقل کر کے آئندہ نسلوں کے لئے بیان کر جاتے ہیں، بالخصوص وہ واقعات جن کی طرف لوگوں کی نظریں لگی ہوئی ہوں یہ معاملہ (قرآن کریم کا چیلنج) تو اس

---

(۱) اخرجہ البیہقیؒ وابن اسحٰقؒ (الخصائص الکبریٰ، ص ۱۱۳ ج ۱۔

(۲) اخرجہ البیہقیؒ وابن اسحٰقؒ عن محمد بن کعبؒ (الخصائص الکبریٰ، ص ۱۱۵ ج ۱) وابو یعلیٰؒ عن جابرؓ (جمع الفوائد ص ۲۶ ج ۲)

Marfat.com

وقت چار دانگ عالم میں شہرت پاچکا تھا، اگر اس کا کوئی مقابلہ کیا گیا ہوتا تو اس کا ہم تک نہ پہنچنا ممکن ہی نہ تھا، اگر یہ بات ممکن ہوسکتی ہے تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اس زمانے میں کوئی اور نبی یا بے شمار انبیاء مبعوث ہوئے ہوں، اُن پر کتابیں اُتریں، اور ان میں شریعتِ محمدیؐ کے علاوہ کوئی اور شریعت بیان کی گئی ہو، اور یہ واقعات ہم تک نہ پہنچے ہوں...... اگر یہ بات ناقابلِ تصوّر ہے تو قرآن کریم کے معارضہ کا بھی تصوّر نہیں کیا جاسکتا''(۱)

البتہ چند مسخروں نے قرآن کریم کے مقابلے میں کچھ مضحکہ خیز جملے بنائے تھے وہ تاریخ کے صفحات میں آج تک محفوظ ہیں، اور اہلِ عرب ہمیشہ اُن کی ہنسی اڑاتے آئے ہیں، مثلاً کسی نے ''سورۃ القارعہ'' اور ''سورۃ الفیل'' کے انداز پر یہ جملے کہے تھے، کہ ''اَلْفِیْلُ مَا الْفِیْلُ وَمَا اَدْرٰکَ مَا الْفِیْلُ، لَهٗ مشفرٌ طَوِیْلٌ وَذَنَبٌ اَثِیْلٌ، وَمَا ذَاکَ مِنْ خلقِ رَبِّنَا لِقَلِیْلٍ'' ...... یا کسی نے قرآن کے مقابلے پر یہ جملے بنائے تھے: ''اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ فَعَلَ بِالْحُبْلٰی، اَخْرَجَ مِنْهَا نسمةً تَسعٰی بین شرا سیف وحشی'' ...... یا مسیلمہ کذّاب نے ان جملوں کو قرآن کے مقابلے میں اپنی وحی قرار دیا تھا کہ ''یاضفدع نقّی کم تنقّین، لَاالماء تکدرین ولا الوارد تنفرین'' (۲) پھر نزولِ قرآن کے کافی عرصے بعد کے عربی کے مشہور ادیب اور انشاء پرداز عبداللہ بن المقفع مترجم کلیلہ دومنہ (متوفی ۱۴۲ھ) نے قرآن کریم کا جواب لکھنے کا ارادہ کیا، لیکن اسی دوران کسی بچے کو یہ آیت پڑھتے سنا کہ ''وَقِیْلَ یٰۤاَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَكِ وَیٰسَمَآءُ اَقْلِعِیْ'' تو پکار اُٹھا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کلام کا معارضہ ناممکن ہے، اور یہ ہرگز انسانی کلام نہیں، (۳)

---

(۱) ثلاث رسائل فی اعجاز القرآن، ص۵۰، دارالمعارف مصر۔

(۲) بیان اعجاز القرآن، للخطابی ، (المطبوع فی '' ثلاث رسائل فی اعجاز القرآن ، ص۵۰ و ۵۱۔

(۳) اعجاز القرآن ، للباقلانی'' ص۵۰ ج۱ ہامش الاتقان۔

Marfat.com

قرآن کریم کی اعجازی خصوصیات

اب ہم مختصراً اُن اہم خصوصیات کو بیان کرنا چاہتے ہیں جن کی بناء پر قرآن کریم کا کلام معجز ہے، ظاہر ہے کہ ان خصوصیات کا احاطہ تو بشری طاقت سے باہر ہے، تاہم انسان کی محدود بصیرت کے مطابق ان خصوصیات کو چار عنوانات پر تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) الفاظ کا اعجاز (۲) ترکیب کا اعجاز (۳) اسلوب کا اعجاز (۴) اور نظم کا اعجاز،

الفاظ کا اعجاز

کسی زبان کا کوئی شاعر یا ادیب، خواہ اپنے فن میں کمال کے کتنے ہی بلند مرتبے کو پہنچا ہوا ہو یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس کے کلام میں کہیں بھی کوئی لفظ غیر فصیح استعمال نہیں ہوا کیونکہ بسا اوقات انسان اپنے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کسی نہ کسی غیر فصیح لفظ کے استعمال پر مجبور ہو جاتا ہے، لیکن...... پورے قرآن کریم میں الحمد سے لے کر والناس تک نہ صرف یہ کہ کہیں کوئی ایک لفظ بھی...... غیر فصیح نہیں ہے، بلکہ ہر لفظ جس مقام پر آیا ہے وہ فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے ایسا اٹل ہے کہ اُسے بدل کر اسی فصاحت وبلاغت کے ساتھ دوسرا لفظ لانا ممکن ہی نہیں ہے، عربی زبان ایک انتہائی وسیع زبان ہے جو اپنے ذخیرہ الفاظ کے اعتبار سے دنیا کی دولت مند ترین زبانوں میں سے ایک ہے، چنانچہ اُس میں ایک مفہوم کے لئے معمولی معمولی فرق سے بہت سے الفاظ پائے جاتے ہیں، قرآن کریم الفاظ کے اس وسیع ذخیرے میں سے اپنے مقصد کی ادائیگی کے لئے وہی لفظ منتخب فرماتا ہے جو عبارت کے سیاق، معنی کی ادائیگی اور اسلوب کے بہاؤ کے لحاظ سے موزوں ترین ہو، یہ بات چند مثالوں سے واضح ہوسکے گی،

ا...... زمانۂ جاہلیت میں ''موت'' کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے بہت سے عربی الفاظ مستعمل تھے، (۱) مثلاً (۱) موت (۲) ہلاک (۳) فناء (۴) حتف (۵) شعوب (۶) حمام (۷) مَنون (۸) سام (۹) قاضیہ (۱۰) ہمیغ (۱۱) نیط (۱۲) فود (۱۳) مقدار (۱۴) جباز (۱۵) قیتم (۱۶) حلاق (۱۷) طلاطل

(۱۸)طلاطلہ (۱۹)عول (۲۰)ذام (۲۱) کفت (۲۲)جداع (۲۳)حُزرۃ (۲۴) خالج، لیکن ان میں سے اکثر الفاظ کے پسِ منظر میں اہلِ عرب کا یہ قدیم نظریہ جھلکتا تھا کہ موت کے ذریعہ انسان کے تمام اجزاء ہمیشہ کے لئے فناء ہو جاتے ہیں، اور اس کا دوبارہ زندہ ہونا ممکن نہیں، چونکہ وہ لوگ معاد وآخرت اور حساب وکتاب کے قائل نہیں تھے، اس لئے انہوں نے موت کے لئے جتنے نام تجویز کئے اُن سب میں اس نظریہ کی جھلک موجود ہے، اگر قرآن کریم اہلِ عرب کی انہی قدیم تعبیرات پر اکتفاء کرتا تو موت کے بارے میں اُن کے باطل نظریہ سے کسی درجہ میں موافقت کا شبہ ہوسکتا تھا، چنانچہ جس جگہ موت کی حقیقت بیان کرنی تھی، وہاں موت کے مفہوم کے لئے قرآن نے مذکورہ چوبیس الفاظ کو چھوڑ کر ایک نیا لفظ اختیار کیا اور عربی زبان کو ایک ایسا خوب صورت، مختصر، جامع اور فصیح لفظ عطا کیا،، جس سے موت کی حقیقت بھی واضح ہو جائے، اور وہ لفظ ہے''تَوَفّی'' جس کے لغوی معنی ہیں ''کسی چیز کو پورا پورا وصول کر لینا'' اس لفظ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ موت ابدی فنا کا نام نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح قبض کرنے کا نام ہے، چنانچہ جب اللہ تعالیٰ چاہے وہ جسم کے منتشر اجزاء کو یکجا کر کے اُن میں دوبارہ رُوح کو لوٹا سکتا ہے، ''موت'' کے لئے یہ لفظ قرآن کریم سے پہلے کسی نے استعمال نہیں کیا تھا، چنانچہ ابن سیّدہؒ نے ''المخصص'' میں ''موت'' کے دوسرے الفاظ کے لئے تو اہلِ عرب کے اشعار سے مثالیں پیش کی ہیں، لیکن ''توفّی'' کے لئے قرآن کریم کے سوا کوئی استشہاد پیش نہیں کیا،(۲)

۲...... ہر زبان کے بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو صوتی اعتبار سے فصیح اور پسندیدہ نہیں سمجھے جاتے، لیکن چونکہ اُن کے مفہوم کی ادائیگی کے لئے کوئی اور متبادل لفظ نہیں ہوتا، اس لئے اہلِ زبان انہیں استعمال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، لیکن قرآن کریم ایسے مواقع پر ایسی خوب صورت تعبیر اختیار کرتا ہے کہ ذوقِ سلیم وجد کر اٹھتا ہے، مثلاً عربی میں تعمیرِ مکان کے لئے پکّی

---

(۱) ابن سیدہؒ اندلسیؒ نے یہ تمام نام شمار کرائے ہیں، اور اہلِ اعراب کے اشعار سے اس کی مثالیں پیش کی ہیں، (المخصص، لابن سیدہ، ص ۱۱۵ ج ۶)

(۲) یتیمۃ البیان لمشکلات القرآن، للشیخ البنوری حفظہ اللہ، ص ۵۶ مجلس علمی ڈابھیل ۱۳۵۷ھ۔

Marfat.com

ہوئی اینٹوں کے لئے جتنے الفاظ مستعمل ہیں وہ سب ثقیل، مبتذل اور ناپسندیدہ سمجھے جاتے ہیں، مثلاً اجُر، قَرْمَدٌ، اور طُوْبٌ، اب قرآن کریم میں یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ فرعون نے اپنے وزیر ہامان کو حکم دیا کہ میرے لئے ایک اونچا محل تعمیر کرنے کے لئے اینٹیں پکاؤ، اس واقعے کو ذکر کرنے کے لئے اینٹ کا لفظ استعمال کرنا ناگزیر تھا، لیکن قرآن کریم نے اس مفہوم کو ایسے معجزانہ انداز سے ذکر فرمایا ہے کہ مفہوم بھی نہایت حسن کے ساتھ ادا ہوگیا، اور ثقیل الفاظ کے استعمال کی قباحت بھی پیدا نہیں ہوئی، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَاۤ أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرِيْ
فَأَوْقِدْ لِيْ يَاهَامَانُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا﴾(۱)

(القصص: ۳۸)

"اور فرعون بولا!: "اے دربار والو! میں تو اپنے سوا تمہارے کسی اور خدا سے واقف نہیں ہوں، ہامان! تم ایسا کرو کہ میرے لئے گارے کو آگ دے کر پکواؤ، اور میرے لئے ایک اُونچی عمارت بناؤ۔"

۳.....عربی میں بعض الفاظ ایسے ہیں جو منفرد ہونے کی حالت میں تو سبک اور فصیح ہیں، لیکن ان کی جمع ثقیل سمجھی جاتی ہے، مثلاً زمین کے معنی میں لفظ "اَرْضٌ" ایک سبک لفظ ہے، اس کی دو جمعیں عربی میں مستعمل ہیں، اَرْضُوْنَ اور اَرَاضِیْ، یہ دونوں ثقیل سمجھی جاتی ہیں، اور اُن کی وجہ سے کلام کی سلاست میں فرق واقع ہو جاتا ہے، لیکن جہاں جمع کا مفہوم ادا کرنا ضروری ہوتا ہے، وہاں ادبائے عرب انہی کے استعمال پر مجبور ہوتے ہیں، اس کے برخلاف قرآن کریم نے بیشتر مقامات پر سَمٰوٰت کو بصیغہ جمع اور اس کے ساتھ اَرض کو مفرد استعمال کیا ہے، اور کہیں اَرض کو بصیغہ جمع استعمال نہیں فرمایا البتہ ایک جگہ سات زمینوں کا ذکر کرنا تھا، جس کے لئے جمع کا صیغہ لانا ضروری تھا، لیکن قرآن نے اس صیغۂ جمع سے احتراز کر کے ایسی

(۱) یتیمة البیان لمشکلات القرآن، للشیخ البنوری حفظ اللہ، ص ۵۶، مجلس علمی ڈابھیل ۱۳۵۷ھ۔ بحوالۂ المثل السائر لابن الاثیر، ص ۱۷۔

Marfat.com

خوب صورت تعبیر اختیار کی کہ مفہوم بھی ٹھیک ادا ہوگیا، اور نہ صرف یہ کہ کلام میں کوئی ثقل پیدا نہیں ہوا، بلکہ اس کے حُسن میں چند در چند اضافہ ہوگیا، ارشاد ہے:

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ﴾

(الطلاق:۱۲)

''اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے، اور زمین بھی اُنہی کی طرح''

دیکھئے! یہاں سَمَاءٌ (آسمان) کی جمع تو لائی گئی، لیکن قرآن نے اَرْضٌ کی جمع لانے کے بجائے اس کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے وَمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ کی تعبیر اختیار فرمائی جس کے اسرار و نکات پر جس قدر غور کیجئے معجزانہ بلاغت کا دریا موجزن نظر آتا ہے،

۴...... قرآن کریم کے بعض الفاظ پر بعض ملحدوں نے ثقیل ہونے کا اعتراض کیا ہے، مثلاً لفظ ''ضِیْزٰی''، لیکن وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ بعض الفاظ اپنی ذات میں ثقیل ہوتے ہیں لیکن ادیب انہیں ایسے سلیقے سے استعمال کرتا ہے کہ اس جگہ اس سے بہتر لفظ نہیں لایا جاسکتا، اردو میں اس کی مثال یہ ہے کہ ''دھول دھپّا'' ایک مبتذل لفظ سمجھا جاتا ہے، جسے فصیح و بلیغ عبارتوں میں عموماً استعمال نہیں کیا جاتا، لیکن غالب کا یہ شعر دیکھئے ؂

دھول دھپّا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

یہاں یہ لفظ ایسے سلیقے کے ساتھ آیا ہے کہ اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ رکھ دیا جائے تو حسن بیان پر پانی پھر جائے گا، عربی میں اس کی مثال یہ ہے کہ گردن کی ایک رگ کا نام ''اخدع'' ہے، عربی کے دو شاعروں نے اس لفظ کو اپنے کلام میں استعمال کیا ہے، لیکن دونوں میں حسن و سلامت کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہے، ابوتمام کہتا ہے ؂

یا دھر قوم عن اخدعیك فقد
اضججت ھذا الانام عن خرقك

یہاں یہ لفظ بڑا ثقیل اور بوجھل معلوم ہو رہا ہے، لیکن اس کے بعد حماسہ کے ایک شاعر عبداللہ بن الصمہ کا یہ شعر پڑھیے

تلفّتّ نحو الحی حتّٰی وَجَدُتّنی
وَجِعُتُ مِن الا صغاء لِیْتًا وّ اخدعا

اس میں وہی ثقیل لفظ اتنی روانی اور خوبصورتی سے آیا ہے کہ ذوقِ سلیم پر کوئی گرانی نہیں ہوتی، بلکہ شعر میں مجموعی طور پر جو سوز و گداز پایا جا رہا ہے یہ ثقیل لفظ اس میں بھی پوری طرح فٹ ہو جاتا ہے، قرآن کریم میں لفظ ''ضِیزیٰ'' بھی ایسے حُسن کے ساتھ آیا ہے کہ اس کی جگہ کوئی خوبصورت سے خوبصورت لفظ بھی اس کی ہمسری نہیں کر سکتا،

﴿اَلَکُمُ الذَّکَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰی ، تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِیْزٰی﴾

اگر انفرادی طور سے دیکھا جائے تو قِسْمَۃٌ جَائِرَۃٌ یا قِسْمَۃٌ ظَالِمَۃٌ کے الفاظ ضِیزیٰ کے مقابلے میں بہتر معلوم ہوتے ہیں، لیکن جس سیاق میں لفظ ضِیزیٰ قرآن میں آیا ہے وہاں اگر ''جائرۃ'' یا ''ظالمۃ'' کے الفاظ رکھ دیئے جائیں تو کلام کی ساری روانی ختم ہو جائے گی،(۱)

ترکیب کا اعجاز

الفاظ کے بعد جملوں کی ترکیب، ساخت اور نشست کا نمبر آتا ہے، اس معاملے میں بھی قرآن کریم کا اعجاز اوجِ کمال پر ہے،

قرآن کریم کے جملوں کے دروبست میں وہ شوکت، سلاست اور شیرینی ہے کہ اس کی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی، یہاں میں صرف ایک مثال پر اکتفاء کرتا ہوں:

قاتل سے قصاص لینا اہلِ عرب میں بڑی قابلِ تعریف بات تھی، اور اس کے فوائد ظاہر

(۱) یہ چاروں مثالیں بنیادی طور پر مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مدظلہم کی کتاب ''یتیمۃ البیان'' سے ماخوذ ہیں، جو حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''مشکلات القرآن'' کے مقدمہ کے طور پر شائع ہوئی ہے، موصوف نے یہ مثالیں حضرت شاہ صاحبؒ اور علامہ ابن اثیرؒ کی ''المثل السائر فی ادب الکاتب والشاعر'' کے حوالے سے پیش کی ہیں،

Marfat.com

کرنے کے لئے عربی میں کئی مقولے مشہور تھے، مثلاً اَلْقَتْلُ اِحْیَاءٌ لِّلْجَمِیْعِ (قتل اجتماعی زندگی ہے) اور اَلْقَتْلُ اَنْفیٰ لِلْقَتْلِ (قتل سے قتل کی روک تھام ہوتی ہے) اور (اَکْثِرُوْا الْقَتْلَ لِیَقِلَّ الْقَتْلُ (قتل زیادہ کرو تا کہ قتل کم ہو جائے) ان جملوں کو اتنی مقبولیت حاصل تھی کہ یہ زباں زدِ عام تھے، اور فصیح سمجھے جاتے تھے، قرآن کریم نے بھی اسی مفہوم کو ادا فرمایا لیکن کس شان سے؟ ارشاد ہے:

﴿ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ ﴾

''اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی (کا سامان ہے)''

اس جملے کے اختصار، جامعیت، سلاست، شوکت، اور معنویّت کو جس پہلو سے دیکھئے بلاغت کا معجز شاہکار معلوم ہوتا ہے، اور پہلے کے تمام جملے اس کے آگے سجدہ ریز دکھائی دیتے ہیں،

اسلوب کا اعجاز

قرآن کریم کے اعجاز کا سب سے زیادہ روشن مظاہرہ اس کے اسلوب میں ہوتا ہے، اور یہ وہ چیز ہے جس کا مشاہدہ ہر کس و ناکس کر سکتا ہے، اس کے اسلوب کی اہم معجزانہ خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

۱...... قرآن کریم ایک ایسی نثر پر مشتمل ہے جس میں شعر کے قواعد وضوابط ملحوظ نہ ہونے کے باوجود ایک ایسا لذیذ اور شیریں آہنگ پایا جاتا ہے، جو شعر سے کہیں زیادہ حلاوت اور لطافت کا حامل ہے،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کا جمالیاتی ذوق نظم اور شعر میں ایک ایسی لذّت اور حلاوت محسوس کرتا ہے جو نثر میں محسوس نہیں ہوتی، اگر آپ اس لذّت اور حلاوت کے سبب پر غور فرمائیں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کا راز درحقیقت لفظوں کی اس ترتیب میں مضمر ہے جو ایک خاص صوتی آہنگ پیدا کرتی ہے، عربی، فارسی، اور اردو کی قدیم شاعری میں اس آہنگ کی

Marfat.com

لذت شعر کے خاص اوزان کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، جب ایک ہی صوتی وزن کے الفاظ بار بار کانوں میں پڑتے ہیں تو اس سے ذوقِ سلیم کو ایک خاص لذت حاصل ہوتی ہے، اور پھر جب وزن کے ساتھ قافیہ بھی مل جاتا ہے تو اس کی لذت دوچند ہو جاتی ہے، اور جب اس کے ساتھ ردیف کی یکسانیت بھی شامل ہو جاتی ہے تو لذت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے، اور اگر مصرعوں کے بیچ بیچ میں عروضی اوزان کے ساتھ صرفی اوزان اور قوافی کی یکسانیت بھی شامل ہو جائے (جیسا کہ مرصّع اشعار میں ہوتا ہے) تو یہ لذت اور بڑھ جاتی ہے،

لیکن اوزان اور قوافی کے اصول ہر خطّے اور ہر زبان میں یکساں نہیں ہوتے، ہر زبان کے لوگ اپنے اپنے ذوق اور مزاج کے لحاظ سے اس کے لئے مختلف قواعد مقرر کرتے ہیں، مثلاً اہل عرب نے اپنی شاعری کو وزن اور قافیہ کے اُن سانچوں تک محدود رکھا ہے، جو خلیل بن احمد وغیرہ نے وضع کئے ہیں، فارسی شاعری میں اوزان کا دائرہ کچھ اور وسیع کیا گیا، اور نئی نئی بحریں اختیار کی گئیں، لیکن قافیہ اور ردیف کی پابندی میں زیادہ کڑی شرائط عائد کردی گئیں، چنانچہ عربی شاعری میں قبور اور کبیر کو ہم قافیہ سمجھا جاتا ہے، اور اگر ایک شعر میں قبور اور دوسرے میں کبیر آرہا ہو تو اُسے کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا، جبکہ فارسی میں یہ ممکن نہیں، اسی طرح عربی میں اگر ایک ہی کلمہ کا آدھا حصہ پہلے مصرعہ میں اور آدھا دوسرے میں ہو تو اُسے معیوب نہیں سمجھتے جبکہ فارسی میں یہ زبردست عیب ہے، بلکہ ایسا شعر شعر ہی نہیں سمجھا جاتا، نیز عربی شاعری میں زحافات اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ بسا اوقات اصلی بحر کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے، جبکہ فارسی میں ایسا نہیں ہوتا، اسی طرح عربی شاعری میں ردیف کا کوئی تصور نہیں جبکہ فارسی میں ردیف کے بغیر غزل پھیکی سمجھی جاتی ہے، مزید یہ کہ اصلی عربی شاعری میں فارسی کی طرح مثنوی، مستزاد، مخمس، مسدس، رباعی اور قطعہ بند نظموں جیسی اصناف کا وجود نہیں تھا، جبکہ فارسی ان اصناف سے مالا مال رہی ہے، اور پھر اسی کے اثر سے اندلس وغیرہ میں موشحات اور ازجال وغیرہ کی اصناف رائج ہوئیں،

عربی اور فارسی میں ان اختلافات کے باوجود اوزان میں بڑی حد تک اشتراک پایا

Marfat.com

جاتا ہے، لیکن قدیم ہندی شاعری کو دیکھئے تو اس میں معروف عروضی اوزان کے بجائے صرف حروف کی تعداد کا لحاظ ہوتا ہے، اور اگر دونوں لفظوں کے حروف کی تعداد ایک ہو تو انہیں ہم وزن سمجھا جاتا ہے، خواہ ان کی حرکات وسکنات میں بڑا فرق ہو، بلکہ بعض اوقات ہندی دوہوں میں معروف عروضی اوزان وقوافی قافیہ یا ردیف کے قواعد بلکہ تعدادِ حروف تک میں بڑا فرق ہوتا ہے، اس کے باوجود انہیں بڑے لطف کے ساتھ پڑھا اور گایا جاتا ہے، اور ان کی تاثیر ناقابلِ انکار ہوتی ہے، اور اس معاملے میں انگریزی شاعری کا مزاج شاید سبھی سے زیادہ آزاد واقع ہوا ہے، کہ اُس میں عروضی اوزان تو کجا مصرعوں کے طول وعرض میں بھی بسا اوقات زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے، اکثر قافیے کی بھی کوئی خاص رعایت نہیں ہوتی، بلکہ صرف تلفظ کے کھٹکوں (Syllables) سے ایک خاص آہنگ (rhythm) پیدا کیا جاتا ہے، اور وہی آہنگ اہلِ زبان کے لئے ایک خاص لذت وکیف کا سبب بن جاتا ہے،

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ شعر کی لذت وحلاوت میں اوزان وقوافی کے لگے بندھے قواعد کوئی عالمگیر حیثیت نہیں رکھتے، یہی وجہ ہے کہ یہ قواعد مختلف زبانوں اور خطوں میں بدلتے رہتے ہیں، لیکن ایک چیز ہے جو اِن سب زبانوں اور تمام قوموں میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے، اور وہ ہے ایک ''متوازن صوتی آہنگ''، یعنی الفاظ کو اس طرح ترتیب دینا کہ اُن کے تلفظ سے اور انہیں سُنکر انسان کا جمالیاتی ذوق حظ محسوس کرے، لیکن انسان چونکہ اس قدرِ مشترک کو اوزان وقوافی کے معروف سانچوں سے الگ کرنے پر قادر نہیں، اس لئے جب وہ شاعری کا لطف پیدا کرنا چاہتا ہے تو اسے لازماً اپنے ماحول کے بنائے ہوئے قواعد وضوابط کی پابندی کرنی پڑتی ہے، یہ صرف قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس نے دنیا کے مختلف خطوں میں مقرر کئے ہوئے شعری قواعد میں سے کسی قاعدے کی پابندی نہیں کی، بلکہ صرف ''متوازن صوتی آہنگ'' کی اس قدرِ مشترک کو اختیار کرلیا ہے جو اِن سارے قواعد کا اصل مقصود ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نثر ہونے کے باوجود شعر سے زیادہ لطافت اور حلاوت کا حامل ہے، اور صرف اہلِ عرب ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر زبان کے لوگ اُسے سُنکر غیر معمولی لذت اور تاثیر

Marfat.com

محسوس کرتے ہیں،

یہیں سے یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ بعض کفارِ عرب نے قرآن کریم کو کس بناء پر شعر قرار دیا تھا؟ ظاہر ہے کہ شعر کی معروف تعریف کسی بھی طرح قرآن کریم پر صادق نہیں آتی، اور کفارِ عرب اپنی ہزار گمراہیوں کے باوجود اتنی حس ضرور رکھتے تھے کہ نثر اور نظم میں تمیز کرسکیں، وہ اس بات سے بے خبر نہیں تھے کہ شعر کے لئے وزن اور قافیہ کی پابندی ضروری ہے، جو قرآنِ کریم میں مفقود ہے، اس کے باوجود انہوں نے قرآن کریم کو شعر اس بناء پر قرار دیا کہ اس کے اسلوب اور آہنگ میں انہوں نے شعر سے زیادہ حلاوت اور تاثیر محسوس کی تھی، اور وہ سمجھ رہے تھے کہ وزن اور قافیہ کی پابندی کے بغیر اس کلام میں شعری ذوق اور وجدان کے لئے وہ جمالیاتی لذت بدرجۂ اتم موجود ہے، جو اوزان وقوافی کی جکڑ بندیوں سے بھی حاصل نہیں ہوتی،

قرآن کریم نے ''متواتر صوتی آہنگ'' کی یہ تاثیر پیدا کرنے کے لئے کونسے نئے اصولوں کی رعایت رکھی ہے؟ اس بات کو بیان کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے، کیونکہ مروجہ الفاظ و مصطلحات اُس کیفیت کو ٹھیک بیان نہیں کرسکتے جو قرآنی اسلوب میں رواں دواں نظر آتی ہے، ہاں جس شخص کو ادبی ذوق اور جمالیاتی حس کا کچھ حصہ ملا ہو وہ ہمارے مذکورہ بالا بیان کی صداقت کو تلاوتِ قرآن کے دوران خود بخود محسوس کرسکتا ہے، (۱)

۲..... علماء بلاغت نے اسلوب کی تین قسمیں قرار دی ہیں، خطابی ادبی، علمی، ان تینوں قسموں کے دائرے الگ الگ ہیں، ہر ایک کی خصوصیات جدا اور مواقع مختلف ہیں، اور ایک ہی عبارت میں ان تینوں اسالیب کو جمع کردینا ممکن نہیں ہے، آپ جب تقریر کرتے ہیں تو آپ کا انداز اور ہوتا ہے، اور جب کوئی ادبی نثر لکھتے ہیں تو اس کا اسلوب بالکل جدا ہوتا ہے، اور جب کوئی علمی مقالہ لکھتے ہیں تو اس کا اسلوب کچھ اور اختیار کرتے ہیں، لیکن قرآن کریم کا اعجاز یہ ہے کہ وہ ان تینوں اسالیب کو ساتھ لے کر چلتا ہے، اس میں خطابت کا زور، ادب کی شگفتگی

---

(۱) یہ پوری بحث حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کی کتاب ''الفوز الکبیر'' سے تشریحی اضافوں کے ساتھ ماخوذ ہے، اس کی مزید تفصیل کے لئے اس کے باب ۳ فصل ۲ کا مطالعہ کیا جائے۔

Marfat.com

اور علم کی متانت ساتھ ساتھ چلتی ہے، اور کسی چیز میں کوئی کمی نہیں آنے پاتی،

۳...... قرآن کریم کے مخاطب اَلھڑ دیہاتی بھی ہیں، پڑھے لکھے لوگ بھی اور اعلیٰ درجے کے علماء اور ماہرین فنون بھی، لیکن اس کا ایک اسلوب بیک وقت ان تینوں طبقوں کو متاثر کرتا ہے، ایک طرف اَن پڑھ آدمی کو اس میں سادہ حقائق ملتے ہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ قرآن میرے ہی لئے اُترا ہے، لیکن دوسری طرف علماء اور محققین جب اُسے گہری نظر سے پڑھتے ہیں تو انہیں قرآن کریم میں علمی نکات نظر آتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب علم وفن کی ایسی باریکیوں پر مشتمل ہے کہ معمولی واقفیت کا آدمی انہیں سمجھ ہی نہیں سکتا،

ایک عام آدمی کے ذہن کے پیش نظر قرآن کریم کا طریقِ استدلال بہت سادہ اور زیادہ تر مشاہدہ کی دلیلوں پر مبنی ہے، توحید، رسالت، آخرت، آفرینش حیات، اور وجود باری جیسے دقیق فلسفیانہ مسائل کو اس نے بالکل سامنے کی دلیلوں سے ثابت کیا ہے، اور مظاہرِ فطرت کی طرف اشارہ کر کے وہ حقائق بیان فرمائے ہیں، جو آسانی کے ساتھ ایک ادنیٰ ذہنی معیار کے آدمی کی سمجھ میں آسکیں، لیکن انہی سادہ حقائق کی تہہ میں اتر کر دیکھئے تو اس میں خالص عقلی اور منطقی دلائل بھی ملیں گے، جو فلسفیانہ موشگافیوں کے مریض کو بھی شفا بخشتے ہیں، باتوں باتوں میں اس نے فلسفہ اور سائنس کے وہ دقیق مسائل بھی حل کر دیئے ہیں جن کی تحقیق کیلئے بڑے بڑے فلسفی آخر تک پیچ وتاب کھاتے رہے،

۴...... اگر ایک ہی بات کو بار بار دُہرایا جائے تو کہنے والا ادب وانشاء میں خواہ کتنا بلند پایہ مقام رکھتا ہو ایک مرحلے پر پہنچ کر سننے والے اُکتا جاتے ہیں، کلام کا زور ٹوٹ جاتا ہے اور اس کی تاثیر کم ہو جاتی ہے، لیکن قرآن کریم کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں ایک ہی بات بعض اوقات بیسیوں مرتبہ کہی گئی ہے، ایک ہی واقعہ بار بار مذکور ہوا ہے، لیکن ہر مرتبہ نیا کیف، نئی لذت اور نئی تاثیر محسوس ہوتی ہے،

۵...... کلام کی شوکت اور اس کی نزاکت وشیرینی دو متضاد صفتیں ہیں، دونوں کے لئے الگ اسلوب اختیار کرنا پڑتا ہے، ان دونوں صفتوں کو ایک عبارت میں جمع کر دینا انسانی قدرت

Marfat.com

سے باہر ہے، لیکن کہ صرف قرآنی اسلوب کا اعجاز ہے کہ اس میں یہ دونوں اوصاف بدرجۂ کمال یکجا پائے جاتے ہیں،

۶...... قرآن کریم نے بعض اُن مضامین میں بلاغت کو اوجِ کمال تک پہنچا کر دکھایا ہے جن میں کوئی بشری ذہن ہزار کوشش کے بعد بھی کوئی ادبی چاشنی پیدا نہیں کرسکتا، مثلاً قانونِ وراثت کو لیجئے، یہ ایک ایسا خشک اور سنگلاخ موضوع ہے کہ اس میں دنیا کے تمام ادیب وشاعر مل کر بھی ادبیت اور عبارت کا حسن پیدا نہیں کر سکتے، لیکن اس کے بعد سورۂ نساء میں یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ الخ والے رکوع کی تلاوت کیجئے، آپ بیساختہ پکار اُٹھیں گے کہ یہ کوئی غیر معمولی کلام ہے، اس پورے رکوع میں قانونِ وراثت بیان کیا گیا ہے، لیکن اس حسن وجمال کے ساتھ کہ ایک ایک جملے پر ذوقِ سلیم وجد کرتا ہے،

۷...... ہر شاعر اور ادیب کی فصاحت وبلاغت کا ایک مخصوص میدان ہوتا ہے جس سے ہٹ کر اس کا کلام پھیکا پڑ جاتا ہے، عربی میں امرؤالقیس نسیب وغزل کا امام ہے، نابغہ، خوف وہیبت کے بیان میں، اعشیٰ حُسن طلب اور وصف میں اور زُہیر رغبت وامید میں بے نظیر ہے، یہی حال ہر زبان کا ہے، لیکن قرآن کریم میں اس قدر مختلف الانواع مضامین بیان کئے گئے ہیں کہ اُن کا احاطہ دشوار ہے، لیکن ترغیب ہو یا ترہیب، وعد ہو یا وعید، وعظ ونصیحت ہو یا امثال وقصص عقائد کا بیان ہو یا احکام کا، ہر جگہ اس کا بیان بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار کو پہنچا ہوا ہے،

۸...... اختصار اور ایجاز قرآن کریم کے اسلوب کا امتیازی وصف ہے، اور اس وصف میں اس کا اعجاز نہایت نمایاں ہے، قرآن کریم چونکہ قیامت تک کے ہر زمانے کی رہنمائی کے لئے آیا ہے، اس لئے اس نے مختصر جملوں میں وہ وسیع مضامین سمیٹ دیئے ہیں کہ ہر دور اور ہر زمانے میں اس سے ہدایات حاصل کی جاسکتی ہیں، چودہ سو سال گزر جانے پر بھی اس کے مضامین پُرانے نہیں ہوئے اس عرصے میں انسانی زندگی نے کتنے پلٹے کھائے، کیسے کیسے عظیم انقلابات رونما ہوئے، لیکن قرآن کریم سدابہار رہا اور رہے گا، وہ تاریخ کی کتاب نہیں، مگر تاریخ کا مستند ترین مأخذ ہے، وہ سیاست وقانون کی کتاب نہیں، لیکن اس نے چند مختصر جملوں

Marfat.com

میں سیاست اور جہاں بانی کے وہ اصول بیان فرمادیئے ہیں، جو رہتی دنیا تک انسانیت کی رہنمائی کریں گے، وہ فلسفہ اور سائنس کی کتاب نہیں، لیکن اس نے فلسفہ اور سائنس کے بہت سے عُقدے کھول دیئے ہیں، وہ معاشیات اور عمرانیات کی کتاب نہیں، لیکن دونوں موضوعات پر اس نے اختصار کے ساتھ ایسی جامع ہدایات دیدی ہیں کہ دنیا کے علوم وفنون سینکڑوں ٹھوکریں کھانے کے بعد آج ان کے قریب پہنچ رہے ہیں،

نظم کا اعجاز

قرآن کریم کا ایک دقیق اعجاز اس کی آیات کے باہمی ربط وتعلق اور نظم وترتیب میں ہے، آپ سرسری نظر سے قرآن کریم کی تلاوت فرمائیں تو بظاہر یہ محسوس ہوگا کہ اس کی ہر آیت جدا مضمون کی حامل ہے، اور ان کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے، اسی وجہ سے نظمِ قرآن کے بارے میں مفسّرین کے دو گروہ ہوگئے ہیں، بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ قرآن کریم چونکہ تیئس سال میں تھوڑا تھوڑا کرکے نازل ہوا ہے، اس لئے اس میں کوئی ربط وترتیب تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، اس کی ہر آیت ایک مستقل مضمون کی حامل ہے، اس کے برخلاف دوسرے گروہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قرآن کریم ایک مکمل کتاب ہے، وہ شروع سے آخر تک باہم مربوط ہے، اور اسی نقطۂ نظر سے اس کا مطالعہ ضروری ہے، اس دوسرے گروہ کی دلیل یہ ہے کہ کسی کتاب کا بے ربط ہونا اس کے نقص کی دلیل ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کا کلام لازماً اس نقص سے بری ہے، مگر پہلا گروہ اس کے جواب میں یہ کہتا ہے کہ جس طرح قدرتی مناظر میں کوئی ربط اور ترتیب نہیں ہوتی بلکہ اُن کا حسن ہی اس بے ترتیبی میں ہوتا ہے کہ کہیں بل کھاتا ہوا دریا ہے، کہیں ناہموار پہاڑ ہے، کہیں اونچی نیچی وادیاں ہیں، اسی طرح قرآن کریم کا حسن بھی اس کی اس مستقل حیثیت میں ہے، غزل کے ہر شعر کا موضوع جدا ہوتا ہے اور اس کو کوئی عیب نہیں سمجھتا، بس (بلاتشبیہ) اسی طرح قرآن کریم میں بھی بے ترتیبی کوئی عیب نہیں،

لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات کے درمیان نہایت لطیف ربط پایا جاتا ہے،

Marfat.com

اور اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، ورنہ اگر کوئی ترتیب ملحوظ نہ ہوتی تو ترتیب نزول اور ترتیبِ کتابت میں فرق رکھنے کی چنداں ضرورت نہ تھی، جس ترتیب سے قرآن کریم نازل ہوا تھا، اُسی ترتیب سے لکھ لیا جاتا، یہ جو کتابت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک الگ ترتیب قائم فرمائی وہ اس بات کی بڑی واضح دلیل ہے کہ قرآنی آیات میں رَبط موجود ہے، البتہ یہ ربط قدرے دقیق ہوتا ہے، اور اس تک پہنچنے کے لئے بڑے غور وفکر کی ضرورت ہے،

اس ربط کو اتنا دقیق اور غامض رکھنے کی حکمت بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے (واللہ اعلم) کہ ہر آیت کی ایک مستقل حیثیت باقی رہے، اور اس کے الفاظ کا عموم ختم نہ ہونے پائے تاکہ **العبرة لعموم اللفظ** پر عمل کرنا آسان ہو، اِس کے علاوہ اُس زمانے میں اہلِ عرب کے خطبات وقصائد کا اسلوب عموماً یہی ہوتا تھا کہ اُن کے مضامین مرتّب اور مربوط ہونے کے بجائے مستقل حیثیت رکھتے تھے، لہٰذا یہ طریقہ اُس دَور کے ادبی ذوق کے عین مطابق تھا، چنانچہ اگر سرسری نظر سے دیکھا جائے، قرآن کریم کی ہر آیت مستقل معلوم ہوگی، لیکن جب آپ غور کی نظر سے دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ پورا کلام مسلسل اور مربوط ہے،

اس طرح قرآن کریم نے اپنے نظم میں جو اسلوب اختیار فرمایا ہے وہ اس کا دقیق ترین اعجاز ہے، اور اس کی تقلید بشری طاقت سے بالکل باہر ہے، بہت سے علماء نے قرآن کریم کے نظم کی توضیح کے لئے مستقل کتابیں لکھی ہیں، اور بعض مفسّرین نے اپنی تفسیروں کے ضمن میں اسے بیان کرنے کا خاص اہتمام کیا ہے، اس معاملے میں امام فخر الدین رازیؒ کی تفسیر کبیر شاید سب سے زیادہ قابل تعریف کاوش ہے، انہیں اللہ نے نظم قرآن کی تشریح کا خاص سلیقہ اور خاص توفیق عطا فرمائی ہے، ان کے بعد قاضی ابوالسّعو درحمۃ اللہ علیہ نے بھی نظم قرآن کی خصوصیات کو بیان فرمانے کا خاص اہتمام فرمایا ہے بعد کے بیشتر مفسّرین اس معاملے میں انہی دو حضرات کے خوشہ چیں ہیں،

نظم قرآن کی ایک ہلکی سی جھلک اس مثال میں دیکھی جاسکتی ہے، سورۂ حجر میں ایک جگہ ارشاد ہے:

Marfat.com

﴿نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ﴾ (الحجر:۴۹و۵۰)

"میرے بندوں کو خبر دیدو کہ میں غفور اور رحیم ہوں، اور میرا عذاب (بھی) بڑا دردناک ہے۔"

اس کے فوراً بعد ارشاد ہے:

﴿وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ﴾ (الحجر:۵۱)

"اور انہیں ابراہیم کے مہمانوں کا حال سنادو۔"

اور اس کے بعد فرشتوں کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آنے کا مشہور واقعہ بیان کیا گیا ہے، بظاہر ان دونوں باتوں میں کوئی جوڑ معلوم نہیں ہوتا، لیکن ذرا غور سے دیکھئے تو درحقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ پہلے جملے کی تائید ہے، اس لئے کہ جو فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے تھے، انہوں نے دو کام کئے ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحٰق علیہ السلام جیسے صالح بیٹے کی خوش خبری دی، دوسرے انہی فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی بستی پر جا کر عذاب نازل کیا، پہلا کام "اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ" کا مظاہرہ تھا اور دوسرا کام "عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ" کا، اس طرح یہ دونوں جملے باہم نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں لیکن الگ الگ دیکھئے تو ان کی مستقل حیثیت بھی ہے، (۱)

قرآن کریم کی پیشگی خبریں

یہ اللہ کی عادت ہے کہ جب وہ کسی کو اپنا پیغمبر بنا کر بھیجتا ہے، اور اس پر اپنا کلام نازل فرماتا ہے تو لوگوں پر اس کا کلام اللہ ہونا ثابت کرنے کے لئے اس میں آئندہ پیش آنے والے واقعات کی کچھ پیشگی خبریں دی جاتی ہیں، اگرچہ پیشینگوئیاں نجومیوں کی طرف سے بھی کی جاتی

(۱) یہاں ہم نے اعجازِ قرآن کی صرف چند اہم وجوہ بیان کرنے پر اکتفاء کیا ہے، مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے "بائبل سے قرآن تک" از حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی مرتبہ احقر ص ۳۵۷ ج ۲، نیز علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کا رسالہ "اعجازِ قرآن"

Marfat.com

ہیں، لیکن اوّل تو وہ یقینی نہیں ہوتیں، چنانچہ بڑے سے بڑا نجومی کبھی یہ دعویٰ نہیں کر سکا کہ اس کی ہر پیشینگوئی درست نکلی ہے، اور کبھی کوئی غلطی نہیں ہوئی، دوسرے اللہ تعالیٰ کی سنت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص جھوٹے دعویٰ نبوت کے ساتھ کوئی پیشینگوئی کرتا ہے تو اسے پورا نہیں ہونے دیا جاتا، قرآن کریم نے کلام اللہ ہونے کے ساتھ بیسیوں پیشگی خبریں دیں ہیں، اور وہ سب کی سب بلا استثناء صحیح ثابت ہوئیں، جس کا انکار اسلام کا کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں کر سکا، یہاں ان تمام پیشگی خبروں کو بالتفصیل بیان کرنا تو ممکن نہیں، لیکن چند اہم خبریں مثال کے طور پر ذکر کی جاتی ہیں:

رُومیوں کی فتح

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعثت کے بعد مکہ مکرمہ میں تشریف فرماتھے اور مشرکین مکہ کی طرف سے آپؐ کو طرح طرح کی اذیتیں دی جارہی تھیں، ٹھیک اُسی وقت دنیا کی دو عظیم طاقتوں روم اور ایران کے درمیان شدید جنگ برپا تھی، اس جنگ میں ایرانی فوجیں مسلسل رومیوں پر غالب آتی جارہی تھیں، رومیوں کے پاؤں ہر جگہ سے اُکھڑ رہے تھے، اور ایرانی لشکر شام کے بڑے بڑے شہروں کو تاخت وتاراج کرتا ہوا طوفانی رفتار سے بڑھ رہا تھا، رُومی حکومت پے در پے ناکامیوں، متواتر شکست اور جان ومال کے بے پناہ نقصان کے باعث اس قدر نڈھال ہو چکی تھی، کہ اس کا کسی مقام پر قدم جمانا ہی مشکل تھا، چہ جائیکہ وہ پلٹ کر کوئی حملہ کر سکے، یہ صورت حال کفارِ عرب کے لئے باعث مسرّت تھی، کیونکہ وہ ایران کو آتش پرست ہونے کی بناء پر اپنے مشابہ اور روم کو اہلِ کتاب ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے مشابہ سمجھتے تھے، اور ایرانیوں کا غلبہ اُن کے نزدیک اپنی فتح اور مسلمانوں کی شکست کا شگون تھا، ان حالات میں سورۂ روم کی یہ ابتدائی آیات نازل ہوئیں،

﴿الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۬ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ

Marfat.com

بَعْدُ وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاءُ
وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝ وَعْدَ اللّٰهِ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (الروم: ۱-۶)

"الٓمٓ رُومی لوگ قریب کی سرزمین میں مغلوب ہوگئے ہیں، اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب آجائیں گے، چند ہی سالوں میں! سارا اختیار اللہ ہی کا ہے، پہلے بھی اور بعد میں بھی، اور اُس دن ایمان والے اللہ کی دی ہوئی فتح سے خوش ہوں گے، وہ جس کو چاہتا ہے، فتح دیتا ہے، اور وہی صاحبِ اقتدار بھی ہے، بڑا مہربان بھی یہ اللہ کا کیا ہوا وعدہ ہے، اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

جولوگ روم اور ایران کے جنگی حالات سے باخبر تھے اُن کے لئے یہ پیشینگوئی قطعی طور پر ناقابل یقین تھی، چنانچہ قریش کے ایک ممتاز سردار اُبی بن خلف نے حضرت ابوبکرؓ سے شرط لگالی کہ اگر تین سال کے دَوران رومی غالب آگئے تو میں تمہیں دس اُونٹ دوں گا، اور اگر غالب نہ آسکے تو تم مجھے دس اونٹ دو گے، اُس وقت اس طرح کی شرط جائز تھی، اس لئے حضرت ابوبکرؓ نے اُسے منظور فرمالیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع کی، آپؐ نے فرمایا کہ قرآن نے "بضع سنین" (چند سالوں میں) فرمایا ہے، اور عربی میں لفظ "بضع" (چند کا اطلاق تین سے لے کر نو سال تک ہوتا ہے، لہٰذا تم اُبی بن خلف سے اونٹوں کی تعداد بڑھا کر شرط کی مدّت نو سال تک مقرر کرلو، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اُبیّ بن خلف سے نو سال کی مدت مقرر کر کے سو اونٹوں کی شرط لگالی، اگرچہ اس پیشینگوئی کے وقت اس کے پورے ہونے کے کوئی آثار نہ تھے، بلکہ اس کے بعد بھی ایرانی افواج آگے ہی بڑھتی چلی گئیں، یہاں تک کہ رومیوں کے دارالحکومت قسطنطنیہ کی دیواروں تک جا پہنچیں مشہور مورخ ایڈورڈ گبن اس پیشینگوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اُسوقت جبکہ یہ پیشینگوئی کی گئی، کوئی بھی پیشگی خبر اتنی بعید از قیاس نہیں ہوسکتی تھی، کیونکہ ہرقل کے ابتدائی بارہ سال رومی شہنشاہیت کے خاتمہ کا اعلان کررہے تھے۔“

(سقوطِ زوال سلطنتِ روما، ج ۵ ص ۳ ۷ و ۴ ۷)

لیکن اپنی پہلی شکست کے ٹھیک سات سال بعد قیصر روم بالکل خلافِ توقع قسطنطیہ سے باہر نکلا اور اس کی فوجوں نے ایرانیوں پر پے در پے حملے کرکے انہیں متعدد مقامات پر شکست فاش دی، اور اس کے بعد رومی لشکر ہر جگہ غالب ہی آتا چلا گیا،

اُدھر اس عرصہ میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہجرت کرکے مدینہ طیبہ جاچکی تھی، اور کفارِ مکہ کے ساتھ اُن کی جنگیں شروع ہوگئی تھیں، اور جس وقت بدر کے میدان میں تین سو تیرہ نہتے مسلمان ایک ہزار مسلح سُورماؤں کا منہ پھیر رہے تھے ٹھیک اُسی وقت یہ خبر ملی کہ رومیوں نے اہلِ ایران کو شکست دیدی ہے، اُس وقت یہ واضح ہوا کہ قرآن کریم نے رومیوں کی فتح کی خبر دینے کے ساتھ جو فرمایا تھا کہ ﴿ یَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ ﴾ (اس روز مسلمان اللہ کی مدد سے خوش ہوں گے) اس سے مسلمانوں کی دوہری خوشی کیطرف اشارہ تھا، ایک رومیوں کی فتح کی اور دوسری بدر کے میدان میں خود اپنی فتح کی،

فتحِ مکہ کی خبر

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کفارِ مکہ کے ظلم وستم سے تنگ آکر ہجرت کے ارادہ سے مکہ مکرمہ سے نکلے، اور غارِ ثور میں تین روز قیام کے بعد مدینہ طیبہ کے راستے پر جحفہ کے قریب پہنچے تو وہاں سے مکہ مکرمہ جانیوالی سڑک نظر آئی، اور طبعی طور سے آپؐ کو وطن کی یاد آئی، اور اُسے مستقلاً چھوڑ دینے کے خیال سے افسوس ہوا، اس موقع پر قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی کہ: (۱)

﴿ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ ﴾

”(اے پیغمبر!) جس ذات نے تم پر اس قرآن کی ذمہ داری ڈالی ہے،

(۱) جمع الفوائد، ص ۷۱، ج ۳ بحوالہ ”صحیح بخاری“۔

Marfat.com

وہ تمہیں دوبارہ اُس جگہ پر لا کر رہے گا جو (تمہارے لئے) اُنسیت کی جگہ ہے۔"

اُس وقت آپؐ جس بے سرو سامانی کے عالم میں مکہ مکرمہ سے نکلے تھے اُس کے پیش نظر ظاہری اعتبار سے اس پیشینگوئی کے پورا ہونے کی کوئی توقع نہ تھی، لیکن چند ہی سال بعد آپؐ اسی شہر مکہ میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور یہ پیشینگوئی پوری ہو کر رہی،

یہودیوں کی تمنائے موت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہودی کہا کرتے تھے کہ آخرت کی فلاح وکامیابی صرف یہودیوں کا مقدر ہے، اور ہم ضرور جنت میں جائیں گے، اس کے جواب میں قرآن کریم نے ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا م بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ﴾

"آپ (اُن سے) کہئے کہ: "اگر اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لئے مخصوص ہے (جیسا کہ تمہارا کہنا ہے) تو موت کی تمنا تو کر کے دکھاؤ، اگر واقعی سچے ہو" اور (ہم بتائے دیتے ہیں کہ) انہوں نے اپنے جو کرتوت آگے بھیج رکھے ہیں، ان کی وجہ سے یہ کبھی ایسی تمنا نہیں کریں گے، اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔"

یہ چیلنج اور یہ پیشینگوئی مدینہ طیبہ کے اس ماحول میں کی جارہی ہے جہاں یہودیوں کی بستیاں کی بستیاں آباد ہیں، اور مسلمانوں کو دن رات ان سے بحث ومناظرہ کا اتفاق پیش آتا رہتا ہے، اگر یہ چیلنج بذریعۂ وحی نہ دیا گیا ہوتا تو جو یہودی آپ کی تکذیب کا کوئی موقع

Marfat.com

فروگذاشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے، وہ بڑی آسانی سے علی الاعلان موت کی تمنا کر کے دکھا سکتے تھے، اور اس طرح جو مناظرے شب و روز جاری تھے ان کا فیصلہ ایک ہی لمحے میں ہو سکتا تھا، لیکن اس آیت کے نزول کے بعد یہودیوں کو سانپ سونگھ گیا، اور کوئی ایک متنفس بھی اس چیلنج کو قبول کرنے کے لئے آگے نہیں بڑھا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت و رسالت کے بارے میں غیر مسلموں کا نظریہ خواہ کچھ ہو، لیکن اِس بات سے آپ کے کسی دشمن نے بھی انکار نہیں کیا کہ آپ عقل و حکمت تدبّر اور فہم و فراست کے اعتبار سے بلند ترین مقام کے حامل تھے، اب یہ بات ایک معمولی سمجھ کے انسان سے بھی متوقع نہیں کہ وہ پورے یقین و اعتماد کے بغیر ایک ایسا چیلنج یا ایسی پیشینگوئی کر گذرے جسے اس کے مخالفین ایک لمحہ میں توڑ سکتے ہوں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے عاقل، حکیم اور مدبّر کی طرف سے یہ چیلنج وحی الٰہی کی رہنمائی کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا،

قرآن کریم کی حفاظت

قرآن کریم سے پہلے جو آسمانی کتابیں مختلف انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوئیں اُن کی حفاظت کا کوئی وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں کیا گیا تھا، چنانچہ وہ اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہیں رہ سکیں، مسلمانوں کا تو خیر عقیدہ ہے ہی کہ آج جن کتابوں کو تورات، زبور یا انجیل کے نام دیئے جاتے ہیں وہ ہرگز بعینہٖ وہ کتابیں نہیں ہیں جو آسمان سے اُتری تھیں، بلکہ ان میں بہت کچھ تحریف و ترمیم ہو چکی ہے،(۱) لیکن خود اہلِ کتاب بھی اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہیں، اور کوئی کٹر سے کٹر یہودی یا عیسائی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ان کتابوں میں ہر ہر لفظ الہامی ہے اور ان میں کہیں کوئی غلطی یا تبدیلی نہیں ہوئی، اس کے برخلاف قرآن کریم نے اپنے بارے میں پیشگی خبر دیدی تھی کہ:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾

(۱) اس کے مفصل اور ناقابلِ انکار دلائل کے لئے ملاحظہ ہو "بائبل سے قرآن تک" مصنفہ مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ، و مرتبہٗ احقر،

Marfat.com

”حقیقت یہ ہے کہ یہ ذکر (یعنی قرآن) ہم نے ہی اُتارا ہے، اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔“

چنانچہ یہ وعدہ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا، اور چودہ سو سال کے اس طویل عرصے میں قرآن کا کوئی نقطہ یا کوئی شوشہ تک نہ ضائع ہو سکا، اور نہ اس میں تحریف وترمیم کی کوئی کوشش کامیاب ہو سکی، اسلام ہمیشہ مخالفتوں اور عداوتوں کے نرغہ میں رہا ہے، اور اس کے دشمنوں نے اسے مغلوب کرنے کی کوشش میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی، لیکن کوئی دشمن قرانِ کریم کو اُس دَور میں بھی مٹانے، ضائع کرنے یا بدلنے میں کامیاب نہیں ہو سکا جبکہ قرآن کریم کے نسخے نہایت محدود تھے، اور نشر واشاعت کے وسائل نایاب، تورات کو دیکھئے کہ کس طرح بابل کا بادشاہ بخت نصر اٹھتا ہے، اور بنی اسرائیل کی روایات کے مطابق سوائے حضرت عزیر علیہ السلام کے کسی شخص کو تورات یاد نہیں تھی، اس لئے تمام نسخے ضائع ہو جانے کے بعد انہوں نے اپنے حافظے سے اُسے دُوبارہ لکھوایا،(۱) پھر روم کا بادشاہ انیتوکس اپی فانیس۔ اٹھتا ہے، اور خود بنی اسرائیل کی روایات کے مطابق تورات کا ایک ایک نسخہ پھاڑ کر جلا دیتا ہے، یہاں تک کہ کوئی نسخہ باقی نہیں رہتا، (۲)

اسی طرح انجیل کو دیکھئے کہ کس طرح طیطوس رومی، شاہ نیرون، ڈومیشیں اور ڈیوکلیشین کے حملوں میں اس کے اصل نسخے نابود ہو جاتے ہیں، لیکن قرآن کریم کا حال یہ ہے کہ اس کا سینکڑوں حملہ آوروں سے سابقہ پڑتا ہے، بہت سے مواقع پر مسلمانوں کا قتلِ عام ہوتا ہے، اُن کے کتب خانہ جلائے جاتے ہیں، قدیم کتابوں کے بڑے بڑے ذخیرے دریا میں بہا دیئے جاتے ہیں، قرامطہ کا سیلاب عظیم پورے عالم اسلام پر ٹوٹتا ہے اور قرآن کریم کی تحریف کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا، لیکن یہ کتاب مبین اللہ کے وعدے کے مطابق کسی ادنیٰ تغیر کے بغیر نہ صرف محفوظ رہتی ہے بلکہ مشرق ومغرب میں اس کی نشر واشاعت کی رفتار بڑھتی ہی

(۱) دیکھئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ص ۵۰۱ ج ۳ مطبوعہ ۱۹۵۰ء مقالہ: بائبل، بحث عہدِ قدیم، فہرست مسلمہ، بحوالہ ایسڈریس دوم ۱۴: ۱۹ تا ۴۸،

(۲) دیکھئے بائبل، ناکس ورژن میکملن، لندن ۱۹۶۳ء، مکابیوں کی پہلی کتاب ۱: ۵۹۔

چلی جاتی ہے، آج بھی اگر بالفرض (خدانخواستہ) قرآن کریم کے تمام مکتوب نسخے ناپید ہو جائیں تو لاکھوں فرزندانِ توحید کے سینے اس کے سچے امانت دار ہیں، اور اگر کوئی شخص قرآن کریم کا ایک لفظ بھی تبدیل کرنا چاہے تو مسلمانوں کے کم سن بچے بھی اُسے پکڑ سکتے ہیں،

پھر قرآن کریم کے صرف الفاظ ہی نہیں، بلکہ معانی کی حفاظت کا جو انتظام اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا گیا ہے وہ بجائے خود ایک مستقل تاریخ ہے، مثلاً مرورِ ایام سے ہر زبان کے الفاظ میں معانی کے اعتبار سے فرق واقع ہوتا رہتا ہے، چنانچہ عبرانی، سُریانی، اور کلدانی زبانیں جن میں پچھلی آسمانی کتابیں نازل ہوئی تھیں، رفتہ رفتہ دنیا سے ناپید ہو گئیں، یا اُن میں ایسا عظیم تغیّر واقع ہو گیا کہ وہ بالکل نئی زبانیں بن گئیں، لیکن قرآن کی زبان کو اللہ تعالیٰ نے یہ شرف بخشا ہے کہ وہ ہزارہا تغیّرات اور انقلابات کے باوجود پوری طرح محفوظ ہے، اور اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ قرآن کریم کا فلاں لفظ اس دَور میں کس معنی میں استعمال ہوتا تھا تو وہ نہایت آسانی سے معلوم کر سکتا ہے،

عربی زبان کو کس غیر معمولی طریقے پر محفوظ رکھا گیا ہے؟ اس کا ایک معمولی سا اندازہ اس واقعے سے ہوگا کہ یمن کے شہر زرائب کے اوپر عکّا نامی دو پہاڑ تھے، ان پہاڑوں کے رہنے والوں نے یہ عہد کیا ہوا تھا کہ وہ اپنی بستی کے باہر کسی بھی شخص سے نہ شادی بیاہ کا تعلق قائم کریں گے، نہ دوستی کا، اور نہ خود کہیں باہر جائیں گے، یہاں تک کہ باہر کا کوئی آدمی ان کے یہاں تین دن سے زیادہ قیام بھی نہیں کر سکتا تھا، اور اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اگر باہر کے لوگوں سے ہمارا میل جول بڑھا تو ہماری عربی زبان بگڑ جائے گی، یہ لوگ اپنے ان اصولوں پر سختی سے عمل پیرا رہے، اور مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ وہ واحد گروہ ہے جس کی عربی زبان ٹھیٹھ زمانۂ جاہلیت کی زبان ہے، اور اس میں سرِ مُو فرق نہیں آیا، (۱)

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم نے جو وعدہ فرمایا تھا کہ اللہ کی یہ کتاب ہمیشہ محفوظ رہے گی، اور خود

---

(۱) معجم البلدان لیاقوت الحمویؒ، ص ۱۴۳ ج ۴، جزو ۱۴، دار صادر بیروت ۱۳۷۶ھ مادّہ "عکوتان" وتاج العروس، للزبیدیؒ، مادّہ "عکۃ"۔

اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کرے گا، اس کی صداقت روز بروز روشن ہوتی چلی جاتی ہے، اور یہ پیشگی خبر سو فی صد درست ثابت ہوئی ہے،

یہاں قرآن کریم کی تمام پیشگی خبروں کا استیعاب کرنا نہیں، بلکہ صرف چند مثالیں پیش کرنا مقصود تھا، اور اِن چند مثالوں ہی سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم نے جو پیشگی خبریں دی تھیں وہ ایسے معجزانہ طریقے پر پوری ہوئی ہیں جس میں کسی انسانی کوشش کا کوئی دخل نہیں،

قرآن کریم کے انکشافات

پیشگی خبروں کے علاوہ قرآن کریم نے بہت سے ایسے علمی اور تاریخی حقائق کی نشاندہی فرمائی ہے جو اُس زمانے میں نہ صرف یہ کہ نامعلوم تھے، بلکہ اُس وقت اُن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، قرآن کریم کی اس قسم کی آیات کو جمع کرکے اگر ان کی مفصل تفسیر بیان کی جائے تو بلاشبہ ایک مستقل کتاب تیار ہوسکتی ہے، یہاں اُن سب آیات کا استیعاب تو ممکن نہیں، البتہ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

۱...... قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے کہ جس وقت فرعون دریا میں غرق ہونے لگا، تو اس نے جان بچانے کے لئے زبانی طور پر ایمان لانے کا اقرار کیا، جس کے جواب میں باری تعالیٰ نے فرمایا:

﴿آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۞ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً﴾

(یونس: ۹۱و۹۲)

’’اب ایمان لاتا ہے؟ حالانکہ اس سے پہلے نافرمانی کرتا رہا، اور مسلسل فساد ہی مچاتا رہا، لہٰذا آج ہم تیرے (صرف) جسم کو بچائیں گے، تاکہ تو اپنے بعد کے لوگوں کے لئے عبرت کا نشان بن جائے۔‘‘

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی ہے اُس وقت اور اس کے بعد بھی صدیوں تک کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ فرعون کی لاش اب تک صحیح سلامت موجود ہے، لیکن اب سے کچھ عرصہ پہلے یہ لاش دریافت ہوئی، اور آج تک قاہرہ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے،

۲..... قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴾

''اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کئے ہیں، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو''

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی ہے اُس وقت عام تصور یہ تھا کہ نر اور مادہ کے جوڑے صرف انسانوں یا جانوروں میں ہوتے ہیں، یا پھر چند نباتات میں، لیکن سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ قرآنی حقیقت واضح ہوتی جارہی ہے کہ نر و مادہ ہر چیز میں موجود ہیں، یہ اور بات ہے کہ کہیں ان جوڑوں کا نام نر اور مادہ رکھ لیا جائے، کہیں مثبت (Positive اور منفی Negative) اور کہیں الیکٹرون اور پروٹون اور کہیں نیوٹرون اور پوزیٹرون، بلکہ ایک آیت میں قرآن کریم نے صراحۃً یہ بھی واضح فرمادیا کہ بہت چیزوں میں جوڑوں کا پایا جانا ابھی لوگوں کو معلوم نہیں،

﴿سُبْحَانَ الَّذِيْ خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾

''پاک ہے وہ ذات جس نے ہر چیز کے جوڑے جوڑے پیدا کئے ہیں، اُس پیداوار کے بھی جو زمین اُگاتی ہے، اور خود ان انسانوں کے بھی، اور اُن چیزوں کے بھی جنہیں یہ لوگ (ابھی) جانتے تک نہیں ہیں۔''

حقانیتِ قرآن اور مغرب کے غیر مسلم مصنّفین

ایک زمانہ تھا جب مغربی مصنّفین عیسائیت کے شدید تعصب میں مبتلا ہو کر کھلّم کھلّا یہ کہا

Marfat.com

کرتے تھے کہ قرآن کریم (معاذ اللہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانی بوجھی تصنیف ہے، اور (معاذ اللہ) آپ کا دعوائے نبوّت خود ساختہ تھا، لیکن اب خود مغرب کے غیر مسلم مصنفین کا کہنا یہ ہے کہ پچھلے اہلِ مغرب کا یہ نظریہ محض ایک مُعاندانہ دعویٰ تھا، جس کی پشت پر کوئی دلیل نہیں تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اس کی تکذیب کرتی ہے، عہدِ حاضر کے معروف مستشرق پروفیسر منٹگمری واٹ لکھتے ہیں:

> ''قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں یہ تصوّر عام کیا گیا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک (معاذ اللہ) جھوٹے پیغمبر تھے، جو غلط طور پر یہ دعویٰ کرتے تھے کہ اُن کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے، لیکن قرونِ وسطیٰ کے یہ تصوّرات جو دراصل جنگی پروپیگنڈے کی حیثیت رکھتے تھے، اب آہستہ آہستہ یورپ اور عیسائی دنیا کے ذہنوں سے اُتر رہے ہیں۔''(۱)

پروفیسر واٹ نے بالکل درست کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تکذیب کسی علمی دلیل پر مبنی نہیں تھی، بلکہ یہ اُس پروپیگنڈے کا ایک جُز تھا، جسے مسلمانوں سے لڑنے کے لئے ضروری سمجھا جارہا تھا، انہوں نے خاصی تفصیل کے ساتھ اُن قدیم اہلِ یورپ کی تردید کی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر (معاذ اللہ) جھوٹے دعوے یا جنون یا کسی بیماری کا الزام عائد کرتے تھے، اور بتایا ہے کہ عہدِ حاضر کے مغربی اسکالر روشن دلائل کی وجہ سے ان الزامات کو تسلیم نہیں کرتے، آخر میں وہ لکھتے ہیں:

> ''لہٰذا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں قرونِ وسطیٰ کے اس تصوّر کو تو اب خارج از بحث قرار دیدینا چاہئے، اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک ایسا انسان سمجھنا چاہئے جو پورے خلوص اور نیک نیتی سے وہ پیغامات سُناتے تھے، جن کے بارے میں اُن کا عقیدہ تھا کہ یہ

(۱) Watt: Bell's Interoduction to the Quran Ch.2 P.17

اُن کے پاس خدا کی طرف سے آئے ہیں۔"(۱)

اس اعتراف کے بعد انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ صاف الفاظ میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت و رسالت کا اقرار کرلیا جاتا، لیکن صدیوں سے ذہنوں میں جمے ہوئے تصوّرات آسانی سے نہیں مٹتے، چنانچہ منٹگمری واٹ اور ان کے طرح کے عہدِ حاضر کے دوسرے مصنّفین ایک طرف تو یہ اعتراف کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دعوائے نبوّت میں مخلص تھے، دوسری طرف اپنے مذہب کو علی الاعلان چھوڑ کر اسلام کو اختیار کرلینا اُن کے لئے مشکل ہے، لہٰذا انہوں نے ایک بیچ کی راہ تلاش کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کی ایک عجیب وغریب توجیہ پیش کی ہے،

اُن کا کہنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی درحقیقت کوئی خارجی چیز نہیں، بلکہ (معاذ اللہ) یہ ایک اندرونی کیفیت تھی جو آپؐ کے طویل غور وفکر اور مشاہدات کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی، اور جسے آپؐ نے پوری دیانتداری سے اللہ تعالیٰ کی یا کسی فرشتے کی آواز سمجھا، آپؐ اپنی عمر کے ابتدائی دَور ہی سے اپنی قوم کے مذہب اور اُن کے طور طریقوں سے بیزار تھے، اسی لئے آپ اُن کے طرزِ عبادت کی تقلید کرنے کے بجائے تنہائی میں غور وفکر فرماتے تھے، آپ کا دل اپنی قوم کی گمراہیوں پر کُڑھتا تھا، اور آپؐ اُن کو اس گمراہی سے نکالنے کے طریقے سوچتے تھے، اسی مقصد کے لئے آپ نے غارِ حراء کی تنہائیوں میں کئی کئی دن گذارنے شروع کئے، وہیں پر طویل غور وفکر کے نتیجے میں عقیدۂ توحید پر آپ کا یقین پختہ ہوتا چلا گیا، اور ساتھ ہی یہ داعیہ بھی کہ اس قوم کو بُت پرستی کی گمراہی سے نکال کر توحید کی طرف دعوت دینی چاہئے، غارِ حراء کی اُن تنہائیوں میں جہاں کوئی بات کرنے والا نہیں تھا، یہ تصور آپؐ کے دل ودماغ پر اس قدر محیط ہوگیا کہ آپؐ کو اپنے دل کی یہ آواز ایک خارجی آواز محسوس ہونے لگی، اور اسے آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی یا کسی فرشتے کی آواز سمجھ کر پورے خلوص ودیانت سے نبوّت کا دعویٰ کردیا،

(۱) Watt: Bell's Interoduction to the Quran Ch.2P.18

Marfat.com

یہ ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوّت کی وہ توجیہ جسے آجکل ''دانشورانِ مغرب'' میں قبول عام حاصل ہے، مستشرقین میں سے ایک دو نہیں، بلکہ بیسیوں ''محققین'' اس کے قائل ہیں، یہاں تک کہ بعض مسلمان کہلانے والے افراد بھی اس سے متاثر نظر آتے ہیں، لیکن ذرا غور فرمایئے کہ اس توجیہ کے پیچھے اس کے سوا اور کیا ذہنیت کارفرما ہے کہ ان ''دانشوروں'' نے یہ بات پہلے ہی طے کرلی کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کی تصدیق اُن کے لئے ممکن نہیں، خواہ اُس پر کتنے روشن دلائل قائم ہو جائیں، اور خواہ اس نبوت کی تردید کے لئے کتنی دور از کار، نا قابلِ فہم اور نا قابلِ یقین تاویلات کو اختیار کرنا پڑے، واقعہ یہ ہے کہ پروفیسر واٹ اور عصر حاضر کے دوسرے مستشرقین آپؐ پر نازل ہونے والی وحی کی جو توجیہ کرتے ہیں اس کا کوئی علمی اور عقلی جواب دیتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، تاہم مندرجۂ ذیل حقائق پر غور فرمایئے:

۱...... کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم، جن کے بارے میں خود اُن کا اعتراف یہ ہے کہ بہترین ذہنی اور عملی صلاحیتوں سے مالا مال تھے تیئس سال تک مسلسل اپنی ایک اندرونی کیفیت کو کسی فرشتے کی آواز سمجھتے رہیں اور آخر وقت تک یہ پتہ نہ لگا سکیں کہ اس غیر معمولی کیفیت کی حقیقت کیا ہے، وحی کا نزول آپؐ پر ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ تیئس سال تک سینکڑوں بلکہ شاید ہزاروں مرتبہ ہوتا رہا ہے، کیا اس پورے عرصہ میں (معاذ اللہ) آپؐ اسی مغالطے میں مبتلا رہے؟

۲...... پھر اگر آپؐ پر یہ نام نہاد ''اندرونی کیفیت'' اپنی قوم کو دیکھ کر طاری ہوتی تھی، تو قاعدے کا تقاضا یہ تھا کہ اس کیفیت کے سب سے پہلے تجربے میں انکی گمراہیوں کی تردید اور عقیدۂ توحید کا بیان ہوتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آپؐ پر نازل ہونے والی پہلی وحی میں نہ کفر وشرک کی تردید ہے، نہ عقیدۂ توحید کا ذکر ہے، اور نہ آپ کی بنیادی تعلیمات میں سے کسی تعلیم کا بیان ہے، اس کے بجائے اُس کے الفاظ یہ ہیں:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝

Marfat.com

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ﴿﴾ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿﴾ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ﴿﴾ (العلق: ۱تا۵)

"پڑھو اپنے پروردگار کا نام لے کر جس نے سب کچھ پیدا کیا، اُس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پید کیا ہے، پڑھو، اور تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کرم والا ہے، جس نے قلم سے تعلیم دی، انسان کو اُس بات کی تعلیم دی جو وہ نہیں جانتا تھا۔"

۳...... پھر یہ عجیب بات ہے کہ "یہ کیفیت" ایک مرتبہ پیش آنے کے بعد فوراً ٹھنڈی پڑ جاتی ہے، اور تین سال تک آپؐ کو کوئی آواز سُنائی نہیں دیتی، اس عرصے میں آپ وحی کے انقطاع سے پریشان بھی رہتے ہیں، لیکن تین سال تک مکمل سکوت طاری رہتا ہے، اس کے بعد پھر وحی نازل ہوتی ہے تو اس میں بھی شرک کی واضح تردید نہیں کی جاتی اور نہ اہلِ عرب کی عملی گمراہیوں کا کوئی ذکر ہوتا ہے...... سوال یہ ہے کہ اگر یہ کیفیت آپؐ پر اپنی قوم کی گمراہیوں پر سوچ بچار اور تصورِ توحید کے غلبہ سے پیدا ہوئی تھی تو وحی کے بالکل ابتدائی واقعات میں یہ تصورات کہاں گئے تھے؟ اور تین سال تک ان تصورات کے غلبے میں کوئی آواز کیوں نہیں سُنائی؟

۴...... اگر یہ کوئی "اندرونی کیفیت" تھی تو پوری طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خیالات سے ہم آہنگ ہونا چاہئے تھا، لیکن قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر آپؐ کے ذاتی خیالات کے خلاف ہدایتیں دی گئیں، بلکہ بعض مقامات پر آپ کی ذاتی رائے کی تردید اور اس پر ایک لطیف عتاب بھی موجود ہے، مثلاً:

﴿ لَیْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْهِمْ اَوْ یُعَذِّبَهُمْ ﴾

(آل عمران: ۱۲۸)

"(اے پیغمبر!) تمہیں اس فیصلے کا کوئی اختیار نہیں کہ اللہ ان کی توبہ قبول کرے یا ان کو عذاب دے۔"

اور

Marfat.com

﴿ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ﴾

(الانفال: ٦٧)

''یہ بات کسی نبی کے شایانِ شان نہیں ہے کہ اُس کے پاس قیدی رہیں، جب تک کہ وہ زمین میں (دشمنوں کا) خون اچھی طرح نہ بہا چکا ہو (جس سے ان کا رُعب پوری طرح ٹوٹ جائے)''

اور

﴿ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴾ (التوبۃ:۴۳) وغیرہ۔

(اے پیغمبر!) اللہ نے تمہیں معاف کر دیا ہے، (مگر) تم نے ان کو (جہاد میں شریک نہ ہونے کی) اجازت اس سے پہلے ہی کیوں دے دی کہ تم پر یہ بات کھل جاتی کہ کون ہیں جنہوں نے سچ بولا ہے، اور تم جھوٹوں کو بھی اچھی طرح جان لیتے۔''

۵...... اگر بالفرض مان لیا جائے کہ کسی تصوّر کا شدید غلبہ انسان کو ایک ''خارجی آواز'' کی طرح محسوس ہونے لگتا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ یہ ''خارجی آواز'' جو پیشینگوئی کر دے وہ ہمیشہ سچ نکلے، جو حکم دیدے وہ انجام کار درست ثابت ہو، جو الفاظ بول دے وہ ایسے پتھر کی لکیر بن جائیں کہ دنیا بھر کے ادیب وخطیب اس کے مقابلہ سے عاجز ہو کر بیٹھ جائیں، یہاں تک کہ اسی کلام کی بنیاد پر پورے جزیرۂ عرب میں ایسا انقلاب عظیم برپا ہو جائے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ہے۔

۶...... اگر تسلیم کر لیا جائے کہ تصوّرات کے غلبے سے محسوس ہونے والی ''آواز'' کوئی حقیقت رکھتی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اسی شخص کے علم وتصوّر کا ایک عکس ہو سکتی ہے جسے وہ سُنائی دے رہی ہے، اور جو بات پہلے سے اُس کے علم وتصور میں نہ ہو وہ اس ''آواز'' سے معلوم نہیں ہو سکتی، لیکن قرآن کریم کی تلاوت کر کے دیکھئے اس میں کتنی بے شمار باتیں ایسی ہیں جو وحی سے

پہلے آپؐ کو معلوم نہیں تھیں، وحی کے اس کلام نے پہلی بار آپ کو ان کا علم عطا کیا، مثلاً آیتِ ذیل پر غور فرمایئے:

﴿مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾ (شوریٰ: ۵۲)

"تمہیں اس سے پہلے نہ یہ معلوم تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے، اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے، لیکن ہم نے اس (قرآن) کو ایک نور بنایا ہے جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔"

۷۔۔۔۔۔ بالخصوص پچھلی امتوں کے اکثر واقعات وہ ہیں جن کے بارے میں خود قرآن کریم نے بھی تصریح کی ہے، اور تاریخی اعتبار سے بھی یہ امر ناقابلِ انکار ہے کہ آپؐ نزولِ وحی سے قبل اُن سے واقف نہیں تھے، قرآنِ کریم نے پہلی بار آپؐ کو اُن کا علم عطا کیا، مثلاً سورۂ ہود میں حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ بیان کرنے کے بعد قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا﴾ (ھود: ۴۹)

"(اے پیغمبر!) یہ غیب کی کچھ باتیں ہیں جو ہم تمہیں وحی کے ذریعے بتارہے ہیں، یہ باتیں نہ تم اس سے پہلے جانتے تھے، نہ تمہاری قوم"

اور سورۂ یوسف کے آخر میں ارشاد ہے:

﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْآ اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ﴾ (یوسف: ۱۰۲)

"(اے پیغمبر!) یہ تمام واقعہ غیب کی خبروں کا ایک حصہ ہے جو ہم تمہیں وحی کے ذریعے بتارہے ہیں، اور تم اُس وقت ان (یوسف کے بھائیوں) کے پاس موجود نہیں تھے جب انہوں نے سازش کر کے اپنا فیصلہ پختہ کرلیا تھا (کہ یوسف کو کنویں میں ڈالیں گے)۔"

Marfat.com

منٹگمری واٹ اور اُن کے دوسرے ہم نوا یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ آپؐ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور:

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دیانت واخلاق پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔''(۱)

لہٰذا قرآن کریم کی کسی آیت میں اُن کے نزدیک بھی غلط بیانی ممکن نہیں، اب سُوال یہ ہے کہ اگر یہ ''وحی'' کوئی خارجی ذریعہ علم نہیں تھا تو اس کے ذریعے آپؐ کو پچھلے انبیاء علیہم السلام کے وہ واقعات کیسے معلوم ہوگئے جو پہلے معلوم نہیں تھے؟

۸......اوپر ہم نے صرف وہ باتیں پیش کی ہیں جو ایک عام آدمی بھی معمولی غور وفکر سے سمجھ سکتا ہے اور جو قرآن کریم کی سرسری تلاوت سے بھی واضح ہوجاتی ہیں، اور اگر حدیث کی ان روایات کو بھی پیش نظر رکھا جائے جن میں نزول وحی کی کیفیات اور اس کا تدائی واقعات بیان کئے گئے ہیں تو منٹگمری واٹ وغیرہ کی یہ خیالی تاویلات خود بخود پادر ہَوا ہوجاتی ہیں، اُن میں سے کچھ روایات پیچھے ''تاریخ نزولِ قرآن'' کے تحت بیان ہوچکی ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ کتاب

بعض مغربی مصنفین نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ آپؐ پر نازل ہونے والی ''وحی'' درحقیقت آپؐ ہی کی ایک ''اندورونی کیفیت'' تھی، جو تصورات کے غلبے سے پیدا ہوئی تھی، یہ جتانے کی کوشش کی ہے کہ آپؐ نزولِ وحی کے آغاز سے پہلے پچھلی اُمتوں کے واقعات سے واقف تھے، اور وہی واقعات اُس ''خاص کیفیت'' کے وقت آپ کی زبان پر آگئے،

اُن کا کہنا یہ ہے کہ آپؐ نے پچھلی اُمتوں کے یہ واقعات (معاذ اللہ) عرب کے یہود ونصاریٰ سے سُنے تھے، اس سلسلے میں خاص طور پر بُحیرا اور نسطورا راہب کے نام لئے جاتے ہیں، (۲) جن سے سفرِ شام کے وقت آپ کی ملاقات کا قصہ سیرت وتاریخ کی مختلف کتابوں

(۱) Watt: Bell's Interoduction to the Quran Ch.2 P.25

(۲) مثلاً دیکھئے جے، ایم، راڈویل (Rodwell) کا انگریزی ترجمہ قرآن مقدمہ، ص ۸ مطبوعہ لندن ۱۹۵۳ء

میں مذکور ہے، بعض مغربی مصنفین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ راہب آریوسی فرقے سے تعلق رکھتے تھے، جو توحید کا قائل تھا، انہی راہبوں سے آپؐ نے (معاذ اللہ) توحید کا تصور اخذ کیا، انہی سے پچھلی کتابوں کا علم حاصل کیا، اور انہی سے پچھلی اُمتوں کے واقعات سیکھے،

لیکن اگر انصاف و دیانت دنیا سے بالکل اُٹھ ہی نہیں گئی تو ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی یہ باور نہیں کرسکتا کہ سفرِ شام کے دَوران اس مختصر سی ملاقات میں ان راہبوں نے اپنے سینے کی تمام معلومات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اُنڈیل دی ہوں گی، اور آپؐ نے اُن سب کو راتوں رات جذب کر کے ایک انقلاب آفریں دین کی بنیاد ڈال دی ہوگی، اوّل تو یہ دعویٰ ہی سرے سے بلادلیل بلکہ بے بنیاد ہے کہ بحیرا اور نسطورا آریوسی فرقے سے تعلق رکھتے تھے، کسی ضعیف سے ضعیف روایت میں بھی اس کی کوئی صراحت نہیں ملتی، اور مل بھی کیسے سکتی ہے جبکہ آریوسی فرقے کو تو چوتھی صدی عیسوی ہی میں بدعتی اور ملحد (Heretic) قرار دے دیا گیا تھا، اور اس کے آرلوسی کا نام لینا بھی قابلِ تعزیر جرم قرار پا گیا تھا، اتھاناسیوس (Athanasius) اور اُس کے ہم نواؤں نے اُس فرقے کا بیج مارنے میں کوئی کسر اٹھانہیں رکھی، اس بیکس فرقے میں اتنی سکت کہاں تھی کہ وہ ساتویں صدی عیسوی تک سانس لے سکتا؟ اور اگر کوئی بچا کھچا فرد باقی ہوتا بھی تو اس کو یہ جرأت کیسے ہوسکتی تھی کہ وہ بصریٰ جیسے شہر میں ایک خانقاہ کا سربراہ بن بیٹھتا؟

دوسرے جن روایتوں میں یہ مذکور ہے کہ سفرِ شام کے دوران آپ کی ملاقات ان راہبوں سے ہوئی تھی، انہی روایات میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ انتہائی مختصر سرسری اور ضمنی ملاقات تھی، جس میں کسی تعلیم و تعلّم کی گنجائش ممکن ہی نہیں، حیرت ہے اُن لوگوں کی عقلوں پر جو ایسی مضحکہ خیز باتوں پر ایمان لا سکتے ہیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کو تسلیم کرنا اُن کے لئے مشکل ہے،

یہاں ہم بحیرا راہب سے آپ کی ملاقات کی مفصّل ترین روایت نقل کرتے ہیں جس سے حقیقت حال واضح ہوسکے گی،

Marfat.com

جامع ترمذیؒ میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ ابوطالب قریش کے کچھ مشائخ کے ساتھ شام کے لئے روانہ ہوئے، شام میں جس جگہ جاکر اُترے وہاں ایک راہب رہتا تھا، اس سے پہلے بھی اس راہب کے پاس سے گزر ہوتا تھا لیکن وہ کبھی ملتفت نہیں ہوتا تھا، اِس مرتبہ جب یہ تجارتی قافلہ وہاں جاکر اُترا، تو راہب خلافِ معمول اپنی خانقاہ سے نکل کر آیا، اور متجسسانہ نظروں سے ایک ایک کو دیکھنے لگا، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑلیا، اور کہا:

هٰذَا سَيِّدُ الْعَالَمِيْنَ، هٰذَا رَسُوْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، يَبْعَثُهُ اللّٰهُ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ،

"یہی ہے تمام جہانوں کا سردار، یہی ہے پروردگارِ عالم کا رسولؐ جسکو اللہ تمام کائنات کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گا۔"

سردارانِ قریش نے اس راہب سے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ راہب نے کہا جس وقت آپ سب گھاٹی سے نکلے تو کوئی شجر و حجر ایسا نہیں تھا جس نے اس کو سجدہ نہ کیا ہو، اور شجر و حجر نبی ہی کے لئے سجدہ کر سکتے ہیں، اس کے علاوہ میں آپؐ کو مُہر نبوت سے بھی پہچانتا ہوں جو سیب کے مشابہ آپؐ کے شانے کے نیچے واقع ہے،

راہب یہ کہہ کر واپس ہو گیا، اور پورے قافلے کے لئے کھانا تیار کرایا، جب کھانے کے لئے سب حاضر ہوئے تو آپؐ موجود نہ تھے، راہب نے دریافت کیا کہ آپؐ کہاں ہیں؟ معلوم ہوا کہ اُونٹ چَرانے گئے ہوئے ہیں، آدمی بھیج کر آپؐ کو بُلایا، جس وقت آپؐ تشریف لائے تو ایک ابر آپؐ پر سایہ کئے ہوئے تھا، جب آپؐ اپنی قوم کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ لوگ آپؐ سے پہلے درخت کے سائے میں جگہ لے چکے ہیں، اب کوئی جگہ سایہ کی باقی نہیں رہی، آپؐ ایک جانب کو بیٹھ گئے، بیٹھتے ہی درخت کا سایہ آپؐ تک جھک گیا، راہب نے کہا کہ درخت کے سائے کو دیکھو، وہ کس طرح آپ کی طرف جھکا ہوا ہے، اور پھر کھڑے ہو کر قریش کے لوگوں سے کہا کہ آپ ان کو روم کی طرف نہ لے جائیں، رُومی اگر ان کو دیکھ لیں گے

Marfat.com

تو آپؐ کی صفات اور علامات سے آپؐ کو پہچان کر قتل کر ڈالیں گے، اثناء کلام میں راہب کی نگاہ اٹھی تو دیکھا کہ روم کے سات آدمی کسی تلاش میں اسی طرف آ رہے ہیں، راہب نے پوچھا، تم کس لئے نکلے ہو؟ رومیوں نے کہا کہ ہم اُس نبی کی تلاش میں نکلے ہیں (جس کی توریت وانجیل میں بشارت مذکور ہے) جو اس مہینے میں سفر کے لئے نکلنے والا ہے، ہم نے اپنے آدمی ہر طرف بھیجے ہیں...... راہب نے کہا اچھا یہ تو بتلاؤ کہ جس شے کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمالیا ہو، کیا اس کو کوئی ٹلا سکتا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں، اس کے بعد رومیوں نے بحیرا راہب سے عہد کیا کہ وہ اب اس نبی کے درپے نہیں ہوں گے، اور وہیں راہب کے پاس ٹھہر گئے، راہب نے پھر قریش سے قسم دے کر پوچھا کہ تم میں سے اُن کا ولی کون ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ ابوطالب ہیں، اس کے بعد راہب مسلسل ابوطالب کو قسمیں دیتا رہا، کہ تم ان کو ضرور واپس بھیج دو، یہاں تک کہ ابوطالب نے آپؐ کو واپس بھیج دیا(۱) بعض علماء کو اس روایت کی صحت میں بھی کلام ہے، (۲) لیکن اگر یہ صحیح ہو تب بھی اس میں خوردبین لگا کر بھی اس بات کی کوئی گنجائش نہیں نظر آتی کہ آپؐ نے بحیرا راہب سے کچھ واقعات سیکھے ہوں گے، یہ ایک انتہائی مختصر ملاقات تھی، جو چند گھنٹوں سے زیادہ آگے نہیں بڑھی، اور یہ ملاقات بھی اُس وقت ہوئی جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عُمر کل بارہ تیرہ سال تھی، (۳) کیا یہ بات کوئی صحیح العقل انسان باور کر سکتا ہے کہ اس کم سنی میں چند گھنٹوں کی اس مختصر ملاقات نے پچھلی امتوں کا ایسا گہرا علم آپؐ کو عطا کر دیا ہو کہ آپؐ اہلِ

---

(۱) جامع ترمذیؒ ابو اب المناقب باب ماجاء فی بدء نبوة النبی صلی الله علیه وسلم، ص ۲۲۵ ج ۲، طبع قرآن محل کراچی،

(۲) چنانچہ حافظ ذہبیؒ نے اسے ناقابلِ اعتماد قرار دیتے ہوئے لکھا ہے، اظنه موضوعاً فبعضهٔ باطل (تلخیص المستدرك، کتاب التاریخ، دلائل النبوة ص ۶۱۵ ج ۲ مطبوعہ دکن ۱۳۴۰ھ) لیکن حافظ ابن حجرؒ وغیرہ نے اسے درست قرار دیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں "رجالهٔ ثقات" (بحوالہ زرقانیؒ شرح المواهب ص ۱۹۶ ج ۱ طبع ازہریہ مصر، ۱۳۲۵ھ)

(۳) اس سفر کے بارے میں تین روایتیں ملتی ہیں، ایک میں آپؐ کی عمر کل نو سال بیان کی گئی ہے، اور علامہ حلبیؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے، (السیرة الحلبیه ص ۱۱۳ ج ۱ مصطفیٰ البابی ۱۳۴۹ھ) اور حافظ ابن عبدالبرؒ نے تیرہ سال کی روایت کو اختیار کیا ہے، لیکن علامہ زرقانیؒ فرماتے ہیں کہ اکثر علماء کا رجحان اس طرف ہے کہ اس وقت آپؐ کی عمر کل بارہ سال تھی (زرقانیؒ: شرح المواهب ص ۱۹۳ ج ۱)

کتاب کو چیلنج کر کے اُن کی کتابوں میں تحریف کی وضاحت فرمائیں، اور اُن کی غلطیاں واضح کریں؟

اور نسطورا راہب سے ملاقات کا قصہ تو بحیرا کے قصہ سے بھی زیادہ مختصر ہے، اور اگر کوئی شخص اُس کی بنیاد پر یہ کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ کتاب سے معلومات حاصل کی تھیں تو سوائے تعصب اور اسلام دشمنی کے اس کی کوئی توجیہ ممکن ہی نہیں،

پھر سوچنے کی بات ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ اہلِ کتاب سے یہ واقعات سُن رکھے تھے، تو وہ کفارِ مکہ جو آپ کی تردید کے لئے ہر رائی کا پہاڑ بنانے کے لئے تیار تھے، اس موقع پر کیوں خاموش رہے؟ انہوں نے یہ دعویٰ کیوں نہیں کیا کہ آپؐ کو یہ باتیں فلاں فلاں اہلِ کتاب نے سکھائی ہیں، انتہاء یہ ہے کہ آپ کبھی کبھی مکہ مکرمہ کے ایک لوہار کے پاس کھڑے ہو جایا کرتے تھے، محض اتنی سی بات سے کفارِ مکہ نے یہ شہرت دیدی کہ یہ لوہار آپؐ کا معلّم ہے، جس کی تردید قرآن کریم نے اس طرح فرمائی کہ:

﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ لِسَانُ الَّذِىْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِىٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِىٌّ مُّبِيْنٌ﴾ (النحل:۱۰۳)

(اے پیغمبر!) ہمیں معلوم ہے کہ یہ لوگ (تمہارے بارے میں) کہتے ہیں کہ: ''ان کو تو ایک انسان سکھاتا ہے پڑھاتا ہے'' (حالانکہ) جس شخص کا یہ حوالہ دے رہے ہیں، اُس کی زبان عجمی ہے، اور یہ (قرآن کی زبان) صاف عربی زبان ہے۔''

لیکن ان میں سے کسی نے کبھی یہ اعتراض نہیں کیا کہ آپؐ نے یہ علم بحیرا، نسطورا یا ورقہ بن نوفل سے حاصل کیا ہے، اس سے صاف واضح ہے کہ یہ ایسا بے تکا اعتراض تھا جسے آپؐ کے کٹر مخالف ہم عصروں نے بھی زبان سے نکالنا پسند نہیں کیا،

قرآن کریم پر چند اعتراضات

بعض مستشرقین نے قرآن کریم کے بیان کئے ہوئے بعض واقعات پر اعتراضات کئے

Marfat.com

ہیں، اور اُن سے یہ جتانے کی کوشش کی ہے کہ (معاذ اللہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعات اہلِ کتاب کے کسی عالم سے زبانی سُنے تھے، جنہیں بیان کرنے میں مغالطہ ہو گیا، مثلاً:

حضرت مریمؑ کے والد کا نام

مثلاً انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ایک اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ: مریم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن کا نام بھی تھا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا بھی، اور اوّل الذکر عمران کی بیٹی تھیں قرآن میں (معاذ اللہ) مغالطے کی بناء پر مؤخر الذکر کو بھی "بنت عمران" قرار دیدیا، (۱)

مقام افسوس ہے کہ یہ بے سروپا اعتراض برٹانیکا جیسی عالمی شہرت کی کتاب میں درج کرتے ہوئے بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی گئی، اگر "برٹانیکا" کا مقالہ نگار کسی یقینی دلیل سے یہ بھی ثابت کر دیتا کہ حضرت مریمؑ کے والد کا نام "عمران" نہیں تھا، تب تو یہ اعتراض کسی درجے میں قابل لحاظ ہو سکتا تھا، لیکن حالت یہ ہے کہ اگر خود انہی سے پلٹ کر یہ پوچھ لیا جائے کہ پھر حضرت مریمؑ کے والد کا نام عمران کے سوا اور کیا تھا؟ تو اس کے جواب میں ان کے پاس خاموشی کے سوا کچھ نہیں ہوگا، انتہاء یہ ہے کہ بائبل میں بھی اُن کے والد کا کوئی نام مذکور نہیں، اور خود برٹانیکا کے مقالہ "مریم" میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ:

> "حضرت مریمؑ کے والدین کے بارے میں پہلی صدی عیسوی کی کسی تاریخی دستاویز میں کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔"

اس طرف یہ لاعلمی اور دوسری طرف یہ دعویٰ کہ قرآن کریم میں حضرت مریمؑ کے والد کا نام (معاذ اللہ) مغالطے پر مبنی ہے، کیا "برٹانیکا" کے مقالہ نگار یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ایک مرتبہ کسی شخص کا نام "عمران" رکھا جا چکا ہو، تو اب دنیا میں کوئی شخص اس کا ہم نام پیدا نہیں ہو سکتا؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ تو قرآن کریم کی حقانیت کی واضح دلیل ہے کہ وہ اُن تاریخی حقائق کی علی الاعلان نقاب کشائی کر رہا ہے جو سات سو سال سے نامعلوم تھے، اور اس خود اعتمادی اور

---

(۱) انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ص ۴۸۳ ج ۱۳ مطبوعہ ۱۹۵۰ء مقالہ "قرآن"

(۱) برٹانیکا، ص ۹۹۹ ج ۱۴ مقالہ "مریم"

Marfat.com

دھڑلے کے ساتھ کر رہا ہے کہ چودہ سو سال سے اس کے بدترین دشمن بھی اسے غلط قرار دینے کی جرأت نہیں کر سکے،

پھر یہ بات صرف حضرت مریمؑ کے والد کے نام ہی تک محدود نہیں، بلکہ حضرت مریمؑ کی پیدائش، اُن کی تربیت، اُن کے بچپن اور اُن کی ابتدائی زندگی کے تمام حالات کے بارے میں تمام ''مستند'' عیسائی مآخذ بالکل خاموش تھے، یہاں تک کہ چاروں معتبر اناجیل میں بھی ان حالات کا تذکرہ موجود نہیں ہے، یہ قرآن کریم ہی تھا جو پہلی بار ان واقعات کو منظر عام پر لایا، شروع شروع میں عیسائی دنیا ان ''انکشافات'' پر بھی اعتراضات کرتی رہی، مگر اب خود عیسائیت کی ایسی قدیم کتابیں دریافت ہو رہی ہیں، جن میں تقریباً قرآن کریم کے بیان کردہ یہی واقعات بیان کئے گئے ہیں (۱) حیرت ہے کہ قرآن کریم کے ان واضح معجزات کو دیکھ کر بھی ان ''دانشوروں'' کو قرآن کریم پر یہ اعتراض ہے کہ حضرت مریمؑ کے والد کا نام کسی عیسائی مآخذ میں نہیں ملتا؟

فرعون کا وزیر ہامان

''برٹانیکا'' کے مقالہ ''قرآن'' ہی میں ایک اعتراض یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ قرآن کریم نے فرعون کے ایک وزیر کا نام ہامان ذکر کیا ہے، حالانکہ اس نام سے فرعون کے کسی وزیر کا نام بائبل کے عہد نامۂ قدیم میں نہیں ملتا، مقالہ نگار نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ دراصل ہامان شاہ اسویرس کا وزیر تھا، جس کا ذکر بائبل میں موجود ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ یہ واقعات زبانی سیکھے تھے، اس لئے آپؐ نے (معاذ اللہ) مغالطے سے یہ نام فرعون کے وزیر کی طرف منسوب کر دیا، (۲)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی انتہائی بے سروپا بات ہے، اور اسی طفلانہ مفروضے پر مبنی ہے کہ دنیا میں ایک نام کے دو انسان نہیں پائے جا سکتے، پھر واقعہ یہ ہے کہ اسویرس کے جس نام

(۱) ملاحظہ ہو ڈکشنری آف دی بائبل از ہیٹنگز، ص ۲۸۸ ج ۳،

(۲) برٹانیکا ص ۸۴۳ ج ۱۳ مقالہ ''قرآن''

نہاد وزیر کا ذکر "برٹانیکا" کے مقالہ نگار نے کیا ہے اس کا قصہ صرف بائبل کی ایک مشتبہ کتاب (Apocryphal book) آستر میں مذکور ہے، اس کتاب کو پروٹسٹنٹ فرقہ معتبر نہیں مانتا، چنانچہ مروّجہ پروٹسٹنٹ انجیلوں میں یہ کتاب موجود نہیں ہے، البتہ کیتھولک فرقہ اسے مستند مانتا ہے، اس مشکوک کتاب میں جس ہامان یا آمان (۱) کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ شاہ اسویرس کا وزیر نہیں بلکہ صدرِ دربار تھا (۲) اور اس کا جو قصہ اس کتاب میں مذکور ہے اسے ہامان کے قرآنی واقعے سے کوئی دُور کی نسبت بھی نہیں، قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے کہ فرعون نے ہامان کو یہ حکم دیا تھا کہ اس کے لئے ایک اونچا محل تعمیر کرائے، تاکہ اس پر چڑھ کر وہ موسیٰؑ کے خدا کو جھانک سکے، نیز قرآن کریم ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہامان آخر وقت تک فرعون کا مُنہ چڑھا وزیر رہا، اور بالآخر اسی کے ساتھ غرق ہوا، اس کے برعکس کتاب استر میں ہامان (یا آمان) کی طرف اس نوعیت کا کوئی قصہ منسوب نہیں کیا گیا کتاب آستر کا ہامان بخت نصر کے واقعے کے بعد کا ہے، اور اس کا قصہ صرف اتنا ہے کہ ایک اتفاقی واقعہ کی بناء پر صرف مختصر عرصہ کے لئے بادشاہ اسویرس کا تقرب حاصل کرتا ہے، لیکن اسی دوران وہ یہودیوں کے قتل عام کا حکم جاری کروادیتا ہے جس سے بادشاہ کی یہودی ملکہ آستر اس کی دشمن ہو جاتی ہے، اور انجام کار بادشاہ اُسے سُولی پر لٹکا کر اس کی جگہ ایک یہودی مرد کے کو نامزد کر دیتا ہے (۳)

جس شخص نے آستر کی کتاب کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہو وہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ آستر کے اس قصے کو ہامان کے قرآنی واقعے سے دور دراز کا بھی تعلق نہیں، اگر واقعۃً ہامان کے تذکرے میں آستر والے ہامان سے اشتباہ لگا ہوتا تو دونوں قصوں میں کہیں تو کوئی اتفاق ہونا چاہئے تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ دونوں میں مطابقت کی کوئی ادنیٰ جھلک بھی نہیں پائی جاتی ہامان کا جو واقعہ قرآن کریم نے بیان کیا ہے وہ آستر یا بائبل کی کسی کتاب میں موجود نہیں ہے، اور آستر میں جو قصہ منقول ہے وہ نہ صرف قرآن کریم میں بلکہ لاکھوں احادیث کے ذخیرے میں بھی کہیں نہیں

(۱) کتاب آستر کے بعض نسخوں میں اس کا نام ہامان اور بعض میں آمان یا ایمان (Aman) مذکور ہے،
(۲) دیکھئے آستر ۳:۱،
(۳) ملاحظہ ہو آستر ۳:۱ و ۸ اور ۷:۶ و ۱۰ اور ۸:۲ (ناکس ورژن مطبوعہ میکملن لندن ۱۹۶۳ء

Marfat.com

ملتا، جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ وہ کبھی آپ کے علم میں آیا تھا،

پھر عجیب بات یہ ہے کہ دو ہمنام شخصوں کو دیکھ کر اشتباہ لگنے کا یہ فلسفہ عہدِ حاضر کے عیسائی اور یہودی مستشرقین کو ہمیشہ صرف قرآن اور اسلام ہی کے معاملات میں یاد آتا ہے، بائبل میں جو سینکڑوں ہم نام انسانوں کا ذکر ہے اُن کے بارے میں انہیں کبھی اس قسم کے خیالات نہیں ستاتے؟

Marfat.com

باب ہشتم

مضامین قرآن (۱)

قرآن کریم کے مضامین پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ تمام مضامین چار بڑے عنوانات پر منقسم ہیں، اور قرآن کریم کی ہر آیت اِن میں سے کسی ایک عنوان کے تحت ضرور آتی ہے:

(۱) عقائد (۲) احکام (۳) قصص (۴) امثال

عقائد (ایجابی پہلو)

قرآن کریم میں بنیادی طور پر تین عقائد کو ثابت کیا گیا ہے، توحید، رسالت، اور آخرت،

توحید کا مطلب یہ ہے کہ انسان کائنات کے ذرّے ذرّے کو صرف ایک ذات کی مخلوق سمجھے، اسی کو پوجے، اُسی کو چاہے، اُسی سے ڈرے، اُسی سے مانگے، اور دل میں یہ یقین رکھے کہ اس بیکراں کائنات کا ہر ذرّہ اسی کے قبضہ قدرت میں ہے، اور کوئی دوسرا اس کی توفیق کے بغیر اُسے اِدھر سے اُدھر ہلا بھی نہیں سکتا،

رسالت کا مطلب یہ ہے کہ وہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپؐ کے تمام

(۱) یہ مضمون احقر نے اس کتاب کی تالیف سے گیارہ سال پہلے ۱۳۸۳ھ میں لکھا تھا، اور اس وقت ماہنامہ "بینات" وغیرہ میں شائع بھی ہوا تھا، اب اُسے معمولی حذف واضافہ کے بعد اس کتاب کا جز بنا رہا ہوں، م، ت، ع،

Marfat.com

پیش رو پیغمبروں کو خدا کا سچا رسول سمجھے، جس بات کو وہ حق کہیں اسے حق سمجھے، اور جو بات اُن کے نزدیک باطل ہو اُسے باطل ٹھہرائے،

آخرت کا مطلب یہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد ایک ایسی زندگی پر ایمان رکھے، جو ابدی ہوگی اور اس میں ہر شخص کو اُن اعمال کا بدلہ دیا جائے گا، جو اس نے اپنی دنیوی زندگی میں کئے ہیں اگر اس نے اچھے کام کئے ہوں گے تو وہ جنت کی سرمدی نعمتوں کا حق دار ہوگا، اور اگر اس نے بُرے کام کر کے اپنی دنیوی عمر کو ضائع کیا ہے تو وہ دوزخ کے دائمی عذاب کا مستحق ہوگا،

ان تین بنیادی عقائد کو ثابت کرنے کے لئے قرآن کریم نے انواع واقسام کے دلائل ذکر فرمائے ہیں، عقلی طور پر دلائل کی چار قسمیں ہیں، کسی چیز کو ثابت کرنے کے لئے یا تو انسان کسی ایسی اتھاریٹی کا حوالہ دیتا ہے جو اپنے مخالف کے نزدیک بھی واجب التسلیم ہو، یہ دلیل نقلی ہوتی ہے، یا پھر وہ منطقی انداز سے اپنے دعوے پر دلیل لاتا ہے یہ منطقی دلیل ہے، یا وہ اپنے مخالف کو ایسی چیزیں دکھاتا ہے جس سے ہر انسان اس نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے جہاں مدعی پہنچا ہے، یہ مشاہداتی دلیل ہوتی ہے، یا پھر وہ اپنے نقطہ نظر کو درست ٹھہرانے کے لئے دنیا کے سابقہ واقعات کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ دیکھو ماضی میں میرے نظریئے کے مطابق عمل کیا گیا تھا تو دنیا نے فلاح پائی تھی، اور فلاں قوم نے اس نظریئے کے خلاف عمل کیا تھا تو وہ تباہ ہوگئی تھی، ایسی دلیل کو تجرباتی یا استقرائی دلیل کہا جاتا ہے،

قرآن کریم میں ان میں سے ہر ایک قسم کی دلیل موجود ہے، اُن کی مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

نقلی دلائل

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو ثابت کرنے کے لئے باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ ﴾ (شعراء:۱۹۶)

"اور اس (قرآن) کا تذکرہ پچھلی (آسمانی) کتابوں میں بھی موجود ہے۔"

اس آیت میں باری تعالیٰ نے کافروں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم محمد صلی اللہ علیہ

Marfat.com

وسلم کی رسالت کا انکار کرتے ہو، حالانکہ جو کتابیں تمہارے نزدیک معتبر ہیں یعنی توراۃ وانجیل، خود ان میں (تحریف ہو جانے کے باوجود) آج تک آپ کی رسالت کا ذکر موجود ہے،

یہ اُن پیشینگوئیوں اور خوش خبریوں کی طرف اشارہ ہے جو سابقہ آسمانی کتابوں میں آپؐ سے متعلق دی گئی تھیں، مثلاً توراۃ کے سفر استثناء میں ہے:

> ''خداوند سیناء سے آیا اور شعیر سے اُن پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت اُن کے لئے تھی۔'' (استثناء، ب ۳۳، درس ۲)

ظاہر ہے کہ فاران اور شعیر کے پہاڑوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ (حضرت موسیٰ[۱] کے بعد آنے والے پیغمبروں میں سے) کوئی اور پیغمبر جلوہ گر نہیں ہوا، اور دس ہزار قدسیوں سے صحابہؓ کی جانب اشارہ معلوم ہوتا ہے، کیونکہ فتح مکہ کے موقع پر مسلمانوں کی تعداد دس ہزار تھی[۲] اسی طرح انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا:

> ''جب وہ یعنی روح حق آئیگا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا، اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سُنے گا وہی کہے گا، اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔'' (یوحنا ۱۵:۱۲)

منطقی دلائل

منطقی دلائل کی بھی بہت سی قسمیں ہیں، اور تقریباً ہر قسم قرآن کریم میں موجود ہے، منطقی دلائل کی سب سے پہلی اور سب سے کثیر الاستعمال قسم وہ ہے جسے اصطلاح میں ''قیاس اقترانی'' کہا جاتا ہے، اس قیاس میں عام طور پر ایک کلیہ بیان کیا جاتا ہے، اور اپنے دعوے کو اس کلیہ پر

(۱) مدینہ منورہ کے قریب ایک پہاڑ کا نام ہے، اور فاران مکہ معظمہ کا مشہور پہاڑ ہے، جس کے ایک حصہ پر غارِ حراء ہے، اور اب وہ جبل النور کے نام سے معروف ہے،

(۲) ۱۹۵۸ء کے ایڈیشن میں بائبل کے ''اربابِ حل وعقد'' نے ''دس ہزار'' کے لفظ کو ''لاکھوں'' سے تبدیل کردیا ہے،

Marfat.com

منطبق کیا جاتا ہے، قرآن کریم میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، سورہ طٰہٰ میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کا جادوگروں سے مقابلہ ہوا اور ان کی رسیاں اور لاٹھیاں سانپ بن کر چلنے لگیں تو حضرت موسیٰؑ کو کچھ خوف محسوس ہوا اس وقت اللہ تعالیٰ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، آپ ہی سربلند رہیں گے، یہ لوگ فلاح نہیں پا سکتے، اس لئے کہ:

﴿اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى﴾

(طٰہٰ:۶۹)

''ان کی ساری کاریگری ایک جادوگر کے کرتب کے سوا کچھ نہیں، اور جادوگر چاہے کہیں چلا جائے، اُسے فلاح نصیب نہیں ہوتی۔''

یہ قیاس اقترانی کی وہ مثال ہے، جس میں صغریٰ اور کبریٰ دونوں موجود ہیں، اور ایسی مثالیں تو بے شمار ہیں جن میں کوئی مقدمہ محذوف ہے، مثلاً، کفار کہا کرتے تھے کہ جب انسان کی ہڈیاں خاک بن کر ختم ہو جائیں گی تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ بروز حشر انہیں از سرِ نو زندہ کر دیا جائے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ عین ممکن ہے، کیونکہ:

﴿بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ﴾ (القیامۃ:۴)

''کیوں نہیں؟ جبکہ ہمیں اس پر بھی قدرت ہے کہ اُس کی انگلیوں کے پور پور کو ٹھیک بنا دیں۔''

یہ صغریٰ ہے اور کبریٰ محذوف ہے، کہ جو ذات پوروں کو برابر کرنے پر قدرت رکھتی ہو وہ یقیناً ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہو گی، (کیونکہ پوروں کا برابر کرنا ہڈیوں کو زندہ کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے) کیونکہ انگلیوں کے پوروں پر جو خطوط قدرت نے رکھے ہیں وہ اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کا ایک عجیب وغریب نمونہ ہے کہ کروڑوں بلکہ اربوں اور پدموں انسان جو اس دنیا میں آئے ان میں سے کسی کے یہ خطوط دوسرے سے نہیں ملتے، اس آدھ انچ کی جگہ میں قدرت نے کیا معجزہ رکھا کہ ہر انسان کے خطوط دوسرے سے الگ ہیں، کبھی ایک کے نشانات دوسرے سے نہیں ملتے، اسی لئے قدیم زمانے سے نشانِ انگشت کو

Marfat.com

دستخط کے قائم مقام اس کی خصوصیت کا مظہر مانا گیا ہے، اور آج بھی تمام حکومتوں، عدالتوں میں نشانِ انگشت کو دستخط کے قائم مقام سمجھا جاتا ہے، اس کے امتیاز کو ظاہر کرنے کے لئے باقاعدہ محکمہ قائم ہے، اس لئے جو ہستی پوروں جیسی نازک اور دقیق چیزوں کے اعادہ پر قادر ہے وہ ہڈیوں کو زندہ کرنے پر بھی یقیناً قادر ہے، لہٰذا یوم آخرت کو جھٹلانا بے دلیل بات ہے،

قیاسِ استثنائی

منطقی دلائل میں سے دوسری اہم قسم ''قیاس استثنائی'' ہے، یہ دلیل عام طور پر کسی چیز کی نفی کرنے کے لئے لائی جاتی ہے، اور اس کے دو جز ہوتے ہیں، پہلے جزء یعنی صغریٰ میں جس چیز کی نفی کرنا مقصود ہوتا ہے اسے کسی دوسری چیز پر موقوف کر دیا جاتا ہے، اور دوسرے جُز یعنی کبریٰ میں اُس چیز کی نفی کر دی جاتی ہے، جس پر پہلی چیز کو موقوف کیا گیا تھا، مثلاً مجھے یہ ثابت کرنا ہے کہ اس وقت دن نہیں ہے، تو میں کہوں گا کہ ''اگر دن موجود ہوتا تو سورج موجود ہوتا، لیکن سورج موجود نہیں ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ دن بھی نہیں ہے''...... اس قسم کی دلیلیں بھی قرآن کریم میں بہت ہیں، مثلاً شرک کی نفی اور توحید کا اثبات کرتے ہوئے ارشاد ہے:

﴿ لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ﴾ (الانبیاء:۲۲)

''اگر آسمان اور زمین میں اللہ کے سوا دوسرے خدا ہوتے تو دونوں درہم برہم ہو جاتے (۱)''

یہ صغریٰ ہے اور کبریٰ محذوف ہے، کہ ''لیکن زمین وآسمان فاسد نہیں ہوئے'' لہٰذا معلوم ہوا کہ زمین وآسمان میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی نہیں ہے،

السّبر والتقسیم

منطقی دلائل میں سے ایک اہم دلیل ''السّبر والتقسیم'' بھی ہے جس کے ذریعے مخالف کے دعوے کو رد کیا جا سکتا ہے، اور اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مخالف سے یہ کہا جائے کہ

(۱) اس لئے کہ ایک خدا ایک کام کو چاہتا، دوسرا نہ چاہتا، لڑائی ہوتی اور فساد پھیل جاتا۔

تمہارے دعوے کے ثابت ہونے کے لئے اتنے احتمالات میں سے کوئی ایک احتمال پایا جانا ضروری ہے، اور کیونکہ یہاں اُن میں سے ایک بھی نہیں پایا جا تا رہا ہے، اس لئے معلوم ہوا کہ تمہارا دعویٰ غلط ہے، مثلاً آپ کے مخالف کا دعویٰ ہے کہ زید پاکستان کی اسمبلی کا ممبر ہے، آپ اس سے جواب میں کہیں کہ پاکستان اسمبلی کا ممبر کہلانے کے لئے ضروری ہے کہ یا تو وہ نیشنل اسمبلی کا ممبر ہو یا مغربی پاکستان اسمبلی کا یا مشرقی پاکستان اسمبلی کا، اور چونکہ وہ ان میں سے کسی کا بھی ممبر نہیں ہے لہٰذا اسے پاکستان اسمبلی کا ممبر نہیں کہا جاسکتا، یہ ہے ''اَلسّبر و التقسیم''۔

قرآن کریم میں اس کی بڑی واضح مثال موجود ہے،

کفار حلال جانوروں میں سے بعض اوقات نر جانوروں کو اپنے اوپر حرام کرلیا کرتے تھے، اور بعض مرتبہ ماداؤں کو، اللہ تعالیٰ نے اُن کا رَد کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارے اس حرام قرار دینے کی علّت کیا ہے؟ عقلاً صرف چار صورتیں ممکن ہیں جن کے سوا کوئی پانچویں بات نہیں ہوسکتی، یا تو انہیں اُن کے مذکر ہونے کی بناء پر قرار دیتے ہو، یا مؤنث ہونے کی بناء پر، یا اس لئے کہ وہ رحم جس میں یہ پیدا ہوئے ہیں اس میں کوئی ایسی بات ہے جو سببِ حرمت بن سکتی ہے، یا پھر عقل کی رُو سے کوئی سببِ حرمت سمجھ میں نہیں آتا، بلکہ تم اسے اس لئے حرام سمجھتے ہو کہ خدا نے اسے حرام قرار دیدیا ہے، اور یہ چاروں باتیں ناممکن ہیں، نر ہونے کو سببِ حرمت اس لئے نہیں ٹھہرا یا جاسکتا کہ تم صرف نر جانوروں کو حرام قرار نہیں دیتے، بلکہ بعض اوقات مادہ جانور بھی حرام کرلیتے ہو، دوسری بات یعنی مادہ ہونے کو بھی اس لئے سببِ حرمت نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ تم نر اور مادہ دونوں قسم کے جانوروں کو حرام کرتے ہو، تیسری صورت یعنی اس رحم کا سببِ حرمت ہونا اس لئے ممکن نہیں کہ پھر تو بیک وقت نر اور مادہ دونوں حرام ہونے چاہئیں، حالانکہ تم ایک وقت میں یا نر کو حرام سمجھتے ہو یا مادہ کو، بیک وقت دونوں کو حرام نہیں کرتے چوتھی صورت یعنی محض اللہ کی اطاعت کی بناء پر حرام سمجھنا بھی ممکن نہیں، اس لئے کہ اللہ نے ایسا کوئی حکم نازل نہیں فرمایا،

﴿وَمِنَ الْإِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ قُلْ ءَآلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ أَمِ الْأُنثَيَيْنِ أَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ أَرْحَامُ الْأُنثَيَيْنِ أَمْ كُنتُمْ شُهَدَآءَ

اِذْ وَصّٰکُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ﴾ (الانعام: ۱۴۴)

''اور اسی طرح اُونٹوں کی بھی دو صنفیں (نر اور مادہ اللہ نے) پیدا کی ہیں، اور گائے کی بھی دو صنفیں، ان سے کہو کہ: ''کیا دونوں نروں کو اللہ نے حرام کیا ہے، یا دونوں مادہ کو؟ یا ہر اُس بچے کو جو دونوں نسلوں کی مادہ کے پیٹ میں موجود ہو؟ کیا تم اُس وقت خود حاضر تھے جب اللہ نے تمہیں اِس کا حکم دیا تھا؟ ''۔

یہاں باری تعالیٰ نے بڑے دلنشیں انداز میں ''سبر و تقسیم'' کے ذریعے اُن کے مزعومات کا رَد فرمایا ہے۔

تسلیم

منطقی استدلال کا چوتھا اہم طریقہ ''تسلیم'' ہوتا ہے. یعنی مخالف کی کسی بات یا ادّعاء کو تسلیم کر کے یہ کہنا کہ اس تسلیم کرنے کے بعد بھی مقصود حاصل نہیں ہوتا، کفار کہا کرتے تھے کہ ہمارے پاس کسی انسان کی بجائے کسی فرشتے کو پیغمبر بنا کر کیوں نہیں بھیجا گیا؟ اس کا جواب باری تعالیٰ نے کئی طریقوں سے دیا ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ:

﴿ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا ﴾ (الانعام:۹)

''اور اگر ہم فرشتے ہی کو پیغمبر بناتے، تب بھی اسے کسی مرد ہی (کی شکل میں) بناتے''۔

یعنی اوّل تو کسی پیغمبر کے لئے فرشتہ ہونا کوئی ضروری نہیں، بلکہ بہتر یہی ہے کہ انسان کو اس مقصد کے لئے بھیجا جائے، لیکن اگر بفرضِ محال تمہاری بات تسلیم کر کے فرشتہ بھیج بھی دیا جائے تو بھی تمہارا مقصود اس سے حاصل نہ ہوتا، اس لئے کہ ہم فرشتے کو اس کی اصلی شکل وصورت میں تو بھیج نہیں سکتے، کیونکہ تم میں اس کی اصلی شکل دیکھنے کی تاب ہی نہیں ہے، لامحالہ اُسے مرد کی صورت میں بھیجا جاتا، اس وقت پھر تم اس پر ایمان نہ لاتے،

Marfat.com

انتقال

منطقی انداز کے مناظرہ میں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مدعی نے ایک دلیل پیش کی، مخالف نے کج فہمی کی بناء پر اس پر کوئی اعتراض کر دیا، مدعی ایسے موقع پر اس کا جواب دینے کے بجائے دوسری دلیل پیش کر دیتا ہے جس کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ میری پہلی دلیل غلط تھی، بلکہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ اعتراض حماقت پر مبنی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ تم وہ دلیل سمجھ نہیں سکے، میں دوسری دلیل دیتا ہوں، اسے ''انتقال'' کہا جاتا ہے،

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک واقعہ میں اس کی واضح مثال ہے، آپ کا جب نمرود سے مناظرہ ہوا، آپ نے اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید پر ایک دلیل پیش کی کہ:

﴿رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ﴾ (البقرہ: ۲۵۸)

''میرا پروردگار وہ ہے جو زندگی بھی دیتا ہے اور موت بھی''

اس پر نمرود نے ایک بے گناہ کو پکڑ کر قتل کروا دیا، اور ایک ایسے شخص کو آزاد کر دیا جسے پھانسی کا حکم ہو چکا تھا، اور کہا کہ:

﴿اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ﴾ (البقرہ: ۲۵۸)

''میں بھی زندگی دیتا ہوں اور موت دیتا ہوں۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ احمق زندہ کرنے اور مارنے کا مطلب ہی نہیں سمجھتا اس لئے فوراً ایک اور لاجواب کر دینے والی دلیل پیش کی کہ:

﴿فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ﴾

(البقرہ: ۲۵۸)

''اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تم ذرا اسے مغرب سے تو نکال کر لاؤ''

﴿فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ﴾ (البقرہ: ۲۵۸)

''اس پر وہ کافر مبہوت ہو کر رہ گیا''

Marfat.com

مشاہداتی دلائل

دلائل کی تیسری قسم وہ ہے جو "مشاہدہ" سے تعلق رکھتی ہے، قرآن کریم نے اس قسم کے دلائل زیادہ استعمال فرمائے ہیں، کیونکہ منطقی اور فلسفیانہ موشگافیاں انسان کو خاموش تو کر دیتی ہیں، مگر بسا اوقات اس سے بات دل میں نہیں اُترتی، اور اُن سے شبہات کے مریض کا علاج نہیں ہوسکتا، اور قرآن کریم کا مقصد کسی کو خاموش کرنا نہیں، حق باتوں کو دلوں میں اُتارنا ہے، دوسرے یہ کہ منطقی دلیلیں ایک خاص طبقہ کے لئے مفید ہوتی ہیں، ہر اَن پڑھ اور جاہل کے لئے وہ کارگر نہیں ہوسکتیں، اور "مشاہدہ" وہ مُنھ بولتی چیز ہے جس کی وجہ سے ایک اَلھڑ دیہاتی بھی بے اختیار پکار اُٹھتا ہے کہ:

> اَلْبَعْرَۃُ تَدُلُّ عَلَى الْبَعِیْرِ وَالْاَثَرُ عَلَى الْمَسِیْرِ فَسَمَاءٌ ذَاتُ اَبْرَاجٍ وَاَرْضٌ ذَاتُ فِجَاجٍ کَیْفَ لَا تَدُلُّ عَلَى اللَّطِیْفِ الْخَبِیْرِ،
>
> "جب راستے میں پڑی ہوئی مینگنی اونٹ کا پتہ دیتی ہے، اور نشانِ قدم مسافروں کا، تو یہ بُرجوں والا آسمان اور یہ غاروں والی زمین لطیف وخبیر خالق کا پتہ کیسے نہیں دے گی۔"

اس لئے اللہ تعالیٰ نے زیادہ تر مشاہداتی دلیلیں ہر مرتبہ نئی شان اور نئی ادا سے پیش فرمائی ہیں، ایک مثال سنئے، توحید کے دلائل دیتے ہوئے ارشاد ہے:

> ﴿ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴿ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۚ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ

Marfat.com

خُلَفَاءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۳﴾

(نمل: ۶۰ تا ۶۳)

''بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور تمہارے لئے آسمان سے پانی اُتارا؟...... پھر ہم نے اُس پانی سے بارونق باغ اُگائے، تمہارے بس میں نہیں تھا کہ تم اُن کے درختوں کو اُگا سکتے۔ کیا (پھر بھی تم کہتے ہو کہ) اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا ہے؟ نہیں! بلکہ ان لوگوں نے راستے سے منہ موڑ رکھا ہے۔ بھلا وہ کون ہے جس نے زمین کو قرار کی جگہ بنایا، اور اُس کے بیچ بیچ میں دریا پیدا کئے، اور اُس (ٹھہرانے) کیلئے (پہاڑوں کی) میخیں گاڑ دیں، اور دو سمندروں کے درمیان ایک آڑ رکھ دی؟ کیا (پھر بھی تم کہتے ہو کہ) اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا ہے؟ نہیں! بلکہ ان میں سے اکثر لوگ حقیقت سے ناواقف ہیں۔ بھلا وہ کون ہے کہ جب کوئی بے قرار اُسے پکارتا ہے تو وہ اُس کی دُعا قبول کرتا ہے، اور تکلیف دُور کر دیتا ہے، اور جو تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے؟ کیا (پھر بھی تم کہتے ہو کہ) اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا ہے؟ نہیں! بلکہ تم بہت کم نصیحت قبول کرتے ہو۔ بھلا وہ کون ہے جو خشکی اور سمندر کے اندھیروں میں تمہیں راستہ دِکھاتا ہے، اور جو اپنی رحمت (کی بارش) سے پہلے ہوائیں بھیجتا جو تمہیں (بارش کی) خوشخبری دیتی ہیں؟ کیا (پھر بھی تم کہتے ہو کہ) اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا ہے؟ (نہیں! بلکہ) اللہ اُس شرک سے بہت بالا و برتر ہے جس کا ارتکاب یہ لوگ کر رہے ہیں۔''

یعنی جو ذات اتنے اہم کام سرانجام دیتی ہے اور اس کے سوا کوئی یہ کام نہیں کر سکتا، تو لامحالہ

اسی کو عبادت کے لئے مخصوص کرنا چاہئے، اور دوسرے کو اس کا شریک بنانا بدترین حماقت ہے، پھر سوچنے کی بات ہے کہ جو ذات تنہا (۱) اتنے عظیم کام انجام دیتی ہے اسے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے کسی ساتھی کی ضرورت کیوں ہو؟

ایک اور جگہ یوم آخرت کا اثبات کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿اَفَلَمْ يَنْظُرُوْا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَالَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۞ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۞ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۞ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۞ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۞ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۭ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ﴾ (ق: ۶ تا ۱۱)

”بھلا کیا انہوں نے اپنے اُوپر آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اُسے کیسے بنایا ہے؟ اور ہم نے اُسے خوبصورتی بخشی ہے، اور اُس میں کسی قسم کے رخنے نہیں ہیں، اور زمین ہے کہ ہم نے اُسے پھیلا دیا ہے، اور اُس میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیئے ہیں، اور اُس میں ہر طرح کی خوشنما چیزیں اُگائی ہیں، تاکہ وہ اللہ سے لَو لگانے والے ہر بندے کے لئے بصیرت اور نصیحت کا سامان ہو، اور ہم نے آسمان سے برکتوں والا پانی اُتارا، پھر اُس کے ذریعے باغات اور وہ اناج کے دانے اُگائے جن کی کٹائی ہوتی ہے، اور کھجور کے اُونچے اُونچے درخت جن میں تہہ بر تہہ خوشے ہوتے ہیں! تاکہ ہم بندوں کو رِزق عطا کریں، اور (اس طرح ہم نے اُس پانی سے ایک مردہ پڑے ہوئے شہر کو زندگی دے دی، بس اسی طرح (انسانوں کا قبروں سے) نکلنا بھی ہوگا۔“

---

(۱) کفارِ عرب جانتے تھے کہ یہ کام اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے، زمین و آسمان اسی نے پیدا کیے ہیں، مگر وہ دنیوی بادشاہوں پر قیاس کرکے یہ سمجھتے تھے کہ اس نے ان کے انتظام کے لئے معاذ اللہ اپنے مددگار رکھے ہوئے ہیں، ۱۲م، ت۔

Marfat.com

قرآن کریم میں انسانی جسم ونفس، کائناتی حقائق، فلکیات، نباتات اور ارضیات سے متعلق جو باتیں بیان ہوئی ہیں وہ زیادہ تر اسی قسم کے دلائل کے ضمن میں آئی ہیں، اور جہاں جہاں آفاق و کائنات پر غور کرنے کی تاکید کی گئی ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ اِنسان اُس کائنات کے اسرار و عجائبات پر غور کر کے اس کے بنانے والے کی قدرت کاملہ کا استحضار پیدا کرے، اور بالآخر اُسی کے آگے سجدہ ریز ہو جائے، اس ضمن میں قرآن کریم نے بہت سے سائنٹفک حقائق کی نقاب کشائی بھی فرمادی ہے، لیکن اس قسم کی تمام باتوں کو قرآن کے پورے سیاق (Context) میں دیکھنا چاہئے، اُسے ایک مستقل سائنس کی کتاب سمجھنے سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوسکتی ہیں،

تجرباتی دلائل

قرآن کریم نے اقوام سابقہ کے تجربات کی طرف توجہ دلائی ہے، چنانچہ وہ جگہ جگہ ارشاد فرماتا ہے:

﴿اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ﴾ (روم:۹)

"کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں، تا کہ وہ دیکھتے کہ ان سے پہلے جو لوگ تھے، اُن کا انجام کیسا ہوا؟ وہ طاقت میں ان سے زیادہ مضبوط تھے، اور اُنہوں نے زمین کو بھی جوتا تھا، اور جتنا اِن لوگوں نے اُسے آباد کیا ہے، اُس سے زیادہ اُنہوں نے اُس کو آباد کیا تھا، اور اُن کے پاس اُن کے پیغمبر کھلے کھلے دلائل لے کر آئے تھے! چنانچہ اللہ تو ایسا نہیں تھا کہ اُن پر ظلم کرے، لیکن وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔"

Marfat.com

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ﴾

(قصص:۵۸)

''اور کتنی ہی بستیاں وہ ہیں جو اپنی معیشت پر اِتراتی تھیں، ہم نے اُن کو تباہ کرڈالا، اب وہ اُن کی رہائش گاہیں تمہارے سامنے ہیں، جو اُن کے بعد تھوڑے عرصے کو چھوڑ کر کبھی آباد ہی نہ ہوسکیں، اور ہم ہی تھے جو اُن کے وارث بنے۔''

ان تجربات کو ذکر کر کے قرآن حکیم یہ بتلانا چاہتا ہے کہ جس جس قوم نے اپنی زندگی کو غلط بنیادوں پر کھڑا کیا ہے، اور جس جس نے ہماری ہدایات کی روشنی سے مُنہ موڑا ہے ہم نے ہمیشہ اُسے تباہی کے اُن گہرے غاروں میں دھکیل دیا ہے جہاں سے وہ پھر کبھی نہیں نکل سکے،

عقائد (سلبی پہلو)

مندرجہ بالا عقائد کو ثابت کرنے کے علاوہ قرآن کریم نے انسانوں کے عقائد و اعمال کی بہت سی گمراہیوں کو رَد کیا ہے، اور اُس گمراہی میں پڑے ہوئے لوگوں کے مختلف شبہات کا تشفی بخش جواب دیا ہے، اس مضمون کی آیتوں کو اصولِ تفسیر کی اصطلاح میں ''آیاتِ مخاصمہ'' کہتے ہیں،

اس قسم کی آیتوں میں چار قسم کے گمراہ انسانوں کا رَد کیا گیا ہے:

(۱) بت پرست مشرکین (۲) نصرانی (۳) یہودی (۴) منافقین

بت پرست مشرکین

بُت پرست مشرکین کی گمراہیاں پانچ اقسام کی تھیں:

(۱) ''شرک'' وہ باری تعالیٰ کی مخصوص صفات میں بُتوں کو شریک ٹھہراتے تھے، اور ان کا

Marfat.com

عقیدہ یہ تھا کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ ہی تمام چیزوں کا خالق ہے، مگر جس طرح دنیا کے بادشاہ اپنی حکومت کے مختلف انتظامات مختلف آدمیوں کو سونپ دیتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حیثیت بھی (معاذ اللہ) ایک ایسے بادشاہ کی سی ہے جو کائنات پر کنٹرول کرتا ہے، مگر رزق وغیرہ جزوی شعبے اس نے بتوں کے سپرد کر رکھے ہیں، اور اب اُن میں اس کا کوئی دخل نہیں، لہٰذا اِن شعبوں سے متعلق سوال بھی بتوں ہی سے کرنا چاہئے، اور ان کی عبادت کرکے انہیں خوش رکھنا چاہئے، تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور ہماری سفارش کرتے رہیں، قرآن کریم نے اُن کا یہ عقیدہ اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿وَمَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ (زمر:۳)

"ہم ان کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کردیں۔"

بُت پرستی کی یہ گمراہی اُن لوگوں میں سب سے پہلے عمرو بن لحی نامی ایک شخص نے پھیلائی تھی اور اس میں شبانہ روز ترقی ہوتی رہی، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت وہ تین سو ساٹھ بتوں کی پرستش کرتے تھے،

قرآن کریم نے اُن کی اس گمراہی کا مختلف طریقوں سے رَد فرمایا ہے، کہیں ان سے دلیل کا مطالبہ کیا کہ آخر کس نے تمہارے کان میں آکر تم سے یہ باتیں کہہ دیں ہیں کہ جن پر بے سوچے سمجھے عمل کئے جاتے ہو، اور انہیں چھوڑنے کا نام نہیں لیتے، کہیں یہ ثابت فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، اس کا ارادہ ہی بڑی سے بڑی چیز کو عدم کے پردوں سے نکال کر وجود کے اسٹیج پر لا کھڑا کر دیتا ہے، پھر اُسے اپنی سلطنت کے انتظام میں دوسروں کی مدد کی کیا حاجت ہے؟ (سورۂ نمل کی جو آیت اوپر پیش کی گئی ہے اس کا خلاصہ یہی ہے) کہیں انہیں اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ جو پتھر کل تک لوگوں کی ٹھوکروں میں پڑا تھا وہ آج ہتھوڑے کی ضرب کھا کر خدا کیسے بن گیا؟ صرف "لات" یا "ہبل" نام رکھ لینے سے اس میں رزق دینے اور مصیبتیں دور کرنے کی صلاحیت کہاں سے آگئی؟

Marfat.com

﴿اِنْ هِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ﴾ (النجم: ۲۳)

''ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ یہ کچھ نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لئے ہیں، اللہ نے ان کے حق میں کوئی ثبوت نازل نہیں کیا۔''

۲......بُت پرستوں کی دوسری گمراہی ''تشبیہ'' تھی، یعنی وہ خدا تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کر کے مجسّم اور (معاذ اللہ) بیوی بچّوں والا سمجھتے تھے، چنانچہ وہ کہتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں، قرآن کریم نے اُن کی اس گمراہی کا رَد دو طرح فرمایا، ایک تو کلّیۃً اللہ سے اولاد کی نفی کر کے:

﴿لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ﴾ (اخلاص: ۳)

''نہ اُس کی کوئی اولاد ہے، اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔''

دوسرے خاص طور سے لڑکیوں کی نفی کر کے، کہ ذرا اپنی عقلمندی تو ملاحظہ کرو کہ تم بیٹیوں کا وجود اپنے لئے تو باعثِ ننگ و عار سمجھتے ہو، اور پھر جس ذات کو پوری کائنات کا پروردگار مانتے ہو اس کے لئے بیٹیوں کے وجود کے قائل ہو:

﴿اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ / مَالَكُمْ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ﴾

''کیا اللہ کے حصے میں تو بیٹیاں ہیں، اور بیٹے تمہارے حصے میں آئے ہیں؟ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ تم کیسی باتیں طے کر لیتے ہو؟''

(الطور: ۳۹/القلم: ۳۶)

۳......اُن کی تیسری گمراہی ''تحریف'' تھی، یعنی وہ اپنے آپ کو دینِ ابراہیم علیہ السلام کا پَیرو سمجھتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم ٹھیک اُن کے طریقے پر ہیں، مگر بہت سے جزوی احکام وقوانین بھی انہوں نے اپنی طرف سے گھڑ لئے تھے، ننگے ہو کر طواف کرنا، نماز کی بجائے سیٹیاں اور تالیاں بجانا، مہینوں کو آگے پیچھے کر لینا، کہ جنگ کرتے کرتے کوئی ''شہر حرام'' آجاتا

Marfat.com

تو وہ کہتے کہ اب کے یہ مہینہ دو مہینے تک چلے گا، باری تعالیٰ نے جابجا اُن کی لغویتوں کو ظاہر کیا ہے، اور مسلمانوں کو ایسی واہیات باتوں سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے۔

﴿ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ (الاعراف: ۳۱)

''اے آدم کے بیٹو اور بیٹیو! جب کبھی مسجد میں آؤ تو اپنی خوشنمائی کا سامان (یعنی لباس جسم پر) لے کر آؤ۔''

﴿ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ﴾

''اور بیت اللہ کے پاس اُن کی نماز سیٹیاں اور تالیاں پیٹنے کے سوا کچھ بھی نہیں۔'' (الانفال: ۳۵)

﴿ اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ ﴾ (التوبۃ: ۳۷)

''اور یہ نسیئ (یعنی مہینوں کو آگے پیچھے کر دینا) تو کفر میں ایک مزید اضافہ ہے''

۴...... اُن کی چوتھی گمراہی یہ تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول خدا تسلیم نہیں کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہمارے جیسا چلنے پھرنے اور کھانے پینے والا انسان پیغمبر کیسے ہو سکتا ہے؟ قرآن کریم نے جابجا اُن کی اس گمراہی کا رَدّ فرمایا، اور سمجھایا کہ بشریت نبوت کے منافی نہیں، اور ہمیشہ سے انبیاء انسانوں ہی میں سے آئے ہیں:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ ﴾

(یوسف: ۱۰۹)

''اور ہم نے آپؐ سے پہلے بھی مرد ہی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم وحی نازل کر دیتے تھے۔''

۵...... اُن کی پانچویں گمراہی ''انکارِ آخرت'' تھی کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو ناممکن سمجھتے تھے، قرآن کریم نے اس کا مختلف دلنشین اسالیب سے رَدّ فرمایا:

﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ

Marfat.com

بِخَلْقِهِنَّ بِقَادِرٍ عَلٰى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴾ (الاحقاف: ۳۳)

”کیا ان کو یہ بھائی نہیں دیا کہ وہ اللہ جس نے سارے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور ان کو پیدا کرنے سے اُس کو ذرا بھی تھکن نہیں ہوئی، وہ یقیناً اس بات پر پوری طرح قادر ہے کہ مُردوں کو زندہ کردے؟۔“

یہودی

قرآن کریم نے یہودیوں کا رد بھی فرمایا ہے، یہ لوگ اپنی گمراہیوں میں حد سے بڑھے ہوئے تھے، بت پرست مشرکین میں جو گمراہیاں تھیں وہ (سوائے انکارِ آخرت کے) سب ان میں بدرجہ اکمل موجود تھیں، کہنے کو تو یہ لوگ اپنے آپ کو ”تورات“ کا پَیرو کہتے تھے، مگر درحقیقت یہ اُس کے پَیرو نہ تھے، تورات تو خود ہی اُن کے رحم وکرم پر تھی، یہ اس میں جس طرح اُن کا دل چاہتا تھا تصرف کرتے تھے، تورات میں ان کا تصرف تین قسم کا تھا،

۱...... تحریف لفظی؛ یعنی یہ لوگ تورات کی آیتوں کا غلط ترجمہ کرکے لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے،

۲...... تحریف معنوی؛ یعنی تورات کی آیتوں کا اپنی طرف سے گھڑ کر مطلب بیان کرتے اور اسی پر دوسروں کو عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتے، اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے:

ہر نبی کی امت میں یہ بات معروف ومشہور رہی ہے کہ کافر اور فاسق ایک چیز نہیں، بلکہ دونوں اپنی حقیقت کے اعتبار سے بھی جدا ہیں، اور دونوں کا انجام بھی مختلف ہے، کافر وہ ہے جو دینِ فطرت کے بنیادی حقائق مثلاً توحید، آخرت اور رسالت پر ایمان نہ رکھتا ہو، ایسا شخص ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عذابِ جہنم کا مستحق ہوتا ہے، اور فاسق وہ ہے جو ان بنیادی چیزوں پر ایمان رکھنے کے باوجود عمل اور کردار کے اعتبار سے اپنے آپ کو دین فطرت کے مطابق نہ بنا سکا ہو، اور ان چیزوں کا ارتکاب کرتا رہتا ہو جو دینِ فطرت نے شدّت کے ساتھ ممنوع قرار دی ہیں، ایسا شخص دائمی عذاب کا مستحق نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنی سزا بھگتنے کے بعد جنت میں چلا جائے گا،

Marfat.com

......تورات میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا تھا کہ جو شخص حضرت موسیٰؑ پر ایمان لے آیا ہے وہ جنت کا مستحق ضرور ہے، اور اگر دوزخ میں جائے گا بھی تو عارضی طور پر، اس کا مطلب یہی تھا کہ جو شخص دینِ فطرت کے بنیادی تصورات سے متفق ہوتے ہوئے اپنے زمانے کے رسول پر ایمان لے آئے گا وہ اس مرتبے کا مستحق ہوگا...... یہودیوں نے اس کا مطلب یہ بیان کیا کہ ہماری نجات کے لئے بھی بس حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانا کافی ہے، اور اگر ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے تو کوئی حرج نہیں،

﴿وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ﴾

(آل عمران: ۲۴)

''اور انہوں نے یہ کہا ہوا ہے کہ ہمیں گنتی کے چند دنوں کے سوا آگ ہرگز نہیں چھوئے گی۔''

قرآن کریم نے اس پر واضح انداز میں رد کرتے ہوئے فرمایا:

﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْۗــــــَٔــتُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (البقرہ ۸۱)

''(آگ تمہیں) کیوں نہیں (چھوئے گی)؟ جو لوگ بھی بدی کماتے ہیں اور ان کی بدی انہیں گھیر لیتی ہے تو ایسے لوگ ہی دوزخ کے باسی ہیں، وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔''

۳...... یہودیوں کی تیسری گمراہی یہ تھی کہ وہ تورات کی بہت سی آیتوں کو چھپاتے تھے، تاکہ دنیا والوں میں اُن کا بلند مرتبہ برقرار رہے، انہیں خطرہ تھا کہ اگر اس قسم کے احکام لوگوں کو معلوم ہو گئے اور انہوں نے یہ دیکھا کہ ہمارے علماء اُن پر عمل نہیں کرتے تو وہ اُن سے بد اعتقاد ہو جائیں گے، اور عزت و شرف کا جو مقام انہیں حاصل ہے، وہ جاتا رہے گا،

چنانچہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت والی آیتیں وہ آیتیں جن میں زانی کو سنگسار کرنے کا حکم تھا چھپا رکھی تھیں اور آپس میں یہ تاکید کرتے رہتے تھے کہ دیکھو یہ باتیں

Marfat.com

کسی مسلمان کو نہ بتا دینا، قرآن کریم نے ان کی اس جہالت کا جگہ جگہ پردہ چاک کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا دیا کہ یہ لوگ ایک دوسرے سے یہ کہتے ہیں کہ:

﴿ اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ﴾

(البقرہ:۷۶)

''کیا تم اِن (مسلمانوں) کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر کھولی ہیں، تاکہ یہ (مسلمان) تمہارے پروردگار کے پاس جا کر انہیں تمہارے خلاف دلیل کے طور پر پیش کریں؟''

نصاریٰ

یہ لوگ اپنے آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا متبع کہتے تھے، اُن کی سب سے پہلی گمراہی اُن کا ''عقیدۂ تثلیث'' تھا، یعنی یہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے (معاذ اللہ) تین اجزاء (اقانیم) ہیں، جو بعض اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہیں، اور بعض اعتبار سے مختلف، پہلا جزء ''باپ'' ہے، دوسرا جزء ''بیٹا'' اور تیسرا جزء ''روح القدس'' ہے، اور بیٹے کا جزء حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا روپ دھار کر دنیا میں آیا تھا،

اللہ تعالیٰ نے جہالت کے اس مضحکہ خیز نظریہ کو علم کی روشنی سے رَد فرمایا، اور جا بجا یہ جتلا دیا کہ یہ تو ایسی بے سروپا بات ہے کہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے پناہ مانگتے ہیں،

﴿وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴾ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ

Marfat.com

كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ ﴿﴾ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿﴾ (المائدة: ۱۱۶ و ۱۱۸)

''اور (اُس وقت کا بھی ذکر سنو) جب اللہ کہے گا کہ: ''اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے علاوہ دو معبود بناؤ؟'' وہ کہیں گے: ''ہم تو آپ کی ذات کو (شرک سے) پاک سمجھتے ہیں، میری مجال نہیں تھی کہ میں ایسی بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں، اگر میں نے ایسا کہا ہوتا تو آپ کو یقیناً معلوم ہو جاتا، آپ وہ باتیں جانتے ہیں جو میرے دِل میں پوشیدہ ہیں، اور میں آپ کی پوشیدہ باتوں کو نہیں جانتا، یقیناً آپ کو تمام چھپی ہوئی باتوں کا پورا پورا علم ہے، میں نے ان لوگوں سے اُس کے سوا کوئی بات نہیں کہی جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا، اور وہ یہ کہ: ''اللہ کی عبادت کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار۔'' اور جب تک میں ان کے درمیان موجود رہا، میں ان کے حالات سے واقف رہا، پھر جب آپ نے مجھے اُٹھالیا تو آپ خود ان کے نگراں تھے، اور آپ ہر چیز کے گواہ ہیں، اگر آپ ان کو سزا دیں، تو یہ آپ کے بندے ہیں ہی، اور اگر آپ انہیں معاف فرمادیں تو یقیناً آپ کا اقتدار بھی کامل ہے، حکمت بھی کامل۔''

بت پرست مشرکین کی طرح یہ بھی انکارِ رسالت، تشبیہ اور تحریف کے مرتکب تھے، جس پر بار بار تنبیہ فرمائی ہے،

منافقین

یہ اُن شریر، بدطینت، بزدل اور کم حوصلہ انسانوں کا گروہ تھا، جن کا دِل تو کفر و شرک کے

Marfat.com

انہی بتوں سے آباد تھا، جنہیں دوسرے کفار کھلّم کھلاّ پوجا کرتے تھے، مگر یہ بیچارے اتنا حوصلہ نہ رکھتے تھے کہ علی الاعلان اپنے عقائد کا اعلان کرسکیں، اس لئے زبان سے توحید، رسالت، اور یوم آخرت کا اقرار کرتے تھے، اور درپردہ مسلمانوں کے خلاف سازش کے جال تیار کرتے رہتے تھے،

ان میں سے بعض تو وہ تھے جو صرف سازش اور دغابازی کے ارادہ سے کلمۂ توحید پڑھتے تھے، مگراُن کا دل کفروشرک کی تمام شقاوتوں سے پُر تھا، اور بعض وہ تھے جو اپنے بڑے بڑوں کو اسلام لاتا دیکھ کر خود بھی زبان سے اسلام لانے کا اقرار کرتے تھے، گویا اُن کے نزدیک اصل مسئلہ اپنے بڑوں کی اتباع تھا، اگر وہ کافر ہیں تو یہ بھی کافر رہتے تھے اور اگر وہ مسلمان ہیں تو یہ بھی اپنے آپ کو مسلمان کہنے لگتے تھے،

چونکہ ان منافقوں کے کوئی مستقل عقائد نہیں تھے، بلکہ یہ زبان سے اپنے آپ کو اسلامی عقائد ہی کے پیرَو کہتے تھے، اس لئے ظاہر ہے کہ اُن کے عقائد پر رَد کرنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، البتہ قرآن کریم نے اُن کی بدطینتی اور سازشی خصلت کو جگہ جگہ بے نقاب کیا ہے، اور اُن کی خباثتوں کے پول کھولے ہیں، اس کے نمونے دیکھنے ہوں تو سورۂ توبہ اور سورۂ انفال پڑھ جایئے، ان دونوں سورتوں میں باری تعالیٰ نے اُن کی گندگیوں کو ایک ایک کرکے بیان فرمایا ہے،

احکام

قرآن کریم کا دوسرا مضمون ''احکام'' ہے، اس میں جن احکام کا ذکر کیا گیا ہے، انہیں ہم اپنی نوعیت کے اعتبار سے تین قسموں پر تقسیم کرسکتے ہیں:

۱...... وہ احکام وقوانین جو خالص اللہ کے حقوق سے متعلق ہیں، جنہیں مختصر الفاظ میں خالص ''عبادات'' کہا جاسکتا ہے، اس میں طہارت، نماز، زکوۃ، روزہ، قربانی اور حج کے احکام داخل ہیں، اور قرآن کریم نے ان چیزوں سے متعلق بنیادی ہدایات عطا فرمائی ہیں،

۲...... وہ احکام وقوانین جو خالص بندوں کے حقوق سے متعلق ہیں جنہیں ہم ''معاملات'' سے تعبیر کرسکتے ہیں، مثلاً تجارت، قضاء، شہادت، امانت، گروی رکھنے، ذبیحہ جانوروں کو کھانے، مختلف مشروبات کے استعمال، وصیت اور میراث وغیرہ ان کے احکام خود قرآن کریم میں موجود ہیں،

۳...... وہ احکام وقوانین جو بعض حیثیت سے عبادت ہیں اور بعض حیثیت سے معاملہ، اس نوع میں سے نکاح وطلاق، حدود وتعزیرات (Criminal Laws) دیانت، قصاص (Torts) جہاد، ایمان، قسمیں اور شرکت کے احکام قرآن کریم نے ذکر فرمائے ہیں،

قرآن کریم چونکہ دنیا کو ایک ایسا پاکیزہ نظام حیات دینا چاہتا ہے جس پر ہر زمانے میں عمل کر کے انسان امن وسکون پا سکیں، اس لئے اس نے اپنے احکام نافذ کرتے وقت ''تدریجی انداز'' اختیار کیا، یعنی کوئی غیر متوقع حکم یکا یک نہیں دیدیا، بلکہ پہلے اپنے اس حکم کے لئے ذہنوں کو ہموار کیا، اور بعد میں اُسے نافذ فرمایا، اس کی ایک مثال شراب کی حرمت ہے، اہلِ عرب شراب کے ایسے متوالے تھے کہ ان کی زبان میں اس کے ڈھائی سو نام ہیں، ان سے اس خبیث عادت کو چھڑانا قرآن کریم ہی کا معجزہ ہے، جب شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شراب کی حلت وحرمت کے بارے میں شریعت کا حکم پوچھا گیا، تو قرآن نے فوراً یہ نہیں فرمادیا کہ اسے چھوڑ دو بلکہ ارشاد ہوا:

﴿قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا﴾

(البقرہ: ۲۱۹)

''آپ کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ بھی ہے، اور لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں، اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔''

سلیم الفطرت انسان اسی سے سمجھ گئے کہ اس چیز کو چھوڑ دینا ہی بہتر ہے، پھر کچھ دنوں کے بعد حکم نازل ہوا:

Marfat.com

﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى ﴾ (النساء:۴۳)

''نشے کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ۔''

اب عام طور پر ذہنوں میں شراب کی ناپسندیدگی بیٹھ چکی تھی، چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد واضح حکم نازل ہوگیا کہ:

﴿ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ ﴾ (المائدہ:۹۰)

''بلاشبہ شراب، جُوا، بُت اور لاٹری کے تیر، گندگی کی چیزیں اور شیطان کا عمل ہیں، لہٰذا تم ان سے پرہیز کرو۔''

شانِ نزول

قرآن کریم میں جس قدر احکام مذکور ہیں وہ دو طریقے سے نازل ہوئے:

۱...... مسلمانوں یا کافروں میں کوئی غلط رواج تھا اس کو بدلنے کی اللہ تعالیٰ نے خود ہی ضرورت محسوس فرمائی، اور اس کے لئے آیت نازل ہوگئی،

اس طرح بعض اوقات ایک ہی آیت نے کئی کئی غلط رسموں کو ختم کر دیا، مثلاً حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اہل عرب کا ایک معمول یہ تھا کہ اپنے زیر سرپرستی یتیم عورتوں کے مال و دولت اور حُسن و جمال کی وجہ سے اُن سے شادی کر لیا کرتے تھے، پھر اُن کو نان ونفقہ اور مہر اس معیار کا نہیں دیتے تھے، جس معیار کا وہ دوسری عورتوں سے نکاح کرنے پر دیتے،

حضرت ابن عباسؓ بیان فرماتے ہیں کہ اہلِ عرب دس دس عورتوں سے بیک وقت شادی کر لیتے تھے، اور جب اُن کے مصارف ادا کرنے پر قادر نہ ہوتے تو اپنے زیر سرپرستی یتیموں کے مال میں خُرد بُرد کرتے تھے،

حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں کہ اہلِ عرب دس دس بیویاں رکھتے تھے، مگر ان کے درمیان عدل وانصاف کا معاملہ نہیں کرتے تھے،

Marfat.com

اہلِ عرب کے یہ تمام طرز ہائے عمل غلط تھے، اور اسلامی معاشرہ میں انہیں بدلنے کی ضرورت تھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک جامع آیت نازل فرمادی جس نے ان تمام خرابیوں کا قلع قمع کردیا،

﴿ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ج فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً ﴾ (النساء : ۳)

"اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف سے کام نہیں لے سکو گے تو (ان سے نکاح کرنے بجائے) دوسری عورتوں میں سے کسی سے نکاح کرلو جو تمہیں پسند آئیں، دو دو سے، تین تین سے، اور چار چار سے، ہاں! اگر تمہیں یہ خطرہ ہو کہ تم (ان بیویوں) کے درمیان انصاف نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر اِکتفا کرو۔"

جو لوگ اپنی زیر پرورش یتیم عورتوں سے شادی کرکے انہیں پورے حقوق نہیں دیتے تھے، اس آیت نے انہیں یہ حکم دیدیا کہ یہ کیا ضروری ہے کہ تم انہی یتیم عورتوں سے شادی کرو، اللہ نے تمہارے لئے دوسری عورتوں میں سے چار تک نکاح کرنا جائز قرار دیا ہے، اُن سے نکاح کرلو، جو لوگ دس دس عورتوں سے نکاح کر ڈالتے تھے اور ان کے مصارف سے کنگال ہوجانے پر یتیموں کے مال میں خُرد بُرد کرتے تھے، انہیں شادی کی ایک معقول حد بتلادی کہ چار سے آگے نہ بڑھو، تاکہ مصارف اتنے زیادہ ہی نہ ہوں کہ یتیموں کے مال میں گڑ بڑ تک نوبت پہنچے، اور جو لوگ دس دس بیویوں سے نکاح کرکے اُن کے درمیان بے انصافی کے مجرم تھے، انہیں بھی یہ فرمادیا گیا کہ چار سے زیادہ شادیاں نہ کرو تاکہ عدل وانصاف پر قائم رہنا آسان ہو، اور اگر ان میں بھی بے انصافی کا خوف رہے تو بس ایک بیوی پر اکتفاء کرو،

اس طرح اس ایک آیت نے بیک وقت کئی خرابیوں کا انسداد کردیا،

۲......احکام کے نازل ہونے کا دوسرا سبب یہ ہوتا تھا کہ کسی خاص واقعہ کے پیشِ نظر صحابہؓ

Marfat.com

نے کوئی مسئلہ پوچھا تو اس پر آیت نازل ہوگئی، اس کی مثالیں "اسباب نزول" کے عنوان کے تحت پیچھے گذر چکی ہیں،

قصص

قرآن کریم کا تیسرا اور اہم مضمون "قصص اور واقعات" ہیں، قرآن کریم میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں انہیں دو قسموں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے، ایک وہ واقعات جو ماضی سے متعلق ہیں اور دوسرے وہ جو مستقبل سے متعلق ہیں،

ماضی کے واقعات

ماضی کے واقعات میں باری تعالیٰ نے زیادہ تر انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان فرمائے ہیں، اور ان کے علاوہ بعض نیک یا نافرمان افراد واقوام کے واقعات بھی مختلف جگہوں پر ذکر کئے ہیں،

قرآن کریم میں کُل ستائیس انبیاء علیہم السلام کے واقعات ذکر فرمائے گئے ہیں، جن کے اسماء گرامی تاریخی ترتیب سے حسب ذیل ہیں:

حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ادریسؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت الحقؑ، حضرت لوطؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ، حضرت یوشعؑ، حضرت حزقیلؑ، حضرت یونسؑ، حضرت الیاسؑ، حضرت الیسعؑ، حضرت شموئیلؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت ذوالکفلؑ، حضرت عُزیرؑ، حضرز کریاؑ، حضرت یحییٰؑ، اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام،

ان حضرات انبیاء علیہم السلام کے علاوہ مندرجہ ذیل افراد واقوام کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے:

(۱) اصحاب الجنّة (۲) اصحاب القریة (۳) حضرت لقمانؒ (۴) اصحاب السّبت (۵) اصحاب الرسّ (۶) حضرت ذوالقرنین (۷) اصحاب الکهف و الرقیم (۸) قوم سباء

(۹) اصحاب الاخدود (۱۰) اصحاب الفیل ۔

ان قصوں کو بیان کرنے سے قرآن کریم کا مقصود تاریخ نگاری نہیں ہے، بلکہ وہ ان قصوں کو یاد دلا کر ایک طرف تو تذکیر و موعظت کا سامان مہیا فرماتا ہے، اور مسلمانوں کو انبیاء کرام کی دعوت و عزیمت سے سبق لینے پر مجبور کرتا ہے، اور دوسری طرف یہ واضح کر دینا چاہتا ہے کہ سابقہ قوموں اور اُمتوں کے یہ بصیرت افروز سچے واقعات اس ذات گرامی ﷺ کی زبان پر جاری ہو رہے ہیں، جو بالکل اُمّی ہے، اور اس نے آج تک کسی کے پاس رہ کر اس قسم کا کوئی علم حاصل نہیں کیا، اس لئے یقیناً اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے باخبر کیا جاتا ہے، اور جو کلام وہ تلاوت فرماتے ہیں وہ کوئی انسانی کلام نہیں خدا کا کلام ہے،

پھر ان قصوں کے درمیان علم و حکمت کے بے شمار خزانے پوشیدہ ہیں اور اُن کی ہر آیت انسان کو زندگی کے ان گنت مسائل پر صحیح اور بہترین رہنمائی عطا کرتی ہے۔

واقعات میں تکرار کیوں؟

قرآن میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں، اُن سے متعلق عام طور پر ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے، کہ قرآن کریم میں ایک ہی قصے کو بعض اوقات کئی کئی بار دُہرایا گیا ہے، چنانچہ حضرت موسیٰؑ کا واقعہ قرآن کریم میں بہتر مقامات پر ذکر کیا گیا ہے، ایسا کیوں؟ اگر ایک قصہ ایک ہی جگہ بیان کر دیا جائے اور بقیہ مقامات پر احکام بیان ہو جاتے تو امت کے لئے شاید زیادہ آسانی کا موجب ہوتا اور بہت سے اختلاف ختم ہو جاتے،

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ دراصل قصوں کو بار بار ذکر کرنے میں کئی حکمتیں ہیں،

ا...... قرآن کریم دفعۃً ایک مرتبہ نازل نہیں ہوا، بلکہ تدریجاً اُترا ہے، اور اس امت کے لئے اُترا ہے جسے اپنے ابتدائی دَور میں قدم قدم پر نت نئی آزمائشوں اور بے شمار تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، بلکہ اگر یوں کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا کہ اُس امت کی پوری زندگی ہی اپنی ترقی کے دَور میں جہاد و قتال، حرب و ضرب، سرفروشی و جانبازی اور محنتوں میں گذری ہے، ایسی

Marfat.com

صورت میں اگر انہیں بار بار تسلّی نہ دی جاتی تو وہ دل شکستہ ہو بیٹھتے، چنانچہ قرآن کریم نے ہر اُس موقع پر پچھلے انبیاء کے واقعات سُنائے جہاں مسلمانوں کو دشواریاں پیش آئیں، اور بار بار انہیں یہ بتلایا کہ ان آزمائشوں میں تم تنہا نہیں ہو، بلکہ دعوتِ حق کا ہر قافلہ اُن کٹھن وادیوں سے گذرا ہے اور انجام کار ہمیشہ کامیابی و کامرانی نے اس کے قدم چومے ہیں،

یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ایک نبی کا واقعہ بھی قرآن حکیم میں یک جا نہیں ہوتا بلکہ اس کے متفرق حصے مختلف مقامات پر مذکور ہیں، جس موقعہ پر جس پیغمبر کے جس واقعے کی ضرورت ہوئی اس موقع پر اسی کو نازل فرمایا گیا،

۲...... دوسری حکمت یہ ہے کہ قصوں کے اس تکرار سے یہ بات واضح انداز میں معلوم ہوتی ہے کہ قرآن حکیم جزئیاتِ احکام بیان کرنے کے لئے نازل نہیں ہوا، وہ احکام کے صرف اصول بیان فرماتا ہے، اور اس کا بنیادی مقصد عقائد کی اصلاح، تذکیر اور خوش کرداری پر اُبھارنا ہے، رہے قانونی جزئیات، سو وہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتشریح پر چھوڑ دیئے ہیں، اور انہیں وہ وحی غیر متلو کے ذریعے دنیا تک پہنچانا چاہتا ہے،

قرآن کریم کا یہ طرزِ عمل "حجیتِ حدیث" پر ایک بڑی واضح دلیل ہے، کیونکہ اگر فقہ وقانون میں صرف قرآن حجت ہوتا اور احادیث حجت نہ ہوتیں، تو قرآن کریم میں بار بار قصے بیان کرنے کی بجائے احکام بیان فرمائے جاتے، اور قصوں کو وحی غیر متلو کے ذریعہ بیان فرمادیا جاتا، ظاہر ہے کہ قصے بیان کرنے سے جو مقصد ہے وہ اس طرح بھی بدرجہ اُتم پورا ہو جاتا، مگر باری تعالیٰ نے اس کے برعکس ترتیب رکھ کر گویا اس بات پر تنبیہ فرمادی ہے کہ قرآن عقائد واخلاق کی تربیت کے لئے آیا ہے، اور صرف اصولِ احکام بیان فرماتا ہے، اور جزئیات کے بارے میں اس کا ارشاد یہ ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ
لَا يَجِدُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾

(النساء:۶۵)

Marfat.com

"نہیں، (اے پیغمبر!) تمہارے پرودگار کی قسم! یہ لوگ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تمہیں فیصل نہ بنائیں، پھر تم جو کچھ فیصلہ کرو اس کے بارے میں اپنے دِلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں، اور اس کے آگے مکمل طور پر سرِ تسلیم خم کر دیں۔"

۳..... قصّوں کے مکرر ہونے کی ایک تیسری حکمت یہ بھی ہے کہ اس سے اعجازِ قرآنی کا مظاہرہ ہوتا ہے، انسان کی نفسیات کا تقاضا ہے کہ وہ ایک ہی بات کو بار بار سنتے رہنے سے اُکتا جاتی ہے، اور چند مرتبہ کے بعد ایک اچھے خاصے واقعے میں بھی اُسے کوئی حظ یا لُطف محسوس نہیں ہوتا، مگر قرآن کریم اگر چہ ایک ہی واقعے کو بار بار ذکر فرماتا ہے، مگر اس میں ہر بار نئی لذت اور ہر مرتبہ نیا کیف محسوس ہوتا ہے، یہ بات انسان کو بیساختہ اس نتیجے تک پہنچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ یہ کلام یقیناً کسی بشری دماغ کا جنم دیا ہوا نہیں ہے،

مستقبل کے واقعات

قرآن کریم نے پیشگوئی کے طور پر مستقبل کے واقعات بھی ذکر فرمائے ہیں، اس قسم کے واقعات میں قیامت کی نشانیاں، قیامت کے احوال، حشر و نشر کا منظر، دوزخ کی ہولناکیاں، اور جنت کی دل فریبیاں بیان کی گئی ہیں، چنانچہ قیامت سے پہلے زمین سے ایک بولتے ہوئے جانور کا نمودار ہونا، یاجوج و ماجوج کا خروج، صورِ اسرافیل، سوال و جواب، اور جہنمیوں کے باہمی مکالمے قرآن کریم میں متعدد جگہوں پر موجود ہیں،

امثال

قرآن کریم میں جو امثال مذکور ہوئیں ہیں اُن کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ امثال جو کسی بات کو سمجھانے کے لئے تمثیل کے طور پر پیش کی گئی ہیں، مثلاً:

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ﴾ (البقرہ:۲۶۱)

''جو لوگ اللہ کے راستے میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال
ایسی ہے جیسے ایک دانہ سات بالیں اُگائے (اور) ہر بال میں سو
دانے ہوں۔''

بتلانا یہ مقصود ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کئے ہوئے مال کا بدلہ آخرت میں سات سو گنا بلکہ بعض حالات میں اس سے بھی زیادہ ملے گا، انسانی عقل اس کو ذرا بعید سمجھ سکتی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے ایک مثال کے ذریعے سمجھا دیا، کہ جس طرح زمین میں ڈالا ہوا ایک بیج درخت پر سات سو نئے بیج لے کر نمودار ہوتا ہے، اسی طرح دنیا میں خرچ کیا ہوا مال آخرت میں سات سو گنا بڑھ کر انسان کو ملے گا،

اس قسم کی تمثیلات بات کو پوری طرح واضح کرنے اور مؤثر بنانے کے لئے لائی گئی ہیں، امثال کی دوسری قسم وہ ہے جسے اردو میں ''کہاوت'' کہتے ہیں، اس قسم کی امثال قرآن کریم میں دو طرح مذکور ہوئی ہیں، بعض تو وہ ہیں جو نزولِ قرآن کے بعد ہی کہاوت بنیں، گویا اُن کا موجد ہی قرآن ہے، مثلاً:

﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ﴾ (الرحمٰن : ۶۰)

''اچھائی کا بدلہ اچھائی کے سوا اور کیا ہے؟''

اور:

﴿وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ (البقرہ:۲۳۷)

''اور اگر تم رعایت کرو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے''

کہاوتوں کی دوسری قسم وہ ہے جس میں صراحۃً کوئی کہاوت تو مذکور نہیں، مگر آیت کے مفہوم سے نکلتی ہے، گویا وہ یا تو عوامی ضرب الامثال کا سرچشمہ ہیں، یا اُن کی طرف دلالت کرتی ہے، ایسی امثال کو ''امثالِ کامنہ'' کہا جا سکتا ہے، اس کی قرآن کریم میں بے شمار مثالیں ہیں، مثلاً ایک عربی کہاوت مشہور ہے کہ:

Marfat.com

لَيْسَ الْخَبَرُ كَالْاَعْيَانِ

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

یہ قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت میں موجود ہے، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے باری تعالیٰ سے عرض کیا کہ ''آپ مجھے دکھلایئے کہ آپ مُردے کو زندہ کس طرح کرتے ہیں؟ اس پر باری تعالیٰ نے پوچھا: ''کیا تم اس پر ایمان نہیں رکھتے؟'' تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

﴿ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ ﴾ (البقرہ: ۲۶۰)

''یقین کیوں نہ ہوتا؟ مگر (یہ خواہش اس لئے کی ہے) تاکہ میرے دِل کو پورا اطمینان حاصل ہو جائے۔''

اسی طرح مثل مشہور ہے:

لَا يُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ مَّرَّتَيْنِ

''مسلمان کو ایک سوراخ سے دومرتبہ نہیں ڈسا جاسکتا۔''

یہ سورۂ یوسف کی آیت میں موجود ہے، جب حضرت یوسف علیہ السلام کے ماں شریک بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنے کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام سے درخواست کی کہ ہمارے ساتھ بنیامین کو بھی بھیجد یجئے، تو انہوں نے فرمایا:

﴿ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَا اَمِنْتُكُمْ عَلٰى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ﴾

(یوسف: ۶۴)

''کیا میں اُس کے بارے میں تم پر ویسا ہی بھروسہ کروں جیسا اس کے بھائی (یوسف) کے بارے میں تم پر پہلے کیا تھا؟''

حصہ دوم

علم تفسیر

- ......تعارف
- ......اُصول
- ......تاریخ

Marfat.com

باب اوّل

علم تفسیر اور اس کے مآخذ

تعارف

لفظ ''تَفْسِیْر'' دراصل ''فَسْر'' سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں ''کھولنا'' اور اس علم میں چونکہ قرآن کریم کے مفہوم کو کھول کر بیان کیا جاتا ہے، اس لئے اُسے ''علم تفسیر'' کہتے ہیں، چنانچہ قدیم زمانے میں تفسیر کا اطلاق قرآن کریم کی تشریح ہی پر ہوتا تھا (۱)، اور عہدِ رسالتؐ سے قرب اور علوم کے اختصار کی بناء پر اس علم میں زیادہ شاخیں نہیں تھیں، لیکن جب اس نے ایک مدوّن علم کی صورت اختیار کی اور مختلف پہلوؤں سے اُس کی خدمت کی گئی، تو یہ ایک انتہائی وسیع اور پہلودار علم بن گیا، اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق اس میں تفصیلات کا اضافہ ہوتا چلا گیا، اب ''علم تفسیر'' جن تفصیلات کو شامل ہے اس کی اصطلاحی تعریف یہ ہے:

عِلْمٌ یُبْحَثُ فِیْهِ عَنْ کَیْفِیَّةِ النُّطْقِ بِاَلْفَاظِ الْقُرْاٰنِ وَمَدْلُوْلَاتِهَا

---

(۱) چنانچہ علّامہ زرکشیؒ نے علم تفسیر کی مختصر تعریف یہ کی ہے: ''علم یعرف به فهم کتاب الله المنزل علیٰ نبیه محمد صلی الله علیه وسلم وبیان معانیه واستخراج احکامه وحکمه'' یعنی ''وہ علم جس سے قرآن کریم کا فہم حاصل ہو اور اس کے معانی کی وضاحت اور اس کے احکام اور حکمتوں کا استنباط کیا جاسکے'' (البرهان، ص ۱۳ ج ۱)

Marfat.com

وَاَحْکَامِهَا الْاِفْرَادِيَّةِ وَالتَّرْکِيْبِيَّةِ وَمَعَانِيْهَا الَّتِيْ تُحْمَلُ عَلَيْهَا حَالَةَ التَّرْکِيْبِ وَتَتِمَّاتٍ لِذٰلِكَ ،(۱)

"علم تفسیر وہ علم ہے جس میں الفاظ قرآن کی ادائیگی کے طریقے، اُن کے مفہوم، اُن کے افرادی اور ترکیبی احکام اور اُن معانی سے بحث کی جاتی ہے جو اُن الفاظ سے ترکیبی حالت میں مراد لئے جاتے ہیں، نیز اُن معانی کا تکملہ، ناسخ و منسوخ، شانِ نزول اور مبہم قصوں کی توضیح کی شکل میں بیان کیا جاتا ہے۔"

اس تعریف کی روشنی میں علم تفسیر مندرجۂ ذیل اجزاء پر مشتمل ہے:

۱...... "الفاظِ قرآن کی ادائیگی کے طریقے۔" یعنی الفاظِ قرآن کو کس کس طریقے سے پڑھا جاسکتا ہے؟ اسی کی توضیح کے لئے قدیم عربی مفسرین اپنی تفسیروں میں ہر آیت کے ساتھ اس کی قراءتیں بھی تفصیل سے واضح کرتے تھے، اور اس مقصد کے لئے ایک مستقل علم "قراآت" کے نام سے بھی موجود ہے، جس کا مختصر تعارف پچھلے صفحات میں آچکا ہے،

۲...... "الفاظِ قرآنی کے مفہوم" یعنی اُن کے لغوی معنی، اس کام کے لئے علم لغت سے پوری طرح باخبر ہونا ضروری ہے، اور اسی بناء پر تفسیر کی کتابوں میں علماءِ لغت کے حوالے اور عربی ادب کے شواہد بکثرت ملتے ہیں،

۳...... "الفاظ کے انفرادی احکام" یعنی ہر لفظ کے بارے میں یہ معلوم ہونا کہ اس کا مادّہ کیا ہے؟ یہ موجودہ صورت میں کس طرح آیا ہے؟ اس کا وزن کیا ہے؟ اور اس وزن کے معانی وخواص کیا ہیں؟ ان باتوں کے لئے "علم صَرف" کی ضرورت پڑتی ہے،

۴...... "الفاظ کے ترکیبی احکام" یعنی ہر لفظ کے بارے میں یہ معلوم ہونا کہ وہ دوسرے الفاظ کے ساتھ مل کر کیا معنی دے رہا ہے؟ اس کی نحوی ترکیب (Grammaticl Analysis) کیا ہے؟ اس پر موجودہ حرکات کیوں آئی ہیں؟ اور کن معانی پر دلالت کر رہی ہیں؟ اس کام کے لئے

---

(۱) روح المعانی، للآلوسیؒ ص۴ ج۱،

Marfat.com

علمِ نحو اور علم معانی سے مدد لی جاتی ہے،

۵...... ''ترکیبی حالت میں الفاظ کے مجموعی معنیٰ''، یعنی پوری آیت اپنے سیاق وسباق میں کیا معنیٰ دے رہی ہے؟ اس مقصد کے لئے آیت کے مضامین کے لحاظ سے مختلف علوم سے مدد لی جاتی ہے، مذکورہ علوم کے علاوہ بعض اوقات علم ادب اور علم بلاغت سے کام لیا جاتا ہے، بعض اوقات علم حدیث سے اور بعض اوقات علم اصولِ فقہ سے،

۶...... ''معانی کے تکملے''، یعنی آیاتِ قرآن کا پس منظر اور جو بات قرآن کریم میں مجمل ہے اس کی تفصیل، اس غرض کے لئے زیادہ تر علم حدیث سے کام لیا جاتا ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی یہ میدان اتنا وسیع ہے کہ اس میں دنیا کے ہر علم وفن کی معلومات کھپ سکتی ہیں، کیونکہ بسا اوقات قرآن کریم ایک مختصر سا جملہ ارشاد فرماتا ہے، مگر اس میں حقائق واسرار کی ایک غیر متناہی کائنات پوشیدہ ہوتی ہے، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿ وَفِيْ أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ (الذّٰریٰت : ۲۱)

''اور خود تمہارے اپنے وجود میں بھی! کیا پھر بھی تمہیں دِکھائی نہیں دیتا؟''

غور فرمائیے کہ اس مختصر سے جملے کی تشریح وتفصیل میں پورا علم الابدان (Physiology) اور پورا علم نفسیات (Psychology) سماجاتا ہے، اس کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنی تخلیقی حکمتِ بالغہ کے جن اسرار کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ سب پورے ہوگئے ہیں، چنانچہ تفسیر کے اس ذیلی جز میں عقل وتدبّر تجربات ومشاہدات کے ذریعے انتہائی متنوع مضامین شامل ہوجاتے ہیں۔

تفسیر اور تاویل

قدیم زمانے میں ''تفسیر'' کے لئے ایک اور لفظ ''تاویل'' بھی بکثرت استعمال ہوتا تھا اور خود قرآن کریم نے بھی اپنی تفسیر کے لئے یہ لفظ استعمال فرمایا ہے، ''وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ'' اس لئے بعد کے علماء میں یہ بحث چھڑ گئی کہ آیا یہ دونوں لفظ بالکل ہم معنی ہیں، یا ان

میں کچھ فرق ہے؟

امام ابوعبیدہؒ وغیرہ نے فرمایا کہ یہ دونوں لفظ بالکل مرادف ہیں اور دوسرے حضرات نے ان دونوں میں فرق بیان کرنے کی کوشش کی، لیکن دونوں میں فرق بتانے کے لئے اتنی مختلف آراء ظاہر کی گئی ہیں کہ ان سب کو نقل کرنا بھی مشکل ہے، مثلاً چند اقوال یہ ہیں:

۱...... ''تفسیر'' ایک ایک لفظ کی انفرادی تشریح کا نام ہے، اور ''تاویل'' جملے کی مجموعی تشریح کا،

۲...... ''تفسیر'' الفاظ کے ظاہری معنی بیان کرنے کو کہتے ہیں، اور ''تاویل'' اصل مراد کی توضیح کو،

۳...... ''تفسیر'' اس آیت کی ہوتی ہے جس میں ایک سے زیادہ معنی کا احتمال نہ ہو، اور ''تاویل'' کا مطلب یہ ہے کہ آیت کی جو مختلف تشریحات ممکن ہیں اُن میں سے کسی ایک کو دلیل کے ساتھ اختیار کرلیا جائے،

۴...... ''تفسیر'' یقین کے ساتھ تشریح کرنے کو کہا جاتا ہے، اور ''تاویل'' تردّد کے ساتھ تشریح کرنے کو،

۵...... ''تفسیر'' الفاظ کا مفہوم بیان کردینے کا نام ہے، اور ''تاویل'' اس مفہوم سے نکلنے والے سبق اور نتائج کی توضیح کا، وغیرہ وغیرہ،(۱)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں ابوعبیدہ ہی کی رائے درست معلوم ہوتی ہے، کہ ان دونوں لفظوں میں استعمال کے لحاظ سے کوئی حقیقی فرق نہیں، جن حضرات نے فرق بیان کرنے کی کوشش کی ہے، اُن کے شدید اختلافِ آرا پر غور کرنے سے ہی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کوئی معیّن اور اتفاقی اصطلاح نہیں بن سکی، اگر ان میں حقیقۃً فرق ہوتا تو ایسے شدید اختلاف کے کوئی معنی نہیں تھے، واقعہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض اہلِ علم نے ''تفسیر'' اور ''تاویل'' کو الگ الگ اصطلاحات قرار دینے کی کوشش کی ہوگی، لیکن اس میں ایسا اختلاف رُونما ہوا کہ کوئی بھی اصطلاح عالمگیر قبولیت حاصل نہ کرسکی، یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے سے

(۱) الاتقان، للسیوطیؒ ص۱۷۳ ج۲، نوع ۷۷۔

Marfat.com

لے کر آج تک کے مفسّرین ان الفاظ کے ساتھ عموماً ہم معنی الفاظ کا سا معاملہ کرتے آئے ہیں، اور ایک کو دوسرے کی جگہ بلا تکلف استعمال کیا جاتا رہا ہے، لہٰذا اس بحث میں وقت کھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔

تفسیر کے مآخذ

''علم تفسیر'' کے اس مختصر تعارف کے بعد سب سے ضروری بحث یہ ہے کہ ''تفسیر قرآن'' کے مآخذ کیا ہیں؟ یعنی وہ کیا ذرائع ہیں جن سے ہم کسی آیت کی تفسیر معلوم کر سکتے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں قدرے تفصیل کی ضرورت ہے جو ذیل میں پیش کی جارہی ہے۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ آیاتِ قرآنی دو قسم کی ہیں، بعض آیات تو اتنی صاف، واضح اور آسان ہیں کہ جو زبان جاننے والا انہیں پڑھے گا، اُن کا مطلب فوراً سمجھ میں آجائے گا، اسی لئے ایسی آیتوں کی تفسیر میں کسی اختلاف رائے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ایسی آیات کی تفسیر کا مآخذ تو صرف ''لغتِ عرب'' ہے، عربی زبان پر ماہرانہ نظر اور عقل سلیم کے سوا اُن کا مطلب سمجھنے کے لئے کسی چیز کی ضرورت نہیں، (۱) لیکن دوسری قسم اُن آیات کی ہے جن میں کوئی اجمال، ابہام، یا تشریحی دشواری پائی جاتی ہے، یا اُن کو پوری طرح سمجھنے کے لئے اُن کے پورے پسِ منظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے، یا اُن سے دقیق قانونی مسائل یا گہرے اسرار و معارف مستنبط ہوتے ہیں، ایسی آیات کی تشریح کے لئے محض زباں دانی کافی نہیں، بلکہ اس کے لئے بہت سی معلومات کی ضرورت ہے، آگے اسی قسم کی آیات کی تفسیر کے مآخذ بیان کئے جارہے ہیں:

اس لحاظ سے ''تفسیر قرآن'' کے کل چھ مآخذ ہیں: خود قرآن کریم، احادیثِ نبویہ، صحابۂ کرامؓ کے اقوال، تابعین کے اقوال، لغتِ عرب اور عقل سلیم، ذیل میں ان تمام مآخذ کی تھوڑی سی تفصیل اور علم تفسیر میں اُن کے مقام کے بارے میں چند مباحث پیش خدمت ہیں:

---

(۱) والحق انّ علم التفسیر منه مایتوقف علی النقل ...... ومنه مالا یتوقف (البرهان للزرکشیؒ: ص ۱۷۱ ج ۲ نوع ۴۱، فصل، بعد کلام الصوفیة فی القرآن، والاتقان، ص ۱۸۳ ج ۲ نوع ۷۸ آخر الکلام علی التفسیر بالرأی

Marfat.com

پہلا ماٰخذ، خود قرآن کریم

تفسیر قرآن کا پہلا ماٰخذ خود قرآن کریم ہے، یعنی اُس کی آیات بعض اوقات ایک دوسرے کی تفسیر کر دیتی ہیں، ایک جگہ کوئی بات مبہم انداز میں کہی جاتی ہے، اور دوسری جگہ اس ابہام کو رفع کر دیا جاتا ہے، مثلاً سورۂ فاتحہ میں ارشاد ہے:

﴿ اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ﴾ (الفاتحه: ۵،۶)

''ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما، اُن لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام کیا ہے۔''

یہاں یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ جن لوگوں پر انعام فرمایا گیا ہے، اُن سے کون لوگ مراد ہیں؟ لیکن دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿ اُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيۡقِيۡنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيۡنَ ﴾ (النسآء: ۶۹)

''وہ لوگ اُن کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اِنعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء، اور صالحین۔''

اسی طرح ایک آیت میں ارشاد ہے:

﴿ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيۡهِ ﴾ (البقرہ: ۳۷)

''پھر آدم نے اپنے پروردگار سے (توبہ کے) کچھ الفاظ سیکھ لئے (جن کے ذریعے انہوں نے توبہ مانگی) چنانچہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔''

لیکن یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ کلمات کیا تھے؟ دوسری جگہ ان کلمات کی وضاحت فرما دی گئی، ارشاد ہے:

﴿ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمۡنَآ اَنۡفُسَنَا وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ

Marfat.com

مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴾ (الاعراف:۲۳)

''دونوں بول اُٹھے کہ: ''اے ہمارے پروردگار! ہم اپنی جانوں پر ظلم کر گذرے ہیں، اور اگر آپ نے ہمیں معاف نہ فرمایا، اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم نامراد لوگوں میں شامل ہو جائیں گے۔''

نیز ایک مقام پر ارشاد ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾

(التوبہ:۱۱۹)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور سچے لوگوں کے ساتھ رہا کرو۔''

یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ ''سچے لوگوں'' سے کون مراد ہیں؟ لیکن ایک دوسری آیت میں اس کی تشریح فرمادی گئی ہے، ارشاد ہے:

﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ج وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ لا وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ج وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ج وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا ج وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ط اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (البقرہ:۱۷۷)

''نیکی تو بس یہی تو نہیں ہے کہ اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف کرلو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر اور اللہ کی کتابوں اور اس کے نبیوں پر ایمان لائیں، اور اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سائلوں کو دیں، اور غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کریں، اور نماز قائم کریں اور زکوۃ

Marfat.com

ادا کریں، اور جب کوئی عہد کرلیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے کے عادی
ہوں، اور تنگی اور تکلیف میں، نیز جنگ کے وقت، صبر و استقلال کے
خوگر ہوں، ایسے لوگ ہیں جو سچے (کہلانے کے مستحق) ہیں، اور یہی
لوگ ہیں جو متقی ہیں۔"

اس آیت نے یہ بات واضح فرمادی کہ "صادقین" سے مراد وہ لوگ ہیں جن میں مذکورہ بالا صفات پائی جاتی ہوں، یہ صرف تین مثالیں تھیں، قرآن کریم میں اس قسم کی بہت سی آیات موجود ہیں،

ا...... "تفسیر القرآن بالقرآن" کی دوسری شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ کوئی بات اس کی ایک قراءت میں مبہم ہوتی ہے اور دوسری قراءت سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے، مثلاً ایک قراءت میں وضو کا طریقہ بیان فرماتے ہوئے قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا
بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ﴾ (المائدہ:٦)

عربی گرامر کی رُو سے اس کا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ:

"تم اپنے چہروں کو اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولو، اور اپنے سروں کا
مسح کرلو، اور پاؤں دھولو۔"

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ:

"اپنے سروں کا اور پاؤں کا مسح کرو۔"

لیکن دوسری قراءت میں "وَاَرْجُلَكُمْ" کے بجائے "وَاَرْجُلُكُمْ" آیا ہے، اس قراءت میں اس کے سوا کوئی ترجمہ نہیں ہوسکتا کہ "اپنے پاؤں دھولو۔" لہٰذا اس قراءت نے یہ واضح کردیا کہ پہلی قراءت میں بھی پاؤں دھونے ہی کا حکم دیا گیا ہے، اور اس میں مسح کرنے کا جو ترجمہ ہوسکتا ہے وہ مراد نہیں ہے،

اس طرح متواتر قراءتوں کی روشنی میں قرآن کریم کی جو تفسیر کی جائے وہ یقینی اور قطعی ہوتی

ہے، مشہور قراءتوں سے اگرچہ علم یقینی تو حاصل نہیں ہوتا، لیکن تفسیر میں اُن کو بڑی اہمیت حاصل ہے، لیکن شاذ قراءتوں کے بارے میں اہل علم کی رائیں مختلف ہیں، بعض حضرات انہیں تفسیر میں کوئی اہمیت نہیں دیتے، اور بعض حضرات انہیں ''خبر واحد'' کے درجے میں قبول کرتے ہیں، اس مسئلے کی پوری تفصیل اُصولِ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے،

۳...... ''تفسیر القرآن بالقرآن'' کی تیسری صورت یہ ہے کہ جس آیت کی تفسیر مطلوب ہے خود اسی کے سیاق وسباق (Context) پر غور کیا جائے، اس طرح بسا اوقات آیت کے کسی حل طلب مسئلے کی تشریح واضح ہوجاتی ہے، مثلاً سورۂ احزاب میں اُمّہات المؤمنین سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہے:

﴿ وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاھِلِیَّةِ الْاُوْلٰی ﴾

(الاحزاب: ۳۳)

''اور اپنے گھروں میں قرار کے ساتھ رہو، اور (غیر مردوں کو) بناؤ سنگھار دِکھاتی نہ پھرو، جیسا کہ پہلی جاہلیت میں دِکھایا جاتا تھا۔''

بعض اصولِ شرعیہ سے ناواقف لوگوں نے یہ دیکھ کر کہ یہاں خطاب ازواج مطہراتؓ کو ہو رہا ہے، یہ دعویٰ کر دیا کہ پردے کا یہ حکم صرف ازواج مطہراتؓ ہی کے ساتھ مخصوص تھا عام عورتوں کے لئے اس پر عمل ضروری نہیں، لیکن قرآن کریم کا سیاق وسباق اس دعوے کی تردید کر رہا ہے، اسی آیت کے آگے اور پیچھے ازواجِ مطہراتؓ سے خطاب کرتے ہوئے اور بھی کئی احکام مذکور ہیں، اور وہ یہ کہ: بولنے میں نزاکت سے کام نہ لو، نیک بات کہو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔'' ان احکام میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں کوئی معقول آدمی یہ کہہ سکے کہ یہ صرف ازواجِ مطہراتؓ کے ساتھ مخصوص ہے، اور دوسری عورتوں کے لئے اس پر عمل ضروری نہیں، لہٰذا ان بہت سے احکام کے بیچ میں سے صرف ایک جملے کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ عام عورتوں کے لئے نہیں ہے، دوسری آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ وغیرہ کے علاوہ قرآن کریم کے سیاق وسباق کے بھی بالکل خلاف ہے،

Marfat.com

حقیقت یہ ہے کہ یہ سارے احکام تمام مسلمان عورتوں کے لئے ہیں، اور یہاں خاص طور سے ازواجِ مطہراتؓ کو خطاب صرف اس لئے کیا گیا ہے کہ اُن پر احکام شرعیہ کی ذمہ داری زیادہ ہے، انہیں ان احکام کا زیادہ اہتمام کرنا چاہئے،

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ﴾

(الاحزاب: ۵۳)

''اور جب تمہیں نبی کی بیویوں سے کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔''

اس آیت کے بارے میں بھی بعض ناواقف لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ صرف ازواجِ مطہرات کے ساتھ مخصوص ہے، حالانکہ اسی آیت کا اگلا جملہ وضاحت کر رہا ہے کہ اس حکم کا اطلاق تمام عورتوں پر ہوتا ہے، ارشاد ہے:

﴿ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ﴾ (الاحزاب: ۵۳)

''یہ طریقہ تمہارے دِلوں کو بھی اور اُن کے دِلوں کو بھی زیادہ پاکیزہ رکھنے کا ذریعہ ہوگا۔''

اب ظاہر ہے کہ دلوں کی پاکیزگی صرف ازواج مطہرات ہی کے لئے مطلوب نہیں، بلکہ تمام مسلمان عورتوں کے لئے مطلوب ہے، اس لئے آیت کے حکم کو کچھ خاص عورتوں میں منحصر کرنا کیسے درست ہوسکتا ہے؟(۱)

اسی طرح سورۂ احزاب ہی میں ارشاد ہے:

﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴾ (الاحزاب: ۳۳)

---

(۱) پردے کے حکم کے عام ہونے پر اور بھی بہت سے واضح دلائل ہیں، یہاں بطورِ مثال صرف سیاق وسباق کو پیش کیا گیا ہے،

Marfat.com

''اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم سے گندگی کو دُور رکھے، اور تمہیں ایسی پاکیزگی
عطا کرے جو ہر طرح مکمل ہو۔''

بعض لوگوں نے اس آیت کے بارے میں یہ کہہ دیا کہ ''اہلِ بیت'' سے مراد صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد وغیرہ ہیں، ازواجِ مطہرات اس میں داخل نہیں، لیکن قرآن کریم کا سیاق وسباق اس نظریہ کی واضح تردید کرتا ہے، کیونکہ اس آیت کے آگے اور پیچھے تمام تر خطاب ازواجِ مطہرات کو ہو رہا ہے، اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ''اہلِ بیت'' کے مفہوم میں داخل نہ ہوں؟ خاص طور سے اگلی آیت میں ارشاد ہے:

﴿ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ ﴾ (الاحزاب:۳۴)
''اور تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور حکمت کی جو باتیں سنائی
جاتی ہیں، اُن کو یاد رکھو۔''

اس میں لفظ ''بیوت'' نے واضح کر دیا کہ پچھلی آیت میں ''اَهْلَ الْبَيْتِ'' کے مفہوم میں ازواجِ مطہراتؓ تو سب سے پہلے داخل ہیں، انہیں اس آیت سے الگ نہیں کیا جا سکتا،

یہ صرف چند مثالیں تھیں، ورنہ قرآن کریم پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس کی تفسیر کے بہت سے حل طلب مسائل سیاق وسباق کو دیکھ کر حل ہو جاتے ہیں، البتہ کبھی سیاق وسباق سے آیت کی تفسیر اتنی واضح ہو جاتی ہے کہ اُسے کوئی بھی معقولیت پسند آدمی رَدّ نہیں کر سکتا، ایسی تفسیر قطعی اور یقینی ہوتی ہے، اور بعض مرتبہ سیاق وسباق کی مدد سے جو تفسیر کی جاتی ہے وہ اتنی واضح نہیں ہوتی، چنانچہ اُسے قبول کرنے یا رَدّ کرنے میں مجتہد علماء کی رائیں مختلف ہو سکتی ہیں،

یہ ''تفسیر القرآن بالقرآن'' کا اجمالی تعارف تھا، بعض حضرات نے ایسی پوری تفسیریں بھی لکھی ہیں جن میں ہر آیت کی تفسیر کسی دوسری آیت سے کرنے کا التزام کیا گیا ہے، اس قسم کی ایک تفسیر علّامہ ابن جوزیؒ نے لکھی ہے، اور علّامہ سیوطیؒ نے الاتقان میں اس کا ذکر کیا ہے،(۱) اسی نوعیت کی ایک گرانقدر کتاب مدینہ طیبہ کے ایک عالم شیخ محمد امین بن محمد مختار شنقیطی

(۱) الاتقان، ص ۱۷۵ ج ۲ نوع ۷۸۔

(رحمۃ اللہ علیہ) نے چند سال پہلے تالیف کی ہے، جو ''اضواء البیان فی ایضاح القرآن بالقرآن'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے، اس کتاب کے مقدمے میں انہوں نے تفسیر القرآن بالقرآن کی مختلف صورتیں زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان فرمائی ہیں،(۱)

دوسرا مأخذ، احادیث نبویؐ

تفسیر قرآن کا دوسرا مأخذ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں، قرآن کریم نے متعدد مقامات پر یہ واضح فرمایا ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں مبعوث فرمانے کا مقصد یہی تھا، کہ آپؐ اپنے قول و فعل سے آیاتِ قرآنی کی تفسیر فرمائیں، چنانچہ سورۂ نحل میں ارشاد ہے:

﴿ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ﴾ (النحل:۴۴)

''اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم پر بھی یہ قرآن اس لئے نازل کیا ہے تا کہ تم لوگوں کے سامنے اُن باتوں کی واضح تشریح کردو جو اُن کے لئے اُتاری گئی ہیں۔''

اس میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا ہے کہ آپؐ کا مقصدِ بعثت یہ ہے کہ آپؐ لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی توضیح فرمائیں، نیز ارشاد ہے:

﴿ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ (ال عمران:۱۶۴)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مؤمنوں پر بڑا احسان کیا کہ اُن کے درمیان اُنہی میں سے ایک رسول بھیجا جو اُن کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرے، اُنہیں پاک صاف بنائے اور اُنہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے، جبکہ یہ لوگ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں

(۱) اضواء البیان ص ۷ تا ۳۷، ج ۱ مطبوعہ دار الاصفہانی، جدہ ۱۳۷۸ھ

مبتلا تھے۔''

نیز سورۂ نساء میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّا اَنۡزَلۡنَا اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰىکَ اللّٰہُ﴾ (النسآء:۱۰۵)

''بیشک ہم نے حق پر مشتمل کتاب تم پر اس لئے اُتاری ہے تا کہ تم لوگوں کے درمیان اس طریقے کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تم کو سمجھا دیا ہے۔''

اور سورۂ نحل میں ارشاد ہے:

﴿وَمَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَہُمُ الَّذِی اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ ۙ وَہُدًی وَّرَحۡمَۃً لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ﴾ (النحل:۶۴)

''اور ہم نے تم پر یہ کتاب اسی لئے اُتاری ہے تا کہ تم ان کے سامنے وہ باتیں کھول کر بیان کر دو جن میں انہوں نے مختلف راستے اپنائے ہوئے ہیں، اور تا کہ یہ ایمان لانے والوں کے لئے ہدایت اور رحمت کا سامان ہو۔''

ان آیات میں خود قرآن کریم نے یہ واضح فرما دیا ہے کہ سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں مبعوث فرمانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ آپؐ دنیا کو قرآن کریم کی ہدایات اور اس کے اسرار و معارف سے آگاہ کریں، اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کے طریقے سکھلائیں، اس لئے خود قرآن کریم ہی سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آپ کی تعلیمات تفسیر قرآن کا اہم ترین ماخذ ہیں،

یوں بھی اس بات کے لئے لمبی چوڑی منطق کی ضرورت نہیں کہ کسی آسمانی کتاب کی صحیح تشریح اس سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے جس پر وہ کتاب نازل ہوئی، اس دنیا میں اس سے بڑا احمق کوئی نہیں ہو سکتا جو یہ کہے کہ قرآن کریم نازل تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا تھا، لیکن اس

کی تفسیر میں زیادہ جانتا ہوں،

بعض لوگ یہ مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں، کہ قرآن کریم کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی اہمیت تو مسلّم ہے، مگر چونکہ وہ ارشادات ہم تک قابلِ اعتماد ذرائع سے نہیں پہنچے، اس لئے ہم اُن پر بھروسہ نہیں کر سکتے،

لیکن اس مغالطے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم کا معلّم بنا کر بھیجا اور بار بار یہ واضح فرمایا کہ آپ کو کتاب اللہ کی تشریح وتوضیح کے لئے بھیجا جارہا ہے، اس لئے قیامت تک تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ آپ کی تعلیمات کی پیروی کریں، اور دوسری آپ کی تعلیمات وتشریحات کو قیامت تک باقی رکھنے کا کوئی محفوظ انتظام نہیں فرمایا، کیا یہ بات کوئی ایسا شخص کہہ سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور قدرت کاملہ پر ایمان رکھتا ہو؟ اور جس نے قرآن کریم میں یہ آیت پڑھی ہو کہ:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرہ:۲۸۶)

''اللہ کسی بھی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتا۔''

بعض لوگ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانے کے لئے تو معلّم قرآن تھے، لیکن ہمارے زمانے میں (معاذ اللہ) آپ کی تعلیمات کی ضرورت نہیں رہی، لیکن اس بے تکی بات کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ صحابۂ کرامؓ جن کی مادری زبان عربی تھی جو اس کے ایک ایک لفظ کا لغوی اور محاوراتی مفہوم جانتے تھے، جو نزولِ قرآن کے پورے ماحول سے نہ صرف باخبر تھے بلکہ اس سے عملاً گزر رہے تھے، اور جو ایک ایک آیت کے پورے پسِ منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، اُنہیں تو کسی پیغمبر کی تعلیم کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا تھا، اور ان کے مقابلہ میں اس زمانے کے لوگ جن کی نہ مادری زبان عربی ہے، نہ نزولِ قرآن کا ماحول سامنے ہے اور نہ اس کے پسِ منظر سے آگاہ ہیں اُن کو قرآن کریم کی تفسیر جاننے کے لئے کسی پیغمبر کی راہنمائی کی ضرورت نہیں؟ اگر ذہن میں عقل وخرد اور دل میں عدل وانصاف کی ادنیٰ رمق باقی ہو تو اس بے سروپا بات کو کون باور کر سکتا ہے؟

Marfat.com

یہ ایک بڑا مفصل موضوع ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات جن ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں وہ کتنے قابلِ اعتماد ہیں؟ اس موضوع کی تحقیق کے لئے علم حدیث اور اسماء الرجال کے پورے کتب خانے موجود ہیں، اور اپنی نفسانی خواہشات کے لئے زبردستی شرعی جواز ڈھونڈنے کی بات تو الگ ہے، لیکن اگر سچے دل سے ان علوم کا مطالعہ کیا جائے تو انسان اس نتیجے پر پہونچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو یوں ہی رہتی دنیا تک واجب الاتباع قرار نہیں دیا بلکہ اُنکی حفاظت کا انتظام فرمایا ہے کہ اس کی تفصیلات دیکھ کر عقلِ انسانی دنگ رہ جاتی ہے، حدیث کے دوسرے شاخ در شاخ علوم کو چھوڑ کر صرف ایک اسماء الرجال کے علم ہی کو دیکھ لیجئے تو وہ اس امت کا ایسا قابلِ فخر اور محیّر العقول کارنامہ ہے جس کی نظیر دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کرسکتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر ہمارے زمانے تک جس کسی شخص نے کوئی حدیث کہیں بیان کی ہے، اس علم کی کتابوں میں اس کا پورا کچا چٹھا وضاحت کیساتھ موجود ہے، کہ وہ کہاں پیدا ہوا؟ کس کس سے احادیث کا علم حاصل کیا؟ کن کن راویوں سے اس کی ملاقات ہوئی؟ اس کا عام کردار کیسا تھا؟ قوتِ حافظہ کس درجہ کی تھی؟ روایت بیان کرتے ہوئے احتیاط کو کس حد تک مدِّ نظر رکھتا تھا؟ اُس کے ہمعصر اور بعد کے علماء نے اس کے بارے میں کیا رائے ظاہر کی ہے؟ آج بھی حدیث کی کسی کتاب میں جس حدیث کے جس راوی کا نام چاہئے نکال لیجئے، اسماء الرجال کی کتابوں میں اُس کے متعلق مذکورہ بالا سوالات کا جواب مل جائے گا۔

یہاں حدیث کی حفاظت کے موضوع پر کوئی مفصل بحث پیش نظر نہیں، اس کے لئے تدوین حدیث پر لکھی ہوئی بہت سی مبسوط کتابیں موجود ہیں، لیکن یہاں صرف اتنا اشارہ کرنا مقصود تھا کہ قرآن کریم کی تفسیر کے معاملے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے انکار واعراض ایک ایسا طرزِ عمل ہے جس پر قرآن کریم، عقل عام اور واقعاتِ تاریخ کسی بھی اعتبار سے غور کیجئے نتیجہ ہمیشہ یہی نکلے گا، کہ اس کی بنیاد میں معقولیت کا کوئی چھینٹا بھی نہیں پڑا۔

البتہ یہ درست ہے کہ احادیث کے موجودہ ذخیرے میں صحیح وسقیم ہر طرح کی روایات ملتی

Marfat.com

ہیں، لہٰذا جو روایت جہاں مل جائے اُسے پڑھ کر کوئی فیصلہ کرلینا درست نہیں بلکہ اُصول حدیث کے مطابق اُسے اچھی طرح جانچنے کی ضرورت ہے، کہ وہ ان اصولوں پر پوری اُترتی ہے یا نہیں، خاص طور سے تفسیر کی کتابوں میں جو روایات ملتی ہیں اُن کی چھان پھٹک اس لئے زیادہ ضروری ہے کہ بیشتر مفسّرین نے اپنی کتابوں میں ہر طرح کی روایتیں صرف جمع کردی ہیں، محدّثانہ طریقے پر اُن کی تحقیق و تفتیش کی بحث کو نہیں چھیڑا، لہٰذا ان روایات سے ٹھیک استفادہ وہی شخص کرسکتا ہے جو علم حدیث اور اس کے متعلقات پر ماہرانہ نگاہ رکھتا ہو، اور جسے صحیح و سقیم روایات کو پرکھنے کے اصول معلوم ہوں،

تیسرا ماٰخذ، اقوالِ صحابہؓ

جن حضرات نے قرآن کریم کی تعلیم براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی وہ صحابۂ کرامؓ ہیں، ان میں سے بعض حضرات نے اپنی پوری زندگیاں اسی کام کے لئے وقف کی ہوئی تھیں کہ قرآن کریم، اُس کی تفسیر، اور متعلقات کو براہِ راست آپؐ کے اقوال وافعال سے حاصل کریں، یہ حضرات اہلِ زبان بھی تھے، اور نزولِ قرآن کے ماحول سے پوری طرح باخبر بھی، لیکن انہوں نے اپنی زباں دانی پر بھروسہ کرنے کے بجائے قرآن کریم کو سبقاً سبقاً آپؐ سے پڑھا، امام ابوعبدالرحمٰن سُلمیؒ مشہور تابعی عالم ہیں وہ فرماتے ہیں:

حَدَّثَنَا الَّذِيْنَ كَانُوْا يَقْرَءُوْنَ الْقُرْاٰنَ كَعُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ وَعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ وَغَيْرِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا اِذَا تَعَلَّمُوْا مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَشْرَ اٰيَاتٍ لَمْ يَتَجَاوَزُوْهَا حَتّٰى يَعْلَمُوْا مَافِيْهَا مِنَ الْعِلْمِ وَالْعَمَلِ (۱)

"(صحابۂ کرامؓ میں سے) جو حضرات قرآنِ کریم کی تعلیم دیا کرتے تھے، مثلاً حضرت عثمانؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ، انہوں نے

(۱) الاتقان، ص۱۷۶، ج۲، نوع ۷۸،

Marfat.com

ہمیں بتایا کہ وہ جب آپ سے دس آیتیں سیکھتے تو اُن سے اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے، جب تک کہ ان آیتوں کی تمام علمی و عملی باتوں کا علم حاصل نہ کرلیں۔"

اسی لئے مسندِ احمدؒ میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں:

كَانَ الرَّجُلُ اِذَا قَرَأَ الْبَقَرَةَ وَاٰلَ عِمْرَانَ جَدَّ فِىْ اَعْيُنِنَا ، (۱)

"جب کوئی شخص سورۂ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران پڑھ لیتا تو ہماری نگاہوں میں وہ بہت قابلِ احترام ہوجاتا تھا۔"

اور موطا امام مالک میں روایت ہے کہ:

اَقَامَ اِبْنُ عُمَرَ عَلٰى حِفْظِ الْبَقَرَةِ ثَمَانَ سِنِيْنَ ، (۲)

"حضرت عبداللہ بن عمرؓ آٹھ سال تک صرف سورۂ بقرہ یاد کرتے رہے۔"

ظاہر ہے کہ حضرت ابن عمرؓ ایسے ضعیف الحافظہ نہیں تھے کہ سورۂ بقرہ کے محض الفاظ یاد کرنے میں اُن کے آٹھ سال خرچ ہوجائیں، یقیناً یہ مدت اسی لئے صرف ہوئی کہ وہ الفاظِ قرآنی کو یاد کرنے کے ساتھ اس کی تفسیر اور جملہ متعلقات کا علم حاصل کررہے تھے،

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

وَالَّذِىْ لَآ اِلٰهَ غَيْرُهٗ مَا نَزَلَتْ اٰيَةٌ مِّنْ كِتَابِ اللّٰهِ اِلَّا وَاَنَا اَعْلَمُ فِيْمَنْ نَزَلَتْ وَاَيْنَ نَزَلَتْ ، وَلَوْ اَعْلَمُ اَحَدًا اَعْلَمَ بِكِتَابِ اللّٰهِ مِنِّىْ تَنَالُهُ الْمَطَايَا لَاَتَيْتُهٗ ۔(۳)

"اُس ذات کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ کتاب اللہ کی کوئی آیت ایسی نازل نہیں ہوئی جس کے بارے میں مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کس کے بارے میں اور کہاں نازل ہوئی؟ اور اگر مجھے کسی ایسے شخص کا پتہ چلے جو کتاب اللہ کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتا ہو اور سواریاں اُس

(۱) الاتقان، ص۱۷۶ ج۲، نوع ۷۸،

(۲) الاتقان، ص۱۷۶ ج۲، نوع ۷۸۔ (۳) تفسیر ابن کثیر، ص۳ ج۱۔

Marfat.com

کے پاس پہنچا سکتی ہوں تو میں اس کے پاس ضرور جاؤں گا۔"

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے بعد تفسیر قرآن کا تیسرا اہم مأخذ اُن صحابۂ کرامؓ کے اقوال ہیں جنہوں نے اس محنت وجانفشانی سے قرآن کریم کی تفسیر سیکھی تھی، لیکن یہاں بھی چند امور کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے:

۱...... صحابۂ کرامؓ کے تفسیری اقوال میں بھی صحیح و سقیم ہر طرح کی روایتیں ملتی ہیں، لہٰذا ان اقوال کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اصولِ حدیث کے مطابق ان کی جانچ پڑتال ضروری ہے،

۲...... صحابۂ کرامؓ کے اقوال اُس وقت حجت ہوں گے جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آیت کی کوئی صریح تفسیر مستند طریقے سے ثابت نہ ہو، اگر آپ کی بیان فرمودہ کوئی تفسیر صحیح احادیث میں منقول ہو تو صحابۂ کرامؓ کے اقوال کی حیثیت محض تائیدی ہوگی، اور اگر کوئی قول آپ کی بیان فرمودہ تفسیر کے معارض ہو تو اسے قبول نہیں کیا جائیگا،

۳...... جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تفسیر مستند روایات میں منقول نہو اور صحابۂ کرامؓ کی بیان کی ہوئی تفسیروں میں کوئی اختلاف نہ ہو وہاں انہی کے اقوال کو اختیار کیا جائے گا،

۴...... جہاں صحابۂ کرامؓ کی بیان کردہ تفسیروں میں کوئی اختلاف ہو وہاں اوّل تو یہ دیکھا جائے گا کہ ان مختلف اقوال میں کوئی ہم آہنگی ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اگر ہم آہنگی ہو سکتی ہے تو اسی پر عمل کیا جائے گا، اور اگر اختلاف ناقابلِ تطبیق ہو تو ایک مجتہد جس قول کو دلائل کے لحاظ سے زیادہ مضبوط پائے اُسے اختیار کر سکتا ہے،(۱)

چوتھا مأخذ، تابعین کے اقوال

تابعین سے مراد وہ حضرات ہیں جنہوں نے صحابۂ کرامؓ سے علم حاصل کیا، اس مسئلے میں

---

(۱) یہ اصول، البرھان، ص ۱۷۲ ج ۲ اور الاتقان، ص ۱۷۶ تا ۱۷۸ ج ۲ سے تلخیص و تنقیح کر کے اخذ کئے گئے ہیں،

Marfat.com

علماء کا اختلاف ہے کہ تفسیر میں تابعین کے اقوال حجت ہیں یا نہیں؟ حافظ ابن کثیرؒ نے اس سلسلے میں بہترین محاکمہ کیا ہے، اُن کے ارشاد کا خلاصہ یہ ہے کہ تابعی اگر کوئی تفسیر کسی صحابی سے نقل کر رہا ہو تو اس کا حکم وہی ہے جو صحابۂ کرامؓ کی تفسیر کا ہے، اور اگر خود اپنا قول بیان کرے تو یہ دیکھا جائے گا کہ دوسرے کسی تابعی کا قول اس کے خلاف ہے یا نہیں؟ اگر کوئی قول اس کے خلاف موجود ہو تو اس وقت تابعی کا قول حجت نہیں ہوگا بلکہ اس آیت کی تفسیر کے لئے قرآن کریم، لغتِ عرب، احادیثِ نبویہ، آثارِ صحابہؓ اور دوسرے شرعی دلائل پر غور کر کے کوئی فیصلہ کیا جائے گا، اور اگر تابعین کے درمیان کوئی اختلاف نہ ہو تو اس صورت میں بلاشبہ اُن کی تفسیر حجت اور واجب الاتباع ہوگی۔"(۱)

پانچواں مأخذ، لغتِ عرب

پیچھے بتایا جاچکا ہے کہ قرآن کریم کی جس آیت کا مفہوم بدیہی طور پر واضح ہو، اور جس کے مفہوم میں کوئی اُلجھن، اشتباہ یا ابہام واجمال نہ ہو، اور نہ اُسے سمجھنے کے لئے کسی تاریخی پسِ منظر کو جاننے کی ضرورت ہو، وہاں تو عربی لغت ہی تفسیر کا واحد مأخذ ہے، لیکن جہاں کوئی ابہام واجمال پایا جارہا ہو، یا جو آیت کسی واقعاتی پس منظر سے وابستہ ہو یا اس سے فقہی احکام مستنبط کئے جارہے ہوں، وہاں محض لغت کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، ایسی صورت میں تفسیر کی اصل بنیاد تو خود قرآن کریم سنتِ نبویہ اور آثارِ صحابہؓ وتابعینؒ پر ہوگی، لیکن ان مآخذ کے بعد لغتِ عرب کو بھی سامنے رکھا جائے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان ایک وسیع زبان ہے، اور اس میں ایک ایک لفظ کئی کئی معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، اور ایک ایک جملے کے متعدد معنی ہوسکتے ہیں، لہٰذا صرف لغت کی بنیاد پر ان میں سے کوئی مفہوم معیّن کرنا مغالطوں کا سبب بنجاتا ہے، اِسی بناء پر بعض حضرات نے "مطلق لغت" کو مستقل مأخذ ماننے سے ہی انکار

(۱) تفسیر ابن کثیرؒ ص۵ ج۱، المکتبة التجارية الكبرىٰ ۱۳۵۶ھ

Marfat.com

کیا ہے، بلکہ امام محمدؒ کی طرف یہ قول منسوب ہے کہ وہ لغت کے ذریعے قرآن کریم کی تفسیر کو مکروہ قرار دیتے تھے، لیکن علامہ زرکشیؒ فرماتے ہیں کہ اُن کا مقصد تفسیر میں لغت کو بالکلیہ نظر انداز کرنا نہیں تھا، بلکہ مقصد یہ تھا کہ کسی آیت کے ظاہر اور متبادر معنی کو چھوڑ کر ایسے معانی بیان کرنا ممنوع ہے، جو قلیل الاستعمال اور دور از کار لغوی تحقیقات پر مبنی ہوں، ظاہر ہے کہ قرآن کریم عرب کے عام محاورات کے مطابق نازل ہوا ہے، لہٰذا جس جگہ قرآن وسنت یا آثارِ صحابہؓ میں کسی لفظ کی تفسیر موجود نہ ہو، وہاں آیت کی وہ تفسیر کی جائے گی جو اہلِ عرب کے عمومی محاورات میں متبادر طور پر سمجھی جاتی ہو، ایسے مواقع پر اشعارِ عرب سے استدلال کر کے کوئی ایسے قلیل الاستعمال معنی بیان کرنا بالکل غلط ہے جو لغت کی کتابوں میں تو لکھے ہوئے ہیں، لیکن عام بول چال میں استعمال نہیں ہوتے ،(۱)

اس کو ایک واضح مثال سے سمجھئے، قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اُن کی قوم نے پانی کی فرمائش کی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ:

﴿ اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ ﴾ (البقرہ:۶۰)

''اپنی لاٹھی پتھر پر مارو''

یہ جملہ کسی زبان جاننے والے کے سامنے...... بولا جائے گا وہ صراحۃً اس کا یہی مطلب سمجھے گا کہ لاٹھی کو پتھر پر مارنے کا حکم دیا جا رہا ہے، چنانچہ اس جملے کی یہی تفسیر صحیح اور معتبر ہے، لیکن سر سیّد احمد خان صاحب نے لغت کے دور از کار حوالوں کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا کہ اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ ''لاٹھی کے سہارے اس چٹان پر چلو'' (۲) اس میں اِضْرِبْ کے معنیٰ ''مارو'' کے بجائے ''چلو'' اور الحجر کے معنیٰ ''پتھر'' کے بجائے ''چٹان'' بیان کرنا ایک ایسی زبردستی ہے جس کی تائید میں اگر لغت کی کتابوں کا کوئی ایک آدھا حوالہ مِل بھی جائے تو عام محاوراتِ عرب اس کی

(۱) البرھان، ص۱۶۰ ج۲، نوع ۴۱، امھات مآخذ التفسیر۔

(۲) تفسیر القرآن، از سر سید احمد خاں صاحب، ص۹۱ ج۱، مطبوعہ لاہور۔

Marfat.com

بالکلیہ تردید کرتے ہیں، (۱)

امام احمدؒ نے لغت کے ذریعے اسی قسم کی تفسیریں بیان کرنے کو ممنوع قرار دیا ہے، اور ظاہر ہے کہ لغت سے اس طرح کا کام لینے کو کوئی بھی عقل وانصاف رکھنے والا شخص درست نہیں کہہ سکتا،

چھٹا ماٰخذ، عقلِ سلیم

عقلِ سلیم کی ضرورت یوں تو دنیا کے ہر کام کے لئے ہے، اور ظاہر ہے کہ پچھلے چار مآخذ سے استفادہ بھی اس کے بغیر ممکن نہیں ہے، لیکن یہاں اس کو ایک مستقل ماٰخذ کے طور پر ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کریم کے اسرار ومعارف ایک ناپیدا کنار سمندر کی حیثیت رکھتے ہیں، مذکورہ بالا پانچ مآخذ کے ذریعے اس کے مضامین کو بقدرِ ضرورت تو سمجھا جا چکا ہے، لیکن جہاں تک اس کے اسرار وحکم اور حقائق ومعارف کا تعلق ہے اُن کے بارے میں کسی بھی دَور میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اب اُن کی انتہاء ہوگئی ہے، اور اس سلسلے میں مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے، اس کے بجائے واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے ان حقائق واسرار پر غور وفکر کا دروازہ قیامت تک کھلا ہے، اور جس شخص کو بھی اللہ تعالیٰ نے علم وعقل اور خشیت وانابت کی دولت سے نوازا ہو وہ تدبّر کے ذریعہ نئے نئے حقائق تک رسائی حاصل کرسکتا ہے، چنانچہ ہر دَور کے مفسرین اپنی اپنی فہم کے مطابق اس باب میں اضافہ کرتے آئے ہیں، اور یہی وہ چیز ہے جس کی دعاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے لئے فرمائی تھی:

اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْہُ التَّاوِیْلَ (۱)

''یا اللہ اس کو تفسیر کا علم اور دین میں سمجھ عطا فرما۔''

---

(۱) یہاں ہم نے سرسید صاحب کے بیان کئے ہوئے اس معنی کو بطور مثال پیش کیا ہے، ورنہ درحقیقت ان کی بیان کی ہوئی اس تشریح کی کسی لغت سے بھی تائید نہیں ہوتی، اور لغت کے اعتبار سے بھی اس میں چند در چند غلطیاں ہیں، مثلاً ''ضرب'' جب چلنے کے معنی میں آتا ہے تو اس کے ساتھ ''فی'' ضرور ہوتا ہے، جیسے ''وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ'' اور یہاں ''فی'' نہیں ہے۔

(۲) البرہان، ص ۱۶۱ ج ۲ نوع ۴۱۔

لیکن اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس طرح عقل وفہم سے مستنبط کئے ہوئے وہی حقائق واسرار معتبر ہیں جو دوسرے شرعی اصول اور مذکورہ بالا پانچ مآخذ سے متصادم نہ ہوں، اور اگر اصولِ شرعیہ کو توڑ کر کوئی نکتہ بیان کیا جائے تو اس کی دین میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے،

Marfat.com

باب دوم

تفسیر کے نا قابلِ اِعتبار مآخذ

تفسیر قرآن کے معتبر اور مستند مآخذ معلوم کرنے کے بعد اُن نا قابل اعتبار مآخذ کی نشاں دہی بھی ضروری ہے جنہیں بعض لوگ تفسیر کی بنیاد قرار دے کر غلط فہمیوں، بلکہ بعض اوقات گمراہیوں کا شکار ہو جاتے ہیں:

ا......اسرائیلی روایات

"اسرائیلیات" یا "اسرائیلی روایات" اُن روایات کو کہتے ہیں جو یہودیوں، یا عیسائیوں سے ہم تک پہنچی ہیں، ان میں سے بعض براہِ راست بائبل یا تالمود سے لی گئی ہیں، بعض مشنا اور ان کی شروح سے، اور بعض وہ زبانی روایات ہیں جو اہلِ کتاب میں سینہ بسینہ نقل ہوتی چلی آئی ہیں، اور عرب کے یہود و نصاریٰ میں معروف و مشہور تھیں، تفسیر کی مروّجہ کتابوں میں ایسی روایات کی ایک بھاری تعداد موجود ہے، ان روایات کا حکم بیان کرتے ہوئے مشہور محقق صاحب تفسیر حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ ایسی روایات کی تین قسمیں ہیں، اور ہر قسم کا حکم علیحدہ ہے:

ا......پہلی قسم وہ اسرائیلیات ہیں جن کی تصدیق دوسرے خارجی دلائل سے ہو چکی ہے مثلاً فرعون کا غرق ہو جانا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں سے مقابلہ، آپ کا کوہِ طور پر جانا

Marfat.com

وغیرہ، ایسی روایات اس لئے قابلِ اعتبار ہیں کہ قرآن کریم یا صحیح احادیث نے اُن کی تصدیق کردی ہے،

۲...... دوسری قسم وہ اسرائیلیات ہیں جن کا جھوٹا ہونا خارجی دلائل سے ثابت ہو چکا ہے، مثلاً یہ کہانی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام آخر عمر میں (معاذ اللہ) بُت پرستی میں مبتلا ہو گئے تھے،(۱) یہ روایت اس لئے قطعاً باطل ہے کہ قرآن کریم نے صراحۃً اس کی تردید فرمائی ہے، اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں یہ من گھڑت کہانی کہ آپؑ (معاذ اللہ) اپنے سپہ سالار اوریا کی بیوی پر فریفتہ ہو گئے تھے،(۲)

۳...... تیسری قسم اُن اسرائیلیات کی ہے جن کے بارے میں خارجی دلائل سے نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ سچی ہیں اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ جھوٹی ہیں، مثلاً تورات کے احکام وغیرہ، ایسی اسرائیلیات کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے:

لَا تُصَدِّقُوْهَا وَلَا تُكَذِّبُوْهَا

"نہ اُن کی تصدیق کرو اور نہ تکذیب"

اس قسم کی روایات کو بیان کرنا تو جائز ہے، لیکن نہ اُن پر کسی دینی مسئلہ کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے، اور نہ اُن کی تصدیق یا تکذیب کی جاسکتی ہے، اور اس قسم کی روایات بیان کرنیکا کوئی خاص فائدہ بھی نہیں ہے، حافظ ابن کثیرؒ (۳) فرماتے ہیں کہ خود قرآن کریم نے سورۂ کہف میں یہ تعلیم دی ہے کہ اس قسم کی روایات کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے؟ ارشاد ہے:

﴿سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۚ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۖ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا﴾ (کہف: ۲۲)

---

(۱) بائبل، کتاب سلاطین اوّل ۱۱: ۲ تا ۱۳ (۲) ایضاً ۲، سموئیل ۱۳: ۱۴۔
(۳) تفسیر ابن کثیر، مقدمہ ص ۴ ج ا و اصول التفسیر لابن تیمیہؒ ص ۴۲۔

”کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین آدمی تھے، اور چوتھا اُن کا کتا تھا، اور کچھ کہیں گے کہ وہ پانچ تھے، اور چھٹا اُن کا کتا تھا، یہ سب اٹکل کے تیر چلانے کی باتیں ہیں، اور کچھ کہیں گے کہ وہ سات تھے، اور آٹھواں ان کا کتا تھا، کہہ دو کہ: ”میرا رب ہی ان کی صحیح تعداد کو جانتا ہے، تھوڑے سے لوگوں کے سوا کسی کو ان کا پورا علم نہیں۔“ لہٰذا ان کے بارے میں سرسری گفتگو سے آگے بڑھ کر کوئی بحث نہ کرو، اور نہ ان کے بارے میں کسی سے پوچھ گچھ کرو۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کی تعداد کے بارے میں اہلِ کتاب کی مختلف اسرائیلی روایات بیان فرمائی ہیں، اور ساتھ ہی مندرجہ ذیل باتوں کی طرف اشارہ فرمادیا ہے:

۱......اسرائیلی روایات اور ان کا اختلاف بیان کرنا جائز ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا،

۲......ان میں سے جو روایتیں غلط ثابت ہو چکی ہوں اُن کے غلط ہونے پر تنبیہ یہ کر دینی چاہئے، جیسا کہ پہلے دو اقوال کو اللہ تعالیٰ نے ”رجماً بالغیب“ کہہ کر رد فرمایا ہے،

۳......جس روایت کی غلطی پر کوئی دلیل نہ ہو، اُس کے بارے میں سکوت اختیار کرنا چاہئے، جیسے کہ اللہ نے تیسری روایت پر سکوت اختیار فرمایا،

۴......ان روایات کے صدق و کذب کے بارے میں یہ ایمان رکھنا چاہئے کہ حقیقی علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے،

۵......ان روایات کے بارے میں زیادہ بحث و مباحثہ سے پرہیز کرنا چاہئے،

۶......ایسی روایات کی زیادہ تحقیق و تفتیش میں پڑنا بھی درست نہیں، کیونکہ ان سے دنیا و آخرت کا کوئی قابلِ ذکر فائدہ متعلق نہیں،

پھر بعض روایات میں تو صراحت ہوتی ہے کہ یہ اسرائیلی روایت ہے، اور بعض روایات میں ایسی صراحت نہیں ہوتی، لیکن دوسرے دلائل کی روشنی میں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ

Marfat.com

اسرائیلیات میں سے ہے، تفسیر کی کتابوں میں جو روایات کعب الاحبار اور وہب بن منبہ سے مروی ہیں وہ زیادہ تر اسی قسم سے تعلق رکھتی ہیں، اس لئے ان دونوں کا مختصر حال معلوم کر لینا بھی ضروری ہے،

کعب الاحبار کون تھے

کعب الاحبار کا پورا نام کعب بن ماتع حمیری ہے، اور وہ کعب الاحبار یا کعب الحبر کے لقب سے مشہور ہیں، یہ یمن کے باشندے تھے، اور انہیں علماء یہود میں ایک ممتاز مقام حاصل تھا، انہوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں کا زمانہ پایا ہے، لیکن سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں مشرّف باسلام نہ ہو سکے، ۱۲ھ میں حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت کے دوران یہ مدینہ طیّبہ آئے اور مسلمان ہو گئے، طبقات ابن سعدؒ میں روایت ہے کہ حضرت عباسؓ نے اُن سے پوچھا کہ "تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کیوں اسلام نہیں لائے؟" اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ میرے "باپ نے مجھے تورات کا ایک نسخہ لکھ کر دیا تھا، اور کہا تھا کہ اس پر عمل کرتے رہو، اور تورات کے علاوہ جتنی کتابیں تھیں انہیں بند کر کے اس پر مہریں لگادیں تھیں، تاکہ میں اُن کا مطالعہ نہ کروں، اور ساتھ ہی مجھ سے اپنے رشتۂ ابوّت کا واسطہ دے کر عہد لیا تھا کہ میں یہ مُہریں نہ توڑوں، لیکن جب دین اسلام دنیا میں غالب ہونے لگا تو میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کہیں میرے باپ نے مجھ سے کوئی علم چھپانے کی کوشش نہ کی ہو، چنانچہ میں نے ان کتابوں کی مُہر توڑ دی، اور اُن کا مطالعہ کیا، تو اس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمت کا تذکرہ مجھے ملا، اس لئے میں اب مسلمان ہو کر آیا ہوں" (۱)

کعب الاحبارؒ کو عام طور سے ثقہ قرار دیا گیا ہے، لیکن علاّمہ محمد زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے بعض روایات کی بناء پر اُن کے بارے میں کچھ شکوک وشبہات کا بھی اظہار کیا ہے، مثلاً یہ واقعہ کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد اقصیٰ تعمیر کرنے کا ارادہ فرمایا تو لوگوں سے مشورہ کیا کہ

(۱) قال الکوثری وفی سند ھذا الخبر حماد بن سلمۃ وھو مختلط ...... وفیہ ایضاً علی بن زید بن جدعان ضعفہ غیر واحد (مقالات الکوثری ص۳۲) ولکن حسّنہ الحافظ فی الاصابۃ (۳:۲۹۸)

"مسجد کو صخرۂ بیت المقدس کے آگے تعمیر کیا جائے یا پیچھے؟" اس پر کعب الاحبارؒ نے مشورہ دیا کہ "مسجد صخرہ کے پیچھے بنائی جائے" یہ سُن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا، "یہودی عورت کے بیٹے! تم پر یہودیت کا ابھی تک اثر ہے، میں تو مسجد کو صخرہ کے آگے بناؤں گا، تاکہ نماز میں صخرہ کا استقبال نہ کیا جائے۔" علامہ زاہد کوثریؒ لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد کعب احبار کے ذہن میں حضرت عمرؓ کے بارے میں کچھ رنجش رہی، یہاں تک کہ اُن کا میل جول ایسے لوگوں کے ساتھ بھی دیکھا گیا جو حضرت عمرؓ کو شہید کرنے کی سازش میں ملوث تھے، اور اس سے پہلے وہ اہلِ کتاب کی بعض کتابوں کے حوالے سے حضرت عمرؓ کو تنبیہ کر چکے تھے کہ آپ کو کسی وقت قتل کیا جائے گا، ان تمام واقعات کو نقل کرنے کے بعد علامہ کوثریؒ لکھتے ہیں:

> "ان بکھرے ہوئے واقعات کو ملانے سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ، حضرت حذیفہؓ، حضرت ابوذرؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عوف بن مالکؓ، اور حضرت معاویہؓ، کعب الاحبار پر پورا بھروسہ نہیں کرتے تھے۔" (۱)

علامہ کوثریؒ نے کعب الاحبار پر جن شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے، اور مختلف صحابہؓ کے اقوال سے جو نتائج نکالے ہیں، اُن سے اختلاف کی گنجائش ہے (۲) لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ اُن کی بیشتر روایات اسرائیلی روایات ہیں، لہٰذا جب تک اُن کی تصدیق خارجی دلائل سے نہ ہو جائے، اُس وقت تک اُن پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

وَہب بن مُنبہ

دوسرے بزرگ جن سے بکثرت اسرائیلی روایات منقول ہیں وہب ابن منبہ (متوفی ۱۱۰ھ) ہیں، یہ بھی یمن کے علاقے صنعاء کے باشندے تھے، اور فارسی الاصل تھے، روایات

(۱) مقالات الکوثری، ص ۳۳ و ۳۴، مقالہ: "کعب الاحبار و الاسرائیلیات"

(۲) مصر کے محقق عالم ڈاکٹر رمزی نعناعہ نے ان شکوک و شبہات کی مفصل اور مدلل تردید کی ہے، (ملاحظہ ہو ان کی کتاب "الاسرائیلیات و اثرھا فی التفسیر" ص ۱۷۲ تا ص ۱۸۳ مطبوعہ دار الضیاء بیروت ۱۹۷۰ء)

Marfat.com

کے مطابق یہ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں پیدا ہوئے تھے، ان کے والد منبہؒ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مسلمان ہو چکے تھے، وہب بن منبہؒ عابد وزاہد تابعی تھے، اورانہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ، اور حضرت جابرؓ وغیرہ سے روایتیں لی ہیں، ان کے پاس علمائے اہلِ کتاب کی روایات اور کتابوں کا بڑا وسیع علم تھا، یہاں تک کہ وہ اس معاملے میں اپنے آپ کو حضرت عبداللہ ابن سلامؓ اور کعب الاحبار کے علوم کا جامع سمجھتے تھے، (۱) امام ابن سعدؒ نے لکھا ہے کہ انہوں نے ان روایات پر مشتمل ایک کتاب ''احادیث الانبیاء'' کے نام سے تالیف کی تھی، (۲) اور مسعودیؒ نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے ایک کتاب ''المبدأ'' کے نام سے لکھی تھی، (۳) اور حاجی خلیفہؒ نے ''کشف الظنون'' میں شاید اسی کتاب کو ''کتاب الاسرائیلیات'' کے نام سے ذکر کیا ہے، (۴) نیز یاقوت الحمویؒ اور قاضی ابن خلکانؒ نے ان کی ایک اور کتاب کا تذکرہ کیا ہے، جس کا نام ''ذکر الملوك المفتوحة من حمير واخبار هم وغير ذلك'' تھا، قاضی ابن خلکانؒ نے یہ کتاب خود دیکھی ہے۔ (۵)

جہاں تک وہب بن منبہؒ کے صدق اور امانت کا تعلق ہے اس کے بارے میں محدثین اور ائمہ جرح وتعدیل نے کوئی کلام نہیں کیا، حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں:

''وہ ثقہ اور سچے تھے، اور اسرائیلی کتابوں سے بکثرت نقل کرتے تھے۔'' امام ابوزرعہؒ اور امام نسائیؒ نے انہیں ''ثقہ'' قرار دیا ہے، امام عجلیؒ فرماتے ہیں: ''وہب ثقہ تابعی تھے'' صرف امام عمرو بن علی الفلاسؒ نے انہیں ضعیف قرار دیا ہے، لیکن اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ انہیں وہبؒ کے صدق وامانت میں کوئی شبہ تھا، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہبؒ ابتداء میں قدریہ فرقہ کے

---

(۱) تذكرة الحفاظ، ص ۱۰۱ ج ۱،

(۲) طبقات ابن سعد، ص ۹۷ ج ۷۔

(۳) مروج الذهبیؒ ص ۱۲۷ ج ۵

(۴) بحث فی نشأة علم التاريخ عند العرب للدكتور عبدالعزيز الدوری ص ۱۱۴،

(۵) معجم الادباء للحموی ص ۲۲۲ ج ۶، ووفيات الاعيان لابن خلكانؒ ص ۱۸۰ ج ۲۔

Marfat.com

عقائد کی طرف مائل تھے، لیکن امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے بعد میں اپنے اس عقیدے سے رجوع کرلیا تھا، اور ابوسنانؒ نے خود وہب بن منبہؒ سے نقل کیا ہے کہ میں پہلے قدری عقائد کا قائل تھا، لیکن بعد میں میں نے اُن سے رجوع کرلیا، (۱)

اس سے صاف واضح ہے کہ ائمہ جرح وتعدیل میں سے کسی نے بھی اُن کی سچائی اور امانت ودیانت پر کوئی اعتراض نہیں کیا، اسی بناء پر امام بخاریؒ، اور امام مسلمؒ دونوں نے اپنی اپنی صحیح میں اُن کی روایات ذکر کی ہیں، لہٰذا جو روایات وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہیں، اگر ان کی سند اصولِ حدیث کی شرائط پر پوری اُترتی ہو تو ان کو بلاشبہ قبول کیا جائے گا، البتہ زمانۂ ماضی کے جو قصے اور زمانۂ آئندہ کی جو خبریں انہوں نے بغیر کسی حوالے کے بیان کی ہیں وہ زیادہ تر اسرائیلی روایات ہیں جن کے بارے میں ہمیں حکم یہ ہے کہ ہم نہ اُن کی تصدیق کریں اور نہ تکذیب، عہد حاضر کے بعض مصنفین مثلاً سید رشید رضا مرحوم وغیرہ نے اُن کی عجیب وغریب اسرائیلی روایات کی بناء پر انہیں ضعیف قرار دیدیا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسرائیلی روایات کا محض بیان کرنا کوئی جرم نہیں، ہاں یہ الگ بات ہے کہ ان روایات پر کسی اسلامی عقیدے یا اسلامی حکم کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی، (۲)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ

کعب الاحبارؒ اور وہب بن منبہؒ تو تابعین میں سے ہیں، اور سب سے زیادہ اسرائیلی روایات انہیں سے مروی ہیں، صحابۂ کرامؓ میں سب سے زیادہ اسرائیلیات شاید حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے سریانی زبان باقاعدہ سیکھی تھی (۳) اس زمانے میں یہود ونصاریٰ کی بہت سی کتابیں اسی زبان میں تھیں اور غزوہ یرموک کے موقع پر

(۱) تہذیب التہذیب ص ۱۶۸ ج ۱۱۔

(۲) سید رشید رضا مرحوم وغیرہ کے اس نظریئے کی مفصل تردید کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر رمزی نعناعہ کی محققانہ کتاب "الاسرائیلیات واثرہا فی التفسیر" ص ۱۸۸۔

(۳) طبقات ابن سعد، ص ۲۶۱ ج ۴،

Marfat.com

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو اس قسم کی کتابیں اتنی بھاری تعداد میں ہاتھ آ گئی تھیں کہ وہ دو اونٹوں پر لادی جاتی تھیں،(۱) حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے بہت سی احادیث خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی روایت کی ہیں، لیکن اُن کا اسرائیلیات سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ اگر وہ صحیح سند سے ثابت ہوں تو دوسرے صحابہؓ کی طرح ان کی روایات بھی واجب التسلیم ہیں، ہاں! جو روایات انہوں نے صراحۃً اہلِ کتاب سے نقل کی ہیں وہ اسرائیلی روایات ہیں جنکی تصدیق یا تکذیب ہم نہیں کر سکتے، اسی طرح جو روایات خود اُن کے اپنے مقولے کے طور پر منقول ہیں اُن کے بارے میں بھی اکثر گمان یہی ہوتا ہے کہ وہ اسرائیلیات ہیں، اور ان کو اسلامی عقائد کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا، مصر کے ایک منکر حدیث مصنف ابوریہ نے اپنی کتاب ''اضواء علی السنۃ المحمدیہ'' میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ پر یہ بے بنیاد الزام عائد کیا ہے کہ وہ کبھی کبھی اسرائیلی روایات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی منسوب کر دیتے تھے، لیکن یہ الزام نہ صرف سو فی صد غلط اور گمراہ کن ہے بلکہ اس نے خود ابوریہ صاحب کے علم و دیانت کی قلعی بھی کھول دی ہے، کیونکہ انہوں نے اپنی دلیل میں حافظ ابن حجرؒ کی فتح الباری سے یہ عبارت نقل کی ہے کہ:

اَنَّ عَبْدَ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو کَانَ قَدْ اَصَابَ زَاملتَیْنِ مِنْ کُتُبِ اَھْلِ الْکِتَابِ وَکَانَ یَرْوِیْھَا لِلنَّاسِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، فَتَجَنَّبَ الْاَخْذَ عَنْہُ کَثِیْرٌ مِّنْ اَئِمَّۃِ التَّابِعِیْنَ وَکَانَ یُقَالُ لَہٗ: لَاتُحَدِّثْنَا عَنِ الزَّاملتَیْنِ،

''حضرت عبداللہ بن عمروؓ کو اہلِ کتاب کی کتابوں میں سے دو اونٹوں کا بوجھ ملا تھا، وہ ان کتابوں کی باتیں لوگوں کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے روایت کرتے تھے، اس لئے بہت سے ائمۂ تابعین نے ان سے روایت کرنے سے احتراز کیا، چنانچہ لوگ اُن سے کہا کرتے تھے کہ ہمیں ان دو اونٹوں کے بوجھ میں سے

(۱) فتح الباری، ص۱۶۶ ج۱،

Marfat.com

کچھ نہ سنایئے۔‘‘

اس عبارت میں خط کشیدہ جملہ حافظ ابن حجرؒ کی ’’فتح الباری‘‘ میں نہیں ہے، ابوریہ صاحب نے یہ جملہ اپنی طرف سے بڑھا کر حافظ ابن حجرؒ کی طرف منسوب کردیا ہے، اس سے آپ منکرینِ حدیث اور مغرب زدہ مؤلفین کی علمی امانت ودیانت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔(۱)

۲......صوفیاءِ کرامؒ کی تفسیریں

صوفیائے کرامؒ سے قرآن کریم کی آیات کے تحت کچھ ایسی باتیں منقول ہیں جو بظاہر تفسیر معلوم ہوتی ہیں، مگر وہ آیت کے ظاہری اور ماثور معنی کے خلاف ہوتی ہیں، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ﴾

’’قتال کروان کافروں سے جوتم سے متصل ہیں،‘‘

اس کے تحت بعض صوفیاء نے کہا کہ:

قَاتِلُوا النَّفْسَ فَاِنَّهَا تَلِى الْاِنْسَانَ،

’’نفس سے قتال کرو، کیونکہ وہ انسان سے سب سے زیادہ متصل ہے‘‘

اس قسم کے جملوں کو بعض حضرات نے قرآن کریم کی تفسیر سمجھ لیا، حالانکہ درحقیقت وہ تفسیر نہیں، صوفیاءِ کرام کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہوتا کہ قرآن کریم کی اصل مراد یہ ہے، اور جو مفہوم ظاہری الفاظ سے سمجھ میں آرہا ہے وہ مراد نہیں ہے، بلکہ وہ قرآن کریم کے ظاہری مفہوم پر جو اس کے اصل مآخذ سے ثابت ہو پوری طرح ایمان رکھتے ہیں، اور اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ قرآن کریم کی تفسیر وہی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے اُن وجدانی استنباطات کو بھی ذکر کردیتے ہیں جو اس آیت کی تلاوت کے وقت اُن کے قلب پر وارد ہوئے، چنانچہ مذکورہ بالا مثال میں صوفیاء کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس آیت میں کفار کے مقابلے پر جہاد وقتال کا حکم مراد

(۱) اور اس سلسلے میں ابوریہ کی مفصل تردید کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر عجاج الخطیب کی کتاب ’’السنۃ قبل التدوین‘‘ اور ڈاکٹر رمزی نعناعہ کی ’’اسرائیلیات واثرھا فی کتب التفسیر‘‘(ص ۱۵۸)

Marfat.com

نہیں، بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ کفار سے جہاد و قتال کا حکم تو اس آیت کا اصلی تقاضا ہے ہی، لیکن اسی آیت سے وجدانی طور پر انسان کو یہ بھی سوچنا چاہئے کہ سب سے قریبی نافرمان اس کا نفس ہے، جو اُسے بُرائیوں پر آمادہ کرتا رہتا ہے، لہٰذا کفار سے جہاد کے ساتھ ساتھ اُس سے بھی جہاد ضروری ہے،

ماضی قریب کے معروف مفسّر علامہ محمود آلوسیؒ جن کی تفسیر میں صوفیاء کرامؒ کے اس قسم کے وجدانی استنباطات بکثرت ملتے ہیں، صوفیاء کے منشاء کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> ’’قرآن کریم میں ساداتِ صوفیاء سے جو کلام منقول ہے، وہ درحقیقت ان دقیق امور کی طرف اشارے ہوتے ہیں جو اربابِ سلوک پر منکشف ہوتے ہیں، اور ان اشارات میں اور قرآن کریم کے ظاہری مفہوم میں جو حقیقتاً مراد ہوتا ہے تطبیق ممکن ہے، صوفیاء کا یہ اعتقاد نہیں ہوتا کہ ظاہری مفہوم مراد نہیں، اور باطنی مفہوم مراد ہے، اس لئے کہ یہ تو باطنی ملحدوں کا اعتقاد ہے جسے انہوں نے شریعت کی بالکلیہ نفی کا زینہ بنایا ہے، ہمارے صوفیاء کرام کا اس اعتقاد سے کوئی واسطہ نہیں، اور ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ جبکہ صوفیاء نے یہ تاکید کی ہے کہ قرآن کریم کی ظاہری تفسیر کو سب سے پہلے حاصل کیا جائے‘‘ (۱)

لیکن صوفیاءؒ کے اس قسم کے اقوال کے بارے میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

۱...... ان اقوال کو قرآن کریم کی تفسیر قرار نہ دیا جائے، بلکہ یہ اعتقاد رکھا جائے قرآن کریم کی اصل مراد وہی ہے جو تفسیر کے اصل مآخذ سے سمجھ میں آتی ہے، اور یہ اقوال محض وجدانی استنباط کی حیثیت رکھتے ہیں، لہٰذا اگر ان اقوال کو قرآن کریم کی تفسیر سمجھ لیا جائے تو یہ گمراہی ہے،

---

(۱) روح المعانی ص ۷ ج ۱، مقدمہ، فائدہ ثانیہ، یہی مضمون علامہ سیوطیؒ نے شیخ تاج الدین بن عطاء اللہؒ سے نقل فرمایا ہے، (الاتقان ص ۱۸۵ ج ۲)

Marfat.com

چنانچہ امام ابوعبدالرحمٰن سُلمیؒ نے ایک کتاب ''حقائق التفسیر'' کے نام سے لکھی تھی جو اسی قسم کے اقوال پر مشتمل تھی، اس کے بارے میں امام واحدیؒ نے فرمایا کہ:

''جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ یہ تفسیر ہے تو وہ کافر ہو جائے گا۔'' (۱)

۲...... اس قسم کے اقوال میں بھی صرف اُن اقوال کو درست سمجھا جا سکتا ہے جن سے قرآن کریم کی کسی آیت کے ظاہری مفہوم یا شریعت کے کسی مسلّمہ اصول کی نفی نہ ہوتی ہو، اور اگر ان وجدانیات کے پردے میں دین کے مسلّم اصول وقواعد کی خلاف ورزی کی جانے لگے تو یہ صریح الحاد ہے،

۳...... اس قسم کے وجدانیات صرف اُس وقت معتبر ہو سکتے ہیں جب وہ قرآن کریم کی تحریف کی حد تک نہ پہنچتے ہوں، اور اگر قرآن کریم کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر کوئی بات کہی جائے تو وہ الحاد اور گمراہی ہے، مثلاً ایک شخص نے آیت قرآنی ''مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ'' کے تحت یہ کہا کہ یہ اصل میں ''مَنْ ذَلَّ ذِیْ یَشْفَ عُ'' ہے، ذِیْ سے مراد ''نفس'' ہے، اور مطلب یہ ہے کہ ''جو شخص نفس کو ذلیل کرے گا، شفا پا جائیگا، اس بات کو یاد رکھو'' علامہ سراج الدین بلقینیؒ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا، تو فرمایا کہ: ''ایسا کہنے والا ملحد ہے'' (۲)

۴...... قدیم زمانے میں ملحدوں کا ایک فرقہ ''باطنیہ'' کے نام سے گذرا ہے، جس کا دعویٰ یہ تھا کہ قرآن کریم سے ظاہری طور پر جو مطلب سمجھ میں آتا ہے، حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہے، بلکہ ہر لفظ سے ایک باطنی مفہوم کی طرف اشارہ ہے، اور وہی قرآن کی اصل تفسیر ہے۔'' یہ اعتقاد باجماعِ امت کفر والحاد ہے، لہٰذا صوفیاء کے کسی قول کے بارے میں اس قسم کا اعتقاد رکھا جائے تو وہ باطنیت ہوگا،

ان چار امور کی رعایت کے ساتھ صوفیائے کرامؒ کے اقوال کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور بلاشبہ بعض مخصوص واردات واحوال رکھنے والوں کو ان اقوال سے فائدہ بھی پہنچا ہے، اسی وجہ سے علامہ آلوسیؒ اپنی تفسیر ''روح المعانی'' میں آیات کی مکمل تفسیر لکھنے کے بعد ایک مستقل عنوان

---

(۱) الاتقان، ص۱۸۴ ج۲، (۲) ایضاً۔

Marfat.com

''من باب الاشارة فی الآیات'' قائم کرتے ہیں، اوراس میں اس قسم کے وجدانیات ذکر فرماتے ہیں،

مذکورہ بالا گزارشات کا خلاصہ یہ ہے کہ صوفیاء کرام نے قرآن کریم کے تحت اپنے جو وجدانیات ذکر فرمائے ہیں وہ قرآن وسنت کے خلاف نہیں ہیں، اور بعض لوگوں نے اُن پر باطنیت کا جوالزام عائد کیا ہے وہ درست نہیں، اس کے باوجود ہم حافظ ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد کو نقل کئے بغیر نہیں رہ سکتے، کہ:

وَمَعَ ذٰلِكَ فَيَالَيْتَهُمْ لَمْ يَتَسَاهَلُوْا بِمِثْلِ ذٰلِكَ لِمَا فِيْهِ مِنَ الْاِيْهَامِ وَالْاِلْبَاسِ ، (۱)

''اس کے باوجود اے کاش! کہ یہ حضرات اس قسم کے اقوال نقل کرنے میں اتنے تساہل سے کام نہ لیتے، کیونکہ ان میں غلط فہمی اوراشتباہ کی بڑی گنجائش ہے۔''

۳...... تفسیر بالرّائے

ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے:

مَنْ تَكَلَّمَ فِي الْقُرْاٰنِ بِرَايِهٖ فَاَصَابَ فَقَدْ اَخْطَأَ

''جو شخص قرآن کریم کے بارے میں اپنی رائے سے کچھ گفتگو کرے تو اگر صحیح بات بھی کہے تو اس نے غلطی کی۔''

علامہ ماوردیؒ فرماتے ہیں کہ بعض غلو پسند لوگوں نے اس حدیث سے یہ مطلب سمجھا کہ قرآن کریم کے بارے میں کوئی بات فکر ورائے کی بنیاد پر کہنا جائز نہیں، یہاں تک کہ اجتہاد کے ذریعہ قرآن کریم سے ایسے معانی بھی مستنبط نہیں کئے جاسکتے جو اصولِ شرعیہ کے مطابق ہوں، لیکن یہ خیال درست نہیں، کیونکہ خود قرآن کریم نے تدبر اور استنباط کو جا بجا مستحسن قرار

(۱) الاتقان،۱۸۴ ج ۲۔

Marfat.com

دیا ہے، اور اگر فکر و تدبر پر بالکل پابندی لگادی جائے تو قرآن وسنت سے شرعی احکام وقوانین مستنبط کرنے کا دروازہ ہی سرے سے بند ہو جائے گا، لہٰذا اس حدیث کا مطلب ہر قسم کی رائے پر پابندی لگانا نہیں ہے“(۱)

چنانچہ اس بات پر جمہور علماء متفق ہیں کہ خود قرآن وسنت کے دوسرے دلائل کی روشنی میں اس حدیث کا منشاء یہ ہرگز نہیں ہے کہ قرآن کریم کے معاملہ میں غور فکر اور عقل ورائے کو بالکل استعمال نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس کا اصل منشاء یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر کے لئے جو اصول اجماعی طور پر مسلّم اور طے شدہ ہیں، اُن کو نظر انداز کر کے جو تفسیر محض رائے کی بنیاد پر کی جائے گی وہ ناجائز ہوگی، اور اگر اس طرح تفسیر کے معاملے میں دخل دے کر کوئی شخص اتفاقاً کسی صحیح نتیجے پر بھی پہنچ جائے تو وہ خطا کار ہے، کیونکہ اس نے راستہ غلط اختیار کیا، اب اصولِ تفسیر کو نظر انداز کرنے کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں، مثلاً:

۱...... جو شخص تفسیر قرآن کے بارے میں گفتگو کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، وہ محض اپنی رائے کے بل بوتے پر تفسیر شروع کر دے،

۲...... کسی آیت کی کوئی تفسیر صراحۃً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ وتابعین سے ثابت ہو اور وہ اسے نظر انداز کر کے محض اپنی عقل سے کوئی معنی بیان کرنے لگے،

۳...... جن آیات میں صحابہؓ وتابعین سے کوئی صریح تفسیر منقول نہیں، ان میں لغت اور زبان وادب کے اصولوں کو پامال کر کے کوئی تشریح بیان کرے،

۴...... قرآن وسنت سے براہ راست احکام وقوانین مستنبط کرنے کے لئے اجتہاد کی اہلیت نہ رکھتا ہو، اور پھر اجتہاد شروع کر دے،

۵...... قرآن کریم کی متشابہ آیات (جن کے بارے میں قرآن نے خود کہہ دیا ہے کہ اُن کی سوفی صد صحیح مراد سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا) ان کی جزم ووثوق کے ساتھ کوئی تفسیر بیان کرے، اور اُس پر مُصر ہو،

---

(۱) ماخوذ از الاتقان، ص ۱۸۰ ج ۲ نوع ۷۸۔

۶...... قرآن کریم کی ایسی تفسیر بیان کرے جس سے اسلام کے دوسرے اجماعی طور پر مسلّم اور طے شدہ عقائد یا احکام مجروح ہوتے ہوں۔

۷...... تفسیر کے معاملے میں جہاں عقل وفکر کا استعمال جائز ہے، وہاں کسی قطعی دلیل کے بغیر اپنی ذاتی رائے کو یقینی طور پر درست اور دوسرے مجتہدین کی آراء کو یقینی طور سے باطل قرار دے،

یہ تمام صورتیں اس "تفسیر بالرّائی" کی ہیں جن سے مذکورہ بالا حدیث میں منع کیا گیا ہے، چنانچہ ایک دوسری حدیث میں ان تمام صورتوں کو اس مختصر جملے میں سمیٹ دیا گیا ہے:

مَنْ قَالَ فِي الْقُرْاٰنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ،

"جو شخص قرآن کریم کے معاملے میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔"

البتہ تفسیر کے اصولوں اور اسلام کے اجماعی طور پر طے شدہ ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے اگر تفسیر میں کسی ایسی رائے کا اظہار کیا جائے جو قرآن وسنت کے خلاف نہ ہو تو وہ اس حدیث کی وعید میں داخل نہیں ہے، البتہ اس قسم کا اظہار رائے بھی قرآن وسنت کے وسیع وعمیق علم اور اسلامی علوم میں مہارت کے بغیر ممکن نہیں، اور علماء نے اس کے لئے بھی کچھ کارآمد اصول مقرر فرمائے ہیں، جو اصولِ فقہ اور اصولِ تفسیر میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں، اور اُن کا ایک نہایت مفید خلاصہ علامہ بدرالدین زرکشیؒ نے اپنی کتاب "البرہان فی علوم القرآن" کی نوع نمبر ۴۱ میں بالخصوص "اقسام التفسیر" کے زیرعنوان (صفحہ ۱۶۴ تا ۱۷۰) بیان فرمایا ہے، یہ پوری بحث نہایت قابلِ قدر ہے، لیکن چونکہ عربی زبان وعلوم کی مہارت کے بغیر اس سے فائدہ نہیں اُٹھایا جاسکتا، اس لئے یہاں اس کا ترجمہ نقل کرنا بے فائدہ ہے، جو عربی داں حضرات چاہیں وہاں ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔

تفسیر میں گمراہی کے اسباب

علم تفسیر جہاں ایک انتہائی شرف وسعادت کی چیز ہے وہاں اس نازک وادی میں قدم رکھنا

Marfat.com

بے حد خطرناک بھی ہے، کیونکہ اگر انسان کسی آیت کی غلط تشریح کر بیٹھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف ایک ایسی بات منسوب کر رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے نہیں کہی، اور ظاہر ہے کہ اس سے بڑی گمراہی کیا ہو سکتی ہے؟ جن لوگوں نے ضروری شرائط پوری کئے بغیر قرآن کریم کی تفسیر میں دخل اندازی کی ہے، وہ کافی محنت خرچ کرنے کے باوجود اس بدترین گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہیں، اس لئے یہاں ایک نظر اُن اسباب پر بھی ڈال لینی ضروری ہے جو انسان کو تفسیر قرآن کے معاملے میں گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں۔

پہلا سبب، نااہلیّت

تفسیر قرآن میں گمراہی کا سب سے پہلا اور سب سے خطرناک سبب یہ ہے کہ انسان اپنی اہلیت وصلاحیت کو دیکھے بغیر قرآن کریم کے معاملے میں رائے زنی شروع کر دے، خاص طور سے ہمارے زمانے میں گمراہی کے اس سبب نے بڑی قیامت ڈھائی ہے، یہ غلط فہمی عام ہوتی جارہی ہے کہ صرف عربی زبان پڑھ لینے کے بعد انسان قرآن مجید کا عالم ہو جاتا ہے، اور اس کے بعد جس طرح سمجھ میں آئے قرآن کریم کی تفسیر کر سکتا ہے، حالانکہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی علم وفن ایسا نہیں ہے جس میں محض زباں دانی کے بل پر مہارت پیدا ہو سکتی ہو، آج تک کبھی کسی ذی ہوش نے انگریزی زبان پر مکمل عبور رکھنے کے باوجود یہ دعویٰ نہیں کیا ہوگا کہ وہ ڈاکٹر ہو گیا ہے، اور میڈیکل سائنس کی کتابیں پڑھ کر دنیا پر مشقِ ستم کر سکتا ہے، اسی طرح کوئی شخص محض انجینیرنگ کتابوں کا مطالعہ کر کے انجینیئر بننے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور نہ قانون کی اعلیٰ کتابیں دیکھ کر ماہر قانون کہلا سکتا ہے، اور اگر کوئی شخص ایسا دعویٰ کرے تو یقیناً ساری دنیا اُسے احمق اور بیوقوف کہے گی، اس لئے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ تمام علوم وفنون محض زبان دانی اور نجی مطالعہ سے حاصل نہیں ہوتے، بلکہ اُن کے لئے سالہا سال کی محنت درکار ہے، انہیں ماہر اساتذہ سے پڑھا جاتا ہے، اس کے لئے بڑی بڑی درسگاہوں میں کئی کئی امتحانات سے گزرنا ہوتا ہے، پھر کسی ماہرِ فن کے پاس رہ کر ان کا عملی تجربہ کرنا پڑتا ہے، تب کہیں انسان ان علوم کا

Marfat.com

مبتدی کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔

جب ان علوم وفنون کا حال یہ ہے تو تفسیر قرآن کریم جیسا علم محض عربی زبان سیکھ لینے کی بناء پر آخر کیسے حاصل ہو جائے گا؟ آپ گزشتہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ علم تفسیر میں درک حاصل کرنے کے لئے کتنی وسیع معلومات درکار ہوتی ہیں؟ قرآن کریم عام کتابوں کی طرح کوئی ایسی مسلسل کتاب نہیں ہے۔ جس میں ایک موضوع کی تمام باتیں ایک ہی جگہ لکھی ہوئی ہوں، بلکہ وہ دنیا کی تمام کتابوں کے برخلاف اپنا ایک جداگانہ اور ممتاز اسلوب رکھتا ہے، لہٰذا کسی آیت کو قرار واقعی طور پر سمجھنے کے لئے اوّل تو یہ ضروری ہے کہ اس آیت کی مختلف قراءتوں، اُس موضوع کی تمام دوسری آیات اور ان کے متعلقات پر پوری نگاہ ہو، پھر آپ پیچھے دیکھ چکے ہیں کہ بہت سی آیتیں کسی خاص واقعاتی پس منظر سے وابستہ ہوتی ہیں، جسے سبب نزول کہا جاتا ہے، اور جب تک سبب نزول کی مکمل تحقیق نہ ہو اس کا پورا مفہوم نہیں سمجھا جا سکتا، نیز یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آچکی ہے کہ قرآن کریم بہت سی مجمل باتوں کی تشریح وتفسیر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر چھوڑ دیتا ہے، لہٰذا ہر آیت میں یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی قولی یا عملی تعلیم موجود ہے یا نہیں؟ اور اگر موجود ہے تو وہ تنقیدِ روایات کے مسلم اصولوں پر پوری اُترتی ہے یا نہیں؟ نیز صحابۂ کرامؓ نے جو نزول قرآن کے عینی شاہد تھے، اس آیت کا کیا مطلب سمجھا تھا؟ اگر اس بارے میں روایات کے درمیان کوئی تعارض واختلاف ہے تو اسے کیونکہ رفع کیا جا سکتا ہے؟ پھر عربی زبان ایک وسیع زبان ہے۔ جس میں ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی اور ایک ایک معنی کے لئے کئی کئی لفظ ہوتے ہیں، لہٰذا جب تک اُس زمانے کے اہلِ عرب کے محاورات پر عبور نہ ہو کسی معنی کی تعیین بہت مشکل ہوتی ہے، اس کے علاوہ صرف الفاظ کے لغوی معنی جاننے سے کام نہیں چلتا، کیونکہ عربی میں نحوی ترکیبوں کے اختلاف سے معانی میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، اور یہ بات عربی لغت وادب پر مکمل عبور کے بغیر طے نہیں کی جا سکتی، کہ اس مقام پر کونسی ترکیب محاوراتِ عرب کے زیادہ قریب ہے؟ اور سب سے آخر میں قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے کلام

کے اسرار و معارف ایسے شخص پر نہیں کھولتا جو اس کی نافرمانیوں پر کمر بستہ ہو، لہٰذا تفسیر قرآن کے لئے اللہ کی بندگی اس کے ساتھ تعلق خاص، طاعت و تقویٰ اور حق پرستی کے بے لاگ جذبے کی ضرورت ہے، اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تفسیر قرآن کے لئے صرف عربی زبان کی معمولی واقفیت کام نہیں دے سکتی، بلکہ اس کے لئے علم اصول تفسیر، علم حدیث اصول حدیث، اصول فقہ، علم فقہ، علم نحو، علم صرف، علم لغت، علم ادب اور علم بلاغت میں ماہرانہ بصیرت اور اس کے ساتھ طہارت و تقویٰ ضروری ہے، ان ضروری شرائط کے بغیر تفسیر کی وادی میں قدم رکھنا اپنے آپ کو گمراہی کے راستے پر ڈال دینے کے مرادف ہے، اور اسی طرزِ عمل کے بارے میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ:

مَنْ قَالَ فِی الْقُرْاٰنِ بِغَیْرِ عِلْمٍ فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ،

''جو شخص قرآن میں بغیر علم کے گفتگو کرے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔''

چند غلط فہمیاں

اس سلسلے میں چند غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے:

۱...... بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے خود اپنے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ

''اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنا دیا ہے، اب کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے؟۔''

اور جب قرآن کریم ایک آسان کتاب ہے تو اس کی تشریح کے لئے کسی لمبے چوڑے علم وفن کی ضرورت نہیں، بلکہ ہر شخص قرآن کریم کا متن پڑھ کر اس کو سمجھ سکتا ہے،

لیکن یہ استدلال ایک شدید مغالطہ ہے، جو خود کم فہمی اور سطحیت پر مبنی ہے، واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات دو قسم کی ہے، ایک تو وہ آیتیں ہیں جن میں عام نصیحت کی باتیں، سبق

آموز واقعات اور عبرت وموعظت کے مضامین بیان کئے گئے ہیں، مثلاً دنیا کی ناپائیداری، جنت ودوزخ کے حالات، خوفِ خدا اور فکر آخرت پیدا کرنے والی باتیں اور زندگی کے دوسرے سیدھے سادے حقائق اس قسم کی آیتیں بلاشبہ آسان ہیں، اور جو شخص بھی عربی زبان سے واقف ہو وہ انہیں سمجھ کر نصیحت حاصل کرسکتا ہے، بلکہ یہ مقصد قرآن کریم کے مستند تراجم دیکھ کر بھی ایک حد تک حاصل ہو جاتا ہے، مذکورہ آیت میں اسی مقصد کے لئے یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے، چنانچہ قرآن کریم نے یہ بات مجمل نہیں چھوڑی "للذکر" (یعنی نصیحت کے واسطے) کا لفظ بڑھا کر اس حقیقت کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے،

اس کے برخلاف دوسری قسم کی آیتیں وہ ہیں جو احکام وقوانین، عقائد اور علمی مضامین پر مشتمل ہیں، اس قسم کی آیتوں کا کماحقہ سمجھنا اور ان سے احکام ومسائل مستنبط کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے، جب تک اسلامی علوم میں بصیرت اور پختگی حاصل نہ ہو اُس وقت تک قرآن کریم سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا، یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ کی مادری زبان اگرچہ عربی تھی، اور عربی سمجھنے کے لئے انہیں کہیں تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے میں طویل مدتیں صرف کرتے تھے، علامہ سیوطیؒ وغیرہ نے امام عبدالرحمٰن سُلمیؒ سے نقل کیا ہے کہ جن حضرات صحابہؓ نے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے، مثلاً حضرت عثمان بن عفانؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ انہوں نے ہمیں بتایا کہ جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی دس آیتیں سیکھتے تو اُس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک ان آیتوں کے متعلق تمام علمی اور عملی باتوں کا احاطہ نہ کرلیں، وہ فرماتے تھے کہ:

فَتَعَلَّمْنَا الْقُرْاٰنَ وَالْعِلْمَ وَالْعَمَلَ جَمِيْعًا

"ہم نے قرآن اور علم وعمل ساتھ ساتھ سیکھا ہے۔"

چنانچہ موطا امام مالکؒ میں روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے صرف سورۂ بقرہ یاد کرنے میں پورے آٹھ سال صرف کئے، اور مسند احمدؒ میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم میں

سے جو شخص سورۂ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران پڑھ لیتا، ہماری نگاہوں میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا تھا۔(۱)

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ حضراتِ صحابہؓ جن کی مادری زبان عربی تھی، جو عربی شعر وادب میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے، اور جن کو لمبے لمبے قصیدے معمولی توجہ سے ازبر ہو جایا کرتے تھے، انہیں قرآن کریم حفظ کرنے اور اس کے معانی سمجھنے کے لئے اتنی طویل مدت کی کیا ضرورت تھی، کہ آٹھ آٹھ سال صرف ایک سورت پڑھنے میں خرچ ہو جائیں؟ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ قرآن کریم اور اس کے علوم کو سیکھنے کے لئے صرف عربی زبان کی مہارت کافی نہیں تھی، بلکہ اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تعلیم سے فائدہ اٹھانا ضروری تھا، ظاہر ہے کہ جب صحابۂ کرامؓ کو عربی زبان کی مہارت اور نزولِ وحی کا براہِ راست مشاہدہ کرنے کے باوجود ''عالمِ قرآن'' بننے کے لئے باقاعدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت تھی تو نزول قرآن کے سینکڑوں سال بعد عربی کی معمولی شُد بُد پیدا کر کے یا صرف ترجمے دیکھ کر مفسّر قرآن بننے کا دعویٰ کتنی بڑی جسارت اور علم ودین کے ساتھ کیسا افسوسناک مذاق ہے؟ ایسے لوگوں کو جو اس جسارت کا ارتکاب کرتے ہیں سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے کہ:

مَنْ قَالَ فِی الْقُرْاٰنِ بِغَیْرِ عِلْمٍ فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ،

''جو شخص قرآن میں بغیر علم کے گفتگو کرے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔''(۲)

علماء اور اجارہ داری

۲......بعض لوگ یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ قرآن کریم تمام انسانوں کے لئے ایک ہدایت کی کتاب ہے، لہٰذا ہر شخص کو اس سے اپنی سمجھ کے موافق فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے،

(۱) اتقان، ص۱۷۶ ج۲ نوع ۷۷۔

(۲) ابوداؤد، منقول از اتقان، ص۱۷۹ ج۲۔

Marfat.com

اور اس کی تشریح و تفسیر پر صرف علماء کی ''اجارہ داری'' قائم نہیں کی جاسکتی،

لیکن یہ بھی انتہائی سطحی اور جذباتی اعتراض ہے جسے حقیقت پسندی اور معاملہ فہمی سے دور کا بھی واسطہ نہیں، قرآن کریم بلاشبہ تمام انسانوں کے لئے سرمایۂ ہدایت ہے، لیکن اس سے یہ کیسے لازم آگیا کہ ہر اَن پڑھ جاہل بھی اس سے دقیق قانونی اور کلامی مسائل کا استنباط کرسکتا ہے، اور اس مقصد کے لئے کسی قسم کی صفاتِ اہلیت درکار نہیں ہیں، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ کوئی ماہر قانون، فلسفی، یا ڈاکٹر اگر اپنے فن پر کوئی کتاب لکھتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا منشاء پوری انسانیت کو فائدہ پہنچانا ہی ہوتا ہے، اب اگر کوئی ایسا شخص جو اِن علوم وفنون کے مبادی سے واقف نہیں ہے کھڑا ہوکر یہ اعتراض کرنے لگے کہ یہ کتابیں تو پوری انسانیت کے فائدے کے لئے لکھی گئی تھیں، اُن پر ماہرین قانون، فلسفیوں اور ڈاکٹروں نے اپنی اجارہ داری کیوں قائم کرلی ہے؟ تو اس کی عقل پر ماتم کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے؟ اگر کسی کتاب سے کماحقہ فائدہ اٹھانے کے لئے اہلیت کی کچھ صفات مقرر کرنا ''اجارہ داری'' قائم کرنے کی تعریف میں آتا ہے تو پھر دنیا کے کسی علم وہنر کو جاہلوں اور اناڑیوں کی دستبرد سے محفوظ نہیں رکھا جاسکتا، دراصل علم وفن کی ہر کتاب انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے لئے ہوتی ہے، لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کے دو ہی طریقے ہیں، یا تو انسان اس علم وفن کو باقاعدہ ماہر اساتذہ سے حاصل کرے، اور اس کے لئے جو محنت اور جتنا وقت درکار ہے، اُسے خرچ کرے، اور اگر وہ ایسا نہیں کرسکتا تو جن لوگوں نے اس علم وفن کو حاصل کرنے کے لئے اپنی عمریں کھپائی ہیں اُن میں سے جس پر زیادہ اعتماد ہو، اُس کی تشریح وتفسیر پر بھروسہ کرے، ان دو راستوں کے علاوہ جو شخص کوئی تیسرا راستہ اختیار کرے گا وہ اپنے اوپر بھی ظلم کریگا اور متعلقہ علم وفن پر بھی، بالکل یہی معاملہ قرآن وسنت کا بھی ہے، کہ وہ بلاشبہ پوری انسانیت کے لئے دستورِ ہدایت ہیں، لیکن اُن سے ہدایت حاصل کرنے کے بھی دو ہی طریقے ہیں، یا تو انسان ان علوم کو ماہر اساتذہ سے باقاعدہ حاصل کرکے ان میں پوری بصیرت پیدا کرے، یا پھر اُن لوگوں کی تشریح وتفسیر پر اعتماد کرے جنہوں نے اپنی زندگیاں ان علوم کے لئے وقف کی ہیں اس سوفی صد معقول اصول کو جس پر دنیا کے ہر

Marfat.com

علم وفن کے معاملے میں عمل کیا جاتا ہے، ''اجارہ داری'' کا طعنہ دینا سوائے سطحی جذباتیت کے اور کیا ہے؟ کیا ساری دنیا میں صرف قرآن وسنت ہی (معاذ اللہ) ایسے لاوارث رہ گئے ہیں کہ اُن سے مسائل مستنبط کرنے کے لئے اہلیت کی کوئی شرط درکار نہیں ہے؟ اور اُن پر ہر کس وناکس مشقِ ستم کرسکتا ہے؟

علماء اور پاپائیت

۳...... مذکورہ اعتراض ہی کو قدرے مختلف عنوان سے بعض لوگ اس طرح تعبیر کرتے ہیں کہ اسلام میں ''پاپائیت'' کی کوئی گنجائش نہیں ہے، یہ بات عیسائی مذہب کا خاصہ ہے کہ اس میں بائبل کی تشریح وتفسیر کا حق صرف پوپ کو حاصل ہوتا ہے، اور کسی دوسرے شخص کو اس سے مجالِ اختلاف نہیں ہوتی، اسلام نے پاپائیت کی جڑ کاٹی ہے، لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ اس دین فطرت میں بھی قرآن کریم کی تفسیر کا سارا حق علماء کے ایک مخصوص طبقے کے حوالے کردیا جائے؟

لیکن یہ اعتراض بھی پاپائیت اور علمائے اسلام دونوں کی بات کو غلط سمجھنے کا نتیجہ ہے، ''علماء'' کسی ایسے مخصوص طبقے یا گروہ کا نام نہیں ہے جس کی بنیاد رنگ ونسل، ذات پات، مال ودولت یا جاہ ومنصب کی خاص شرائط پر ہو، نہ ''علماء'' کسی ایسی لگی بندھی تنظیم کا نام ہے، جس کا رُکن بنے بغیر انسان ''عالم'' کہلانے کا مستحق نہ ہو، بلکہ علم وفضل اور سیرت وکردار کی کچھ مخصوص صفات کا حامل ہر شخص عالم دین ہے، خواہ وہ کسی خطے سے تعلق رکھتا ہو، کوئی زبان بولتا ہو، اور نسب کے اعتبار سے کسی بھی خاندان سے وابستہ ہو، اس لحاظ سے اسلام کے علماء اور عیسائیت کے پاپاؤں میں مندرجہ ذیل واضح فرق موجود ہیں:

۱...... ''پاپائیت'' ایک ایسے پیچیدہ مذہبی نظام کا نام ہے جو ایک لگی بندھی عالمگیر تنظیم میں جکڑا ہوا ہے، اس میں بے شمار عہدے اور منصب ہیں، ان عہدوں اور مناصب پر فائز ہونے والوں کی تعداد مقرر ہے، ہر عہدہ ومنصب پر کسی شخص کا تقرر کچھ معیّن انسان کرتے ہیں، اور وہی

Marfat.com

اس کو فرائض واختیارات تفویض کرتے ہیں، کوئی شخص محض اپنی ذاتی اہلیّت، علم وفضل یا سیرت وکردار کی بنیاد پر لازماً اس تنظیم میں کوئی عہدہ حاصل نہیں کرسکتا، جب تک کہ اس تنظیم کے اربابِ اقتدار اُسے نامزد نہ کریں، اور جب تک وہ اس تنظیم میں کوئی عہدہ حاصل نہ کرے مذہبی معاملات میں اُس کی ہر رائے قطعی غیر مؤثر ہے، خواہ وہ علم وفضل کے کتنے ہی بلند مقام پر فائز ہو، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مذہبی علوم میں اعلیٰ درجے کی مہارت حاصل کرلے تب بھی وہ دلائل کے زور سے چرچ کے مضبوط حصار کو نہیں توڑ سکتا، اور اگر یہ معیّن تنظیم اپنی کتبِ مقدسہ اپنے پیغمبروں اور اپنے اسلاف سے بغاوت پر کمر باندھ لے تب بھی تنظیم سے باہر کے کسی عالم کو اس کے خلاف دَم مارنے کی گنجائش نہیں ہے،

اس کے برخلاف ''علمائے اسلام'' کی کسی بھی زمانے میں اس نوعیت کی کوئی عالمگیر تنظیم نہیں رہی، جس میں داخلے کے بغیر مذہبی معاملات میں لب کشائی ممنوع ہو، جس کے عہدوں کا دائرہ اختیار خاص ہو، اور جن میں تقرر کا فیصلہ کچھ مخصوص افراد کرتے ہوں، اس کے بجائے ہر وہ شخص جس نے ماہر اساتذہ کے زیرِ نگرانی قرآن وسنت اور متعلقہ علوم میں بصیرت اور اصلاح وتقویٰ پیدا کرلیا ہو وہ ''عالم دین'' کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے، مذہبی معاملات میں اُس کے فرائض واختیارات کا تعیّن معدودے چند انسانوں کا کوئی گروہ نہیں کرتا، بلکہ اس کے علم وتقویٰ کی بنیاد پر عام مقبولیت اس کا فیصلہ کرتی ہے، چرچ کے اربابِ بست وکشاد اپنے عہدہ ومنصب کے زور پر اپنی بات منواتے ہیں، اور ایک مسلمان عالم اپنے علم وفضل اور سیرت وکردار کی قوّت سے یہ مقام حاصل کرتا ہے، وہاں چرچ کے متشدّد قوانین کسی شخص کو واجب الاتباع اور قابل تقلید قرار دیتے ہیں اور یہاں اس معاملے میں اصل فیصلہ کن قوّت اُمّت کا اجتماعی ضمیر ہے، کلیسا کے عہدہ داروں کی ایک تعداد مقرر ہے اور اس تعداد کے پورا ہو جانے کے بعد کوئی شخص کتنا ہی بڑا عالم ہو اپنے زمانے کے کلیسا کے کسی فیصلے سے اختلاف نہیں کرسکتا، اس کے برعکس علمائے دین کی کوئی تعداد مقرر نہیں ہے، علم دین کی ضروری شرائط پوری کرنے کے بعد ہر شخص عالم دین کے حقوق حاصل کرسکتا ہے،

Marfat.com

۲...... پھر کلیسائی نظام میں مذہب اور عقائد کی تشریح وتفسیر کے تمام اختیارات فردِ واحد پر مرکوز ہو جاتے ہیں، جسے ''پوپ'' کہتے ہیں، اس پوپ کو مذہب کے کروڑوں پیروؤں میں سے کل ستر کارڈینل (Cardinals) منتخب کرتے ہیں، اس پوپ کے اختیارات یہ ہیں کہ وہ رئیس الحوارین (جناب پطرس) کا تنہا خلیفہ ہے، تمام مذہبی معاملات میں آخری اتھارٹی ہے، مذہب کی تشریح کے معاملے میں ہر مسیحی کے لئے واجب الاتباع ہے، اس کی زبان قانون کی حیثیت رکھتی ہے، اور کسی بڑے سے بڑے عالم کو اس سے اختلاف کا حق نہیں پہنچتا، ''انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا'' میں اس کے اختیارات کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> ''لہٰذا پوپ عقائد ونظریات کے معاملہ میں مقتدرِ اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے اسی استناد (Authority) اور اسی معصومیت (Infallibility) کا حامل ہے، جس طرح پورا کلیسا، وہ قانون ساز اور جج کی حیثیت وہ تمام اختیارات رکھتا ہے جو پوری کلیسا کو حاصل ہیں (۱)......''

غور فرمائیے کہ پوری تاریخِ اسلام میں آج تک کسی بھی عالم دین نے کبھی اس مطلق العنانی کا دعویٰ کیا ہے؟

۳...... پھر عیسائی عقائد کے مطابق ''پوپ'' نظریاتی مسائل کا اعلان کرتے ہوئے معصوم اور خطاؤں سے پاک ہوتا ہے، چنانچہ برٹانیکا میں ہے:

> ''لہٰذا پوپ کے دو خصوصی امتیازات ہیں، ایک یہ کہ جب وہ مقتدرِ اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے عقائد کے بارے میں کوئی اعلان کرے تو وہ معصوم اور غلطیوں سے پاک ہوتا ہے، اور دوسرے یہ کہ وہ مذہب کے تمام پیروؤں پر حاکمانہ اختیار کامل (Sovereign jurisdiction) رکھتا ہے، یہ دونوں استحقاقات جن کا دعویٰ اور

---

(۱) انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا مقالہ ''پوپ'' ص ۲۲۲و۲۲۳ ج ۱۸۔

استعمال صدیوں سے پوپ کرتے آئے ہیں، ان کو جولائی ۱۸۷۰ء
کی ویٹی کن کونسل میں واضح دستوری شکل بھی دیدی گئی ہے۔"(۱)

اس کے برخلاف یہ تمام علمائے اسلام کا متفقہ عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے بعد کوئی فرد معصوم نہیں ہے، اور ہر ایک سے غلطی ہو سکتی ہے، چنانچہ علمائے اسلام پوری آزادی سے ایک دوسرے پر تنقید کرتے آئے ہیں، اور یہ سلسلہ عہدِ صحابہؓ سے اب تک جاری ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ کوئی مشہور سے مشہور عالم اگر قرآن وسنت کی تشریح میں کوئی غلطی کرے تو دوسرے تمام علماء اس کی گرفت کر کے اُمت کو اس کے نتائجِ بد سے محفوظ کر سکتے ہیں،

۴...... پھر کلیسا میں جو ستر کارڈینل پوپ کا انتخاب کرتے اور اس کو مشورے دیتے ہیں ان کی نامزدگی خود پوپ صاحب تنِ تنہا کرتے ہیں، چنانچہ "برٹانیکا" میں ہے:

"کارڈنیلوں کی نامزدگی آجکل تنِ تنہا پوپ کا کام ہے، پوپ جن افراد کو خفیہ طور پر چُنتا ہے، اُن کے ناموں کی اشاعت سے یہ کام مکمل ہو جاتا ہے اس کے لئے کسی اور ضابطے کی پابندی ضروری نہیں،......
اسی طرح سیکرڈ کالج کی ووٹنگ یا منظوری کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔"(۲)

اس کے علاوہ کلیسا کے یہ اربابِ اقتدار جو مذہب کے سیاہ وسفید کے مالک ہوتے ہیں ان کا تقرر محض اہلیت کی بنیاد پر نہیں ہوتا، بلکہ مختلف خِطوں میں مختلف علاقائی تعصبات کار فرما ہوتے ہیں، "برٹانیکا" ہی کا ایک اور بیان ملاحظہ ہو:

"ریاستہائے متحدہ امریکہ میں کلیسا دنیا کی ہر قوم کے مختلف گروپوں سے مرکب ہوتا ہے، لیکن انگریزی بولنے والی اقوام اکثریت میں ہوتی ہیں، اُنیسویں صدی کے وسط تک آئرش اور جرمن اقوام کو سب

---

(۱) انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا مقالہ "پوپ" ص ۲۲۳ ج ۱۸، مزید دیکھئے مقالہ "معصومیت" (Infallibility)
(۲) انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ص ۸۵۵ ج ۴، مقالہ "کارڈینل"

Marfat.com

سے زیادہ کوٹا حاصل تھا،...... ان کے علاوہ مشرقی کیتھولک اقوام مثلاً (یونانی، شامی اور آرمینی) ایک قابلِ لحاظ تناسب سے موجود ہیں"(۱)

اس مختصر سے تعارف کے بعد پاپائی نظام کا موازنہ علمائے اسلام سے کیجئے تو دونوں میں زمین و آسمان کا تفاوت ہے، علماءِ اسلام کی نہ کوئی لگی بندھی تنظیم ہے، نہ کوئی فردِ واحد مذہبی معاملات میں حاکم اعلیٰ ہے، نہ کوئی شخص معصومیت اور غلطیوں سے پاک ہونے کا دعویٰ دار ہے، نہ علماء کی کوئی مخصوص تعداد مقرر ہے جس پر اضافہ نہ ہو سکتا ہو، نہ کوئی شخص دوسرے علماء کی تنقید سے بالاتر ہے، نہ عالم کے منصب پر فائز ہونے کے لئے کسی فردِ واحد کی اجازت اور منظوری درکار ہے، نہ اس منصب کے لئے کسی رنگ و نسل یا زبان و وطن کی کوئی قید ہے، بلکہ تاریخ اسلام میں اکثر سیاست عربوں کے پاس رہی، لیکن علماء عجمیوں بلکہ غلاموں کے خاندان سے پیدا ہوتے رہے، اور پورا عالم اسلام ان کے علم و فضل اور تقدس و تقویٰ کا لوہا مانتا رہا، لہٰذا جب یہ بات کہی جاتی ہے کہ قرآن و سنت کے علوم میں دخل اندازی کے لئے ان علوم میں بصیرت و مہارت درکار ہے تو اُس پر "پاپائیت" کا الزام عائد کرنا حقیقت اور انصاف کے ساتھ ایک سنگین مذاق کے سوا کچھ نہیں،(۲) اس کے بجائے درحقیقت دینی علوم کی مثال دوسرے علوم کی سی ہے، جس طرح دنیا کے تمام علوم فنون کے بارے میں کسی شخص کی بات اُس وقت تک قابلِ قبول نہیں ہو سکتی جب تک اس نے اُس متعلقہ علم کو ماہر اساتذہ سے حاصل کر کے ان کا عملی تجربہ حاصل نہ کیا ہو، اسی طرح قرآن و سنت کی تشریح و تفسیر میں کسی کی بات اُس وقت تک قابلِ قبول نہیں ہوگی جب تک اس نے متعلقہ علوم کو باقاعدہ حاصل کر کے ماہر اساتذہ کے زیر

(۱) انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ص ۸۵۵ ج ۴، مقالہ "رومن کیتھولک چرچ" ص ۱۲۱ ج ۱۹۔

(۲) یہاں ہمارا منشاء صرف یہ بتانا ہے کہ علماء اسلام اور پاپاؤں کے درمیان کیا فرق ہے؟ یہ بات فی الحال ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ پاپائیت کے نظام میں واقعۃً کتنی خرابیاں اور کتنی اچھائیاں ہیں؟ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ پروٹسٹنٹ فرقے کے پروپیگنڈہ نے جہاں پاپائیت کی حقیقی خرابیوں کی نشاں دہی کی ہے، وہاں اسے محض بدنام کرنے کے لئے بہت سے الزامات غلط بھی لگائے ہیں جو اس پر عائد نہیں ہوتے، لیکن یہاں اس بحث کا موقع نہیں ہے۔ محمد تقی۔

نگرانی اُن کا عملی تجربہ نہ کیا ہو، اگر اس بات کو کوئی شخص "پاپائیت" سے تعبیر کرتا ہے، تو دنیا کا کوئی علم وفن اس "پاپائیت" سے خالی نہیں ہوسکتا،

۲...... قرآن کریم کو اپنے نظریات کے تابع بنانا

تفسیر قرآن کے سلسلے میں دوسری عظیم گمراہی یہ ہے کہ انسان اپنے ذہن میں پہلے سے کچھ نظریات متعیّن کر لے، اور پھر قرآن کریم کو اُن نظریات کے تابع بنانے کی فکر کرے، جیسا کہ علّامہ ابن تیمیہؒ نے نشان دہی فرمائی ہے (۱) قدیم زمانے سے باطل فرقوں، ظاہر پرستوں اور اپنے وقت کے فلسفے سے مرعوب لوگوں نے تفسیر قرآن میں یہی گمراہ کن طریقہ اختیار کیا ہے، اور الفاظ قرآنی کو توڑ موڑ کر اپنے نظریات کے مطابق بنانے کی کوشش کی ہے، حالانکہ یہ طرزِ عمل دنیا کے کسی بھی معاملہ میں حق وانصاف کے مطابق نہیں ہے، خاص طور سے قرآن کریم کے بارے میں یہ طریق کار اختیار کرنا اتنا بڑا ظلم ہے کہ اس کے برابر کوئی ظلم نہیں ہوسکتا، قرآن کریم نے جگہ جگہ اپنے آپ کو "ہدایت" کی کتاب قرار دیا ہے، "ہدایت" کے معنی یہ ہیں کہ "جس شخص کو منزل کا راستہ معلوم نہ ہو اُسے راستہ دکھلانا" لہٰذا قرآن کریم سے "ہدایت" حاصل کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ انسان اپنے آپ کو اس شخص کی طرح خالی الذہن رکھے جسے اپنی منزل کا پتہ معلوم نہ ہو، اس کے بعد دل میں یہ اعتقاد پیدا کرے کہ قرآن کریم جو راستہ بتائے گا وہی میرے لئے صلاح وفلاح کا موجب ہوگا، خواہ اسے میری محدود عقل قبول کرے یا نہ کرے، اگر میری عقل ایسی ہی قابل اعتماد تھی کہ میں اس کے زور پر سب کچھ معلوم کرسکتا تھا تو پھر قرآن کریم کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اس اعتقاد کے ساتھ جب انسان قرآن کریم کی طرف رجوع کرے گا، اور اُن آداب وشرائط کو ملحوظ رکھے گا جو قرآن کریم سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہیں تو اُسے بلاشبہ ہدایت حاصل ہوگی اور وہ منزل مراد کو پالے گا،

اس کے برعکس اگر کسی شخص نے محض اپنی عقل کی بنیاد پر کچھ مخصوص نظریات اپنے ذہن

(۱) اصول التفسیر، لابن تیمیہؒ صفحہ ۲۳ مطبوعہ مکتبہ علمیہ لاہور۔

Marfat.com

میں پہلے سے بٹھالئے، اور پھر قرآن کریم کو اُن مخصوص نظریات کی عینک سے پڑھنا شروع کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی اس مقدس کتاب کو ہدایت حاصل کرنے کے لئے نہیں، بلکہ محض اپنے عقلی نظریات کی تائید حاصل کرنے کے لئے پڑھ رہا ہے، ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی عقل پر اتنا بھروسہ کرتا ہو اور اپنی عقل کو قرآن کا خادم نہیں بلکہ (معاذ اللہ) قرآن کو اپنی عقل اور خواہشات کا خادم بنانا چاہتا ہو، قرآن کریم اسے ہدایت کی روشنی عطا کرنے سے بے نیاز ہے، ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی صحیح مراد تک پہنچنے کے بجائے اپنی گمراہی کی دلدل میں پھنستا چلا جاتا ہے، اور اُسے ہدایت کی توفیق نہیں ہوتی، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا ہے:

﴿ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ﴾

"اللہ تعالیٰ اس (قرآن) کے ذریعے بہت سوں کو گمراہ کرتا ہے، اور بہت سوں کو ہدایت بخشتا ہے۔"

لہٰذا قرآن کریم سے ہدایت حاصل کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اپنے ذہن کو دوسرے نظریات سے خالی کر کے ایک طالب حق کی طرح قرآن کریم کی طرف رجوع کیا جائے، اور اس کی مراد سمجھنے کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے، اُن کو حاصل کر کے اس کی تفسیر معلوم کی جائے، اور اس طرح جو کچھ ثابت ہو اس پر ایک سچے مؤمن کی طرح ایمان رکھا جائے، اور جو شخص اتنی استطاعت نہ رکھتا ہو، یا اُسے اپنے ذہن پر یہ اعتماد نہ ہو اس کے لئے سیدھا راستہ یہ ہے کہ وہ خود "تفسیر قرآن" کی وادی میں قدم رکھنے کے بجائے اُن لوگوں کی تفسیر پر بھروسہ کرے، جنہوں نے اپنی عمریں اسی کام میں صرف کی ہیں، اور جن کی علمی بصیرت اور للّٰہیت وخدا ترسی پر اُسے زیادہ اعتماد ہو۔

۳..... زمانے کے افکار سے مرعوبیت

تفسیر قرآن کے سلسلے میں تیسری گمراہی یہ ہے کہ انسان اپنے وقت کے فلسفیانہ اور عقلی

Marfat.com

نظریات سے ذہنی طور پر مرعوب ہو کر قرآن کریم کی طرف رجوع کرے، اور تفسیر قرآن کے معاملے میں اُن نظریات کو حق و باطل کا معیار قرار دے دے، یہ گمراہی دراصل دوسری گمراہی کے ذیل میں خود بخود آجاتی ہے، لیکن چونکہ ہمارے زمانے میں مغربی افکار سے مرعوبیت نے خاص طور سے بڑی قیامت ڈھائی ہے اس لئے یہاں اس گمراہی کو مستقل طور سے ذکر کیا جارہا ہے،

تاریخ اسلام کے ہر دَور میں ایسے افراد کی ایک جماعت موجود رہی ہے جو قرآن وسنت کے علوم میں پختگی پیدا کئے بغیر اپنے زمانے کے فلسفے کی طرف متوجہ ہوئے، اور وہ فلسفہ ان کے ذہنوں پر اس بُری طرح مسلّط ہو گیا کہ وہ اس کے بنائے ہوئے فکر و نظر کے دائروں سے باہر نکلنے کی صلاحیت سے ہی محروم ہو گئے، اس کے بعد جب انہوں نے قرآن کریم کی طرف رجوع کیا، اور اس کی بہت سی باتیں انہیں اپنے آئیڈیل فلسفے کے خلاف محسوس ہوئیں تو انہوں نے اس فلسفے کو جھٹلانے کے بجائے قرآن کریم میں تحریف و ترمیم شروع کردی، اور اس کے الفاظ کو کھینچ تان کر اپنے فلسفیانہ افکار کے مطابق بنانا شروع کردیا،

جب مسلمانوں میں یونانی فلسفے کا چرچا ہوا، اور لوگوں نے قرآن وسنت کے علوم میں پختگی پیدا کئے بغیر اس فلسفے کو حاصل کرنا شروع کیا، تو یہی فتنہ پیش آیا، اور بعض لوگ جو یونانی فلسفے سے بُری طرح مرعوب ہو گئے تھے، قرآن کریم کو توڑ موڑ کر اس فلسفے کے مطابق بنانے کی کوشش میں لگ گئے، ان میں بہت سے لوگ مخلص بھی تھے، اور سچے دل سے یہ سمجھتے تھے کہ یونانی فلسفہ نا قابلِ تردید ہے، اور قرآن وسنت کی متوارث تفسیر اس کے لائے ہوئے فکری سیلاب کا مقابلہ نہیں کر سکے گی، اس لئے اس تفسیر کو بدل کر قرآن وسنت کی ایسی تشریح کرنی چاہئے جو یونانی فلسفے کے مطابق ہو، لیکن درحقیقت یہ قرآن وسنت اور اسلام کے ساتھ ایک نادان دوستی تھی جس نے اسلام کی کوئی خدمت کرنے کے بجائے مسلمانوں میں نظریاتی انتشار برپا کیا، اور معتزلہ اور جہمیہ جیسے بہت سے نئے فرقے پیدا کردیئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پختہ کار علمائے دین جنہیں قرآن وسنت کے علوم میں رسوخ حاصل تھا، اور جو قرآن وسنت

Marfat.com

کے مقابلے میں وقت کے کسی چلتے ہوئے نظام فکر سے مرعوب نہیں تھے، اُن کی ایک بڑی جماعت کو دوسرے کام چھوڑ کر ایسے لوگوں کی تردید میں مصروف ہو جانا پڑا اور انہوں نے یونانی فلسفے کی فکری غلطیوں کی نشان دہی کر کے ایسے لوگوں کی مدلّل اور مفصّل تردید کی جو اس فلسفے کے اثر سے قرآن وسنت میں معنوی تحریف کے مرتکب ہوئے تھے، غرض ایک عرصے تک فکری مباحث اور تصنیف ومناظرہ کا بازار گرم رہا، اور فریقین کی طرف سے اپنے اپنے موقف کی تائید میں پورے کتب خانے تیار ہو گئے،

پختہ کار علماءِ دین کا موقف یہ تھا کہ قرآن کریم کسی انسان کی نہیں اُس خالقِ کائنات کی کتاب ہے جو اس دنیا اور اس میں ہونے والے واقعات کی رتّی رتّی سے باخبر ہے، اور اس دنیا کے بدلتے ہوئے حالات سے اس سے زیادہ کوئی باخبر نہیں ہوسکتا، لہٰذا قرآن کریم کی تعلیمات اور اس کے بیان کردہ حقائق سدا بہار، اور نا قابل ترمیم ہیں، جن احکام وقوانین اور نظریات پر زمانے کی تبدیلی اثر انداز ہوسکتی تھی اُن کے بارے میں قرآن کریم نے خود کوئی معیّن بات کہنے کے بجائے ایسے جامع اصول بیان فرمادیئے ہیں جو ہر تبدیلی کے موقع پر کام آسکیں، اور اُن کی روشنی میں ہر بدلے ہوئے ماحول میں رہنمائی حاصل کی جاسکے، لیکن جو باتیں قرآن کریم نے وضاحت کے ساتھ بیان فرمادی ہیں، یا جن کی واضح تفسیر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، وہ زمانے کی تبدیلی سے بدلنے والی باتیں نہیں ہیں،

فلسفہ اور سائنس کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اس کے وہ بیشتر نظریات جو قطعی مشاہدہ پر مبنی نہیں ہیں، مختلف زمانوں میں بدلتے رہے ہیں، اور جس زمانے میں جو نظریہ رائج رہا وہ لوگوں کے ذہن وفکر پر اس بڑی طرح چھا گیا کہ لوگ اس کے خلاف کوئی بات سننے کے لئے تیار نہ رہے، لیکن جب زمانے کے کسی انقلاب نے اس نظریئے کی کایا پلٹی تو وہی نظریہ اتنا بدنام ہوا کہ اس کو منہ سے نکالنا بھی دقیانوسیت کی علامت بن گیا، اب اس کی جگہ کسی نئے نظریئے نے ذہنوں پر اپنا سکہ بٹھایا، اور اس کی گھن گرج نے ہر مخالف رائے کا گلا گھونٹ دیا، پھر ایک عرصہ گزرنے پر یہ نیا نظریہ بھی اپنی آن بان کھو بیٹھا، اور کسی تیسرے نظریئے نے اس کی جگہ

Marfat.com

لے لی، فکرِ انسانی کی تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے، اور جب تک حقیقت کی پیاس انسان کو قطعی مشاہدے تک نہیں پہنچا دیتی اُس وقت تک یہی ہوتا رہے گا، اس کے برخلاف قرآن کریم نے جن حقائق کی طرف واضح رہنمائی عطا کی ہے، وہ چونکہ ایک ایسی ذات کے بیان کئے ہوئے ہیں جس کے سامنے یہ پوری کائنات اور اس میں ہونے والے حوادث ہاتھ کی ہتھیلی سے زیادہ واضح اور بے غبار ہیں، اس لئے فکر اور فلسفے کی اس آنکھ مچولی کو اس کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جاسکتا، آپ زمانے کے جس نظریہ سے مرعوب ہوکر قرآن کریم کو اس کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں گے، ہوسکتا ہے کہ وہی نظریہ عہد جہالت کی یادگار ثابت ہو، اور آپ اسے زبان پر لاتے ہوئے بھی شرمانے لگیں،

راسخ العقیدہ اہلِ علم کا یہ طرزِ فکر تجربے سے بالکل سچا ثابت ہوا، آج فلسفہ اور سائنس کی ترقیات نے یونانی فلسفے کی دھجیاں بکھیر دی ہیں، اور اس کے نہ صرف بہت سے طبعی، عنصری اور فلکیاتی نظریات غلط قرار پاگئے، بلکہ اُن کی بنیاد پر مابعد الطبعی (Metaphysical) نظریات کی جو عمارت اٹھائی گئی تھی، وہ بھی زمین بوس ہوچکی ہے، جن لوگوں نے یونانی فلسفے کی چمک دمک سے خیرہ ہوکر قرآن وسنت کو موم کی ناک بنایا تھا، آج اگر وہ زندہ ہوتے تو یقیناً اُن کی ندامت وشرمندگی کی کوئی انتہا نہ رہتی،

لیکن حیرت ہے کہ سطح پرستوں کا ایک گروہ تاریخ سے کوئی سبق لینے کے بجائے مغربی افکار سے متاثر ومرعوب ہوکر قرآن وسنت کی ایسی تفسیر گھڑنے کی فکر میں ہے جو مغرب کے چلے ہوئے نظریات پر فٹ ہوسکے، یہ گروہ تفسیر کے تمام معقول اور معروف اصولوں کو توڑ کر صرف ایک اصول کی بنیاد پر قرآن کریم کے ساتھ مشقِ ستم میں مصروف ہے، اور وہ اصول یہ ہے کہ اللہ کے اس کلام کو کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر مغربی افکار کے مطابق بنادیا جائے، یہ لوگ کبھی یہ سوچنے کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ جس کلام پر وہ تاویل وتحریف کی مشق کررہے ہیں وہ کس کا کلام ہے؟ جن نظریات کی خاطر وہ خدا کے کلام میں کھینچ تان کررہے ہیں، وہ کتنے پائیدار ہیں؟ اور جب فکرِ انسانی کا قافلہ ان نظریات کو روند کر اور آگے بڑھے تو اس قسم کی تفسیروں اور

Marfat.com

تشریحات کا حشر کیا ہوگا؟

معجزات کا مسئلہ

یہ بات ایک مثال سے واضح ہوگی، جب مغرب کے مشہور فلسفی نیوٹن نے سترہویں صدی میں قانونِ تجاذب کا انکشاف کیا تو اس کائنات اور اس میں پائی جانے والی ہر چیز کے بارے میں ایک نظریہ مقبول عام ہوگیا، جسے "میکانکی نظریۂ حیات" کہتے ہیں، اور سادہ لفظوں میں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ پوری کائنات علّت و معلول کے نظام میں اس طرح جکڑی ہوئی ہے کہ اس سے سرِ مُو تجاوز نہیں کرسکتی، یہاں پائی جانے والی ہر چیز کی ایک فطرت یا نیچر ہے، جو اس کے لئے لازم ذات ہے، اور کبھی اس سے الگ نہیں ہوسکتی، مثلاً آگ کی فطرت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جلائیگی، اس طرح فطرت کا اس سے الگ ہونا ممکن نہیں، چنانچہ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ آگ موجود ہو اور اس سے جلانے کی خاصیت ختم ہوجائے،

جب پوری دنیا میں اس نظریہ کا ڈنکا بجنا شروع ہوا تو مغرب کے مفکرین نے ایسے تمام واقعات کا مذاق اڑانا شروع کیا، جنہیں وہ مافوق الفطرت (Super Natural) سمجھتے تھے، اور جو اُن کے دریافت کئے ہوئے علّت و معلول کے نظریہ کے خلاف تھے، چنانچہ انہوں نے ہر اُس چیز کو توہم پرستی قرار دیدیا جو عادی اسباب کے ماتحت واقع نہ ہوئی ہو، اس نظریئے کی گھن گرج اور اس سے زیادہ "مافوق الفطرت" اشیاء کے استہزاء نے عالم اسلام کے بعض متجددین کو بھی انتہائی مرعوب و متأثر کردیا، اور جب انہوں نے دیکھا کہ قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کے بہت سے معجزات مذکور ہیں جو اس نظریہ سے میل نہیں کھاتے، تو انہوں نے قرآن کریم کے الفاظ میں ایسی کھینچ تان شروع کردی جس سے یہ سارے معجزات اہلِ مغرب کی اصطلاح میں "مافوق الفطرت" یا "سپر نیچرل" ہونے کے بجائے عادی اسباب کے ماتحت آجائیں، مثلاً علّت و معلول کے مذکورہ بالا نظریہ کے مطابق جلانا آگ کی لازمی خاصیت تھی جو کبھی اس سے جُدا نہیں ہوسکتی، لیکن قرآن کریم نے واضح الفاظ

Marfat.com

میں بیان کیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو اُن کے لئے آگ کو ٹھنڈا کر دیا گیا تھا، چنانچہ عالم اسلام کے بعض تجدّد پسند لوگوں نے اس واقعے ہی سے سرے سے انکار کر دیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تھا، اور اس غرض کے لئے قرآن کریم کی واضح آیتوں میں ایسی کھینچ تان شروع کر دی جو قرآن کی معنوی تحریف کی حد تک پہنچ گئی، اور جو تیرہ سو سال کے عرصے میں قرآن وسنت کے کسی عالم کے وہم وگمان میں بھی نہیں آئی تھی، اور پوری اُمت کے برخلاف آیاتِ قرآنی کی اس تحریفِ معنوی کا جواز پیدا کرتے ہوئے سر سید احمد خان صاحب نے لکھا:

''ان کے (قدیم علمائے اسلام کے) زمانے میں نیچرل سینز نے ترقی نہیں کی تھی، اور کوئی چیز اُن کو قانونِ فطرت کیطرف رجوع کرنے والی اور اُن کی غلطیوں سے متنبہ کرنے والی نہ تھی، پس یہ اسباب اور مثل ان کے اور بہت سے اسباب ایسے تھے کہ اُن کی کافی توجہ قرآن مجید کے ان الفاظ کی طرف نہیں ہوئی، مثلاً ...... حضرت ابراہیمؑ کے قصے میں کوئی نص صریح اس بات پر نہیں ہے کہ درحقیقت اُن کو آگ میں ڈال دیا گیا تھا، مگر انہوں نے اس بات پر خیال نہیں کیا۔''(۱)

حالانکہ احادیث وروایات سے قطع نظر، خود قرآن کریم کے الفاظ اس واقعہ سے متعلق یہ ہیں:

﴿ قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانْصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ ﴾ قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَى إِبْرَاهِيمَ ﴾ وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ ﴾ (الانبیآء ۶۸ تا ۷۰)

''وہ (ایک دوسرے سے) کہنے لگے: ''آگ میں جلا ڈالو اس شخص کو، اور اپنے خداؤں کی مدد کرو، اگر تم میں کچھ کرنے کا دم خم ہے۔'' (چنانچہ انہوں نے ابراہیم کو آگ میں ڈال دیا، اور) ہم نے کہا: ''

(۱) مقدمہ تفسیر قرآن از سر سید احمد خان، ص ۱۷ ج ۱۔

Marfat.com

اے آگ! ٹھنڈی ہوجا، اور ابراہیم کے لئے سلامتی بن جا۔'' اُن لوگوں نے ابراہیم کے لئے بُرائی کا منصوبہ بنایا تھا، مگر نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اُنہی کو بُری طرح ناکام کردیا۔''

﴿ قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ﴿﴾ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ ﴾ (الصّٰفّٰت: ۹۸/۹۷)

''اُن لوگوں نے کہا: ''ابراہیم کے لئے ایک عمارت بناؤ، اور اُسے دہکتی ہوئی آگ میں پھینک دو۔'' اس طرح اُنہوں نے ابراہیم کے خلاف ایک بُرا منصوبہ بنانا چاہا، لیکن ہم نے انہیں نیچا دکھادیا۔''

ان واضح اور صریح الفاظ پر تحریف وتاویل کی مشقِ ستم صرف اس بناء پر کی گئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ سے زندہ سلامت نکل آنے کا یہ واقعہ مغرب کے رائج الوقت ''نیچرل سینس'' کے خلاف تھا، چنانچہ سرسید احمد خان صاحب اور ان کے ہم نوا دوسرے تجدّد پسندوں نے مغرب کی اس ''نیچرل سینس'' کی خاطر نہ صرف تفسیر قرآن کے تمام اصولوں کو پامال کیا اور قرآن کریم کے الفاظ میں کھینچ تان شروع کی، بلکہ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے معادِ جسمانی جیسے عقائد پر بھی خطِ نسخ پھیر دیا، ملائکہ، شیاطین، اور جنّات کو بھی توہم پرستی قرار دیدیا، انبیاء علیہم السلام کے تمام معجزات کو ''مافوق الفطرت'' کہہ کر اُن کے منکر ہوگئے، اور اس غرض کے لئے پورے قرآن کو شاعرانہ تمثیلات کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا، ایسے لوگوں کی تفسیریں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ جیسے قرآن کریم نے انبیاء علیہم السلام کے تمام واقعات اپنے سیدھے سادے اسلوب کے بجائے تمثیلات کے معمّوں میں بیان کئے ہیں جن کا انکشاف تیرہ سو سال بعد پہلی بار ان فدایانِ مغرب پر ہوا ہے، قرآن کریم کے واضح اور صریح لفظ کو من مانے مجازی معنی پہنادینا ان حضرات کا ایک معمولی کھیل ہے، جس کی بے شمار مثالیں اُن کی تفسیروں میں ملتی ہیں، اور اس تمام کدوکاوش کا منشاء سرسید احمد خان صاحب کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

Marfat.com

جب معجزات کو مافوق الفطرت قرار دیا جاوے جس کو انگریزی میں ''سپر نیچرل'' کہتے ہیں، اور اس سے انکار کرتے ہیں اور ان کا وقوع ایسا ہی ناممکن قرار دیتے ہیں، جیسے کہ قولی وعدے کا ایفاء نہ ہونا، اور علانیہ کہتے ہیں کہ کسی ایسے امر کے واقع ہونے کا ثبوت نہیں ہے، جو مافوق الفطرت ہو، اور جس کو تم معجزہ قرار دیتے ہو، اور اگر بفرضِ محال خدا کی قدرت کے حوالے پر اس کو تسلیم بھی کریں تو وہ ایک بے فائدہ امر ہوگا۔'' (۱)

اس کے برخلاف علمائے اسلام کا موقف یہ تھا کہ معجزات کا وقوع عقلی طور پر کوئی محال نہیں ہے، ہاں یہ واقعات خلاف عادت ضرور ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی پیغمبر کی حقانیت ہر عامی اور اَن پڑھ کے سامنے واشگاف کرنا چاہتا ہے تو ان کے ہاتھ پر ایسے حیرت انگیز خلاف عادت کام ظاہر کردیتا ہے، جنہیں دیکھ کر ہر شخص یہ سمجھ جائے کہ اللہ کے اس پیغمبر کو تائیدِ خداوندی حاصل ہے، مگر چونکہ مغرب میں نیچرل سینس کا سکّہ چلا ہوا تھا، اس لئے سرسید صاحب وغیرہ یہ بات کہتے ہوئے شرماتے تھے،

لیکن قدرتِ خداوندی کا یہ کرشمہ ملاحظہ فرمایئے کہ جس وقت سرسید احمد خان صاحب اور اُن جیسے دوسرے متجدّ دین ''نیچرل سینس'' کی خاطر تمام انبیاءؑ کے معجزات کا انکار کررہے تھے اور اس غرض سے قرآن کریم کی آیات پر تحریف وتاویل کی مشق کی جارہی تھی، ٹھیک اُسی زمانے میں سائنس کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب رونما ہورہا تھا، نیوٹن کے نظریات نئی تحقیقات کی روشنی میں غلط ثابت ہورہے تھے، اور آئن اسٹائن اپنے انقلابی نظریہ اضافت کی داغ بیل ڈال رہا تھا، جس نے سائنس کے گزشتہ مفروضات کی کایا پلٹ کر رکھ دی، اور اس کی بنیاد پر بیسویں صدی میں جس ایٹمی سائنس کا ڈنکا بجا اس نے قانون کشش اور قانون علت ومعلول کو رَد کرکے نیچرل اور سُپر نیچرل کی تفریق ہی ختم کرڈالی، چنانچہ عہد حاضر کا ایک عظیم اور مسلم

(۱) تفسیر القرآن از سرسید احمد خان صاحب ص ۱۰ ج ۱۔

Marfat.com

سائنس داں سر آرتھر ایڈنگٹن (Eddington) لکھتا ہے:

"سائنس کی تحقیقات سے اشیاء کی کسی اندرونی ذاتی و لاینفک خاصیت یا ماہیت و نوعیت (نیچر) کا پتہ نہیں چلتا۔"(۱)

اور اس طرح:

"ایک اہم نتیجہ خارجی دنیا میں قانونِ علت کے ختم ہو جانے کا یہ نکلتا ہے کہ فطرت اور فوق الفطرت کے درمیان کوئی واضح فرق باقی نہیں رہتا۔"

سائنس کے مسلمات میں یہ زبردست انقلاب کس طرح رُونما ہوا، اس کی مختصر سرگذشت ہمارے دَور کے مشہور سائنٹسٹ سر جیمس جینز (Sir james jeans) کی زبانی سنئے:

"گلیلو اور نیوٹن کی عظیم سترہویں صدی کی یہ بڑی عظیم کامیابی اور فتح مان لی گئی تھی کہ کائنات میں ہر مابعد کا تغیر و تبدل یا تخلیق اپنے ماقبل کا ناگزیر نتیجہ و لازمہ ہوتا ہے، حتی کہ ساری کائنات فطرت (نیچر) کی پوری تاریخ آخر تک لازمی اور ناگزیر نتیجہ اس ابتداء کا ہے جس میں وہ پہلے دن تھی،

اس تصور ہی کا لازمہ وہ تحریک تھی جس نے ساری مادی کائنات کو بس ایک مشین بنا اور سمجھ لیا تھا، یہ صورت حال انیسوی صدی کے آخر تک مسلّم اور جاری رہی، اور ساری نیچرل سائنس کا واحد مقصد اس کائنات کو مشینی ساخت (میکانکس) میں تبدیل و تحویل کر دینا بن گیا........

پھر اسی انیسویں صدی کے آخر مہینوں میں برلن کے ماکس پلانک

(۱) Eddington ; The Nature of Physicals World P 303

ماخوذ از "مذہب و سائنس" از مولانا عبدالباری ندوی، ص ۸۶ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء۔

Marfat.com

(Max Plank) نے کوانٹم نظریہ کی بنیاد ڈالی جو بالآخر ترقی کر کے جدید طبعیات (فزکس) کا ایک ہمہ گیر اصول قرار پا گیا جس نے آگے چل کر سائنس کے میکانکی عہد کا خاتمہ کر کے ایک نئے دَور کا آغاز کر دیا۔"

ابتداء میں پلانک کے نظریہ سے صرف یہ معلوم ہوا تھا کہ کائناتِ فطرت میں تسلسل کا عمل کارفرما نہیں، لیکن ۱۹۱۷ء میں آئن اسٹائن نے بتایا کہ پلانک کا نظریہ دراصل بہت زیادہ انقلاب انگیز نتائج کا حامل ہے اور بقول جیمس جینز:

"یہ نظریہ اس قانونِ علّت و معلول ہی کو اپنی فرمانروائی کے تخت سے اتار دینے والا ہے، جس کو اب تک کائنات کے ایک ہمہ گیر رہنما اصول کا مقام حاصل تھا، پُرانی سائنس کا یہ قطعی اعلان اور دعویٰ تھا کہ فطرت (نیچر) سلسلہ علل و معلولات کے بندھے ہوئے قوانین سے باہر ایک قدم نہیں نکال سکتی، علت "الف" کے بعد ناگزیر طور پر "ب" کے معلول ہی کو پیدا یا ظاہر ہونا چاہئے، لیکن نئی سائنس اب صرف اتنا دعویٰ کر سکتی ہے کہ "الف" کے بعد "ب" "ج" وغیرہ کے یوں تو بے شمار امکانات ہیں، البتہ اتنا صحیح ہے کہ اُن میں "الف" کے بعد "ب" کا نمودار ہونا "ج" کے مقابلے میں اور "ج" کا "د" کے مقابلے میں اغلب ہے،

جیمس جینز نے بتایا ہے کہ اس اغلبیّت یا ظن غالب کے سوا کسی نام نہاد علّت کے بعد کسی خاص نام نہاد معلول ہی کے پیدا ہونے کا حکم نہ تو قطعیت کے ساتھ لگایا جا سکتا ہے نہ اس کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے، بلکہ:

This is matter which Lies on the kness of gods whatever gods there de.

Marfat.com

''یہ معاملہ کلّیۃً خدا ہی کے ہاتھ میں ہے، جس کو بھی خدا کہا جائے۔''(۱)

غرض بیسویں صدی میں ایٹمی تجربات کی روشنی میں جو سائنس پروان چڑھی ہے اس نے ان پرانے تصورات کو جڑ مُول ہی سے ختم کر دیا ہے کہ کائناتی اشیاء کی خاصیتیں اُن اشیاء سے جُدا نہیں ہوسکتیں، اور آگ سے جلانے کی صفت کو کبھی الگ نہیں کیا جاسکتا، اب سائنس کا کہنا یہ ہے کہ آگ اکثر و بیشتر جلاتی ضرور ہے، اور غالب گمان یہی ہے کہ جہاں آگ ہوگی وہاں تپش اور جلن پائی جائے گی، لیکن اگر کبھی اس کے خلاف ہو جائے تو یہ نہ عقل کے خلاف ہے اور نہ سائنسی مسلّمات اس کی تردید کر سکتے ہیں، لہٰذا آج کا سائنسداں معجزات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ لاعلمی کا اظہار کر سکتا ہے، اُن کو ناممکن کہہ کر اُن کا اصولی انکار نہیں کر سکتا، شاید یہی وجہ ہو کہ بیسویں صدی میں مغرب کے عوام پھر اُن چیزوں کی طرف لوٹ رہے ہیں جنہیں وہ پہلے ''مافوق الفطرت'' سمجھ کر توہم پرستی قرار دیا کرتے تھے، انتہاء یہ ہے کہ پھر تجدّد پسندوں کی ذہنیت ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ وہ زمانے کے عام شور وشغب سے متاثر ومرعوب ہو کر بڑی جلدی سے ایک رائے قائم کر لیتے ہیں، اور معاملے کی پوری تحقیق کئے بغیر ہی اُس رائے پر فکر ونظر کی پوری عمارت کھڑی کر لیتے ہیں، معجزات کے معاملے میں بھی یہی ہوا ہے کہ جس وقت سرسید احمد خان صاحب اور اُن کے ہم نوا دوسرے متجدّدین معجزات کو ''ناممکن'' قرار دے رہے تھے اس وقت مغرب میں عام شور تو بیشک اُن کے انکار ہی کا تھا، لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ فلسفہ اور سائنس کی دنیا کے تمام لوگ ہیوم اور ھکسلے کی طرح معجزات کے منکر ہوں، بلکہ بہت سے ممتاز سائنس داں اُس وقت بھی معجزات کے قائل تھے جن میں نیوٹن، فرائڈ، سمپسن، کیلون، اور لسٹر بطورِ خاص قابل ذکر ہیں، اور جرمنی کے مشہور

(۱) جیمس جینز کی کتاب ''پر اسرار کائنات'' (Mysterious Universe) ص ۲۷ تا ص ۳۲ ماخوذ از ''مذہب وسائنس'' مولانا عبدالباری ندوی، ص ۸۳ تا ۸۵۔

سائنس دان لوئز نے تو معجزات کی تائید میں بڑے معرکے کے مضامین لکھے ہیں، اور ثابت کیا ہے کہ معجزات کسی بھی طرح عقل یا سائنس کے خلاف نہیں ہیں، (۱)

اوپر عہدِ حاضر کے سائنس دانوں کے جو اقوال پیش کئے گئے ہیں ہم نے اُن کو قرآن کریم کی صداقت اور حقانیت کی دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا، کیونکہ قرآن کریم کی سچائی ان اقوال کی تائید سے بے نیاز ہے، وہ اُس وقت بھی سچا تھا، جب سائنس داں مافوق الفطرت اشیاء کا مذاق اڑاتے تھے، اور آج بھی سچائی ہے، جب سائنس داں خود مافوق الفطرت اشیاء کے امکان کو تسلیم کررہی ہے، اور اگر بالفرض کل سائنس کے نظریات دوبارہ بدل جائیں تو اس کی سچائی میں اس وقت بھی ذرّہ برابر کمی نہیں آئے گی، لیکن یہ اقوال ہم نے صرف یہ بتانے کے لئے پیش کئے ہیں، کہ جن لوگوں نے مروّجہ نظریات سے مرعوب ہوکر قرآن کریم کی تفسیر میں کتر بیونت کرنے کی کوشش کی تھی اُن کی بنیاد کس قدر کمزور اور ناپائیدار تھی، انہوں نے ایک ایسے کلام کو وقتی نظریات کے پیمانے سے ناپنے کی کوشش کی تھی، جس کا علم ماضی و مستقبل کی تمام وسعتوں کو محیط ہے، اور جس کے آگے فکرِ انسانی کی تمام کاوشیں بچوں کے کھیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں،

لہٰذا اگر قرآن کریم کو اپنے نظریات کا تابع بنانے کے بجائے اُس سے واقعۃً رہنمائی حاصل کرنی ہے، تو اسے رائج الوقت نظریات کی عینک سے پڑھنے کے بجائے اُس طرح پڑھیے جس طرح سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحابؓ نے پڑھا تھا، اور اس کی تشریح و تفسیر کے

---

(۱) ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ص ۵۸۷ و ۵۸۸، مطبوعہ ۱۹۵۰ء مقالہ ''معجزہ'' Miracle اس مقالے میں الفریڈ، ای، گاروے نے معجزات کے امکان اور ضرورت پر اچھی بحث کی ہے، اور ثابت کیا ہے کہ معجزات نہ صرف عقل اور سائنس کی رُو سے ممکن ہیں، بلکہ ان کی ضرورت ناقابلِ تردید ہے، اس کے علاوہ معجزہ کے موضوع پر مندرجۂ ذیل کتابیں بطور خاص قابلِ مطالعہ ہیں: (۱) سیرۃ النبیؐ ص ۱۱۷ تا ۱۱۹ ج ۳، باب مؤلفہ مولانا عبدالباری ندوی، (۲) موقف العقل والعلم والعالم، مؤلفہ شیخ مصطفیٰ صبری بک، (۳) اسلام اور معجزات، مؤلفہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ۔

وقت مروّجہ افکار شور وغل سے متأثر ہونے کے بجائے وہ اصول استعمال کیجئے جو تفسیر کے فطری معقول اور واقعی اصول ہیں، ان اصولوں کے ذریعہ جو بات قرآن کریم سے واضح طور پر ثابت ہوجائے اُسے جھینپ جھینپ کر اور شرما شرما کر نہیں، بلکہ پورے یقین وایمان اور خود اعتمادی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیجئے، اور زمانے کے مروّجہ نظریات ہزار اس کے خلاف ہوں، یہ یقین رکھئے کہ حق وہی ہے جو قرآن کریم نے بیان کردیا، اگر انسانیت کی قسمت میں کوئی فلاح لکھی ہے تو وہ ہزار ٹھوکریں کھانے کے بعد اس کے بیان کئے ہوئے حقائق تک پہنچ کر رہے گی،

خلافِ عقل اور ماورائے عقل

یہاں ذہنوں میں یہ اشکال پیدا ہوسکتا ہے کہ اگر تفسیر کے معروف اصول وقواعد کے مطابق کوئی ایسی بات قرآن کریم کی طرف منسوب ہوئی ہو جس کے بارے میں ہم جدید تحقیقات کی روشنی میں کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہوں کہ وہ عقل یا مشاہدے کے خلاف ہے تو پھر قرآن کریم کی اسی قدیم تفسیر پر اصرار کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم قرآن کریم کی باتوں کو قطعی مشاہدات کے خلاف قرار دیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف وہ بات منسوب کریں جو یقینی مشاہدے سے غلط ثابت ہوچکی ہے،

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کی جو تفسیر قطعی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابۂ کرامؓ کے اجماع واتفاق سے ثابت ہو، وہ آج تک کبھی عقل یا قطعی مشاہدے کے خلاف ثابت نہیں ہوئی، چودہ سو سال کے عرصے میں علمی تحقیقات وانکشافات میں سینکڑوں انقلاب آئے، لیکن آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ قرآن کریم کی کوئی قطعی الثبوت تفسیر مشاہدے کے خلاف پڑی ہو، اور چونکہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی قولی اور عملی تفسیر ہی کے لئے مبعوث کیا گیا تھا، لہٰذا آپ کی بیان کردہ ہر تفسیر بھی اللہ تعالیٰ ہی کی ہدایت کے مطابق ہے، اور آپ کی کوئی تفسیر آئندہ بھی عقل یا مشاہدے کے خلاف نہیں ہوسکتی،

البتہ اس معاملے میں غلطی دو طرح لگتی ہے:

۱...... جو لوگ زمانے کے مروّجہ نظریات سے بہت جلد مرعوب ہو جانے کے عادی ہیں، وہ کسی چیز کے "خلافِ عقل" ہونے کا فیصلہ بہت جلد کر ڈالتے ہیں، یہ ایک طے شدہ مسئلہ ہے کہ حیرت انگیز چیز خلافِ عقل نہیں ہوتی، اور نہ اُس چیز کو ناممکن کہا جاسکتا ہے جس کے اسباب سمجھ میں نہ آئے ہوں، ایسی چیز کو مستبعد (Improbable) غیر معمولی (Extra Ordinary) یا حیرت انگیز (astonishing) تو کہہ سکتے ہیں، لیکن اس کو ناممکن (impossible) کہنا خود خلافِ عقل ہے، جو شخص متعلقہ فن سے واقف نہ ہو اس کے لئے یہ بات قطعی نا قابلِ فہم ہے کہ وائرلیس سیٹ میں ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے انسان کی آواز کس طرح سُنائی دے رہی ہے؟ اور اگر کسی دیہاتی کے سامنے یہ بات کہی جائے تو عجب نہیں کہ وہ اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار ہی کر دے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وائرلیس سیٹ میں دور دراز کے کسی آدمی کی آواز سنائی دینا "خلافِ عقل" یا "ناممکن" ہے، بعض حضرات قرآن کریم کی تفسیر کے معاملے میں اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے، بلکہ ہر اُس چیز کو "خلافِ عقل" یا "ناممکن" قرار دیدیتے ہیں جو محض حیرت انگیز یا زیادہ سے زیادہ خلافِ عادت اور مستبعد (improbable) معلوم ہوتی ہے، حالانکہ قرآن کریم اور احادیث وغیرہ میں اس قسم کی باتوں کا پایا جانا ہر گز محلِ تعجب نہیں، ہم کتاب کے شروع میں عرض کر چکے ہیں کہ وحیِ نبوّت کا آغاز ہی اُس مقام سے ہوتا ہے جہاں عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے، وحی و رسالت کے سلسلے کا تو مقصدِ اصلی ہی یہ ہے کہ اس کے ذریعہ انسان کو اُن باتوں سے باخبر کیا جائے جنہیں وہ محض عقل کے ذریعے نہیں جان سکتا، چنانچہ اگر وحی و رسالت کا سلسلہ نہ ہوتا تو عقل معاد و آخرت، حساب و کتاب، جنت و جہنم اور ملائکہ وغیرہ کا ادراک از خود نہیں کر سکتی تھی، ورنہ اگر یہ ساری باتیں نری عقل سے معلوم ہو سکتی تھیں تو انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمانے، اُن پر وحی نازل کرنے اور انہیں آسمانی کتابیں دینے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی، لہٰذا اگر وحی اور رسالت پر ایمان ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ علم کے اس ذریعے سے ہمیں بہت سی باتیں ایسی معلوم ہوں گی جو محض عقل سے معلوم نہ ہو سکتی تھیں، اور

Marfat.com

جن کا ادراک و تصور عقل کے لئے مشکل تھا،

اور جب یہ بات طے ہوگئی کہ قرآن و حدیث میں ایسی حیرت انگیز چیزوں کا وجود اُن کے موضوع کے لحاظ سے بالکل مناسب بلکہ ضروری ہے، تو قرآن کریم کی کسی ظاہر و متبادر اور اجماعی تفسیر کو محض اس بنیاد پر رَد نہیں کیا جاسکتا کہ اس سے ایک حیرت انگیز بات ثابت ہوتی ہے، تاوقتیکہ وہ بات واقعۃً خلافِ عقل یعنی ناممکن اور مُحال نہ ہو، لیکن قرآن کریم کی قطعی تفسیروں میں آج تک کوئی بات ایسی ناممکن اور خلافِ عقل ثابت نہیں ہوسکی، اور نہ قیامت تک ہوسکتی ہے، اس مسئلے کی مزید تفصیل و تشریح ہم انشاء اللہ اگلے باب میں اصولِ تفسیر کے تحت کریں گے،

۲...... دوسری غلطی بعض اوقات یہ ہوتی ہے کہ قرآن کریم کی کوئی تفسیر قطعی اور یقینی نہیں ہوتی، نہ قرآن کریم کے سیاق و سباق سے، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی قطعی تفسیر سے، نہ اُمتِ مسلمہ کے اجماع سے، اس کے باوجود وہ تفسیر عام لوگوں میں اتنی مشہور ہوجاتی ہے کہ لوگ اسے یقینی اور قطعی تفسیر سمجھنے لگتے ہیں، اور جب وہ عقل کی کسی قطعی دلیل یا مشاہدے کی بنا پر غلط ثابت ہوتی ہے تو بعض ناواقف لوگ اس پر اصرار کرتے ہیں، اور بعض قرآن کریم یا اس کی یقینی اور قطعی تفسیروں کے بارے میں یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ اسی طرح خلافِ عقل ہوسکتی ہیں، لہٰذا ایسے موقع پر یہ دیکھنا چاہئے کہ قرآن کریم کی جو تفسیر عقل کی کسی دلیل قطعی یا مشاہدے کے خلاف معلوم ہورہی ہے وہ کس درجہ کی ہے؟ محض عام شہرت کی بناء پر اسے یقینی تفسیر سمجھ لینا غلط ہے،

یہ بحث ''اصولِ تفسیر'' کے تحت قدرے تفصیل کے ساتھ آگے آرہی ہے، کہ جب عقلی اور نقلی دلائل میں تضاد معلوم ہو تو صحیح راہِ عمل کیا ہے؟ اُس موقع پر اس بحث کو ضرور دیکھ لینا چاہئے،

۴...... قرآن کریم کے موضوع کو غلط سمجھنا

تفسیر قرآن کے بارے میں چوتھی گمراہی یہ ہے کہ بعض لوگ قرآن کریم کے موضوع کو

Marfat.com

ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھتے، اوراس میں وہ باتیں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جواس کے موضوع سے خارج ہیں، مثلاً بعض حضرات اس جستجو میں رہتے ہیں کہ قرآن کریم سے کائنات کے تمام سائنسی اور طبعی حقائق مستنبط کئے جائیں، اور سائنس کے مسلمات کوقرآن کریم سے ثابت کیا جائے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر قرآن سے سائنس کے یہ مسائل ثابت نہ ہوسکے، تو (معاذ اللہ) یہ قرآن کریم کا نقص ہوگا، چنانچہ وہ پورے خلوص کے ساتھ قرآنی آیات سے سائنسی مسلمات ثابت کرنے کی فکر میں رہتے ہیں، اور بعض اوقات اس غرض کے لئے قرآنی الفاظ کو غلط معنی پہنادیتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا اصل موضوع سائنس نہیں ہے، اس میں اگر کہیں کائناتی حقائق کا ذکر آیا ہے تو ضمنی طور سے آیا ہے، لہٰذا اگراس میں کہیں کوئی سائنٹفک حقیقت واضح طور سے مل جائے تو اُس پر تو بلاشبہ ایمان رکھنا چاہیے، لیکن سائنس کا کوئی مسئلہ پہلے سے ذہن میں رکھ کر قرآن کریم سے اُسے زبردستی نکالنے کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص طب کی کتاب میں قانون کے مسائل تلاش کرنے لگے،

قرآن کریم نے اپنا موضوع اور مقصدِ نزول مبہم نہیں چھوڑا، بلکہ بیسیوں آیات میں یہ واضح کردیا ہے کہ اُسے کیوں نازل کیا گیا ہے؟ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیات پر غور فرمائیے:

﴿ لَقَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿﴾ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ (المائدہ:۱۵و۱۶)

''تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی آئی ہے، اور ایک ایسی کتاب جوحق کوواضح کردینے والی ہے، جس کے ذریعے اللہ ان لوگوں کوسلامتی کی راہیں دکھاتا ہے جواس کی خوشنودی کے طالب ہیں، اور انہیں اپنے حکم سے اندھیریوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے، اورانہیں سیدھے راستے کی ہدایت عطافرماتا ہے۔''

﴿ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ

Marfat.com

مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَاجَآءَنَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ﴾ (المآئده : ۱۹)

''اے اہلِ کتاب! تمہارے پاس ہمارے پیغمبر ایسے وقت دِین کی وضاحت کرنے آئے ہیں جب پیغمبروں کی آمدرُکی ہوئی تھی، تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس نہ کوئی (جنت کی) خوشخبری دینے والا آیا، نہ کوئی (جہنم سے) ڈرانے والا۔ لو اَب تمہارے پاس خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا آ گیا ہے، اور اللہ ہر بات پر پوری پوری قدرت رکھتا ہے۔''

﴿ وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴾ (المآئده: ۴۸)

''اور (اے رسول محمد! صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تم پر بھی حق پر مشتمل کتاب نازل کی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اُن کی نگہبان ہے، لہٰذا ان لوگوں کے درمیان اسی حکم کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے، اور جو حق بات تمہارے پاس آ گئی ہے اسے چھوڑ کر ان کی خواہشات کے پیچھے نہ چلو تم میں سے ہر ایک (اُمت) کے لئے ہم نے ایک (الگ) شریعت اور طریقہ مقرر کیا ہے، اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک اُمت بنا دیتا، لیکن (الگ شریعتیں اس لئے دِیں) تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں دیا ہے اس میں

Marfat.com

تمہیں آزمائے، لہٰذا نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو، اللہ ہی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے، اُس وقت وہ تمہیں وہ باتیں بتائے گا جن میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔''

﴿ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴾

(الانعام: ۵۵)

''اور ہم اسی طرح نشانیاں تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں، (تاکہ سیدھا راستہ بھی واضح ہو جائے) اور تاکہ مجرموں کا راستہ بھی کھل کر سامنے آجائے۔''

﴿ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِىْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (الاعراف ۲)

''(اے پیغمبر!) یہ کتاب ہے جو تم پر اس لئے اُتاری گئی ہے کہ تم اُس کے ذریعے لوگوں کو ہوشیار کرو، لہٰذا اس کی وجہ سے تمہارے دِل میں کوئی پریشانی نہ ہونی چاہیے، اور مؤمنوں کے لئے یہ ایک نصیحت کا پیغام ہے۔''

﴿ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ (الاعراف: ۶۳)

''کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس ایک ایسے شخص کی معرفت جو تمہاری ہی جنس کا (بشر) ہے کوئی نصیحت کی بات آگئی تاکہ وہ شخص تم کو ڈراوے، اور تاکہ تم ڈر جاؤ اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

﴿ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ﴾ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ﴾ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ

Marfat.com

وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴾ (لقمٰن: ۱تا۴)

''یہ اُس حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں، جو نیک لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت بن کر آئی ہے، وہ نیک لوگ جو نماز قائم کرتے ہیں، اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور آخرت کا پورا یقین رکھتے ہیں۔''

﴿ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَارَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴾ (السجدہ: ۱تا۳)

''ربّ العالمین کی طرف سے یہ ایک ایسی کتاب اُتاری جاری ہے جس میں کوئی شک کی بات نہیں ہے، کیا لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ پیغمبر نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ نہیں! (اے پیغمبر!) یہ تو وہ حق ہے جو تمہارے پروردگار کی طرف سے اس لئے آیا ہے کہ تم اس کے ذریعے اُن لوگوں کو خبردار کرو جن کے پاس تم سے پہلے کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا۔''

﴿ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ﴾ (یٰس: ۵و۶)

''یہ قرآن اُس ذات کی طرف سے اُتارا جارہا ہے جس کا اِقتدار بھی کامل ہے، جس کی رحمت بھی کامل، تاکہ تم اُن لوگوں کو خبردار کرو جن کے باپ دادوں کو پہلے خبردار نہیں کیا گیا تھا، اس لئے وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔''

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴾

(زمر: ۲)

''(اے پیغمبر!) بیشک یہ کتاب ہم نے تم پر برحق نازل کی ہے، اس لئے اللہ کی اس طرح عبادت کرو کہ بندگی خالص اُسی کے لئے ہو۔''

Marfat.com

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ فَرِيْقٌ فِى الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِى السَّعِيْرِ ﴾ (شوریٰ:۷)

''اور اسی طرح ہم نے یہ عربی قرآن تم پر وحی کے ذریعے بھیجا ہے، تا کہ تم مرکزی بستی (مکہ) اور اُس کے اِرد گرد والوں کو اُس دن سے خبردار کرو جس میں سب کو جمع کیا جائے گا، جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے، ایک گروہ جنت میں جائے گا، اور ایک گروہ بھڑکتی ہوئی آگ میں۔''

﴿ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۞ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ۞ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴾ (الجاثیہ: ۱۸ تا ۲۰)

''پھر (اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں دِین کی ایک خاص شریعت پر رکھا ہے، لہٰذا تم اُسی کی پیروی کرو، اور اُن لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنا جو حقیقت کا علم نہیں رکھتے، وہ اللہ کے مقابلے میں تمہارے ذرا بھی کام نہیں آسکتے، اور حقیقت یہ ہے کہ ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور اللہ متقی لوگوں کا دوست ہے، یہ (قرآن) تمام لوگوں کے لئے بصیرتوں کا مجموعہ ہے، اور جو لوگ یقین کریں، اُن کے لئے منزل تک پہنچانے کا ذریعہ اور سراپا رحمت ہے۔''

﴿ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِىَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِىْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّضْلِلِ

Marfat.com

اللّٰهُ فَمَالَهٗ مِنْ هَادٍ﴾ (زمر: ۲۳)

"اللہ نے بہترین کلام نازل فرمایا ہے، ایک ایسی کتاب جس کے مضامین ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، جس کی باتیں بار بار دُہرائی گئی ہیں، وہ لوگ جن کے دِلوں میں اپنے پروردگار کا رُعب ہے ان کی کھالیں اس سے کانپ اُٹھتی ہیں، پھر اُن کے جسم اور اُن کے دِل نرم ہو کر اللہ کی یاد کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، یہ اللہ کی ہدایت ہے جس کے ذریعے وہ جس کو چاہتا ہے، راہِ راست پر لے آتا ہے، اور جسے اللہ راستے سے بھٹکا دے، اُسے کوئی راستے پر لانے والا نہیں۔"

یہ محض چند مثالیں ہیں، اور اگر صرف انہی پر غور کر لیا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کا اصل مقصد انسان کو آخرت کی تیاری پر آمادہ کرنا اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی تعلیم و ترغیب ہے، اور جتنی باتیں اس میں تاریخی واقعات یا کائنات و آفاق سے متعلق آئی ہیں وہ سب اسی بنیادی موضوع کی تائید و تقویت کے لئے آئی ہیں، لہٰذا اگر اس میں سائنس کا کوئی مشہور مسئلہ موجود نہ ہو تو نہ یہ کوئی عیب کی بات ہے نہ تعجب کی، کیونکہ یہ اس کا موضوع ہی نہیں ہے، اسی طرح اگر ماضی یا مستقبل کا کوئی واقعہ قرآن مجید میں نہ ملے تو یہ بھی کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے، کیونکہ وہ تاریخ کی کتاب نہیں، بلکہ اس میں جستہ جستہ واقعات عبرت اور موعظت کے لئے بیان کئے گئے ہیں،

اس سے بعض اُن غیر مسلموں کا اعتراض بھی دُور ہو جاتا ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ مغربی ممالک نے جن علوم و فنون کے ذریعے مادّی ترقی کی ہے، اُن کے بارے میں قرآنِ کریم نے کچھ کیوں نہیں بتایا؟ اور اُن لوگوں کی غلط فہمی بھی دُور ہو جاتی ہے جو اِن اعتراضات سے متاثر ہو کر اس فکر میں رہتے ہیں کہ قرآن کریم سے سائنس وغیرہ کا کوئی نہ کوئی مسئلہ کسی نہ کسی طرح ثابت کیا جائے، کیونکہ اس کوشش کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص قانون کی کسی کتاب پر یہ اعتراض کرنے لگے کہ اس میں ایٹم بم بنانے کا طریقہ کیوں مذکور نہیں؟ تو اس کے جواب میں

Marfat.com

کوئی دوسرا شخص قانونی الفاظ کو توڑ موڑ کر اس سے ایٹم کی تھیوری نکالنے کی کوشش کرنے لگے، ظاہر ہے کہ یہ اُس اعتراض کا جواب نہیں، بلکہ ایک مذاق ہوگا، اسی طرح جو شخص قرآن کریم میں سائنس اور انجینیرنگ کے مسائل نہ ہونے پر معترض ہو، اس کا صحیح جواب یہ نہیں ہے کہ قرآنی الفاظ کو توڑ موڑ کر اس سے سائنس کے مسائل زبردستی نکالے جائیں، بلکہ اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ قرآن کریم نہ سائنس یا انجینیرنگ کی کتاب ہے اور نہ مادّی ترقی حاصل کرنے کے طریقے اس کا موضوع ہیں، چونکہ یہ ساری باتیں انسان اپنی عقل وفکر اور تجربات ومشاہدات کے ذریعے معلوم کر سکتا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کو انسان کی اپنی محنت وکاوش اور تحقیق وجستجو پر چھوڑ دیا، اور ان باتوں کو قرآن کریم کا موضوع بنایا جو محض انسانی عقل سے معلوم نہیں ہوسکتیں، بلکہ اُن کے ادراک کے لئے وحی الٰہی کی رہنمائی ناگزیر ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں عقل وفکر اور تجربات ومشاہدات کے ذریعے موجودہ مقام تک پہنچ گیا، لیکن ایمان ویقین کی دولت، قلب وروح کی پاکیزگی، اعمال واخلاق کی تطہیر، اللہ کے ساتھ بندگی کا تعلق اور اخروی زندگی سنوارنے کا جذبہ جو وحی الٰہی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا تھا، اور جسے قرآن کریم نے اپنا موضوع بنایا ہے وہ عقل وفکر کی اس حیرت انگیز تگ وتاز کے بعد بھی انسان کو نہ حاصل ہوسکا ہے، اور نہ اُس وقت تک حاصل ہوسکتا ہے جب تک اس معاملے میں سچے دل سے قرآن کی رہنمائی حاصل نہ کی جائے،

ہماری اس گزارش کا منشاء یہ ہرگز نہیں ہے کہ قرآن کریم سے سائنس کا کوئی مسئلہ اخذ کرنا علی الاطلاق کوئی جرم ہے، ہمیں یہ تسلیم ہے کہ قرآن کریم میں ضمنی طور سے سائنس کے بہت سے حقائق کا بیان آیا ہے، چنانچہ جہاں اس کی کسی آیت سے کوئی واضح سائنٹفک بات معلوم ہورہی ہو اسے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اس معاملے مندرجہ ذیل غلطیوں سے پرہیز لازمی ہے:

ا...... سائنس کی جو بات قرآن کریم میں مذکور ہے وہ ضمناً مذکور ہے، اس کا اصل مقصد ان حقائق کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا استحضار اور اس کے ذریعے ایمان میں پختگی پیدا

Marfat.com

کرنا ہے، لہٰذا اس بنیاد پر قرآن کریم کو سائنس کی کتاب سمجھنا یا باور کرنا بالکل غلط ہے،

۲ ...... جہاں سائنس کے کسی مسئلے کی مکمل وضاحت موجود نہ ہو وہاں خواہ مخواہ الفاظ اور سیاق و سباق کو توڑ موڑ کر سائنس کی کسی دریافت پر چسپاں کرنے کی کوشش کسی طرح درست نہیں، یہ بات ایک مثال سے واضح ہوگی؛

جس وقت سائنس کی دنیا میں یہ نظریہ مشہور ہوا کہ زمین اپنی جگہ ساکن ہے اور دوسرے سیارے اس کے گرد حرکت کرتے ہیں تو بعض لوگوں نے اس نظریہ کو قرآن کریم سے ثابت کرنے کی کوشش کی، اور قرآن کریم کی اس آیت سے استدلال کیا گیا:

﴿ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا ﴾ (النمل :۶۱)

یا (وہ ذات لائق عبادت ہے) جس نے زمین کو جائے قرار بنایا۔''

ان لوگوں کا کہنا تھا کہ ''جائے قرار'' کا لفظ یہ بتا رہا ہے کہ زمین اپنی جگہ ساکن ہے، حالانکہ قرآن کریم کا مقصد تو یہ بیان کرنا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا انعام ہے کہ تم زمین پر ڈانواڈول رہنے کے بجائے اطمینان کے ساتھ رہتے ہو، اور اس میں لیٹنے، بیٹھنے اور قرار حاصل کرنے کے لئے تمہیں کوئی تکلیف برداشت کرنی نہیں پڑتی، اب ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس انعام کا زمین کی حرکت و سکون سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ زمین متحرک ہو یا ساکن، یہ نعمت ہر صورت میں انسان کو حاصل ہے، اس لئے اس آیت سے زمین کو ساکن ثابت کرنا ایک خواہ مخواہ کی زبردستی ہے،

پھر جب سائنس نے زمین کے ساکن ہونے کے بجائے متحرک ہونے کا نظریہ پیش کیا تو بعض حضرات کو یہ نظریہ بھی قرآن سے ثابت کرنے کی فکر لاحق ہوئی، اور مندرجہ ذیل آیت کو حرکتِ زمین کی تائید میں پیش کر دیا:

﴿ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ﴾

(النمل :۸۸)

''تم (آج) پہاڑوں کو دیکھتے ہو تو سمجھتے ہو کہ یہ اپنی جگہ/ جمے ہوئے ہیں، حالانکہ (اُس وقت) وہ اس طرح پھر رہے ہوں گے جیسے بادل

Marfat.com

پھرتے ہیں۔"

ان حضرات نے یہاں "تَمُرُّ" کا ترجمہ "چل رہے ہوں گے" کے بجائے "چل رہے ہیں" کر کے یہ دعویٰ کیا کہ اس آیت میں زمین کی حرکت کا بیان ہے، کیونکہ پہاڑوں کے چلنے کا مطلب یہ ہے کہ زمین چل رہی ہے، حالانکہ آیت کا سیاق وسباق (Context) صاف بتا رہا ہے کہ یہ قیامت کے حالات کا بیان ہے، اور آیت کا مقصد یہ ہے کہ قیامت کے دن یہ سارے پہاڑ جنہیں تم اپنی جگہ اٹل سمجھتے ہو فضاء میں بادلوں کی طرح اُڑتے پھریں گے، لیکن قرآن کریم سے سائنس کے مسائل مستنبط کرنے کے شوق نے سیاق وسباق پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں دیا،

واقعہ یہ ہے کہ زمین کی حرکت اور سکون کے بارے میں قرآن کریم خاموش ہے، اور پورے قرآن میں کہیں اس مسئلے کا بیان نہیں ہے، اس لئے کہ یہ بات اس کے موضوع سے خارج ہے، نہ قرآن سے زمین کی حرکت ثابت ہوتی ہے نہ سکون، لہٰذا سائنس کے دلائل کے لحاظ سے اس میں سے جو نظریہ بھی اختیار کیا جائے قرآن اس میں مزاحم نہیں ہوتا، اور نہ اُس سے دین وایمان کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے،

یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ قرآن سے سائنٹفک مسائل مستنبط کرنے کی کوششیں بسا اوقات بڑے خلوص کے ساتھ کی جاتی ہیں، اور اس کا منشاء غیر مسلموں کو یہ بتانا ہوتا ہے کہ دیکھو! جو بات تم نے صدیوں کی محنت کے بعد معلوم کی ہے وہ ہمارے قرآن میں پہلے سے موجود ہے، لیکن درحقیقت اگر یہ استنباط اصولِ تفسیر کو توڑ کر کیا گیا ہے تو یہ قرآن کے ساتھ نادان دوستی کے سوا کچھ نہیں، جس وقت لوگ قرآن سے زمین کا ساکن ہونا ثابت کرنا چاہ رہے تھے، وہ بزعم خود اسے قرآن کی خدمت تصور کرتے تھے، لیکن اگر اُن کی یہ کوشش کامیاب ہو جاتی اور عالمگیر طور پر یہ مان لیا جاتا کہ قرآن زمین کے ساکن ہونے کا قائل ہے، تو آج جبکہ زمین کو ساکن سمجھنا سائنس کے نقطۂ نظر سے کلمۂ کفر کے مرادف ہو گیا ہے قرآن کے ساتھ یہ ناداں دوستی کیا نتائج پیدا کرتی؟ لہٰذا سائنس کے بارے میں جو باتیں قطعی طور

Marfat.com

سے قرآن کریم میں موجود ہیں انہیں تو قرآن کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے، لیکن جن باتوں کی قطعی وضاحت قرآن نے نہیں کی، اُن کو خواہ مخواہ اس کی طرف منسوب کرنا کل بھی غلط تھا اور آج بھی غلط ہے۔ (۱)

---

(۱) اس مسئلہ کی مزید تفصیل وتشریح کے لئے ملاحظہ ہو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ کی کتاب "الانتباہات المفیدہ" اور اس کی "حل الانتباہات" انتباہ چہارم ص ۲۷ تا ۴۶ ج ۲ مطبوعہ دہلی۔

باب سوم

تفسیر کے چند ضروری اُصول

سا کہ اوپر عرض کیا گیا، قرآن کریم کی تفسیر اور اس سے احکام وقوانین کا استنباط ایک
ع ہے، اور اس کے مکمل اصولوں کو سمجھنے کے لئے عربی زبان وادب نحو وصرف،
وفقہ کی واقفیت ضروری ہے، لہٰذا اس کتاب میں یہ تمام اصول بیان نہیں
حصہ قرآن کریم سے احکام وقوانین مستنبط کرنے کے اصولوں پر ہی
ع کا مفصل علم حاصل کرنا چاہتا ہو اس کے لئے علم اصولِ فقہ کو
ہم چاہتے ہیں کہ یہاں تفسیر قرآن کے سلسلے میں چند وہ
فقہ کی پوری مہارت کے بغیر بھی سمجھ میں آسکتے
ملے میں بڑی غلط فہمیاں بلکہ گمراہیاں پھیل
، بلکہ اس علم کے جستہ جستہ مباحث ہیں، جنہیں عص
ب لرکے پیش کیا جارہا ہے، واللہ الموفق والمعین،

۱.....قرآن کریم اور مجاز

ہروری بات یہ ہے کہ بعض اوقات ایک لفظ سے اس کے حقیقی معنی مراد نہیں ہوتے،
زی معنی مراد ہوتے ہیں، مثال کے طور پر ''شیر'' کے حقیقی معنی تو ایک مخصوص درندے کے

Marfat.com

ہیں، لیکن بسا اوقات یہ لفظ ''بہادر انسان'' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، انیس کا مصرعہ مشہور ہے ع

کس شیر کی آمد ہے کہ رَن کانپ رہا ہے

یہاں شیر سے مراد وہ درندہ نہیں ہے، بلکہ بہادر انسان ہے، اسی طرح اور بھی بہت سے الفاظ کسی خاص مناسبت سے کسی ایسے معنی میں استعمال ہوجاتے ہیں جو اُن کے لغوی اور حقیقی معنی نہیں ہوتے، قرآن کریم میں بھی بہت سے الفاظ اپنے حقیقی اور لغوی معنی میں استعمال نہیں ہوتے، بلکہ ان سے مجازی معنی مراد لئے گئے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر شخص کو یہ اختیار ہے کہ وہ قرآن کے جس لفظ کو چاہے حقیقی معنی پر اور جس کو چاہے مجازی معنی پر محمول کرسکتا ہے، بلکہ علماء اُمّت نے اس کا ایک ایسا ضابطہ بنایا ہے جو سوفی صد معقول ہے اور جس پر تمام علماء متفق ہیں، یہاں اس ضابطے کو سمجھ لینا ضروری ہے،

وہ ضابطہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ میں اصل یہ ہے کہ اُن سے حقیقی معنی مراد ہوں گے، اور مجازی معنی صرف اُس وقت مراد ہوں گے جب حقیقی معنی کسی مجبوری کی وجہ سے مراد نہ ہوسکتے ہوں، اور جہاں کوئی مجبوری نہ ہو وہاں مجازی معنی مراد لینا کسی طرح درست نہیں ہوگا، مجبوری کی صورتیں مندرجۂ ذیل ہیں:

۱...... حقیقی معنی عقلی طور پر یا قطعی مشاہدے کی رُو سے ممکن نہ ہوں، اور عقلی طور پر ممکن نہ ہونے کی مفصل تشریح ان شاء اللہ اگلے اصول میں ''قرآن کریم اور عقلی دلائل'' کے زیر عنوان آئے گی،

۲...... عرف اور محاورے کے اعتبار سے اُس لفظ یا جملے کے حقیقی معنی متروک ہوگئے ہوں، مثلاً کفار کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ﴾

''یہ لوگ تھوڑا ہی ایمان لاتے ہیں''

لفظ ''قلیل'' کے حقیقی معنی ''تھوڑے'' یا ''کم'' کے ہیں، لیکن ایسے مقامات پر عُرف اور محاورے میں یہ معنی مراد نہیں ہوتے کہ وہ ایمان تو لاتے ہیں مگر تھوڑا، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے

Marfat.com

کہ بالکل ایمان نہیں لاتے، اور اس طرح ''قلیلا'' کا لفظ مجازاً نفی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اردو میں ''تھوڑا ہی'' اور انگریزی میں ''few'' کا بھی یہی حال ہے

۳......مجازی معنی مراد لینے کے لئے تیسری مجبوری یہ ہوتی ہے کہ عبارت کے سیاق وسباق میں کوئی قرینہ ایسا ہوتا ہے جو حقیقی معنی کو ناممکن بنادیتا ہے، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾

''اب جو چاہے، ایمان لے آئے، اور جو چاہے کفر اختیار کرے۔''

ان الفاظ کا ٹھیٹھ لغوی اور حقیقی مطلب یہ ہوگا کہ (معاذ اللہ) یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایمان اور کفر کی مساوی اجازت ہے، لیکن آگے ارشاد ہے:

﴿ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ﴾ (الکہف:۲۹)

''ہم نے بیشک (ایسے) ظالموں کے لئے آگ تیار کر رکھی ہے۔''

ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ آیت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ایمان اور کفر مساوی طور سے جائز ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ دونوں کا انجام واضح ہو جانے کے بعد انسان کو اختیار ہے کہ وہ کفر کی راہ پر باقی رہے یا ایمان لے آئے، پہلی صورت میں اُسے عذابِ جہنم سے واسطہ پڑے گا اور دوسری صورت میں وہ رضائے الٰہی سے ہمکنار ہوگا، (۱)

ان مجبوریوں کے سوا کسی لفظ کو اُس کے حقیقی معنی کے بجائے مجازی معنی پر محمول کرنا ہرگز درست نہیں، یہ ایک متفقہ اصول ہے، اور اس کی معقولیت ناقابلِ انکار ہے اس لئے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے کلام سے مجازی معنی مراد لینے کی کھلی چھٹی دیدی جائے، تو قرآن کریم کی کوئی آیت معنوی تحریف سے محفوظ نہیں رہ سکتی، اور ہر شخص اپنے من مانے نظریات کو قرآن کریم میں ٹھونس کر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہاں الفاظ کے مجازی معنی مراد ہیں،

---

(۱) یہاں ہم نے اس مسئلہ کے مفصل معنی مباحث سے بچتے ہوئے سادہ الفاظ میں اس اصول کا خلاصہ بیان کیا ہے اس موضوع کی مکمل اور جامع ومانع بحث کے لئے اصولِ فقہ کی کتابیں ملاحظہ فرمائی جائیں، بالخصوص فخر الاسلام بزدویؒ کی ''اصول اور اس کی شرح'' ''کشف الاسرار'' لعبد العزیز النجاریؒ۔

Marfat.com

بلکہ بات صرف حقیقت اور مجاز تک ہی محدود نہیں، بسا اوقات ایک ہی لفظ یا ایک ہی جملے کے ایک سے زائد معنی ہو سکتے ہیں، اور وہ سب اس کے حقیقی معنی ہوتے ہیں، ایسی صورت میں بھی مسلّمہ قاعدہ یہ ہے کہ جو معنی عرف اور محاورے کے لحاظ سے زیادہ قریبی ظاہر اور متبادر ہوں اُن کو اختیار کیا جائے گا، اور دور دراز کے معانی کو اس وقت تک اختیار نہیں کیا جا سکتا جب تک قریبی معنی مراد لینے میں مذکورہ بالا مجبوریوں میں سے کوئی مجبوری لاحق نہ ہو، یا خود سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد سے دوسرے معنی ثابت نہ ہو جائیں، چنانچہ علامہ بدر الدین زرکشیؒ تحریر فرماتے ہیں:

> اَحَدُهُمَا اَنْ یَّکُوْنَ اَحَدُهُمَا اَظْهَرُ مِنَ الْاٰخَرِ، فَیَجِبُ الْحَمْلُ عَلَی الظَّاهِرِ اِلَّا اَنْ یَّقُوْمَ دَلِیْلٌ عَلٰی اَنَّ الْمُرَادَ هُوَ الْخَفِیُّ دُوْنَ الْجَلِیِّ فَیُحْمَلُ عَلَیْهِ،
>
> "(قرآن کریم میں ایک سے زائد معانی کے احتمال کی) ایک صورت یہ ہے کہ ایک معنی دوسرے کے مقابلے میں زیادہ ظاہر ہوں، ایسی صورت میں وہی معنی مراد لئے جائیں گے جو زیادہ ظاہر ہیں، اِلّا یہ کہ کوئی دلیل اس بات پر قائم نہ ہو جائے کہ یہاں ظاہری معنی کے بجائے پوشیدہ معنی مراد ہیں، ایسی صورت میں پوشیدہ معنی مراد لینا ضروری ہوگا۔"(۱)

یہ اصول اس قدر بدیہی (Selfevident) اور معقول ہے کہ قرآن کریم تو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، عام انسانی گفتگو میں بھی اس پر عمل کئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں، اور اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو کسی بھی شخص کی بات کو صحیح طور سے سمجھنا ممکن نہ رہے، فرض کیجئے کہ ایک مسافر ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر اپنے نوکر سے کہتا ہے کہ "ٹکٹ لے آؤ" اس کے جواب میں نوکر ریلوے کا ٹکٹ لانے کے بجائے ڈاک کا ٹکٹ لے آئے تو اُسے ساری دنیا احمق

(۱) البرھان فی علوم القرآن، ص ۱۶۷ ج ۲۔

قرار دے گی، اگر چہ ''ٹکٹ'' کے لفظ میں دونوں احتمال موجود تھے، لیکن نوکر کی حماقت یہ ہے کہ اس نے ریلوے اسٹیشن کے ماحول میں ٹکٹ کے ظاہری اور قریبی معنی کو چھوڑ کر دُور کے معنی مراد لئے، اسی طرح اگر کسی شہر کا حاکم کسی انجینیر کو یہ حکم دے کہ فلاں جگہ ایک نہر کھودی جائے جس سے آس پاس کی آبادی سیراب ہو سکے، اور انجینیر اس کا یہ مطلب بیان کرے کہ نہر کھودنے سے یہاں مراد ایک درسگاہ قائم کرنا ہے جس سے آس پاس کی آبادی تعلیم حاصل کر سکے، اور اپنے اس دعوے کی تائید میں بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کا کلام پیش کر دے کہ انہوں نے درسگاہ کے لئے ''نہر'' کا لفظ استعمال کیا ہے، تو ایسے انجینیر کو آپ کیا کہیں گے؟ ظاہر ہے کہ ساری دنیا اُسے دیوانہ قرار دے گی، کیونکہ ''نہر'' کے لفظ کو مجازاً ''درسگاہ'' کے معنی میں بے شک استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اس لفظ کی یہ تشریح اسی وقت درست ہو سکتی ہے جبکہ ''نہر'' کے اصلی اور حقیقی معنی کے خلاف کوئی دلیل یا قرینہ موجود ہو، اور مذکورہ مثال میں ایسی کوئی دلیل موجود نہیں تھی،

بعض لوگ اس واضح اصول کو پس پشت ڈال کر قرآن کریم کی تفسیر میں شدید گمراہیوں کے شکار ہو گئے ہیں، قدیم زمانے میں ملحدین کی ایک جماعت قرامطہ یا باطنیہ کے نام سے گزری ہے، اس نے تو اپنے مذہب باطل کی پوری عمارت اسی طرح کھڑی تھی کہ قرآن کریم کے ہر لفظ کو اس کے ظاہری اور حقیقی مفہوم سے ہٹا کر اسے عجیب وغریب معانی پہنائے تھے، چنانچہ اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ قرآن کریم میں ''صلوٰۃ'' (نماز) سے مراد امام (یعنی باطنی لیڈر) کی اطاعت ہے، ''حج'' سے مراد اُس لیڈر کی زیارت اور خدمت ہے، ''صوم'' (روزے) سے مراد اس لیڈر کا راز فاش کرنے سے پرہیز ہے، نہ کہ کھانے پینے سے، اور ''زنا'' سے مراد باطنی فرقے کا کوئی راز فاش کرنا ہے، (۱) اسی طرح عصائے موسیٰ سے مراد ان کے نزدیک حضرت موسیٰ کا غالب آجانا ہے، اور بادل کے سایہ کرنے سے مراد انکی حکومت کا قیام ہے، (۲)

(۱) دیکھئے ''الفرق بین الفِرَق: لِعبدا لقاھر البغدادی الاسفرائینی ص ۲۹۶ مطبع المدنی قاہرہ۔

(۲) الملل والنحل للشھیر ستانی مع حاشیہ ص ۳۳۴ ج ۱۔

اب پورے واقعے کا خلاصہ خود اُن کے الفاظ میں یہ ہے:

''یہ فطرت انسانی خدا تعالیٰ نے باغ کے استعارے میں بیان کی ہے، اس لئے تمام فطرت کو باغ ہی کے استعارہ میں بیان فرمایا ہے، سنِ رشد وتمیز کے پہنچنے کو درخت معرفتِ خیر وشر کو پھل کھانے سے، انسان کا اپنی بدیوں کے چھپانے کو درخت کے پتوں سے ڈھانکنے سے تعبیر کیا ہے، مگر شجرۃ الخلد کے پھل تک اس کو نہیں پہنچایا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک فانی وجود ہے اور اس کو دائمی بقاء نہیں۔'' (۱)

ان اقتباسات پر ہم کسی علمی تبصرے کی ضرورت نہیں سمجھتے، (۲) قرآن کریم میں حضرتِ آدمؑ اور ابلیس کا واقعہ ملاحظہ فرمایئے، اور مذکورہ بالا تاویلات وتحریفات کو اس پر چسپاں کر کے دیکھئے، خود اندازہ ہوجائے گا کہ حقیقت ومجاز کے بارے میں جو مسلّمہ اصول اوپر بیان کیا گیا ہے اس کو نظر انداز کر کے کیسی کیسی لغو باتیں قرآن کریم کی طرف منسوب کی گئی ہیں،

اِس طرح قرآن کریم جا بجا جنت کی نعمتوں کے بیان سے بھرا پڑا ہے، اس میں جنت کے ہَرے بھرے باغات، بہتے ہوئے دریاؤں، خوبصورت مکانات، حسین اور پاکیزہ شریکِ

---

(۱) تفسیر القرآن از سر سید احمد خان، ص ۱۵۹ ج ۱۔

(۲) البتہ مذکورہ بالا تحریفات پر ہمیں فرقۂ باطنیہ کا مشہور لیڈر عبیداللہ بن الحسن القیر وانی یاد آ گیا، جس نے اپنے ایک پیر و کو لکھا تھا: اِنّی اُوصیک بتشکیک النّاس فی القرآن والتوراۃ والزبور والانجیل وبدعوتھم الی ابطال الشرائع والیٰ ابطال المعاد والنشور من القبور وابطال الملائکۃ فی السمأ وابطال الجن فی الارض، واُوصیک بان تدعوھم الی القول بانّہ قد کان قبل آدم بشر کثیر، فانّ ذٰلک عونٌ علیٰ قدم العالم (الفَرْقُ بین الفِرَق، ص ۲۹۶ و ۲۹۷) ''یعنی میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ لوگوں کو قرآن، توراۃ، زبور اور انجیل کے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار بناؤ، انہیں تمام شرعی قوانین کے باطل ہونے کی طرف دعوت دو، اور آخرت اور حشر ونشر، آسمان میں ملائکہ اور زمین میں جنات کے تصور کو مٹاؤ، نیز میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ لوگوں کو اس اعتقاد کی طرف دعوت دو کہ آدم (علیہ السلام) سے پہلے بھی بہت سے انسان ہو چکے ہیں، کیونکہ یہ اعتقاد دنیا کو غیر فانی ثابت کرنے میں تمہارا مددگار ثابت ہوگا۔

زندگی، لذیذ کھانوں اور پھلوں کا بیان اس کثرت

خان صاحب فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ مجاز ہی مجاز ہے

اور راحت'' کا بیان ہے، اور مذکورہ بالا اشیاء محض اس لئے بیان

ان لذتوں کے لالچ میں دن رات اطاعت میں لگے رہیں،

''ایک تربیت یافتہ دماغ خیال کرتا ہے کہ وعدہ وعید، دور کے جن الفاظ سے بیان ہوئے ہیں اُن سے بعینہٖ وہی اشیاء نہیں، بلکہ اس کا بیان کرنا صرف اعلیٰ درجے کی خوشی وراحت کو انسانی کے لائق تشبیہ میں لانا ہے، اس خیال سے اُس کے دل میں ایک بے انتہا عمدگی، نعیم جنت کی اور ایک ترغیب اوامر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے کی پیدا ہوتی ہے، اور ایک کوڑ مغز ملا یا شہوت پرست زاہد یہ سمجھتا ہے کہ درحقیقت بہشت میں نہایت خوبصورت اَن گنت حوریں ملیں گی، شرابیں پئیں گے، میوے کھاویں گے، دودھ وشہد کی ندیوں میں نہاویں گے، اور جو دل چاہے گا وہ مزے اُڑاویں گے، اور اس لغو، بیہودہ خیال سے دن رات اوامر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے میں کوشش کرتا ہے''(۱)

واقعہ یہ ہے کہ حقیقت ومجاز کے بارے میں جو اصول اوپر بیان کیا گیا ہے اگر اس کو پسِ پشت ڈال دیا جائے تو کوئی خراب سے خراب عقیدہ اور بُرے سے بُرا عمل ایسا نہیں ہے جسے قرآن کی طرف منسوب نہ کیا جا سکے، آخر باطنی فرقے کے لوگوں نے مجاز واستعارہ کے یہی ہتھیار استعمال کر کے قرآن سے مجوسی عقائد ثابت کر دیئے تھے، اور آج بھی بہت سے عیسائی پادری قرآن کریم ہی کی آیتوں میں دور دراز کی تاویلات کر کے اُسے عیسائی مذہب کا حامی ثابت کرتے رہتے ہیں، اور پھر جب آدھا قرآن مجاز واستعارے پر مشتمل ہے اور اس میں

(۱) تفسیر القرآن از سرسید احمد خان، ص ۳۵ ج ۱۔

Marfat.com

ملائکہ سے مراد درختوں کی قوّتِ نمو، دریاؤں کی قوّت روانی اور آگ کی قوّتِ احراق، آدم علیہ السلام سے مراد نوعِ انسانی، ابلیس سے مراد شر کی قوّتیں ہوسکتی ہیں تو دوزخ سے مراد دنیوی تکلیفیں اور جنت سے مراد دنیوی راحتیں بھی ہوسکتی ہیں، اور خدا کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے کہ (معاذاللہ) وہ کسی مستقل وجود کا نام نہیں، بلکہ کائنات کی اصل یعنی مادے یا توانائی کا نام ہے، اور خدا کا تصور جو قرآن میں بیان ہوا ہے، وہ (معاذاللہ) آپؐ نے محض اس لئے بیان فرمایا تاکہ عرب کے بدوؤں کو اس سے ڈرا کر اچھے کاموں کی طرف بُلایا جاسکے، لیجئے! اس طرح مجاز و استعارے کے اس ہتھیار نے دین و مذہب کی بالکل ہی چھٹی کر ڈالی، اور قرآن پر عمل کرنے کے لئے خدا کے وجود پر ایمان رکھنا بھی ضروری نہ رہا، اور یہ بات محض ایک عقلی مفروضہ ہی نہیں ہے، مجاز اور تمثیل کے استعمال کو کھلی چھٹی دے کر فرقۂ باطنیہ نے بالکل اسی جیسے دعوے کئے تھے، علاّمہ عبدالقاہر بغدادیؒ تحریر فرماتے ہیں:

> "فرقۂ باطنیہ کے مشہور لیڈر عبیداللہ بن الحسن قیروانی نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ آخرت کی جزاء و سزاء لغو باتیں ہیں اور جنت سے مراد درحقیقت دنیا ہی کا عیش و آرام ہے، اور عذاب سے مراد شریعت پرستوں کا نماز، روزے اور حج و جہاد کے چکّر میں پھنسا رہنا ہے۔" (۱)

لہٰذا اگر قرآن کریم سے اللہ کی کتابِ ہدایت کی حیثیت میں فائدہ حاصل کرنا ہے تو یہ طرزِ عمل انتہائی نامعقول ہے، بیہودہ اور خطرناک ہے، کہ قرآن کریم کی جو بات اپنے کسی نظریہ کے خلاف معلوم ہو اس میں تأویلات کا دروازہ کھول کر یہ کہنا شروع کر دیا جائے کہ اس کے ظاہری اور حقیقی معنی کے بجائے فلاں معنی مراد ہیں، عہدِ حاضر کے جن مصنفین نے علم تفسیر کی ضروری شرائط پوری کئے بغیر قرآن کریم کی تفسیر پر قلم اٹھایا ہے، اُن میں یہ اصولی غلطی بکثرت پائی جاتی ہے، اور اُن کے مطالعہ کے دَوران اگر مذکورہ بالا اصول کو ذہن میں رکھا جائے تو ایسی تصانیف کی بہت سی غلطیاں خود بخود واضح ہوجاتی ہیں،

---

(۱) الفَرق بین الفِرَق، ص ۲۵۹۔

Marfat.com

۲......قرآن کریم اور عقلی دلائل

عہدِ حاضر کے بعض مصنفین قرآن وسنت کے ارشادات میں بعض اوقات یہ کہہ کر دوراز کار تأویلات اختیار کرتے ہیں کہ ان ارشادات کا ظاہری مفہوم عقل کے خلاف ہے، اس لئے اُن کی ایسی تأویلات کرنی ضروری ہے جو عقل کے خلاف نہ ہو، اس معاملے میں چونکہ غلط فہمیاں بہت عام ہیں، اس لئے ہم یہاں اس مسئلے کو قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں،

سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ قرآن وسنت سے جو باتیں ثابت ہوتی ہیں آگے ہم انہیں "نقلی دلائل" سے تعبیر کریں گے، اور عقل سے جو باتیں معلوم ہوتی ہیں، انہیں "عقلی دلائل" سے،

دراصل اس معاملے میں غلط فہمیوں کا اصل سبب یہ ہے کہ ہمارے علماء ومتکلمین نے اپنی کتابوں میں یہ قاعدہ لکھا ہے کہ اگر نقلی دلائل عقلی دلائل کے خلاف ہوں تو عقلی دلائل پر عمل کیا جائے گا، اور نقلی دلائل اگر سند کے اعتبار سے قابلِ اعتماد نہ ہوں تو ان کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ وہ صحیح نہیں ہیں، اور اگر وہ سند کے لحاظ سے نا قابلِ انکار ہوں تو یہ کہیں گے کہ اُن کا ظاہری مفہوم مراد نہیں ہے، پھر اگر ان کا کوئی دوسرا مطلب بے تکلف ہوسکتا ہو تو کہا جائے گا کہ وہ مفہوم مراد ہے، اور اگر کوئی بے تکلف مطلب سمجھ میں نہ آئے تو کہیں گے کہ اس کا صحیح مفہوم ہم پر واضح نہیں ہوسکا، اور اس کا حقیقی علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، نقلی دلائل کی اس آخری قسم ہی کو "متشابہات" سے تعبیر کرتے ہیں،(۱)

---

(۱) امام رازیؒ اپنی کتاب "اساس التقدیس فی علم الکلام" میں تحریر فرماتے ہیں: اعلم ان الدلائل القطعیة العقلیة اذا قامت علی ثبوت شئی، ثم وجدنا ادلّة نقلیة یشعر ظاهر ها بخلاف ذٰلك، فهناك لایخلو الحال من احد امور اربعة ...... ولما بطلت الاقسام الاربعة لم یبق اِلّا أن یقطع بمقتضیٰ الدلائل العقلیة القاطعة بان هذه الدلائل النقلیة امّا ان یقال انها غیر صحیحة، او یقال انها صحیحة الا ان المراد منها غیر ظواهر ها، ثم ان جوزنا التاویل و شغلنا علی سبیل التبرع بذکر تلك التأویلات علی التفصیل، وان لم یجز التأویل فوضنا للعلم بها الی الله تعالیٰ، فهذا هو القانون الکلّی المرجوع الیه فی جمیع المتشابهات، (اساس التقدیس ص ۱۷۲ و ۱۷۳ فصل ۳۲، مطبوعہ مصطفیٰ البابی مصر ۱۳۵۴ھ)

Marfat.com

یہ قاعدہ علماء اور متکلمین میں مشہور و معروف ہے، لیکن اس کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی بناء پر بعض مصنفین نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ قرآن وسنت کی جو کوئی بات اپنی کسی رائے کے خلاف ہوئی اس میں یہ کہہ کر تاویل شروع کردی کہ یہ عقل کے خلاف ہے، حالانکہ جن متکلمین نے یہ قاعدہ بیان کیا ہے انہوں نے اس کی مکمل تشریح بھی کردی ہے، یہاں اس تشریح کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے، حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ ''الانتباہات المفیدہ'' میں اس قاعدے کو بہترین انداز میں منضبط فرمایا ہے، پہلے ہم انہی کے الفاظ میں یہ قاعدہ ذکر کرتے ہیں، اس کے بعد انشاءاللہ اس کی مفصّل تشریح پیش کی جائے گی، حکیم الامت حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''دلیل عقلی ونقلی میں تعارض کی چار صورتیں عقلاً محتمل ہیں:

ایک یہ کہ دونوں قطعی ہوں، اس کا کہیں وجود نہیں، نہ ہوسکتا ہے، اس لئے کہ صادقین میں تعارض محال ہے، دوسرے یہ کہ دونوں ظنی ہوں، وہاں جمع کرنے کے لئے گو ہر دو میں صرف عن الظاہر کی گنجائش ہے، مگر لسان کے قاعدے سے کہ اصل الفاظ میں حمل علی الظاہر ہے، نقل کو ظاہر پر رکھیں گے اور دلیل عقلی کی دلالت کو حجت نہ سمجھیں گے، تیسرے یہ کہ دلیل نقلی قطعی ہو اور عقلی ظنی، یہاں یقیناً نقلی کو مقدم رکھیں گے چوتھے یہ کہ دلیل عقلی قطعی ہو اور نقلی ظنی ہو، ثبوتاً یا دلالۃً، یہاں عقلی کو مقدم رکھیں گے، نقلی میں تاویل کریں گے، پس صرف یہ ایک موقع ہے، درایت کی تقدیم کا روایت پر، نہ یہ کہ ہر جگہ اس کا دعویٰ یا استعمال کیا جاوے''(۱)

اس قاعدے کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ عقلی دلائل تین قسم کے ہوسکتے ہیں:

(۱) الانتباہات المفیدہ مع حل الانتباہات، ص ۶۶ و ۶۷، ج ۱ مطبوعہ دہلی۔

۱...... قطعی عقلی دلائل

یعنی ایسے عقلی دلائل جو سوفی صد یقینی ہوں، انہیں تمام انسان کسی ادنیٰ اختلاف کے بغیر تسلیم کرتے آئے ہوں، اوران کے خلاف ہر بات سوفی صد ناممکن ہو، مثلاً یہ بات کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں، قطعی عقلی دلیل ہے، جس کے خلاف کبھی نہیں ہوسکتا، یعنی دو اور دو مل کر کبھی تین یا پانچ نہیں ہوسکتے، اسی طرح یہ بات عقلاً قطعی طور سے ناممکن ہے کہ ایک شخص ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ پر موجود بھی ہو اور وہاں سے غائب بھی،

ظنی عقلی دلائل

یعنی وہ عقلی باتیں جو سوفی صد یقینی تو نہ ہوں، لیکن عقل اور تجربے کی رُو سے اُن کی سچائی کا غالب گمان پیدا ہوتا ہو، ایسی باتوں کی سچائی پر تمام اہل عقل ہمیشہ متفق نہیں رہتے، بلکہ مختلف زمانوں، مختلف خطوں اور عقل وخرد کے مختلف سانچوں کے اعتبار سے ان معاملات میں نظریاتی اختلاف پیش آتا رہتا ہے، مثال کے طور پر نیوٹن کا نظریہ تجاذب (Theory of Gravity) آئن اسٹائن کا نظریۂ اضافت (Theory of Relativity) ڈارون کا نظریۂ ارتقاء (Theory of Evolution) وغیرہ، ظاہر ہے کہ اُن میں سے کوئی بھی نظریہ سوفی صد یقینی نہیں تھا، بلکہ ان فلسفیوں نے اپنی عقل اور اپنے تجربات کو کام میں لاکر ایک رائے قائم کی تھی، جو اُن کو اس وقت کی معلومات اور اس وقت کے حالات کے لحاظ سے زیادہ صحیح معلوم ہوئی تھی، اور اس کی سچائی پر اُن کا گمان غالب ہوگیا تھا، لیکن اس رائے کو یقینی اور قطعی طور سے سوفی صد درست نہیں کہا جاسکتا، یہی وجہ ہے کہ بہت سے دوسرے فلاسفہ نے اس سے اختلاف کیا، ایک زمانے میں کوئی نظریہ ذہنوں پر چھایا رہا، اور دوسرے زمانے میں وہی نظریہ عقل سے خارج نظر آنے لگا،

Marfat.com

وہمی عقلی دلائل

۳...... یعنی وہ دلائل جن کی بنیاد یقین یا گمان غالب کے بجائے محض وہم وقیاس پر ہو، مثلاً اب سے کچھ عرصہ پہلے تک سائنس دانوں کا یہ خیال تھا کہ مریخ پر زندگی موجود ہے، ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی بنیاد کسی قطعی یا ظنی دلیل پر نہیں، بلکہ محض وہمی اندازوں پر تھی،

اسی طرح نقلی دلائل کی بھی تین قسمیں ہیں۔

۱...... قطعی نقلی دلائل

وہ دلائل ہیں جو سو فی صد یقینی ہوں، یعنی کسی مضمون کے متعلق ان کے الفاظ بھی بالکل صریح اور صاف ہوں، اور سند وثبوت کے اعتبار سے بھی یقینی طور سے قابلِ اعتماد ہوں، مثلاً قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا (زنا کے پاس تک نہ جاؤ) یہ اس بات کی قطعی اور یقینی دلیل ہے کہ اسلام میں زنا حرام ہے، کیونکہ مسلمانوں کو قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اور اس کی مذکورہ آیت سے یقینی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم زنا سے منع کرنا چاہتا ہے، اسی طرح جو باتیں متواتر احادیث (۱) یا اجماعِ قطعی سے ثابت ہوں وہ بھی اسی قسم میں داخل ہیں،

۲...... ظنی نقلی دلائل

یعنی وہ نقلی دلائل جو پہلی قسم کی طرح قطعی تو نہیں ہوتے لیکن اُن سے جو بات ثابت ہوتی

(۱) متواتر ان احادیث کو کہتے ہیں جن کے روایت کرنے والے ہر دور میں اتنے رہے ہوں کہ عقل اُن سب کے بیک وقت جھوٹا ہونے کو ناممکن سمجھتی ہو، ایسی احادیث تو سند وثبوت کے اعتبار سے سو فی صد قطعی اور یقینی ہوتی ہیں، لیکن اخبار آحاد (یعنی وہ حدیثیں جن کو روایت کرنے والے کسی زمانے میں صرف ایک یا دو تین رہ گئے ہوں) ظنی ہوتی ہیں، یعنی اُن کے ثبوت کا ایسا یقین نہیں ہوتا جیسے متواتر احادیث کا، البتہ اگر وہ اصول حدیث کی شرائط پر پوری اترتی ہوں تو غالب گمان یہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح ہیں، اس لئے پوری امت کا اس پر اتفاق ہے کہ اُن پر عمل ضروری ہے،

Marfat.com

ہے اس کے صحیح ہونے کا غالب گمان قائم ہو جاتا ہے، مثلاً وہ تمام احادیث جو متواتر نہیں ہیں، لیکن اصولِ حدیث کی شرائط پر پوری اُترتی ہیں، ایسی احادیث اگرچہ واجب العمل ہیں، اور ان کی مخالفت کرنا جائز نہیں ہوتا، لیکن چونکہ ثبوت کے اعتبار سے وہ قرآن اور متواتر احادیث کی طرح قطعی اور یقینی نہیں ہوتیں، اس لئے انہیں دوسرے درجے میں رکھا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ایسی حدیث قرآن کریم یا متواتر احادیث کے خلاف ہو تو اس کی ایسی تشریح کی جائے گی جو قرآن کریم یا متواتر احادیث کے مطابق ہو، اور اگر ایسی تشریح ممکن نہ ہو تو اُسے چھوڑ دیا جائے گا،

۳...... وہمی نقلی دلائل

یعنی وہ نقلی دلائل جن کی صحت کا غالب گمان بھی قائم نہ ہوتا ہو بلکہ وہ محض وہم پر مبنی ہوں، مثلاً وہ احادیث جو اصولِ حدیث کی شرائط پر پوری نہیں اُترتیں،

ان چھ قسموں میں سے دو (یعنی وہمی عقلی دلائل اور وہمی نقلی دلائل) کا تو کوئی اعتبار ہی نہیں ہے، لہٰذا وہ خارج از بحث ہیں، البتہ باقی چار اقسام کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے عقلی اور نقلی دلائل میں تعارض واختلاف کی عقلاً چار صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱...... پہلی صورت یہ ہے کہ دلیل نقلی بھی قطعی ہو اور دلیل عقلی بھی قطعی، یہ صورت محض ایک نظریاتی مفروضہ ہے، عملاً آج تک نہ ایسا ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے، کہ کوئی قطعی نقلی دلیل کسی قطعی عقلی دلیل کے مخالف ہو جائے، اگر کہیں بظاہر ایسا نظر آتا بھی ہو تو نقلی دلیل صرف اپنی سند اور ثبوت کے اعتبار سے قطعی ہوگی، لیکن اس کا جو مضمون قطعی دلیل عقلی کے مخالف معلوم ہو رہا ہو، اس پر اس کی دلالت قطعی نہیں ہوگی، اور اگر اس مضمون پر اس کی دلالت قطعی ہوگی تو وہ سند اور ثبوت کے اعتبار قطعی نہیں ہوگی، ایسا نہ آج تک ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے، کہ کوئی دلیل نقلی اپنے ثبوت اور دلالت دونوں کے اعتبار سے قطعی ہو، اور پھر وہ قطعی دلیل عقلی کے خلاف ہو،

Marfat.com

کہ وہ ایک دلدل جیسے (سیاہ) چشمے میں ڈوب رہا ہے۔"

یہ بھی قرآن کریم کی آیت ہے، اس لئے اس کے کلام الٰہی ہونے میں کوئی شبہ نہیں، لیکن اس جملے کا جو مفہوم ظاہری طور سے سمجھ میں آتا ہے کہ سورج واقعی ایک کیچڑ والے چشمے میں ڈوب رہا تھا، وہ عقل و مشاہدہ کے قطعی دلائل کی رُو سے درست نہیں، کیونکہ یہ بات یقینی ہے کہ سورج اور زمین دونوں الگ الگ کرے ہیں، جو کسی بھی مقام پر آپس میں نہیں ملتے، لہٰذا آیت کا یہ ظاہری مفہوم مراد لینا کسی طرح درست نہیں ہوگا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس مقام پر اُس وقت ذوالقرنین پہنچے تھے وہاں سے آگے کوئی آبادی نہیں تھی، اور حدِ نظر تک دَلدَل ہی دَلدَل تھی، اس لئے دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ سورج اس کیچڑ والے چشمے میں ڈوب رہا ہے، یہ مفہوم اگرچہ آیت کے الفاظ سے پہلے مفہوم کے برابر ظاہر نہیں ہے، لیکن چونکہ آیت کے الفاظ میں اس کی بھی پوری گنجائش ہے، اس لئے یہ آیت پہلے مفہوم پر ظنی الدلالۃ ہے، اور جب اس کا مقابلہ عقل و مشاہدہ کے قطعی دلائل سے ہوا تو یہ قطعی دلائل راجح قرار پائے، اور آیت کے اس مفہوم کو باجماع اختیار کر لیا گیا، جو اِن قطعی دلائل کے موافق تھے،

۳...... تیسری صورت یہ ہے کہ نقلی دلیل قطعی ہو اور عقلی دلیل ظنی، ظاہر ہے کہ اس صورت میں نقلی دلیل ہی کو ترجیح ہوگی، کیونکہ ظنی دلیل قطعی دلائل کا مقابلہ نہیں کر سکتی، مثال کے طور پر ڈارون نے اپنے نظریۂ ارتقاء میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ انسانوں کی نسل یکایک وجود میں نہیں آئی، بلکہ حیوانات مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ ایک سلسلۂ ارتقاء سے وابستہ رہے ہیں، اور اس ارتقاء کے نتیجے میں انہوں نے بہت سی ہیئتیں بدلی ہیں، یہاں تک کہ انسان بننے سے پہلے اس کی آخری شکل بندر یا بن مانس تھی، اور انہی بندروں یا بن مانسوں کی ایک نسل ارتقاء کے مراحل طے کرتی ہوئی انسان بن گئی، ظاہر ہے کہ ڈارون کا یہ نظریہ ایک قیاسی نظریہ تھا، اور جو دلائل اس نے پیش کئے تھے، اگر انہیں دلائل کہنا صحیح ہو تو زیادہ سے زیادہ وہ ظنی دلائل تھے، اس کے مقابلے میں قرآن کریم واضح الفاظ میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ

وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَآءً ﴾ (النسآء: ۱)

"اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیوی پیدا کی، اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں (دُنیا میں) پھیلا دیئے۔"

نیز ارشاد فرمایا:

﴿ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴾ الحجر: ۲۸ تا ۳۱)

"اور وہ وقت یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا تھا کہ: "میں سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے ایک بشر کو پیدا کرنے والا ہوں، لہٰذا جب میں اُس کو پوری طرح بنالوں، اور اُس میں اپنی روح پھونک دُوں تو تم سب اُس کے آگے سجدے میں گر جانا" چنانچہ سارے کے سارے فرشتوں نے سجدہ کیا۔" الخ

یہ اور اُن جیسی متعدد آیات صراحۃً یہ ثابت کرتی ہیں کہ بنی نوع انسان کی ابتداء ایک فردِ واحد (حضرت آدم علیہ السلام) سے ہوئی ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے گارے سے پیدا کیا تھا، قرآن کریم کے یہ دلائل قطعی ہیں، لہٰذا ان سے ڈارون کے نظریئے کی قطعی تردید ہوجاتی ہے، اور اس نظریہ کی وجہ سے (جسے زیادہ سے زیادہ ظنی کہا جاسکتا ہے) قرآن کریم کے صریح بیانات کو چھوڑ دینا یا ان میں دور از کار تاویلات کرنا کسی طرح درست نہیں ہوسکتا،

۴..... چوتھی صورت یہ ہے کہ نقلی دلیل بھی ظنی ہو اور عقلی دلیل بھی ظنی، اس صورت میں بھی علماء اور متکلمین کا اس پر اتفاق ہے کہ نقلی دلیل کو ترجیح ہوگی، اور جب تک عقلی دلیل قطعی مشاہدے کی صورت اختیار نہ کرلے اُس وقت تک اس کی وجہ سے قرآن وسنت کو اس کے ظاہری مفہوم سے ہٹانا درست نہیں ہوگا، اس کی وجہ وہی ہے جو "قرآن کریم اور مجاز" کے عنوان

کے تحت تفصیل سے بیان ہو چکی ہے کہ صرف قرآن کریم ہی نہیں دنیا کی ہر گفتگو میں اصل یہ ہے کہ وہ حقیقت ہو، مجازی معنی اسی وقت اختیار کئے جائیں گے جب کوئی مجبوری لاحق ہو جائے، اگر عقل کی کوئی دلیل قطعی حقیقی معنی کے معارض ہو تب تو مجبوری واضح ہے، اور اس صورت میں مجازی معنی بھی مراد لینا واضح ہے، لیکن جب عقلی دلیل ظنی ہے تو مجازی یا دُور کے معنی اختیار کرنے کی مجبوری ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ عقل کے ظنی دلائل کا حال یہ ہے کہ وہ کبھی عالمگیر اور ابدی نہیں ہوتے، ایک شخص ظنی دلیل کو تسلیم کرتا ہے لیکن دوسرا اس کا منکر ہے، ایک زمانے میں اسے قبول عام حاصل ہے، اور دوسرے زمانے میں اُسے جہالت سمجھا جاتا ہے، فلسفہ اور سائنس کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے وہ اس قسم کے کتنے بیشمار نظریات سے بھری ہوتی ہے، ایک ہی زمانے میں ایک فلسفی ایک نظریئے کا قائل ہے، اور اپنے ظنی دلائل کو تمام دوسرے دلائل پر فوقیت دیتا ہے، لیکن دوسرا فلسفی ٹھیک اُسی دَور میں ایک بالکل متضاد نظریہ کو درست سمجھتا ہے، اور اس کے دلائل کو ترجیح دیتا ہے، پھر جب زمانہ کچھ آگے بڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے دَور کے تمام فلسفیوں کے دلائل بے بنیاد اور غلط تھے، ایسے ظنی عقلی دلائل کا تو شمار مشکل ہے جنہیں آگے چل کر عقل اور مشاہدے کے قطعی دلائل نے ہمیشہ کے لئے باطل قرار دیدیا، اس کے برخلاف چودہ سو سال کی مدّت میں ایسے ظنی نقلی دلائل اِکا دُکا ہی ملیں گے، جن کو عقل کے قطعی دلائل یا مشاہدے نے یقینی طور پر غلط قرار دیدیا ہو، لہٰذا اگر عقل کی ہر ظنی دلیل کی وجہ سے نقلی دلائل میں تاویلات کا دروازہ کھولا گیا تو قرآن وسنت کو بازیچۂ اطفال بنانے کے سوا اس کا اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے؟ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی اچھی بات لکھی ہے:

> ”دراصل اس قسم کے مباحث علمیہ کے لئے اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو مسائل علم یقین اور مشاہدے کی حد تک پہنچ چکے ہیں اور قرآنی علوم اور وحی الٰہی ان حقائق کا انکار نہیں کرتے (کیونکہ قرآن عزیز مشاہدے اور بداہت کا کبھی بھی انکار نہیں کرتا، تو ان کو بلاشبہ تسلیم

Marfat.com

کیا جائے، اس لئے کہ ایسے حقائق کا انکار بے جا تعصب اور تنگ نظری کے سوا اور کچھ نہیں، اور جو مسائل ابھی تک یقین اور جزم کی اُس حد تک نہیں پہنچے جن کو مشاہدہ اور بداہت کہا جا سکے، تو اُن کے متعلق قرآن عزیز کے مطالب میں تاویلات نہیں کرنی چاہئیں، اور خواہ مخواہ اُن کو جدید تحقیقات کے سانچے میں ڈھالنے کی سعی ہرگز جائز نہیں، بلکہ وقت کا انتظار کرنا چاہئے، کہ وہ مسائل اپنی حقیقت کو اس طرح آشکارا کر دیں کہ ان کے انکار سے مشاہدے اور بداہت کا انکار لازم آجائے، اس لئے کہ یہ حقیقت ہے کہ مسائل علمیہ کو تو بارہا اپنی جگہ سے ہٹنا پڑا ہے، مگر علوم قرآنی کو کبھی ایک مرتبہ بھی اپنی جگہ سے ہٹنے کی ضرورت پیش نہیں آئی'' (۱)

لہٰذا بنیادی اصول تو یہی ہے کہ جب عقل اور نقل کے ظنی دلائل میں تعارض پیش آئے تو نقل کے ظنی دلائل کو ترجیح ہوگی، اور عقل کے ظنی دلائل کی بنیاد پر نقلی دلائل میں دور دراز کی تاویلات اختیار کرنا درست نہیں ہوگا، لیکن یہاں ایک بات یاد رکھنی چاہئے اور وہ یہ کہ ظنی دلائل بھی سب ایک ہی طرح کے نہیں ہوتے، بلکہ اُن میں بھی مختلف درجات ہوتے ہیں، چنانچہ بعض ظنی دلائل دوسرے ظنی دلائل کے مقابلے میں زیادہ قوی ہوتے ہیں، مثلاً یہ بات بھی ظنی ہے کہ زمین حرکت کرتی ہے، اور یہ بھی ظنی ہے کہ انسان سے پہلے دنیا میں ''نیا ندرتھل'' (Neanderthal) کے نام سے ایک مخلوق پائی جاتی تھی، (۲) لیکن ظاہر ہے کہ قوت کا جو درجہ پہلی بات کو حاصل ہے، وہ دوسری بات کو حاصل نہیں، اسی طرح ایک ظنی نقلی دلیل وہ ہے جو صحیح بخاریؒ اور صحیح مسلمؒ اور تمام حدیث کی کتابوں میں موجود ہو، اور ایک وہ ہے جو صحیح سند کے ساتھ منقول ہے، لیکن صحاح ستہ اور حدیث کی معروف و متداول کتابوں میں نہیں پائی جاتی

---

(۱) قصص القرآن، ص ۴۹ ج ۱، واقعہ آدم علیہ السلام، مسئلہ نمبر ۱۰۔

(۲) دیکھئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، مطبوعہ ۱۹۵۰ء مقالہ ''Man'' ص ۷۶۴ ج ۱۴۔

Marfat.com

ظاہر ہے کہ پہلی قسم دوسری کے مقابلے میں زیادہ قوی ہے، اس طرح ظنی دلائل میں درجات متفاوت ہوسکتے ہیں، اب اگر کوئی عقلی دلیل ظنی درجۂ اوّل کی ہو اور نقلی دلیل ظنی درجۂ دوم سوم کی ہو تو ایسی صورت میں ایک مجتہد عقلی دلیل کو نقلی دلیل پر ترجیح دیکر نقلی دلیل کی ایسی توجیہ کرسکتا ہے جو ظاہری الفاظ کے لحاظ سے نسبتاً بعید لیکن عقلی دلائل کے مطابق ہو، البتہ جب تک وہ عقلی دلیل مشاہدے یا قطعیات سے ثابت نہ ہو جائے اُس وقت تک نقلی دلیل کی اس توجیہ کو قطعی اور متعیّن طریقے سے بیان نہ کرنا چاہئے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے جو عقلی دلائل کے لحاظ سے راجح معلوم ہوتا ہے۔

لیکن چونکہ ظنی دلائل کے ان درجات کو نپے تلے قواعد کے تحت لانا مشکل ہے اس لئے یہ فیصلہ کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے کہ کونسی دلیل کسی درجے کی ظنی ہے، چنانچہ یہ فیصلہ وہی شخص کرسکتا ہے جسے نقل و عقل کے دلائل پر مکمل عبور اور قرآن وسنت کے علوم میں پوری بصیرت حاصل ہو، اور اس معاملے میں اہلِ علم کی آراء میں اختلاف بھی پیدا ہو جاتا ہے،

یہ بات ایک مثال سے واضح ہوسکے گی، قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے کہ جب حضرت ذوالقرنین نے یاجوج وماجوج کو روکنے کے لئے دیوار بنائی تو فرمایا:

﴿ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّىْ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّىْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّىْ حَقًّا ﴾ (الکہف: ۹۸)

"یہ میرے رَبّ کی رحمت ہے (کہ اُس نے ایسی دیوار بنانے کی توفیق دی) پھر میرے رَبّ نے جس وقت کا وعدہ کیا ہے، جب وہ وقت آئے گا تو وہ اس (دیوار) کو ڈھا کر زمین کے برابر کردے گا، اور میرے رَبّ کا وعدہ بالکل سچا ہے۔"

اس میں اکثر مفسرین نے یہ فرمایا ہے کہ "پروردگار کا وعدہ" سے مراد قیامت ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب قیامت قریب آجائے گی، اور یاجوج ماجوج کے نکلنے کا وقت ہوگا، اُس وقت یہ دیوار ٹوٹ جائے گی، اگرچہ قرآن کریم نے صرف "پروردگار کا وعدہ" کا لفظ ذکر فرمایا

Marfat.com

ہے، اُس کی مزید تشریح وتفسیر نہیں فرمائی، لیکن چونکہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر یہ لفظ قیامت کے معنی میں آیا ہے، اس لئے مفسرین نے یہاں بھی اُس کے یہی معنی مراد لئے ہیں، لیکن یہ تفسیر قطعی نہیں بلکہ ظنی ہے،

دوسری طرف اب تک جو جغرافیائی اور تاریخی تحقیقات ہوئی ہیں اُن سے گمان یہ ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کی بنائی ہوئی دیوار کافی عرصہ پہلے ٹوٹ چکی ہے، اگرچہ یہ تحقیقات بھی ظنی ہیں، کیونکہ ذوالقرنین کی دیوار کا قطعی اور یقینی تعین جس میں کوئی شبہ باقی نہ رہے، بہت مشکل ہے،

اس کے باوجود ایک شخص جسے عقلی اور نقلی دلائل میں موازنے کا مکمل سلیقہ اور ان معاملات کی صحیح بصیرت عطا فرمائی ہو یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ یہ تاریخی اور جغرافائی تحقیقات درجۂ اوّل کی ظنی ہیں، اور آیت کی مذکورہ بالا تفسیر درجۂ دوم کی ظنی ہے، لہٰذا ان تحقیقات کے مطابق یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ قرآن کریم کی مذکورہ آیت میں ''پروردگار کے وعدے'' سے مراد قیامت کے بجائے وہ معیّن وقت بھی ہوسکتا ہے، جس میں اس دیوار کا ٹوٹنا تقدیر الٰہی میں طے شدہ ہے، چنانچہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے گزشتہ عام مفسرین کے خلاف اسی تفسیر کی طرف اپنا رُجحان ظاہر کیا ہے کہ ذوالقرنین نے اس قول کا منشاء قیامت کی کسی علامت کی طرف اشارہ کرنا نہیں تھا، بلکہ وہ ایک عام بات کہنا چاہتے تھے، کہ جب میرے پرودگار کا حکم ہوگا یہ دیوار ٹوٹ جائے گی، اور قیامت کے قریب یأجوج ومأجوج کے جس خروج کا ذکر قرآن کریم نے دوسری جگہ فرمایا ہے اُس کا دیوار ٹوٹنے کے واقعے سے کوئی تعلق نہیں، (۱)

لیکن، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، ظنی دلائل کی یہ درجہ بندی بڑا نازک کام ہے، اور اس کے لئے نقلی وعقلی علوم میں قرارِ واقعی بصیرت ومہارت کی ضرورت ہے، لہٰذا اس معاملے میں پوری احتیاط، سمجھ بوجھ اور خوفِ خدا کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے، اور محض کسی رائج الوقت

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام از حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ ص ۱۹۷ ونفحۃ العنبر از حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، ص ۱۵۸ و قصص القرآن۔

Marfat.com

نظریئے کی چمک دمک سے مرعوب ہو کر جلد بازی میں کوئی فیصلہ کر لینا اکثر گمراہی کی طرف لے جاتا ہے،

یہ ہے عقلی اور نقلی دلائل میں تعارض کے وقت صحیح طریق کار جو تمام علمائے سلف کا معمول رہا ہے، اور جس کی معقولیت پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا،

۳......احکام شرعیہ اور عقل

قرآن کریم کی تفسیر میں عقل کے استعمال کی ایک بدترین صورت یہ ہے کہ قرآن کریم کے صریح اور واضح الفاظ سے جو شرعی حکم ثابت ہو رہا ہو، اُس سے اس بناء پر انکار کیا جائے کہ اس کی حکمت ہماری سمجھ میں نہیں آسکی، آجکل مغربی افکار کے تسلّط سے یہ خطرناک وبا بھی عام ہو رہی ہے کہ جن شرعی احکام پر چودہ سو سال سے پوری امتِ مسلمہ متفق چلی آ رہی ہے، اور جو قرآن کریم یا احادیثِ نبویہؐ سے صراحت و وضاحت کے ساتھ ثابت ہیں، وہ بعض افراد کو اپنے مزاج کے خلاف معلوم ہوتے ہیں، اس لئے قرآن وسنت کی جن نصوص سے وہ ثابت ہیں ان میں وہ تاویل اور تحریف کا دروازہ کھول دیتے ہیں، اور وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں یہ احکام شرعیہ (معاذ اللہ) مبنی بر حکمت نہیں رہے،

مثلاً قرآن کریم نے چور کی سزا کے بارے میں واضح حکم دیا ہے کہ:

﴿ اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا ﴾ (المائدہ:۳۸)

"جو مرد چوری کرے اور جو عورت چوری کرے، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو"

اب ایک عرصہ سے مغرب کے مصنفین اسلام کی مقرر کی ہوئی ان سزاؤں پر اعتراض کرتے ہیں، اور چوروں پر ترس کھا کر ہاتھ کاٹنے کی سزا کو بہت سخت بلکہ (معاذ اللہ) وحشیانہ قرار دیتے رہے ہیں، چنانچہ عالم اسلام کے وہ متجددین جو مغرب کے ہر اعتراض کے جواب میں ہاتھ جوڑ کر معذرت پیش کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں اسی وقت سے اس فکر میں پڑے ہوئے ہیں کہ کسی طرح اسلام کی مقرر کی ہوئی ان سزاؤں میں کوئی ایسی ترمیم کی جائے جو اہلِ

Marfat.com

مغرب کو راضی کر سکے، چنانچہ وہ سورۂ نور کی مذکورۂ بالا آیت میں توڑ مروڑ کی کوشش کرتے رہے ہیں، ایک معاصر اہلِ قلم نے اپنے ایک مقالہ میں تو یہاں تک لکھ دیا کہ مذکورہ آیت میں ''چور'' سے مراد ''سرمایہ دار'' ہیں، اور اُن کے ہاتھ کاٹنے سے مراد اُن کے کارخانے ضبط کر لینا ہے، اور اس آیت میں چور کی سزا بیان نہیں کی گئی بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ سرمایہ داروں کی تمام صنعتیں قومی تحویل میں لے لینی چاہئیں،

یہی حال اُن لوگوں کا ہے جو سُود، قمار اور شراب وغیرہ کی کسی نہ کسی شکل کو جائز قرار دینے کی فکر میں ہیں، اور اپنے اس طرزِ عمل کی تائید میں یہ کہتے ہیں کہ عقل کی رُو سے موجودہ دَور میں ان کی حرمت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، لہٰذا یہاں اصولی طور پر یہ سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ احکام شرعیہ اور عقل میں کیا نسبت ہے؟ شرعی احکام کے معاملہ میں عقل سے کام کتنا لیا جا سکتا ہے؟ اور اس کی کیا حدود ہیں؟

واقعہ یہ ہے کہ قرآن وسنت کے احکام عقلِ سلیم کے عین مطابق ہیں، اور ان میں سے ایک ایک کے بارے میں پوری تفصیل سے ناقابلِ انکار دلائل کے ذریعہ یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ انسانیت کی صلاح و فلاح کا اس سے بہتر کوئی راستہ نہیں، البتہ اس موضوع سے متعلق جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں وہ چونکہ چند در چند ہیں، اس لئے یہاں اس بحث کو کئی حصوں میں پر منقسم کرنا پڑے گا، ذیل میں ہم مقدمہ کے طور پر چند باتیں بیان کرتے ہیں، ان مقدمات کے اچھی طرح ذہن نشین ہو جانے کے بعد ہی صحیح نتیجہ برآمد ہو سکے گا، لیکن جو حضرات واقعۃً اس مسئلہ کی تشفی بخش تحقیق چاہتے ہیں اُن سے گزارش یہ ہے کہ وہ اس بحث کے صرف کسی ایک جزء کو دیکھ کر عجلت میں فیصلہ نہ کریں، بلکہ پوری بحث اور اس کے تمام مقدمات کو ایک مرتبہ پورے غور و خوض اور ٹھنڈے دل کے ساتھ پڑھ لیں، واللہ ولی الھدایۃ والتوفیق،

ا...... آزاد عقل اور ہدایت و گمراہی

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا قرآن وسنت کا کوئی حکم عقل سلیم کے مخالف نہیں لیکن سب سے

Marfat.com

پہلے متعین کرنے کی بات یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر انسان کی عقل دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، لہٰذا اچھے بُرے کی تمیز کے لئے کونسی عقل کو بنیاد بنایا جائے؟

اگر دنیا کے تمام معاملات کا فیصلہ اور قانون سازی اُس خالص عقل کی بنیاد پر کی جانے لگے جو ہر قسم کی دینی پابندیوں سے آزاد ہو تو دنیا میں ایک ایسی فوضویت اور انارکی کا دَور دَورہ ہوگا، جس کی موجودگی میں انسانیت کی بالکلیہ تباہی یقینی ہے وجہ یہ ہے کہ اگر انسانی عقل کو ہر قسم کی حدود وقیود سے آزاد کر دیا جائے تو اس سے وہ پیش پا افتادہ اخلاقی مسلمات اور حقائق بھی ثابت نہیں ہو سکتے جنہیں ایک شریف بچہ بھی درست سمجھتا ہے، مثلاً اپنی بہن کے ساتھ بدکاری کا ارتکاب ایسا گھناؤنا جرم ہے جسے دنیا کے کسی مذہب وملّت اور کسی قوم میں بھی پسند نہیں کیا جا سکتا...... یہاں تک کہ وہ بدترین ملحد جو خدا اور رسولؐ کو بھی نہیں مانتے وہ بھی اس فعل کو انتہائی برا سمجھتے ہیں، لیکن اگر آپ خالص اور آزاد عقل کی بنیاد پر اس گھناؤنے فعل کو ناجائز ثابت کرنا چاہیں تو ہرگز نہیں کر سکتے، کیونکہ خالص اور آزاد عقل کی بنیاد پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک بہن اپنے بھائی کو راحت پہنچانے کے لئے کھانا پکاتی ہے، اس کے سونے کے لئے بستر تیار کرتی ہے، اس کے کپڑے سیتی ہے، اس کی ضروریات کو سنوار کر رکھتی ہے، وہ بیمار ہو جائے تو اس تیمارداری کرتی ہے، غرض اپنے بھائی کو آرام پہنچانے کے لئے اس قسم کی جو خدمت بھی انجام دیتی ہے، تو معاشرہ اُسے اچھی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور اس کی تعریف کرتا ہے، لیکن اگر یہی بہن اپنے بھائی کی جنسی تسکین کے لئے اپنے آپ کو پیش کرے تو ساری دنیا اس پر لعنت وملامت کی بوچھاڑ کر دیتی ہے، اگر ہر معاملہ کا تصفیہ خالص اور آزاد عقل کے حوالے سے کیا جائے تو وہ بالکل بجا طور پر یہ سوال کر سکتی ہے کہ اگر ایک بھائی اپنی بہن سے ہر قسم کا آرام حاصل کر سکتا ہے تو جنسی آرام حاصل کرنا کیوں ممنوع ہے؟ یہ سوال اخلاق اور رسم ورواج کی مقرر کی ہوئی حدود کے تحت انتہائی اچھنبا بلکہ گھناؤنا محسوس ہوتا ہے، لیکن جو عقل کسی قسم کی حدود وقیود کی پابند نہ ہو اس کو آپ یہ کہہ کر مطمئن نہیں کر سکتے کہ یہ فعل اخلاقی اعتبار سے انتہائی پست اور گھناؤنا فعل ہے، سوال یہ ہے کہ خالص عقلی نقطۂ نظر سے اس میں کیا خرابی ہے؟ آپ کہیں

Marfat.com

گے کہ اس سے اختلاط انساب کا فتنہ پیدا ہوتا ہے، لیکن اوّل تو برتھ کنٹرول کے اس دور میں اس جواب کے کوئی معنی ہی نہیں رہے، اور اگر بالفرض اس سے اختلاطِ انساب ہوتا بھی ہو تو خالص عقل کی بنیاد پر ثابت کیجئے کہ اختلاطِ انساب بری چیز ہے، کیونکہ وہاں بھی ایک آزاد عقل یہ کہہ سکتی ہے کہ اختلاطِ انساب کو بُرائی قرار دینا مذہب واخلاق کا کرشمہ ہے، اور جو عقل مذہب واخلاق کی زنجیروں سے آزاد ہو اس کے لئے کسی بُرائی کو بُرائی ثابت کرنے کے لئے کسی خالص عقلی دلیل کی ضرورت ہے،

آپ کہیں گے کہ یہ عمل انتہا درجے کی بے حیائی ہے، لیکن خالص اور آزاد عقل اس کے جواب میں یہ کہے گی کہ "حیا" اور "بے حیائی" کے یہ سارے تصوّرات مذہب، اخلاق یا سماج کے بنائے ہوئے ہیں، ورنہ عقلی اعتبار سے یہ عجیب معاملہ ہے کہ ایک عورت اپنے جسم کو ایک قطعی انجان آدمی کے حوالے کردے تو یہ "حیاداری" ہے اور جس بے تکلف شخص کے ساتھ اس کا بچپن گزرا ہے اس کے حوالے کرے تو یہ "بے حیائی" ہے...... ؟ آپ کہیں گے کہ انسانی فطرت اس عمل سے انکار کرتی ہے لیکن آزاد عقل اس کے جواب میں کہتی ہے کہ اس عمل کے غیر فطری ہونے کی دلیل عقلی کیا ہے؟ درحقیقت یہ عمل اس کے خلافِ فطرت معلوم ہوتا ہے کہ صدیوں سے سماج اس کو بُرا سمجھتا آرہا ہے، اگر سماج کے بندھن کو توڑ کر خالص عقل سے سوچیں تو اس عمل میں قباحت کیا ہے؟ غرض آپ خالص عقل کی بنیاد پر اس سوال کو حل کرنا چاہیں گے تو یہ قیامت تک حل نہیں ہو سکے گا،

اور یہ محض ایک مفروضہ ہی نہیں، آج کی آزاد عقل نے تو اس قسم کے بے شمار سوالات اٹھا ہی رکھے ہیں، پُرانے زمانے میں بھی جب کسی نے خالص اور آزاد عقل کے ذریعہ دنیا کے معاشرتی مسائل حل کرنے کی کوشش کی ہے وہ ہمیشہ عقلی سوال وجواب کی اس بھول بھلیاں میں پھنس کر رہ گیا ہے، یقین نہ آئے تو فرقۂ باطنیہ کے حالات کا مطالعہ کیجئے، اس فرقہ کا ایک مشہور لیڈر عبیداللہ بن الحسن القیر وانی اپنی کتاب "السیاسۃ والبلاغ الاکید والناموس الاعظم" میں لکھتا ہے:

Marfat.com

"اس سے زیادہ تعجب کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ لوگ عقل کا دعویٰ کرنے کے باوجود اس قسم کی بے عقلیاں کرتے ہیں کہ اُن کے پاس ایک حسین وجمیل بہن یا بیٹی موجود ہوتی ہے، اور خود ان کی بیوی ایسی حسین نہیں ہوتی، اس کے باوجود وہ اپنی بہن یا بیٹی کو اپنے اوپر حرام سمجھ کر اس کو ایک اجنبی شخص کے حوالے کر دیتے ہیں، اگر یہ جاہل عقل سے کام لیتے تو انہیں احساس ہوتا کہ ایک اجنبی کے مقابلہ میں اپنی بہن اور بیٹی کے وہ خود زیادہ حق دار تھے، دراصل اس نادانی کی ساری وجہ یہ ہے کہ اُن کے رہنما نے اُن پر دنیا کی لذّتیں حرام کر دی ہیں۔"(۱)

اس گھناؤنی عبارت کی شناعت وخباثت پر جتنی چاہے لعنت بھیجتے رہیے، لیکن ساتھ ہی دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے کہ خالص اور آزاد عقل کی بنیاد پر اس دلیل کا کوئی جواب آپ دے سکتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ دنیا بھر کے جو عقل پرست صبح وشام آزاد عقل کی رٹ لگاتے رہتے ہیں، اگر وہ سب مل کر اس اعتراض کا خالص عقلی جواب دینا چاہیں تب بھی قیامت تک نہیں دے سکتے۔

اور پھر کمال یہ ہے کہ یہ عبیداللہ قیروانی جس کی عبارت اوپر لکھی گئی ہے قرآن کا کھلا منکر نہیں تھا، بلکہ دوسرے باطنیہ کی طرح قرآن میں عقل کی بنیاد پر تاویلات کیا کرتا تھا، اور یہ دعویٰ کیا کرتا تھا کہ قرآن کے جو معنی ظاہری طور پر سمجھ میں آتے ہیں درحقیقت وہ مراد نہیں ہیں، بلکہ یہ سب کچھ مجاز واستعارہ اور تمثیل وتشبیہ ہے، جس کا حقیقی مطلب کچھ اور ہے،

اسی طرح اگر آپ مطلق زِنا کی حرمت آزاد اور خالص عقل سے ثابت کرنا چاہیں تو یہ بھی ممکن نہیں ہوگا، کیونکہ آزاد عقل یہ سوال کر سکتی ہے کہ اگر دو مرد وعورت باہمی رضامندی سے بدکاری کا ارتکاب کرنا چاہیں تو اس میں کیا قباحت ہے؟ اور اسی بنا پر مغربی قوانین میں باہمی رضامندی سے زنا کر لینا کوئی جرم نہیں ہے، کیونکہ ان قانون سازوں کو زنا بالرضا میں کوئی خالص عقلی خرابی نظر نہیں آئی، بلکہ ابھی کچھ عرصہ پہلے برطانیہ کی مجلسِ قانون ساز نے بھاری

---

(۱) الفرق بین الفِرق، لعبد القاهر البغدادیؒ ص ۲۹۷۔

Marfat.com

اکثریت سے تالیوں کی گونج میں یہ قانون منظور کیا ہے کہ دو مردوں کا باہمی رضامندی سے لواطت (Homo Sexuality) کا ارتکاب قانوناً بالکل جائز ہے، اس قانون سازی کی وجہ بھی یہی تھی کہ خالص عقلی طور پر اس عمل میں کوئی قابل سزا بات نظر نہیں آئی،

اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں، انسانی ذہن کے بنائے ہوئے قوانین کا یہ لازمی خاصہ ہے کہ وہ انسانیت کی صحیح تربیت کر کے اس کو امن وسکون سے ہمکنار کرنے میں ہمیشہ نا کام رہتے ہیں، اوران کے ذریعہ انسان عقل کے نام پر ایسی ایسی بے عقلیاں کرتا ہے کہ الامان، وجہ یہ ہے کہ جب ''خالص عقل'' قانون سازی کی بنیاد ٹھہری تو اس دنیا میں ہر انسان کی عقل دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، زمانے کا کوئی عام چلن اگر ایک زمانے کے افراد کو کسی ایک عمل کی اچھائی یا بُرائی پر متفق کرتا بھی ہے تو کسی دوسرے زمانے کی عقل اسی عمل کے بارے میں کوئی مختلف رائے دیدیتی ہے کیونکہ ''عقل'' کے پاس کوئی ایسا متفقہ معیار نہیں ہے جس کی بنیاد پر اقدار (values) کا تعین کیا جاسکے، اوراس کی روشنی میں صحیح قوانین بنائے جاسکیں،

چنانچہ عہدِ حاضر کے ماہرینِ قانون بھی عقل وفہم کے ہزار دعووں کے باوجود سالہا سال کی بحثوں کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ قانون سازی کا یہ بنیادی مسئلہ ہم ابھی طے نہیں کر سکے کہ قانون سازی کے لئے کسی چیز کو اچھا یا بُرا سمجھنے کا کیا معیار ہمیں مقرر کرنا چاہئے؟ ہمارے زمانے کے معروف ماہر قانون ڈاکٹر پیٹن (George Whitecross Paton) اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے اپنی کتاب ''اصولِ قانون میں لکھتے ہیں:

> ''ایک مثالی نظام قانون میں کون سے مفادات کا تحفظ ضروری ہے؟ یہ ایک اقدار کا سوال ہے جس میں فلسفۂ قانون کو اپنا کردار ادا کرنا ہوتا ہے بنیادی طور پر یہ ''فطری قانون'' (Natural Law) کا مسئلہ ہے، لیکن اس سوال کا جواب ہم جتنا فلسفہ سے حاصل کرنا چاہتے ہیں، اتنا ہی فلسفہ سے اس کا جواب ملنا مشکل ہے، کیونکہ ابھی تک اقدار کا کوئی متفقہ پیمانہ ہمیں نہیں مل سکا، واقعہ یہ ہے کہ صرف مذہب ایسی

چیز ہے کہ جس میں ہمیں ایسی بنیاد مل سکتی ہے، لیکن مذہب کے حقائق کو اعتقاد یا وجدان کے ذریعہ تسلیم کرنا ضروری ہے، نہ کہ خالص منطقی دلائل کے زور پر"(۱)

آگے اسی مصنف نے ان آراء وخیالات کی بڑی دلچسپ داستان بیان کی ہے جو قانون کے مقصد، اس کے فلسفہ اور اس کے اخلاقی بنیادوں سے متعلق مختلف مفکرین نے ظاہر کی ہیں، لیکن یہ آراء وخیالات اس قدر متضاد ہیں کہ جارج پیٹن لکھتے ہیں:

"قانون کا مقصد کیا ہونا چاہئے؟ اس بارے میں آراء ونظریات تقریباً اتنے ہی بے شمار ہیں جتنے اس موضوع سے مَس رکھنے والے مصنفین کی تعداد، کیونکہ ایسے لکھنے والے مشکل ہی سے ملیں گے جنہوں نے قانون کے لئے کوئی مثالی مقصد وضع نہ کیا ہو۔"

آگے انہوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ اس موضوع پر ہر زمانے میں مفکرینِ قانون عقل وفکر کی تگ وتاز سے اس الجھی ہوئی ڈور کو کس طرح مزید پُر پیچ بناتے رہے ہیں، آخر میں وہ لکھتے ہیں:

The orthodox natural law theory based its absolutes on the revealed truths of religion if we attempt to secularize jurisprudence,where can we find an agreed basis of values ? (P. 126)

"راسخ العقیدہ فطری قانون کا نظریہ اپنے عمومی اصولوں کی بنیاد مذہب کے الہامی حقائق پر رکھتا تھا، اگر ہم اصولِ قانون کو لادینی بنانے کی کوشش کریں تو اقدار کی متفقہ بنیاد ہم کہاں سے لاسکیں گے؟"

---

(۱) Paton : jurisprudence 3 rd ed . 1967 P.121

غرض یہ کہ اگر وحی الٰہی کی رہنمائی سے قطع نظر کر کے عقل کو بالکل مادر پدر آزاد چھوڑ دیا جائے تو اچھے بُرے کی تمیز کرنے کے لئے کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی، انسان کو گمراہی اور بے عقلی کے ایسے ایسے تاریک غاروں میں گرا کر چھوڑتی ہے کہ جہاں رُشد و ہدایت کی کوئی ہلکی سی کرن بھی نہیں پڑتی، وجہ یہ ہے کہ وحی الٰہی کی رہنمائی کے بغیر جب انسان نِری عقل کو استعمال کرتا ہے تو وہ اسے آزاد عقل سمجھتا ہے لیکن درحقیقت وہ اس کی نفسانی خواہشات کی غلام ہو کر رہ جاتی ہے جو عقل کی غلامی کی بدترین شکل ہے، جو لوگ ہر کام میں خالص عقل کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں وہ درحقیقت انتہاء درجہ کی خود فریبی میں مبتلا ہیں، اُن کے مقابلہ میں وہ لوگ زیادہ حقیقت پسند اور جرأت مند ہیں جو کھل کر یہ کہتے ہیں کہ ہماری عقل آزاد نہیں، بلکہ ہماری خواہشات نفس کی غلام ہے، فلسفۂ قانون کی بحث میں ماڈرن مفکرین کے ایک گروہ کا ذکر آتا ہے، جن کا فلسفہ (Noncognitivist Ethical Theory) کے نام سے مشہور ہے، عہدِ حاضر کے معروف ماہر قانون ڈاکٹر فرائڈمین کے الفاظ میں اس فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ:

> Reason is and ought only to be the slave of the passions and can never pretend to any other office than to serve and odey them

یعنی ''عقل درحقیقت انسانی جذبات کی غلام ہے، اور اسے صرف انہی جذبات کا غلام ہونا بھی چاہئے، اس کا کام اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ اُن جذبات کی خدمت اور اطاعت کرتی رہے۔''

اس فلسفہ کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر فرائڈمین لکھتے ہیں:

''اس کے علاوہ ہر چیز مثلاً ایک سادہ حکم، شرم و حیا، جمائی، بلکہ ''اچھے'' ''برے'' جیسے تصورات یا ''فلاں کام ہونا چاہئے'' اور ''فلاں کام اس

(۱) Friedmann : Legal Theory, London 1967 P.36,37

لائق ہے" جیسے الفاظ سب خلاصۂ خواہشات و جذبات کی پیداوار ہیں،
اور علم اخلاق نام کی کسی چیز کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے"(۱)

اس بحث سے قطع نظر کہ اُن لوگوں کا یہ فلسفہ اچھا ہے یا بُرا؟ لیکن بات انہوں نے بالکل سچی کہی ہے، کہ وحی الٰہی کی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد عقل اور اخلاق نام کی کوئی چیز باقی رہ ہی نہیں سکتی، اس کے بعد انسان کے وجود اور اعمال و افعال پر خلاصۂ اس کے جذبات و خواہشات کی حکمرانی ہوتی ہے، اور یہ خواہشات و جذبات اسے جہاں لیجانا چاہیں وہاں اُسے جانا پڑتا ہے، پھر اگر کسی کام کو انسان کا ضمیر قبول بھی نہ کرتا ہو تب بھی اس کے پاس خواہشات کو رَد کرنے کے لئے کوئی معیّن بنیاد باقی نہیں رہتی، چنانچہ برطانیہ میں ہم جنس پرستی کو سندِ جواز دینے کا اقدام اسی بیچارگی کے عالم میں ہوا کہ بعض مفکرین اُسے ناپسند کرتے تھے، اور خود جائز قرار دینے والے بعض افراد کا ضمیر اس پر مطمئن نہ تھا، لیکن خواہشات کی غلام بننے کے بعد عقل کے پاس اس مطالبہ کو رَد کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا، وولفنڈن کمیٹی (Wolfenden Committee) جو اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے بنائی گئی تھی، اور جس کی سفارشات کی بنیاد پر اسمبلی میں یہ فیصلہ ہوا، اس کی رپورٹ کے یہ الفاظ کس درجہ عبرت خیز ہیں:

> "جب تک قانون کے ذریعہ کام کرنے والی سوسائٹی اس بات کی جانی بوجھی اور سوچی سمجھی کوشش نہ کرے کہ معاشرے میں جُرم کا خوف گناہ کے خوف کے برابر ہو جائے اُس وقت تک پرائیویٹ اخلاق اور بداخلاقی کے تصور کی حکمرانی باقی رہے گی، جو مختصر مگر صاف لفظوں میں قانون کے دائرۂ کار سے باہر ہے"(۱)

لیکن قرآن کریم جو انسانیت کو خواہشات کی بھول بھلیاں میں بھٹکتا چھوڑنے کے لئے نہیں بلکہ ہدایت کا صاف اور سیدھا راستہ بتانے کے لئے آیا ہے، اور جس نے واضح طور سے بتایا ہے کہ انسان کی جبلّت میں اچھی اور بُری ہر طرح کی خواہشات ودیعت کی گئی ہیں وہ اپنے

(۱) Friedmann : Legal Theory, London 1967 P.46

Marfat.com

پیرووں کو اس ہولناک اندھیرے میں نہیں چھوڑ سکتا، اس کی اصطلاح میں وحی کی رہنمائی سے آزاد عقل کا نام ''ہویٰ'' ہے، جس کے بارے میں اس کے ارشادات یہ ہیں:

﴿وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ﴾ (المؤمنون: ۷۱)

''اور اگر حق ان کی خواہشات کے تابع ہو جاتا تو آسمان اور زمین اور اُن میں بسنے والے سب برباد ہو جاتے۔''

﴿اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ﴾ (محمد: ۱۴)

''اب بتاؤ کہ جو لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشن راستے پر ہوں، کیا وہ اُن جیسے ہو سکتے ہیں جن کی بدکاری ہی اُن کے لئے خوشنما بنادی گئی، اور وہ اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے چلتے ہوں؟۔''

﴿وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا﴾ (الکھف: ۲۸)

''اور کسی ایسے شخص کا کہنا نہ مانو جس کے دِل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے، اور جو اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا ہوا ہے، اور جس کا معاملہ حد سے گذر چکا ہے''

﴿فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى﴾

(طٰہٰ: ۱۶)

''لہٰذا کوئی ایسا شخص تمہیں اس سے ہرگز غافل نہ کرنے پائے جو اس پر ایمان نہ رکھتا ہو، اور اپنی خواہشات کے پیچھے چلتا ہو، ورنہ تم ہلاکت میں پڑ جاؤ گے۔''

﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ﴾ (القصص: ۵۰)

Marfat.com

’’اور اُس سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہش کے پیچھے چلے؟‘‘۔

﴿ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ﴾

(الشوریٰ:۱۵)

’’پس اسی کی تم دعوت دو، اور جیسا تمہیں حکم دیا گیا ہے اس پر استقامت اختیار کرو، اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو‘‘

﴿ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ﴾

(البقرہ:۸۷)

’’پھر یہ آخر کیا معاملہ ہے کہ جب کبھی کوئی رسول تمہارے پاس کوئی ایسی بات لے کر آیا جو تمہاری نفسانی خواہشات کو پسند نہیں تھی تو تم اکڑ گئے‘‘۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کی اصل بنیاد اس عقل پر نہیں جو خواہشات نفس کی غلام ہو، بلکہ اُس عقل پر ہے جو اللہ تعالیٰ کی عطاء کی ہوئی ہدایات کی پابند اور اپنے حدود کار سے اچھی طرح واقف ہو، اور یہی عقل سلیم کی تعریف ہے،

۲......اسلامی احکام کی حکمتیں اور دین میں ان کا مقام

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دین کے ذریعہ جو احکام دیئے ہیں وہ معاذ اللہ عقل وحکمت کے خلاف ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے احکام عقل سلیم کے عین مطابق ہیں، اور تجربہ اس کا گواہ ہے کہ صلاح وفلاح کا اس سے بڑھ کر کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا، چنانچہ اس کے ہر حکم میں بہت سی حکمتیں مصلحتیں اور انسانیت کے فوائد مضمر ہوتے ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہماری محدود عقل اُن تمام حکمتوں اور مصلحتوں کا احاطہ بھی کرسکے، ظاہر ہے کہ وہ خالق کائنات جس کے سامنے زمین وآسمان کی تمام موجودات اور ماضی ومستقبل کے تمام حالات ہیں، اس کے علم وحکمت کا کون احاطہ کرسکتا ہے؟ لہٰذا یہ عین ممکن ہے کہ قرآن وسنت کے کسی حکم کی حقیقی حکمت ومصلحت ہماری سمجھ میں نہ آئے، لیکن کسی حکم کی حکمت سمجھ میں نہ آنے

Marfat.com

کا یہ نتیجہ ہرگز نہیں ہونا چاہئے کہ اس حکم ہی کو درست تسلیم نہ کیا جائے، کیونکہ اگر انسان کو اپنے فائدے کی تمام باتیں از خود سمجھ میں آسکتی تھیں تو پیغمبروں کے بھیجنے اور آسمانی کتابیں نازل کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، وحیٔ و رسالت کا مقدس سلسلہ تو جاری ہی اس لئے کیا گیا ہے تا کہ اس کے ذریعہ انسان کو ان باتوں کی تعلیم دیجا سکے جس ادراک نری عقل سے ممکن نہیں، اس لئے اگر اللہ پر، اس کی قدرتِ کاملہ پر، اس کے علم محیط پر، اس کے بھیجے ہوئے پیغمبروں پر اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں پر ایمان ہے تو لازماً یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس کے نازل کئے ہوئے ہر حکم کی پوری پوری مصلحت کا بالکلیہ سمجھ میں آجانا ضروری نہیں، اور اگر اس کا کوئی حکم ہماری محدود عقل و نظر سے ماوراء ہو تو اُسے ماننے سے انکار کرنا کوئی معقول طرزِ عمل نہیں،

اس بات کو ایک نظیر سے سمجھئے، دنیا کے جس کسی ملک میں کوئی قانون بنایا جاتا ہے وہاں قانون سازوں کے پیش نظر ہر قانون کی کچھ مصلحتیں ہوتی ہیں، اور انہی مصلحتوں کی خاطر وہ قانون نافذ کیا جاتا ہے، لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ملک کا ہر باشندہ مُلک کے ہر قانون کی پوری پوری مصلحتوں سے باخبر ہو؟ ظاہر ہے کہ ملک میں بسا اوقات اکثریت ایسے افراد کی ہوتی ہے جو قانون اور اس کی عائد کی ہوئی پابندیوں کے فوائد سے واقف نہیں ہوتے، اب کسی ملک کا جو قانون اُس کے بہترین دماغوں نے تمام پہلو مدِ نظر رکھ کر بنایا ہے، کیا اُسے اس بناء پر ناکارہ یا غلط کہا جاسکتا ہے کہ چند اَن پڑھ دیہاتیوں کو اس کا فائدہ سمجھ میں نہیں آیا؟ اگر کوئی جاہل انسان محض اس بناء پر کسی قانون کی تعمیل سے انکار کرے، کہ اس کی مصلحتیں میری سمجھ سے باہر ہیں تو اس کا مقام جیل خانے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

پھر ماہرین قانون اور ایک جاہل انسان کے علم میں تو کسی نسبت کا تصور کیا بھی جاسکتا ہے، خالق کائنات اور ایک بے مقدار انسان کے علم میں تو کوئی نسبت ہی...... متصور نہیں، لہٰذا ایک انسان کے لئے یہ بات کیونکہ معقول ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی صریح اور واضح حکم کو اس بناء پر رَد کر دے یا اس میں تاویل و تحریف کا مرتکب ہو کہ اس کے فوائد اس کی سمجھ میں نہیں آرہے،

Marfat.com

۳...... حکمتوں پر حکم کا مدار نہیں ہوتا

اسی بناء پر تمام اہل علم کا ہر دَور میں اس بات پر اجماع رہا ہے کہ شرعی احکام کا دار و مدار اُن کی حکمتوں پر نہیں بلکہ علّتوں پر ہوتا ہے، چونکہ ہمارے دَور میں بہت سے حضرات ''علّت'' اور ''حکمت'' کا فرق بھی سمجھ نہیں پاتے، اس لئے یہاں مختصراً ان دونوں کی حقیقت بھی سمجھ لینا ضروری ہے،

''علّت'' اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی قانون کے واجب التعمیل ہونے کا لازمی سبب ہوتی ہے، اس کی حیثیت ایک ایسی لازمی علامت کی سی ہے جسے دیکھتے ہی قانون کے متبعین پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ حکم کی پیروی کریں، اور ''حکمت'' اس فائدے اور مصلحت کو کہتے ہیں جو قانون وضع کرتے وقت قانون ساز کے پیش نظر ہوتی ہے، مثلاً قرآن کریم نے شراب کی حرمت کا حکم دیا ہے، اور ''نشہ'' کو حرمت کی لازمی علامت قرار دیا گیا ہے، کہ جس چیز میں بھی نشہ ہو اس کا پینا ممنوع ہے، اور اس ممانعت کی بہت سی مصلحتیں ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ لوگ ہوش وحواس کھو کر ایسے افعال میں مبتلا نہ ہوں جو انسانی شرف و وقار سے فروتر ہیں...... اس مثال میں قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ ''شراب سے پرہیز کرو'' ایک حکم ہے، ''نشہ'' اس حکم کی علّت ہے، اور لوگوں کو ہوش وحواس کھو کر بُرے افعال سے بچانا اس کی حکمت ہے، اب ممانعت کے حکم کا دار و مدار اس کی علّت یعنی ''نشہ'' پر ہوگا، اور جس چیز میں بھی ''نشہ'' پایا جائے گا، اُسے حرام کہیں گے، اس حکم کی حکمت پر حکم کا دار و مدار نہیں ہوگا، لہٰذا اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں شراب پینے کے باوجود بہکتا نہیں ہوں، اور نہ ہوش وحواس کھوتا ہوں، اس لئے شراب میرے لئے جائز ہونی چاہئے، یا اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ آجکل شراب تیار کرنے کے زیادہ ترقی یافتہ ذرائع ایجاد ہو چکے ہیں جنہوں نے اُس کے نقصانات کو کم کر دیا ہے، اور شراب پینے والوں کی ایک بڑی تعداد شراب نوشی کے باوجود ہوش وحواس کے ساتھ اپنے کام کرتی رہتی ہے، اس لئے آجکل شراب جائز ہونی چاہئے، تو ظاہر ہے کہ اس کا یہ عذر قابلِ سماعت نہیں ہوگا،

Marfat.com

اسی طرح قرآن وسنت نے اپنے متبعین کو مشقت سے بچانے کے لئے یہ حکم دیا ہے کہ سفر میں پوری نماز پڑھنے کے بجائے آدھی نماز پڑھا کرو، جسے ''قصر'' کہتے ہیں، اس مثال میں ''قصر'' ایک حکم ہے، سفر اس کی علت ہے، اور مشقت سے بچانا اس کی حکمت ہے، اب حکم کا دارومدار اس کی علت یعنی سفر پر ہوگا، حکمت پر نہیں، لہٰذا اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ آجکل ہوائی جہازوں اور ریل کے آرام دہ ڈبوں نے سفر کو آسان کر دیا ہے، اور اب پہلی سی مشقت باقی نہیں رہی اس لئے آجکل ''قصر'' کا حکم باقی نہیں رہا، تو اس کا یہ کہنا درست نہیں ہوگا، کیونکہ اللہ کے بندے کی حیثیت میں ہمارا کام حکم کی علت دیکھ کر حکم پر عمل کرنا ہے، اس حکم کی حکمتوں اور مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کر احکام کی تعمیل ہمارا منصب نہیں،

اور یہ قاعدہ صرف اسلامی شریعت ہی کا نہیں، بلکہ رائج الوقت قوانین میں بھی یہی قاعدہ کارفرما ہے، مثال کے طور پر ٹریفک کے حادثات کی روک تھام کے لئے حکومت نے یہ قانون بنایا ہے کہ جب کسی چوراہے پر سرخ سگنل نظر آئے ہر گاڑی کے لئے رُک جانا لازمی ہے، اس مثال میں گاڑیوں کے لئے یہ حکم کہ ''رک جاؤ'' ایک قانون ہے، سُرخ سگنل اس قانون کی علت ہے، اور تصادم کے خطرات سے بچاؤ کرنا اس کی ''حکمت'' ہے، اب اس حکم کا دارومدار اس کی ''علت'' یعنی ''سرخ سگنل'' پر ہے، نہ کہ اس کی ''حکمت'' یعنی تصادم کی روک تھام پر، لہٰذا اگر کسی وقت حادثے کا کوئی خطرہ نہ ہو تب بھی سگنل دیکھ کر رُک جانا لازمی ہے، اور اگر کوئی ڈرائیور یہ سوچ کر سگنل پار کر جائے کہ اس کی نظر میں حادثے کا کوئی خطرہ نہیں ہے تو قانون کی نظر میں وہ مجرم اور چالان کا مستحق ہے،

غرض رائج الوقت قوانین میں بھی احکام کا دارومدار ہمیشہ ان کی علتوں پر ہوتا ہے ...... حکمتوں پر نہیں ہوتا، اور جب دنیا کے عام قوانین کا معاملہ یہ ہے تو اللہ کے بنائے ہوئے قوانین میں تو اس قاعدے کی پابندی زیادہ ضروری ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم ہر شرعی حکم کی تمام حکمتوں اور مصلحتوں کا احاطہ نہیں کر سکتے اس لئے اگر احکام کا مدار حکمتوں پر رکھا جائے تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کسی ایک فائدے کو حکم کی واحد حکمت سمجھ کر اس کے مطابق کوئی اقدام کر بیٹھیں،

Marfat.com

حالانکہ اس کی دوسری بہت سی حکمتیں اور بھی ہوں، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ "حکمت" یا "مصلحت" عموماً کوئی لگی بندھی، منضبط اور ایسی واضح چیز نہیں ہوتی جسے دیکھ کر ہر کس و ناکس یہ فیصلہ کرسکے کہ یہاں یہ حکمت حاصل ہو رہی ہے یا نہیں؟ اب اگر حکم کا دار و مدار اس کی حکمتوں پر رکھ دیا جائے تو احکام و قوانین کا نفاذ ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ ہر شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے فلاں حکم پر اس لئے عمل نہیں کیا کہ اس وقت اس کی حکمت نہیں پائی جا رہی تھی، مثلاً اگر ہر شخص کو یہ آزادی دیدی جائے کہ وہ چوراہے عبور کرتے وقت خود یہ فیصلہ کرے کہ حادثے کا خطرہ ہے یا نہیں، اگر خطرہ ہو تو رُک جائے اور خطرہ نہ ہو تو آگے بڑھ جائے، تو اس کا نتیجہ شدید بدنظمی اور پرلے درجے کی ابتری کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اسی طرح اگر شراب کی حرمت کو اس کی علّت یعنی نشہ کے بجائے اس کی حکمت پر موقوف کردیا جائے تو ہر شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے شراب سے ایسا نشہ لاحق نہیں ہوتا جو میرے ہوش و حواس گم کر کے میرے کاموں میں خلل انداز ہو، ایسی صورت میں حرمتِ شراب کا حکم محض ایک کھلونا بننے کے سوا اور کیا نتیجہ پیدا کرسکتا ہے؟

اس کے برعکس احکام کی علّتیں ایسی لگی بندھی اور منضبط ہوتی ہیں کہ ہر شخص انہیں دیکھ کر یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ یہاں علّت پائی جا رہی ہے، لہٰذا ان کے ذریعہ احکام کی خلاف ورزی پر گرفت بھی بآسانی ہوسکتی ہے، اور اُن پر قوانین کا دار و مدار قرار دے کر ہی دنیا میں نظم و ضبط، امن و سکون اور قانون کا احترام پیدا کیا جاسکتا ہے،

یہی وجہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ کے بہت سے علماء نے اسلامی احکام کی حکمتیں اور مصلحتیں واضح کرنے کے لئے باقاعدہ ضخیم کتابیں لکھی ہیں، اور ہر ہر حکم کے بارے میں بتایا ہے کہ اس سے کیا کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں، لیکن نہ تو کسی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ اسلامی احکام کی تمام حکمتوں کو پا گیا ہے، اور نہ یہ غلط فہمی کسی کو ہوئی ہے کہ آئندہ ان احکام کی تعمیل حکمتوں اور مصلحتوں کو دیکھ کر کیجائے گی، مثلاً حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" اسی مقصد کے لئے لکھی ہے کہ اس کے ذریعہ شریعت کی حکمتوں کو تفصیل سے واضح کریں، اور انہوں نے ایسے لوگوں کی سخت تردید کی ہے جو احکام شریعت کی حکمتوں کا انکار

Marfat.com

کرتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ہی وہ تحریر فرماتے ہیں:

لا یحل أن یتوقف فی امتثال احکام الشرع اذا صحت بها الروایة علیٰ معرفة تلك المصالح لعدم استقلال عقول کثیر من الناس فی معرفة کثیر من المصالح ولکون النبی صلی اللّٰه علیه وسلم اوثق عندنا من عقولنا ولذلك لم یزل هٰذا العلم مضنونا به علیٰ غیر اهله (۱)

''یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ شریعت کے جو احکام صحیح روایت سے ثابت ہیں اُن کی تعمیل میں اس بناء پر پس و پیش کیا جائے کہ اُن کی مصلحتیں ہمیں معلوم نہیں، کیونکہ بہت سے لوگوں کی عقلیں بہت سی مصلحتوں کو سمجھ ہی نہیں سکتیں، اور کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے نزدیک ہماری عقلوں سے زیادہ قابلِ اعتماد ہیں اسی لئے اس علم (یعنی حکمت دین کے علم) کو ہمیشہ نااہل لوگوں سے بچانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔''

۴......احکام شریعت کا اصل مقصد اتباع کا امتحان ہے

ایک اور چیز جو احکام شریعت کے معاملہ میں پیش نظر رہنی چاہئے یہ ہے کہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق انسان کی زندگی کا مقصد ''اللہ کی بندگی'' ہے، ارشاد ہے:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ﴾

(الذّٰریات: ۵۶)

''اور میں نے جنات اور انسانوں کو اس کے سوا کسی اور کام کے لئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔''

اور اس بندگی کا طریقہ بھی قرآن کریم نے واضح فرمادیا ہے، کہ وہ اللہ اور اس کے رسول

(۱) حجة الله البالغه ص ۶ ج ۱ مطبوعه مکتبۂ سلفیه لاهور ۱۳۹۵ھ، اسی کی مزید تفصیل وتحقیق کے لئے ملاحظہ ہو، کتاب مذکور، ص ۱۲۹ ج ۱ باب الفرق بین المصالح والشرائع ۱۲

Marfat.com

(صلی اللہ علیہ وسلم) کے مکمل اتباع میں منحصر ہے، ارشاد ہے:

﴿ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ﴾ (الاعراف:۳)

''(لوگو!) جو کتاب تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے اُتاری گئی ہے اس کے پیچھے چلو، اور اپنے پروردگار کو چھوڑ کر دوسرے (من گھڑت) سرپرستوں کے پیچھے نہ چلو۔''

﴿ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ، اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ (یٰسٓ:۲۰و۲۱)

''اے میری قوم کے لوگو! ان رسولوں کا کہنا مان لو، ان لوگوں کا کہنا مان لو جو تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگ رہے اور وہ صحیح راستے پر ہیں۔''

﴿ وَاتَّبِعُوْا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ (الزمر:۵۵)

''اور تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس جو بہترین باتیں نازل کی گئی ہیں، اُن کی پیروی کرو۔''

﴿وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾

(الانعام:۱۵۵)

''اور (اسی طرح) یہ برکت والی کتاب ہے جو ہم نے نازل کی ہے، لہٰذا اس کی پیروی کرو، اور تقویٰ اختیار کرو، تاکہ تم پر رحمت ہو۔''

﴿ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ ﴾ (الاعراف:۱۵۸)

''اب تم اللہ پر اور اُس کے رسول پر ایمان لے آؤ جو نبی امی ہے، اور جو اللہ پر اور اُس کے کلمات پر ایمان رکھتا ہے اور اُس کی پیروی کرو۔''

قرآن کریم ہی نے یہ واضح فرمایا ہے کہ انسان کو پیدا کرنے اور اُسے مختلف احکام کا پابند

Marfat.com

بنانے کا مقصد اس بات کی آزمائش ہے کہ کون اللہ اور اس کے رسول کی اتباع کرتا ہے اور کون نہیں کرتا؟

﴿ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾

(الملک :۲)

''جس نے موت اور زندگی اس لئے پیدا کی تا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ بہتر ہے۔''

﴿ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ ﴾ (البقرہ:۱۴۳)

''اور جس قبلے پر تم پہلے کار بند تھے، اُسے ہم نے کسی اور وجہ سے نہیں، بلکہ صرف یہ دیکھنے کے لئے مقرر کیا تھا کہ کون رسول کا حکم مانتا ہے اور کون اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے؟''

اور جب بندے کا کام ہی اللہ اور اس کے رسول کی اتباع ہوا، اور اسی میں اس کی ساری آزمائش ہے، تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا کوئی صریح حکم آجانے کے بعد انسان کا کام بس سرِ تسلیم خم کردینا ہے، اُس کے بعد اُسے یہ اختیار باقی نہیں رہتا کہ وہ حکم اسے اچھا لگے تو قبول کرے اور اچھا نہ لگے تو اُسے رَد کردے۔

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ یَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ﴾ (الاحزاب :۳۶)

''اور جب اللہ اور اُس کا رسول کسی بات کا حتمی فیصلہ کردیں تو نہ کسی مؤمن مرد کے لئے یہ گنجائش ہے نہ کسی مؤمن عورت کے لئے کہ اُن کو اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی رہے۔''

لہٰذا اللہ اور اس کے رسول کا واضح حکم سننے کے بعد اگر کوئی شخص اس بناء پر اُسے ماننے میں تأمل کرے کہ اس کی حکمت و مصلحت اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تو درحقیقت وہ عقل کا نہیں، بلکہ

Marfat.com

اپنی خواہشات نفس یا شیطان کا اتباع کر رہا ہے:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِى اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ يَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطَانٍ مَّرِيْدٍ ﴾ (الحج:۳)

''اور لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں بے جانے بوجھے جھگڑے کرتے ہیں، اور ہر اُس سرکش شیطان کے پیچھے چل کھڑے ہوتے ہیں۔''

ایسے شخص کو آخرت میں ہی نہیں، دنیا میں بھی خسارہ اُٹھانا پڑے گا:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ج فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ نِ اطْمَاَنَّ بِهٖ ج وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ نِ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ج خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ط ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴾ (الحج:۱۱)

''اور لوگوں میں وہ شخص بھی ہے جو ایک کنارے پر رہ کر اللہ کی عبادت کرتا ہے، چنانچہ اگر اُسے (دُنیا میں) کوئی فائدہ پہنچ گیا تو وہ اُس سے مطمئن ہو جاتا ہے، اور اگر اُسے کوئی آزمائش پیش آ گئی تو وہ منہ موڑ کر (پھر کفر کی طرف) چل دیتا ہے ایسے شخص نے دُنیا بھی کھوئی، اور آخرت بھی یہی تو کھلا ہوا گھاٹا ہے۔''

لہٰذا اللہ اور اس کے رسول کا ہر حکم اگرچہ اپنے پیچھے بیشمار حکمتیں اور مصالح رکھتا ہے، لیکن انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اس حکم کی اطاعت کا مقصود اصلی اُن حکمتوں اور مصلحتوں کو نہ بنائے، بلکہ اس کا اصل مطمحِ نظر ایک حقیقی بندے کی طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت، اس کی خوشنودی اور اس کے احکام کا اتباع ہونا چاہئے، یہی وجہ ہے کہ جب قرآن کریم میں سود کی حرمت کا حکم نازل ہوا، اور اس پر کفار نے یہ اعتراض کیا کہ:

﴿ قَالُوْا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ﴾

''انہوں نے کہا تھا کہ: ''بیع بھی تو سود ہی کی طرح ہوتی ہے''۔

Marfat.com

تو اس کے جواب میں بہت سی عقلی دلیلیں بھی دی جاسکتی تھیں، اور یہ بھی بتایا جاسکتا تھا کہ بیع وشراء اور سودی لین دین میں کیا فرق ہے؟ لیکن ان ساری عقلی توجیہات کو چھوڑ کر قرآن حکیم نے ایک ہی ٹکسالی جواب دیا:

﴿ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ﴾ (البقرہ:۲۷۵)

''حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔''

یعنی جب اللہ تعالیٰ نے ان دونوں میں سے ایک چیز کو حلال اور ایک کو حرام کر دیا تو اب تمہیں عقلی دلیلیں طلب کرنے کی گنجائش نہیں، تمہارے لئے دونوں کے درمیان یہی فرق کیا کم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں کا حکم یکساں نہیں رکھا، بلکہ ایک کو جائز اور دوسرے کو ناجائز قرار دیدیا ہے،

قرآن کریم نے حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا واقعہ دسیوں مقامات پر ذکر فرمایا ہے، اس واقعہ میں مذکور ہے کہ ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کرتے ہوئے یہ دلیل پیش کی تھی کہ ''میں آدم سے بہتر ہوں'' تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو کیچڑ سے'' غور فرمایئے کہ خالص اور آزاد عقل کے نقطۂ نظر سے اس دلیل میں کیا خرابی تھی؟ لیکن یہی ''عقلی دلیل'' ابلیس کے راندۂ درگاہ ہونے کا سبب بن گئی، وجہ وہی تھی کہ واضح اور صریح حکم آجانے کے بعد اس کے خلاف عقل کی پیروی درحقیقت عقل کی نہیں خواہشات کی غلامی ہے شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے یہی بات بڑے لطیف پیرایہ میں کہی ہے

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیلؑ نے جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

۵......قرآن وسنت کی تعبیر کا صحیح طریقہ

اور جب انسان کا فریضہ احکام الٰہی کا اتباع ہے تو اس کا صاف اور سادہ طریقہ یہ ہے کہ قرآن وسنت کا جو حکم صریح اور واضح ہو اسے اپنے واضح معنی میں ہی اختیار کیا جائے، اور محض اس بناء پر اس میں توڑ مروڑ اور تاویل وتحریف کا ارتکاب نہ کیا جائے کہ یہ واضح معنی ہمارے نفس

Marfat.com

کو پسند نہیں آرہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب ہماری ہدایت کے لئے نازل فرمائی ہے، اور اس لئے نازل فرمائی ہے کہ اس کے احکام کا ادراک ہم محض اپنی عقل سے نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا اُس کی تشریح وتفسیر میں اگر ہم اپنی خواہشات کی بناء پر دوراز کار تاویلات اختیار کریں گے، تو یہ اُن احکام کا نہیں بلکہ اپنی خواہشات کا اتباع ہوگا، اور اس سے کتاب الٰہی کا مقصد نزول ہی تلپٹ ہوکر رہ جائے گا۔

قرآن کریم کا معاملہ تو انتہائی ارفع واعلیٰ ہے، خود انسانی ذہن کے تراشے ہوئے قوانین کا حال یہ ہے کہ جب پارلیمنٹ کوئی قانون منظور کر لیتی ہے تو جج کے ذمہ لازم ہوتا ہے کہ وہ اس قانون کی لفظی پیروی کرے، اگر اسے اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں وہ قانون غلط معلوم ہوتا ہو تب بھی وہ اس کے اتباع پر مجبور ہے، اور اس کے لئے اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ اپنی ذاتی رائے کی بنیاد پر قانون کی ایسی تعبیر وتشریح کرے جو اس کے الفاظ اور عبارتوں کے لحاظ سے دوراز کار ہو، موجودہ ''اصولِ قانون'' میں ایک مستقل بحث ''تعبیر قانون'' (Interpretation of statutes) سے متعلق ہوتی ہے، اس بحث کا خلاصہ ڈاکٹر جارج پیٹن کے الفاظ میں یہ ہے:

> ''انگریزی مقدمات میں تعبیر قانون کے تین بنیادی اصول تجویز کئے گئے ہیں پہلا اصول لفظی اصول کہلاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی قانونی دفعہ کا مطلب واضح ہو تو ہر حال میں اسی پر عمل کیا جائے گا، نتائج خواہ کچھ ہوں، دوسرا اصول ''سنہرا اصول'' کہلاتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ قانون کے الفاظ کو ہمیشہ اُن کے معمولی معنی پہنائے جائیں گے، تاوقتیکہ ایسا کرنے سے کوئی اہمال یا قانون کی باقی دفعات سے واضح تضاد پیدا نہ ہوتا ہو، تیسرا اصول فسادی اصول (Mischief Rule) ہے جو اس بات پر زور دیتا ہے کہ اس قانون کی عمومی پالیسی کیا ہے؟ اور کس خرابی کو کرنا اس کے پیش نظر ہے''

Marfat.com

آگے اس تیسرے اصول کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''یہ نظریہ کہ پارلیمنٹ کی نیت اور اس کے مقصد کی پیروی کرنی چاہئے، ہمیں (الفاظ قانون سے) زیادہ دور نکلنے کی گنجائش نہیں دیتا، کیونکہ یہ ایک متفقہ مسئلہ ہے کہ (تعبیر قانون کے وقت) پارلیمنٹ کی داخلی نیت (Subjective Intention) پر غور نہیں کیا جا سکتا، بلکہ پارلیمنٹ کی نیت بھی لازماً اس کے وضع کردہ قانون ہی سے نکالی جا سکتی ہے'' (۱)

یہ اس قانون کا حال ہے جسے انسانی ذہن جنم دیتا ہے، اور جس کے بارے میں پیٹن کے الفاظ میں خود ماہرینِ قانون کا اعتراف یہ ہے کہ:

''یہ سمجھنا مبالغہ ہوگا کہ انسان اپنے ہر عمل کی کوئی معقول وجہ رکھتا ہے، اس کے بجائے ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ ہم کوئی کام پہلے کر لیتے ہیں اور سوچتے بعد میں ہیں، ہمارا یہ طرزِ عمل صرف اسی قسم کی صورتِ حال سے مخصوص نہیں جب ہم کسی تیز رفتار کار سے اپنی جان بچانے کے لئے چھلانگ لگاتے ہیں، بلکہ یہ طرزِ عمل بسا اوقات اس وقت بھی ہوتا ہے، جب ہم معاشرتی رسوم و عادات کو جنم دیتے ہیں، بلکہ اگر کسی ادارے یا قانون کی تشکیل کے وقت کوئی معقول پالیسی پہلے سے متعیّن رہی ہو تب بھی ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ قانون کا حاصل ہونے والا نتیجہ اُس مقصد سے بالکل مختلف ہوتا ہے جس کی خواہش نے وہ قانون بنوایا تھا'' (۲)

لیکن ایک جج یہ جاننے کے باوجود کہ قانون کے موجودہ ڈھانچے سے اس کے مطلوبہ نتائج

(۱) Paton : A Text Book of jurisprudence P 217

(۲) ایضاً ص ۱۹ا باب ۵ عنوان ۳۶۔

Marfat.com

حاصل نہیں ہو سکتے، اُسی قانون کی لفظی پیروی پر مجبور ہے، اور اسے دور از کار تاویلات گھڑنے کا حق حاصل نہیں، خواہ وہ اس کی نظر میں مطلوبہ نتائج سے زیادہ قریب ہوں، بلکہ بقول پیٹن:

> اگر کہیں غیر منصفانہ قوانین نافذ ہوں تو لیجسلیچر (قانون ساز ادارہ) تو انہیں منسوخ کر سکتا ہے، لیکن جج پر ایسے قانون کی پیروی لازم ہے، خواہ وہ اس قانون کے اصولوں کو کتنا ہی ناپسند کرتا ہو"(۱)

کیونکہ جج درحقیقت قانون ساز نہیں، بلکہ شارح قانون ہے، اس کا منصب قانون وضع کرنا نہیں، بلکہ قانون کا اتباع کرنا ہے، اور وہ قانون کی تشریح بھی انہی حدود میں رہ کر سکتا ہے، جو "اتباع" کے دائرے میں سما سکتی ہوں، اُسے "اتباع" کی حدود پھلانگ کر "اصلاح و ترمیم" کے منصب پر پہنچ جانے کا اختیار نہیں ہے،

یہ حال انسان کے بنائے ہوئے اُن قوانین کا ہے جن میں فکری غلطیوں کے ہزار امکانات موجود ہیں، جن میں نہ قانون سازوں کی امانت و دیانت شک و شبہ سے بالاتر ہوتی ہے، نہ اُن کی عقل و فکر کو غلطیوں سے پاک کہا جا سکتا ہے، اور نہ اس بات کی کوئی ضمانت ہے کہ انہوں نے واقعۃً اس قانون کے تمام ممکنہ نتائج پر کماحقہ غور کر لیا ہوگا،

پھر یہ ان انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیں جنہیں آنے والے دن کا بھی کچھ پتہ نہیں کہ وہ حالات میں کیا تبدیلی لے کر نمودار ہوگا؟ اور نہ اس بات کا کوئی علم ہے کہ ہمارے مطلوبہ نتائج اس قانون سے حاصل ہو سکیں گے یا نہیں؟

جب محض قیاسات اور تخمینوں کے اندھیروں میں بنے ہوئے قوانین کا اتباع اس درجے میں لازم ہے تو وہ خالقِ کائنات جس کے علم محیط سے موجودات کا کوئی ذرّہ مخفی نہیں جو زمانے کے تمام بدلتے ہوئے حالات سے پوری طرح باخبر ہے جو انسان کے نفع و نقصان اور اس کی مصلحتوں کو اچھی طرح جانتا ہے، اس کے بنائے ہوئے قوانین میں محض اپنی پسند اور ناپسند کی بنیاد پر دور از کار تاویلات تلاش کرنا آخر کونسی عقل، کونسی دیانت اور کونسے انصاف کی رُو سے

(۱) ایضاً ص ۲۱۱ باب ۹ عنوان ۴۹۔

Marfat.com

درست ہو سکتا ہے؟

۶...... زمانے کی تبدیلی اور احکام شرعیہ

پھر یہاں ایک اور غلط فہمی کو دور کرنا بھی ضروری ہے، آج کل یہ بات تقریباً ہر "جدت پسند" کی زبان پر رہتی ہے کہ کسی بھی نظام قانون کو جامد (Static) نہیں ہونا چاہئے، بلکہ حالات کے لحاظ سے تغیر پذیر (Dynamic) ہونا چاہئے، اور یہ بات "جدت پسند" ذہن کی خاصیت ہے کہ اس کی نظر میں جب کوئی چیز بُری قرار پاتی ہے تو وہ ہر حال میں سرتاپا بُری ہوتی ہے، اور اس کا نام ہی گالی بن جاتا ہے، اور جب کوئی چیز اچھی معلوم ہوتی ہے تو وہ ہر حال میں سراپا خیر ہی خیر قرار پاتی ہے، اور جگہ بے جگہ اس کا استعمال ایک فیشن بن جاتا ہے، یہی حال جامد (static) اور تغیر پذیر (Dynamic) کی اصطلاحات کا ہے کہ اوّل الذکر کی بُرائی کرنا، اور مؤخر الذکر کی تعریف کرنا آج کا علمی فیشن بن چکا ہے، اور جس "جدت پسند" کو دیکھئے، دنیا کی ہر چیز میں "جامد" اور "ناقابلِ تغیر" کے نام سے منہ بنانے اور "تغیر پذیر" کے نام سے خوش ہونے کا عادی بن چکا ہے، یہی وجہ ہے کہ مغرب کے فکری نظام میں کوئی بڑے سے بڑا اخلاقی یا دینی اصول ناقابل تغیر باقی نہیں رہا، بلکہ انہوں نے زندگی کی ہر چیز کو "تغیر پذیری" کی خراد پر گھس دیا ہے، اور اس کی دست برد سے نہ کوئی دینی عقیدہ محفوظ ہے اور نہ کوئی اخلاقی اصول صحیح سالم رہا ہے،

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ نہ چیز کا ہر حال میں "ناقابلِ تغیر" رہنا انسانیت کے لئے مفید ہے اور نہ ہر چیز کا ہر حال میں "تغیر پذیر" رہنا، انسان کو اس دنیا میں اچھی زندگی بسر کرنے کے لئے جہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنی حکمت عملی میں تبدیلی کرتا رہے وہاں اس بات کی بھی شدید ضرورت ہے کہ اس کے پاس کچھ اصول واحکام ہر حال اور ہر زمانے میں اَن مٹ اور ناقابلِ ترمیم ہوں، اور دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت ان میں تبدیلی نہ کر سکے، ورنہ اس کی بہیمی اور نفسانی خواہشات "زمانے کی تبدیلی" کی

Marfat.com

آڑ لے کر اس کو شر و فساد اور اخلاقی دیوالیہ پن کی اس آخری سرحد تک پہنچا سکتی ہیں جہاں وہ "انسانیت" کے ہر جامے سے آزاد ہو کر جانوروں کی صف میں شامل ہو جائے، اگر دنیا کے ہر فکری اصول، ہر اخلاقی ضابطے اور ہر قانونی حکم کو "تغیر پذیر" قرار دے کر جب جی چاہے بدل دینے کی آزادی ہو تو اس کا انجام اُس اخلاق باختگی، انسانیت کشی اور اضطراب و بےچینی کے سوا ہو ہی نہیں سکتا، جو ہمارے زمانے میں مغربی معاشرے کا مقدر بن چکی ہے،

اور جب یہ بات طے ہوگئی کہ تمام فکری اصول اور قانونی احکام قابل ترمیم و تغیّر نہیں ہونے چاہئیں، بلکہ کچھ احکام ایسے بھی رہنے ضروری ہیں جو کسی حال تبدیل نہ ہوں، تو اب صرف یہ مسئلہ باقی رہجاتا ہے کہ قانون کے کونسے احکام کو ناقابل تغیر قرار دیا جائے اور کونسے احکام کو قابل تغیّر؟ اگر اس مسئلے کو "عقلِ خالص" کے حوالے کیا جائے تو اس کی نارسائی کا مفصل حال آپ پیچھے دیکھ چکے ہیں، اس کے علاوہ اس مسئلہ کو "نری عقل" کے حوالہ کر کے آپ کبھی ایسے ناقابل تغیّر اصول و احکام حاصل نہیں کر سکتے، جو ساری دنیا کے انسانوں کے درمیان متفق علیہ ہوں، کیونکہ دنیا میں ہر شخص کی عقل کا فیصلہ اور سوچ کے نتائج دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، چنانچہ ایک شخص یا جماعت کسی ایک اصول کو ناقابل تغیر قرار دے گی اور دوسرا شخص یا جماعت کسی دوسرے اصول کو، اور مسئلہ جوں کا توں باقی رہے گا، لہٰذا اس مسئلہ کا حل بھی بجز اس کے کوئی نہیں کہ جس ذات نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جو انسان کی تمام واقعی ضروریات سے بھی باخبر ہے اور اس کے نفس کی چوریوں سے بھی آگاہ ہے، اسی سے اس معاملہ میں رہنمائی طلب کی جائے، اور اس سے رہنمائی طلب کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ اُس کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے بھیجے ہوئے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشادات کی طرف رجوع کیا جائے، جو بالترتیب قرآن کریم اور احادیث میں موجود ہیں،

جب ہم قرآن کریم اور احادیث نبویہ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں واضح طور سے نظر آتا ہے کہ ان میں بعض احکام صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، اور بعض احکام میں ان دونوں نے محض چند موٹے موٹے اصول بیان کرنے پر اکتفاء فرمایا ہے، اور ان

کی جزوی تفصیلات بیان نہیں فرمائیں، قرآن کریم کے ارشادات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت چونکہ کسی خطے یا زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر جگہ اور ہر زمانے کے لئے عام ہے، اس لئے جن احکام پر زمانے کی تبدیلی کا کوئی اثر نہیں پڑتا، اُن کو قرآن وحدیث میں صراحت ووضاحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے، اور بعض اوقات اُن کی جزوی تفصیلات بھی معیّن فرمادی گئی ہیں، اس کے برعکس جو احکام زمانے کی تبدیلی سے متاثر ہوسکتے تھے قرآن وحدیث نے اُن کی جزوی تفصیلات معیّن کرنے کے بجائے کچھ عام اور ہمہ گیر اصول بیان فرمادیئے ہیں، جن کی روشنی میں ہر دَور کے اہلِ علم جزوی تفصیلات معیّن کرسکیں،

لہٰذا قرآن وحدیث میں جو احکام منصوص ہیں اور جن پر امت کا اجماع منعقد ہوچکا ہے وہ قطعی طور پر ناقابل تغیر اور ہر دور کے لئے واجب العمل ہیں، کیونکہ اگر زمانے کے بدلنے سے اُن میں فرق پڑتا تو انہیں قرآن وحدیث میں منصوص نہ کیا جاتا، ہاں جو احکام قرآن وسنت میں منصوص نہیں ہیں، اور نہ اُن پر امت کا اجماع منعقد ہوا ہے اُن میں قرآن وسنت کے بیان کردہ اصولوں کے مطابق قیاس واجتہاد کی گنجائش ہے، اسی قسم کے احکام پر زمانے کی تبدیلی اثر انداز ہوسکتی ہے، اور ایسے ہی احکام کے بارے میں فقہاء کا یہ مقولہ ہے کہ:

الاحکام تتغیّر بتغیّر الزمان

"احکام زمانے کی تبدیلی سے بدلتے رہتے ہیں"

ورنہ اگر قرآن وسنت کے واضح اور صریح احکام میں بھی زمانے کی تبدیلی سے ترمیم وتغیر کی گنجائش ہوتی تو اللہ تعالیٰ کو آسمانی کتاب نازل کرنے اور پیغمبروں کو مبعوث فرمانے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی، بس ایک ہی حکم کافی تھا، کہ "اپنے زمانے کے حالات کے مطابق اپنی عقل سے احکام وضع کرلیا کرو۔" لہٰذا جو شخص قرآن وسنت کے صریح اور واضح احکام سننے کے بعد بھی "زمانے کی تبدیلی" کا عذر پیش کرتا ہے، یا "زمانے کی تبدیلی" کی بنیاد پر قرآن وسنت کے واضح احکام کو من مانے معنی پہنانے اور اُن میں ترمیم وتحریف کے لئے تیار رہتا ہے، وہ آسمانی کتابوں کے نزول اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے بنیادی مقصد تک سے بے خبر ہے،

Marfat.com

۷......زمانے کی تبدیلی کا مطلب

پھر یہاں "زمانے کی تبدیلی" کا مطلب سمجھ لینا بھی ضروری ہے، زمانے کے جو تبدیلی احکام شرعیہ پر اثر انداز ہوتی ہے، وہ تبدیلی ہے جس سے حکم کی علت (۱) بدل جائے، مثلاً ہمارے قدیم فقہاء نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک گھوڑا کرایہ پر لے اور گھوڑے کے مالک سے یہ طے نہ کرے کہ کتنی دور اس پر سفر کرنا ہے اور اس کی کل اُجرت کیا ہوگی، تو یہ اجارہ فاسد اور ناجائز ہے، لیکن آج جبکہ میٹر والی ٹیکسیاں ایجاد ہوچکی ہیں تو یہ حکم باقی نہیں رہا، آج لوگ ٹیکسی میں بیٹھنے سے قبل ڈرائیور سے کوئی معاملہ نہیں کرتے، اور فریقین میں سے کسی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ سفر کی مجموعی اُجرت کیا ہوگی، لیکن اس کے باوجود یہ اجارہ جائز اور درست ہے، وجہ یہ ہے کہ پہلے زمانے کے فقہاء نے جو مسئلہ بیان کیا تھا اس کی علت خود انہی کے بیان کے مطابق یہ تھی کہ اجرت طے نہ ہونے کی صورت میں فریقین کے درمیان جھگڑے کا قوی امکان تھا، اب زمانہ بدل گیا اور میٹروں کی ایجاد کے بعد عرف عام یہ ہوگیا کہ میٹر جو اجرت بتا دیتا ہے اس پر فریقین متفق ہوجاتے ہیں، اس لئے جھگڑے کا وہ قوی امکان باقی نہیں رہا جو معاملہ کے ناجائز ہونے کی علت تھا، چنانچہ زمانے کی اس تبدیلی سے حکم بھی بدل گیا،

اس کے برعکس جہاں حکم کی علت برقرار ہو وہاں محض زمانے کے عام چلن کی بنیاد پر احکام میں تبدیلی نہیں ہوسکتی، اسلام میں اس اصول کی کوئی گنجائش نہیں ہے، کہ زمانے میں جس جس برائی کا رواج پھیلتا جائے اس کو جائز و حلال، اور جس جس نیکی کو لوگ چھوڑتے جائیں اُسے غیر ضروری قرار دیتے جاؤ، کیونکہ اس شکست خوردہ ذہنیت کی تان بالآخر اُسی "خواہش پرستی" پر جا کر ٹوٹتی ہے جس سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کیا ہے اور جس کی غلامی سے نجات دینے کے لئے سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں،

(۱) علت کا صحیح مطلب سمجھنے کے لئے گزشتہ قریبی صفحات میں عنوان "حکمتوں پر حکم کا مدار نہیں ہوتا" ضرور ملاحظہ فرمالیا جائے۔

Marfat.com

۸...... عقل کا صحیح دائرۂ کار

مذکورہ بحث کا خلاصہ مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ جو احکام قرآن وسنت میں منصوص ہیں اُن کے بارے میں زمانے کے کسی مروّجہ نظریہ یا اہلِ زمانہ کے عام چلن سے مرعوب ومتأثر ہو کر عقلی گھوڑے دوڑانا اور قرآن وسنت کو توڑ مروڑ کر ان میں دوراز کار تاویلات تلاش کرنا یا زمانے کی تبدیلی کا عذر پیش کرنا کسی طرح درست نہیں، کیونکہ قرآن وسنت میں جو احکام منصوص ہیں وہ ایسے ہی ہیں جن پر زمانے کی تبدیلی سے کوئی حقیقی اثر نہیں پڑتا خواہ زمانے کے شور وشغب اور خواہشات کی رَو نے انہیں کتنا ہی اجنبی اور اچھنبا بنا دیا ہو، لہٰذا ایسے مواقع پر ''عقلی تاویلات'' کو احکام شرعیہ میں دخل دینا درحقیقت عقلِ سلیم کا نہیں بلکہ اُس ''عقل'' کا اتباع ہے جو خواہشات نفس کی غلام ہوتی ہے، اور جس کے بارے میں تفصیل سے عرض کیا جا چکا ہے کہ اس کا نتیجہ بدترین گمراہی اور انسانیت، اخلاق اور شرافت کی تباہی کے سوا کچھ نہیں،

حقیقت یہ ہے کہ خود ''عقلِ سلیم'' ہی کا تقاضا یہ ہے کہ انسانی دماغ کی حدود کو پہچانا جائے، اور اس پر وہ بوجھ نہ ڈالا جائے جس کا وہ متحمل نہیں ہے، اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز کی صلاحیت کی کچھ حدود ہیں، جن سے آگے وہ کام نہیں دیتی، ''عقل'' بھی اسی کائنات کا ایک حصہ ہے، اور اس کی صلاحیتیں بھی غیر محدود نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتابوں اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعے انہی حقائق واحکام کی طرف انسان کی رہنمائی فرمائی ہے، جن کے ادراک میں عقل ٹھوکریں کھا سکتی تھی، لہٰذا ان آسمانی کتابوں اور انبیاء علیہم السلام کی صراحتوں کے مقابلہ میں عقلی حکمتوں کو پیش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی احمق ہوائی جہاز کے انجن کو ریل گاڑی کے اصولوں کے مطابق ٹیسٹ کرنا شروع کر دے،

آخر میں یہ بات ذہن نشین کر لینا بھی ضروری ہے کہ مذکورہ بالا بحث کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ قرآن وسنت پر ایمان لانے کے بعد عقل کا کوئی کام باقی ہی نہیں رہتا، وجہ یہ ہے کہ انسان کو زندگی میں جن کاموں سے سابقہ پیش آتا ہے اُن میں سے ایسے افعال بہت کم ہیں

جنہیں شریعت نے فرض وواجب یا مسنون ومستحب یا حرام ومکروہ قرار دیا ہے، اس کے مقابلے میں ایسے افعال بے شمار ہیں جنہیں "مباح" قرار دیا گیا ہے، یہ "مباحات" کا دائرہ عقل کی وسیع جولانگاہ ہے، جس میں شریعت کوئی مداخلت نہیں کرتی، ان "مباحات" میں سے کسی کو اختیار کرنا اور کسی کو چھوڑ دینا عقل ہی کے سپرد کیا گیا ہے، اس وسیع جولان گاہ میں عقل کو استعمال کر کے انسان مادّی ترقی اور سائنٹفک انکشافات کے بامِ عروج تک بھی پہنچ سکتا ہے، اور ان ترقیات وانکشافات کا صحیح فائدہ بھی حاصل کرسکتا ہے، اس کے برعکس احکام الٰہیہ میں دخل اندازی کرنے کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکلا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی یہ ترقیات جن کو انسانیت کے لئے باعثِ رحمت ہونا چاہئے تھا، اُن کا نہ صرف صحیح فائدہ انسان کو حاصل نہیں ہورہا، بلکہ بسا اوقات وہ انسان کے لئے ایک عذاب کی صورت اختیار کرگئی ہیں، یہ تمام تر نتیجہ اسی بات کا ہے کہ "عقل" پر وہ بوجھ لاد دیا گیا ہے جو اس کی برداشت سے باہر تھا، اور جس کا تحمل انسان سے وحی الٰہی کے مکمل اتباع کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا،

فلسفۂ تاریخ کے مشہور امام علامہ ابن خلدونؒ نے اس سلسلے میں بڑی نفیس بات لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں:

فاتھم ادراکك ومدرکاتك فی الحصر، واتبع ماامرك الشارع من اعتقادك وعملك، فھو احرص علیٰ سعادتك، واعلم بما ینفعك لانه من طور فوق ادراکك ومن نطاق اوسع من نطاق عقلك ولیس ذلك بقادحٍ فی العقل ومدارکه، بل العقل میزان صحیح، فاحکامه یقینیة لاکذب فیھا، غیر انك لاتطمع ان تزن به امور التوحید والاٰخرة وحقیقة النبوة وحقائق الصّفات الالٰھیّة وکل ماوراء طوره، فانّ ذلك طمع فی محال، ومثال ذلك مثال رجل رآی المیزان الذی یوزن به الذھب، فیطمع ان یزن به الجبال، ھذا لایدرك علیٰ ان المیزان فی احکامه غیر صادق، لکن العقل یقف

Marfat.com

عنده ولا يتعدى طوره .(۱)

"لہٰذا تم اپنے علم اور معلومات کو اس حصر کر دینے میں خطاوار سمجھو، (جو کچھ ہم جانتے ہیں تمام موجودات ان میں منحصر ہیں) اور شارع علیہ السلام کے بتائے ہوئے اعتقادات اور اعمال کا اتباع کرو، کیونکہ وہ تم سے زیادہ تمہارے بہی خواہ اور سود و بہبود کو سمجھنے والے ہیں، ان کا علم تمہارے علم سے بلند اور ایسے ذریعے سے حاصل ہونے والا ہے جو تمہاری عقل کے دائرہ سے وسیع تر ہے، اور یہ بات عقل اور اس کی معلومات کے لئے کوئی عیب نہیں ہے، بلکہ عقل درحقیقت ایک صحیح میزان ہے، جس کے احکام یقینی اور جھوٹ سے پاک ہیں، لیکن یہ میزان اتنی بڑی نہیں ہے کہ تم اس سے توحید و آخرت کے امور، نبوت وصفات الٰہیہ یا کسی اور ایسی چیز کا وزن کرنے لگو جو عقل کی دسترس سے باہر ہیں، اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص سونا تولنے کا کانٹا دیکھے اور پھر اس سے پہاڑوں کو تولنے کی خواہش کرنے لگے، ظاہر ہے کہ (جب اس میں پہاڑ نہ تُل سکیں تو) یہ نہیں کہا جائے گا کہ ترازو جھوٹی ہے، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ ہر میزان کی ایک حد ہوتی ہے، جس سے آگے وہ کام نہیں دے سکتی، اسی طرح میزانِ عقل بھی ایک خاص موقع پر ٹھہر جاتی ہے، اور اپنی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔"

اسی طرح قرآن وسنت نے بہت سی باتیں خود بیان کرنے کے بجائے فقہاء کے اجتہاد و استنباط پر چھوڑ دی ہیں، چنانچہ جو لوگ اس کام کے اہل ہوں، اُن کے لئے قرآن وسنت اور اصولِ شریعت کی روشنی میں احکام کا استنباط عقل کے استعمال کا دوسرا بڑا میدان ہے، جس میں ہر زمانے کے فقہاء طبع آزمائی کرتے رہے ہیں، لیکن قرآن وسنت کی

---

(۱) مقدمہ ابن خلدونؒ۔

Marfat.com

صراحتوں کو چھوڑ کر یا اصولِ شرعیہ کو پامال کر کے محض عقل کی بنیاد پر قرآن وسنت میں توڑ مروڑ کی کوشش سونے کے کانٹے سے پہاڑوں کو تولنے کے مرادف ہے،

آخر میں اس بحث کو ہم شیخ الاسلام حضرت علاّمہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں:

''یہ منشاء ہرگز نہیں کہ فکر واستدلال ایک محض عبث اور لغو چیز ہے، یا اس سے تعرض کرنا کوئی شرعی گناہ ہے، لیکن ہاں! کسی فردِ بشر کے واسطے ہم یہ جائز نہیں رکھتے کہ وہ اپنی عقلِ شخصی اور فکر ناقص کو اصلِ اصول ٹھہرا کر انبیاء علیہم السلام کے پاک وصاف، صحیح وصادق اور بلند وبرتر تعلیمات کو زبردستی ان پر منطبق کرنے کی کوشش کرے جس پر اکثر اوقات اس کا ضمیر بھی خود اندر سے نفریں کر رہا ہو، اس کے برخلاف نہایت ضروری ہے کہ انسان خدا اور اس کے رسولوں کے ارشادات کو اصل قرار دے کر اپنی عقلی معلومات کو ان کے تابع بنادے، اور جو کچھ وہ فرمائیں اس کو اپنے امراض روحانی کے حق میں اکسیر شفا تصور کر کے سمعاً و طاعۃ کہتا ہوا بلا حجت وتکرار سر اور آنکھوں پر رکھے،

﴿ وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِى اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴾

''اور جو لوگ اللہ کے بارے میں بحثیں نکالتے ہیں جبکہ لوگ اُس کی بات مان چکے ہیں، اُن کی بحث اُن کے پروردگار کے نزدیک باطل ہے، اور اُن پر (اللہ کا) غضب ہے، اور اُن کے لئے سخت عذاب۔''(۱)

---

(۱) العقل والنقل، مؤلفہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ صفحہ ۹۵ مطبوعہ ادارۂ اسلامیات، لاہور، ۱۳۹۶ھ۔

Marfat.com

باب چہارم

قُرونِ اُولیٰ کے بعض مفسرین

ہمارا ارادہ تھا کہ اس کتاب میں علم تفسیر کی مفصل اور مبسوط تاریخ بھی ذکر کی جائے، لیکن چند در چند وجوہ کی بناء پر یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا، اس کے علاوہ اس موضوع پر مستقل کتابیں منظر عام پر آبھی چکی ہیں،(۱) لہٰذا علم تفسیر کی مکمل تاریخ کے بجائے اس باب میں ہم صرف قرونِ اُولیٰ کے بعض ایسے مفسرین کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں، جن کے حوالے تفسیر کی کتابوں میں انتہائی کثرت سے آتے ہیں، مقصد یہ ہے کہ تفسیر کا مطالعہ کرتے وقت مندرجہ ذیل مباحث ذہن میں رہیں تو ان حضرات کے اقوال سے صحیح نتیجے تک پہنچنے میں انشاء اللہ آسانی ہوگی،

حضرت عبداللہ بن عباسؓ

یوں تو صحابۂ کرامؓ کی ایک بڑی جماعت علم تفسیر کی خدمت کے لئے معروف ہے، لیکن ان حضرات میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو بطور خاص ایک امتیازی مقام حاصل ہے، اس کی بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ ان کے حق میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علم تفسیر کی مہارت کی دعاء فرمائی تھی، متعدد روایات میں وارد ہے کہ آپؐ نے اُن کے سر پر ہاتھ پھیر کر یہ دُعا فرمائی کہ:

اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْہُ التَّاوِیْل

---

(۱) مثلاً ملاحظہ ہو تاریخ القرآن و تاریخ التفسیر مؤلفہ پروفیسر عبدالصمد صارم صاحب۔

''یا اللہ اس کو دین کی سمجھ عطا فرما اور انہیں تفسیر قرآن کا علم عطا فرما''

اور ایک مرتبہ یہ دُعا فرمائی کہ:

اَللّٰھُمَّ بارك فيه وانشر منه (۱)

''یا اللہ! ان کو برکت عطا فرما اور ان کے ذریعہ علم دین کو عام فرما۔''

اور بعض روایات میں ہے کہ آپؐ نے ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

نعم ترجمان القرآن انت (۲)

''تم قرآن کریم کے اچھے ترجمان ہو۔''

چنانچہ ان کو صحابۂ کرامؓ ''ترجمان القرآن'' اور ''الحبر'' (زبردست عالم) اور ''البحر'' (دریائے علم) کے القاب سے یاد کرتے تھے، (۳) چنانچہ بڑے بڑے صحابۂ کرامؓ ان کی کم سنی کے باوجود تفسیری معاملات میں اُن کی طرف رجوع کرتے اور ان کے قول کو خاص وزن دیتے تھے،

خود فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد میں نے انصار کے صاحب سے کہا کہ ابھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے صحابہؓ باقی ہیں، آؤ ہم ان سے (علم کی باتیں) معلوم کیا کریں، اُن صاحب نے کہا: ''کیا آپ کا خیال ہے کہ کسی وقت لوگ علم کے معاملہ میں آپ کے محتاج ہوں گے؟ (جو اُس وقت کی تیاری ابھی سے کرنا چاہتے ہیں)'' چنانچہ انہوں نے میری تجویز منظور نہ کی، اور میں نے تنہا یہ کام شروع کر دیا، کہ صحابہؓ کے پاس جاتا اور ان سے علم کی باتیں معلوم کرتا رہا، اگر مجھے کسی شخص کے حوالہ سے کوئی حدیث پہونچتی تو میں اُس کے دروازے پر پہنچ جاتا، معلوم ہوتا کہ وہ دوپہر کے وقت آرام میں ہیں تو میں اپنی چادر کو تکیہ بنا کر وہیں دروازے پر بیٹھ رہتا، ہوا کے جھکڑ میرے چہرے پر مٹی لالا کر ڈالتے رہتے، جب وہ صاحب باہر نکل کر مجھے دیکھتے تو کہتے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

(۱) الاصابہ، للحافظ ابن حجرؒ، ص ۳۲۳ ج ۲۔

(۲) الاتقان ص ۱۸۷ ج ۲ بحوالہ حلية الاولياء لابی نعیم۔

(۳) ایضاً بحوالۂ مذکورہ۔

Marfat.com

چچازاد بھائی! آپ کیوں تشریف لائے؟ میرے پاس پیغام بھیج دیا ہوتا، میں آپ کے پاس چلا آتا۔'' میں جواب میں کہتا: ''نہیں! یہ میرا فرض تھا کہ آپ کے پاس آؤں'' چنانچہ میں اُن سے اس حدیث کے بارے میں پوچھتا (یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رہا) وہ انصاری بزرگ (جنہوں نے میرے ساتھ چلنے سے انکار کیا تھا) بعد میں کافی دن تک زندہ رہے، یہاں تک کہ انہوں نے مجھے اس حالت میں دیکھا کہ لوگ میرے اردگرد جمع ہیں، اور مجھ سے سوالات کررہے ہیں، اس وقت انہوں نے کہا کہ ''یہ نوجوان مجھ سے زیادہ عقلمند تھا۔'' (۱)

عبیداللہ بن علی بن ابی رافع کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ، ابورافعؓ کے پاس آتے اور ان سے پوچھتے کہ فلاں دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کہا تھا؟ اور ابن عباسؓ کے پاس ایک آدمی اور ہوتا جو (ابورافعؓ کا جواب) لکھ لیتا تھا، (۲)

یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس ہر وقت طلبۂ علم کا جمگھٹا لگا رہتا تھا، اور آپ اُن کے سامنے قرآن کریم کی تفسیر، احادیث نبویہؐ اور فقہی مسائل وغیرہ بیان فرماتے رہتے تھے، (۳)

انہی وجوہ پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو ''امام المفسرین'' کہا جاتا ہے، اور تفسیر قرآن کے معاملے میں سب سے زیادہ روایات انہی سے مروی ہیں،

البتہ اُن سے جو روایات مروی ہیں اُن کا ایک بڑا حصہ ضعیف بھی ہے، لہٰذا اُن کی روایات سے استفادہ کے لئے انہیں اصولِ حدیث کی شرائط پر جانچنا ضروری ہے، اس سلسلے میں چند باتیں یاد رکھنے کی ہیں:

۱...... حضرت ابن عباسؓ کی روایات میں سب سے زیادہ قوی اور قابلِ اعتماد وہ روایات ہیں جو ''ابوصالح عن معاویہ بن صالح عن علی بن ابی طلحہ عن ابن عباسؓ'' کے طریق سے

---

(۱) الاصابہ ص ۳۲۳ ج ۲، بحوالۂ مسند دارمی ومسند حارث بن ابی اسامہ، مزید ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ للذہبی، ص ۳۸ ج ا طبع دکن،

(۲) ایضاً بحوالۂ مسند رویانی۔ (۳) ملاحظہ ہو الاصابہ، ص ۳۲۵ ج ۲، و الاستیعاب علی ھامش الاصابہ ص ۳۴۷ ج ۲۔

مروی ہیں، امام احمدؒ کے زمانے میں مصر میں حضرت ابن عباسؓ کی تفاسیر کا ایک مجموعہ اسی سند کے ساتھ موجود تھا، امام احمدؒ اس کے بارے میں فرماتے تھے کہ اگر کوئی شخص صرف اسی نسخہ کو حاصل کرنے کا قصد لے کر مصر کا سفر کرے تو یہ کوئی بڑی بات نہ ہوگی، یہ نسخہ تو بعد میں نایاب ہوگیا، لیکن بہت سے محدثین اور مفسرین نے اس کے اقتباسات اپنی کتابوں میں نقل کئے ہیں، چنانچہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اس کی بہت سی روایات تعلیقاً لی ہیں، نیز حافظ ابن جریرؒ، ابن ابی حاتمؒ اور ابن المنذرؒ نے متعدد واسطوں سے بہت سی روایات اسی طریق سے نقل فرمائی ہیں،(۱)

گولڈزیہر کا ایک مغالطہ

یہاں ایک مغالطہ کی طرف توجہ دلانا مناسب ہوگا، مشہور مستشرق گولڈ زیہر (Goldziher) نے اپنی کتاب ''مذاہب التفسیر الاسلامی'' میں حسب عادت یہ مغالطہ انگیزی کی ہے کہ:

> ''خود مسلمان ناقدین حدیث اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباسؓ سے وہ تفسیری اقوال خود نہیں سنے جو انہوں نے اس کتاب میں ذکر کئے ہیں، خود اسلامی نقدِ حدیث کا یہ فیصلہ ابن عباسؓ کی تفاسیر کے اُس مجموعہ کے بارے میں ہے جو سب سے زیادہ قابلِ قبول سمجھا جاتا ہے''(۲)

لیکن گولڈزیہر نے یہ ذکر نہیں کیا کہ نقدِ حدیث کے ماہر علماء نے جہاں یہ لکھا ہے کہ علی بن ابی طلحہؒ نے یہ تفسیری اقوال حضرت ابن عباسؓ سے نہیں سُنے، وہاں انہوں نے تحقیق کے بعد یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہ روایات علی بن ابی طلحہؒ نے کچھ مجاہدؒ سے لی ہیں، اور کچھ سعید بن جبیرؒ سے،

---

(۱) الاتقان، ص ۱۸۸ ج ۲ نوع نمبر ۸۰

(۲) مذاہب التفسیر الاسلامی از گولڈزیہر ترجمہ عربی: ڈاکٹر عبدالحلیم النجار، ص ۹۸۔

Marfat.com

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

بعد ان عرفت الواسطة وهى ثقة فلاضير فى ذٰلك (۱)

''جب بیچ کا واسطہ معلوم ہو گیا، اور وہ ثقہ ہے، تو اب کوئی حرج باقی نہیں رہا''

علی بن ابی طلحہؒ کے اس طریق کے علاوہ حضرت ابن عباسؓ کی روایات کے اور بھی متعدد صحیح یا حسن طرق ہیں، مثلاً أبو ثور عن ابن جريج عن ابن عباسؓ یا حجاج بن محمد عن ابن جريج عن ابن عباسؓ یا قيس عن عطاء بن السائب عن سعيد بن جبير عن ابن عباسؓ یا ابن اسحٰق عن محمد بن ابى محمد عن عكرمة او سعيد بن جبير عن ابن عباسؓ وغیرہ (الاتقان)

۳..... حضرت ابن عباسؓ کی جو روایات مندرجہ ذیل اسانید سے آئی ہیں وہ ضعیف ہیں:

(الف) محمد بن السائب الكلبى عن ابى صالح عن ابن عباسؓ اور جب کلبی سے محمد بن مروان السّدّیّ الصغیر روایت کریں تو اس سند کو محدثین سلسلۃ الکذب قرار دیتے ہیں، مفسرین میں سے ثعلبیؒ اور واحدیؒ نے اس سلسلے سے بکثرت روایات نقل کی ہیں،

(ب) ضحاك بن مزاحم عن ابن عباسؓ، یہ طریق اس لئے ضعیف ہے کہ ضحاک کی ملاقات حضرت ابن عباسؓ سے ثابت نہیں، اور اگر ضحاک سے روایت کرنے والے بشر بن عمارہ عن ابی روق ہوں تو یہ سلسلہ اور ضعیف ہو جاتا ہے، اس لئے کہ بشر بن عمارہ ضعیف ہیں، اور اگر ضحاک سے روایت کرنے والے جویبر ہوں تو اس کا ضعف

---

(۱) الاتقان، ص ۱۸۸ ج ۲، مزید دیکھئے تهذيب التهذيب، ص ۳۳۹ ج ۷۔

اور زیادہ ہو جاتا ہے، کیونکہ جو یبر نہایت ضعیف ہیں،

(ج) عطیة العوفی عن ابن عباسؓ ، یہ طریق بھی عطیۃ العوفی کے ضعف کی بناء پر ضعیف ہے، البتہ بعض حضرات اُسے حسن کہتے ہیں، کیونکہ امام ترمذیؒ نے عطیہ کی روایات کی تحسین کی ہے، اس مسئلہ پر مفصل بحث عطیۃ العوفی کے تذکرے میں آ رہی ہے،

(د) مقاتل بن سلیمان عن ابن عباسؓ ، یہ طریق بھی مقاتل بن سلیمانؒ کے ضعف کی بناء پر مجروح ہے،(۱) مقاتل کا پورا حال بھی آگے آ رہا ہے،

مروّجہ تفسیر ابن عباسؓ کی حیثیت

۴...... ہمارے زمانے میں ایک کتاب...... "تنویر المقیاس فی تفسیر ابن عباسؓ " کے نام سے شائع ہوئی ہے، جسے آجکل عموماً "تفسیر ابن عباسؓ " کہا اور سمجھا جاتا ہے، اور اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے، لیکن حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس کی نسبت درست نہیں کیونکہ یہ کتاب محمد بن مروان السّدّیؒ عن محمد بن السائب الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباسؓ کی سند سے مروی ہے،(۲) اور پیچھے گذر چکا ہے کہ اس سند کو محدثین نے "سلسلة الکذب" (جھوٹ کا سلسلہ) قرار دیا ہے، لہٰذا اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا،

حضرت علیؓ

تفسیرِ قرآن کے معاملے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقام انتہائی بلند ہے، پہلے تین خلفاء کی وفات چونکہ جلدی ہو گئی تھی اس لئے اُن سے تفسیری روایات بہت کم مروی ہیں، اس کے برخلاف حضرت علیؓ عرصۂ دراز تک افادۂ علم میں مشغول رہے، اس لئے ان سے

---

(۱) یہ پوری بحث الاتقان ص ۱۸۸ و ۱۸۹ ج ۲ نوع نمبر ۸۰ سے ماخوذ ہے، مزید تفصیل کے لئے ان راویوں کا تذکرہ ملاحظہ فرمایئے جو آگے آ رہا ہے۔ (۲) دیکھئے تنویر المقباس ص ۲ ج اوّل۔

Marfat.com

بہت سی روایات منقول ہیں، علم تفسیر میں اُن کے مقام بلند کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ابوالطفیلؒ کہتے ہیں:

''میں نے حضرت علیؓ کو خطبہ دیتے ہوئے دیکھا، وہ فرمارہے تھے کہ ......مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں سوالات کیا کرو، کیونکہ خدا کی قسم! قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں جس کے بارے میں مجھے معلوم نہ ہو کہ یہ رات کو نازل ہوئی یا دن کو، میدان میں اُتری یا پہاڑ پر؟'' (۱)

حضرت علیؓ نے چونکہ آخر میں کوفہ کو اپنا مستقر بنالیا تھا، اس لئے آپ کا علم زیادہ تر اسی علاقے میں پھیلا، اور آپ کی بیشتر روایات اہلِ کوفہ سے مروی ہیں،

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی ان صحابہؓ میں سے ہیں جن سے قرآن کریم کی بہت سی تفاسیر منقول ہیں بلکہ اُن کی مرویات حضرت علیؓ سے بھی زیادہ ہیں، حافظ ابن جریرؒ وغیرہ نے اُن کا یہ قول روایت کیا ہے کہ:

والذی لاالہ غیرہ مانزلت اٰیة من کتاب اللّٰہ الا وانا اعلم فیمن نزلت واین نزلت ، ولو اعلم مکان احد اعلم بکتاب اللّٰہ منی تنالہ المطایا لا تیتہٗ، (۲)

''قسم اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، کہ کتاب اللہ کی جو آیت بھی نازل ہوئی ہے، اس کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ وہ کس شخص کے بارے میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی؟ اور اگر مجھے کسی ایسے شخص کا پتہ معلوم ہوجائے جو کتاب اللہ کو مجھ سے زیادہ جانتا ہو تو میں اُس کے پاس ضرور جاؤں گا، بشرطیکہ اس کی جگہ تک

(۱) الاتقان، ص ۱۸۷ ج ۲ نوع نمبر ۸۰۔ (۲) ایضاً۔

Marfat.com

اونٹنیاں جاسکتی ہوں۔"

مشہور تابعی حضرت مسروق بن الاجدعؒ فرماتے ہیں کہ:

"حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہمارے سامنے ایک سورت پڑھتے، اور دن کا بیشتر حصہ اس کی تفسیر میں اور اس کے بارے میں احادیث بیان کرنے میں صرف فرمادیتے تھے۔" (۱)

اور حضرت مسروقؒ ہی کا قول ہے کہ میں نے بہت سے صحابۂ کرامؓ سے استفادہ کیا ہے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوا کہ تمام صحابہؓ کے علوم چھ آدمیوں میں جمع تھے:

حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابوالدرداءؓ، اور حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہم اجمعین، پھر میں نے غور کیا تو ان چھ حضرات کے علوم دو حضرات کے درمیان منحصر پائے، حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، (۲)

حضرت اُبی بن کعبؓ

حضرت ابی بن کعبؓ بھی اُن صحابہ میں سے ہیں جو تفسیر اور قراآت کے علم میں معروف تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے بارے میں فرمایا:

اقرؤهم أُبيّ بن كعبؓ (۳)

"صحابہؓ میں سب سے بڑے قاری اُبی بن کعبؓ ہیں"

آپ کی جلالتِ قدر کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے امام المفسرین نے آپ سے استفادہ کیا ہے، حضرت معمرؒ فرماتے ہیں:

عامة علم ابن عباس من ثلثة: عمرؓ وعلیؓ وابی بن کعبؓ (۴)

"حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بیشتر علوم تین حضرات سے ماخوذ ہیں،

---

(۱) تفسیر ابن جریرؒ ص۲۷ ج۱۔ (۲) مقدمہ نصب الرایہ، للکوثریؒ ص۳۰ ج۱

(۳) (۴) تذکرۃ الحفاظ للذہبیؒ ص۳۸ ج۱۔

Marfat.com

حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، اور حضرت اُبی بن کعبؓ''

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اُبی بن کعبؓ پہلے مفسر ہیں، جن کی تفسیر کتابی صورت میں مرتب ہوئی، ان کی تفسیر کا ایک بڑا نسخہ تھا، جس کو ابو جعفر رازی بواسطۂ ربیع بن انس عن ابی العالیہ روایت کرتے تھے، امام ابن جریرؒ، ابن ابی حاتمؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام حاکمؒ نے اس سے روایات لی ہیں، امام حاکمؒ کی وفات ۴۰۵ھ میں ہوئی، اس لئے یہ نسخہ پانچویں صدی تک موجود تھا، (۱)

مذکورہ حضرات کے علاوہ حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت جابرؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت انسؓ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے بھی تفسیر قرآن کے سلسلے میں روایات منقول ہیں،

صحابہؓ کے بعد

صحابۂ کرامؓ نے مختلف مقامات پر قرآن کریم کے درس کا سلسلہ جاری کیا ہوا تھا اُن کی تعلیم وتربیت سے تابعین کی ایک بڑی جماعت تیار ہوئی، جس نے علم تفسیر کو محفوظ رکھنے کے لئے نمایاں خدمات انجام دیں، ان میں سے اُن چند حضرات کا مختصر تعارف درج ذیل ہے، جن کا حوالہ کتبِ تفسیر میں بہ کثرت آتا ہے،

۱......حضرت مجاہدؒ

ان کا پورا نام ابوالحجاج مجاہد بن (۲) جبر المخزومیؒ ہے، (ولادت ۲۱ھ وفات ۱۰۳ھ) یہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے خاص شاگرد ہیں، جن سے انہوں نے تیس مرتبہ قرآن کریم کا دور کیا ہے، اور تین مرتبہ تفسیر پڑھی ہے، (۳) قتادہؒ اُن کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

---

(۱) الاتقان، ص۱۸۹ ج۲۔

(۲) ان کے والد کا صحیح نام جبر (بروزن نصر) ہے، اور بعض حضرات جُبیر (بروزن زبیر) بھی کہتے ہیں، (تهذیب الاسماء واللغات للنووی ص۸۳ ج۲۔)

(۳) تہذیب التہذیب ص۴۳ ج۱۰۔

Marfat.com

اعلم من بقی بالتفسیر مجاهد

''تفسیر کے جو علماء باقی ہیں اُن میں مجاہدؒ سب سے بڑے عالم ہیں''

اور خصیفؒ کا قول ہے:

اعلمهم بالتفسیر مجاهد (۱)

'' مجاہدؒ تفسیر کے سب سے بڑے عالم ہیں ''

کہا جاتا ہے کہ اُن کی تفاسیر کا ایک مجموعہ مصر کے کتب خانہ خدیویہ میں محفوظ ہے، (۲) حضرت مجاہدؒ اگرچہ تابعین میں سے ہیں، لیکن صحابہؓ کرامؓ بھی اُن کی قدر کرتے تھے، حضرت مجاہدؒ خود فرماتے ہیں:

صحبت ابن عمر و انی ارید ان اخدمه فکان هو یخدمنی (۳)

''میں حضرت ابن عمرؓ کی صحبت میں رہا، اور میں اُن کی خدمت کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ میری خدمت کرتے تھے''

چنانچہ حضرت ابن عمرؓ نے ایک مرتبہ اُن کی رکاب پکڑ کر فرمایا:

''کاش! کہ میرا بیٹا سالم اور میرا غلام نافع حافظہ میں تم جیسے ہو جائیں''

حضرت مجاہدؒ کی وفات ۱۰۳ھ میں سجدہ کی حالت میں ہوئی، (۵)

۲......حضرت سعید بن جبیرؒ

مشہور تابعی ہیں، اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت انسؓ، حضرت عبداللہ بن مغفلؓ، حضرت ابومسعود البدریؓ جیسے صحابہؓ سے استفادہ کیا ہے، (۴) عبادت اور زہد میں معروف ہیں، رات کو نماز میں کثرت

(۱) تذکرۃ الحفاظ للذهبیؒ ص ۸۶ ج ۱ ترجمہ ۸۳۔

(۲) تاریخ التفسیر، از عبدالصمد صارم، ص ۷۸ مطبوعہ دہلی ۱۳۵۵ھ۔

(۳) حلیۃ الاولیاء لابی نعیم، ص ۲۸۵ و ۲۸۶ ج ۳۔

(۴) تہذیب الاسماء و اللغات للنوویؒ ص ۲۱۶ ج ۱۔

(۵) (البدایہ و النہایہ لابن کثیرؒ ص ۲۲۴ ج ۹

سے رونے کی بناء پر انکی بینائی میں نقص آ گیا تھا، (۱) حجاج بن یوسف نے ۹۴ھ میں شہید کیا، جس کا واقعہ معروف ہے، انہوں نے خلیفہ عبدالملک بن مروان کی فرمائش پر ایک تفسیر لکھی تھی، خلیفہ نے اس کو شاہی خزانہ میں محفوظ کرا دیا تھا، کچھ عرصہ کے بعد یہ تفسیر حضرت عطاء بن دینار (متوفی ۱۲۶ھ) کے ہاتھ آ گئی، چنانچہ وہ اس نسخہ کی بناء پر اس تفسیر کی روایات کو حضرت سعید بن جبیرؒ سے مرسلاً روایت کیا کرتے تھے، (۲) لہٰذا عطاء بن دینارؒ سے حضرت سعید بن جبیرؒ کی جو روایات منقول ہیں وہ محدثین کی اصطلاح کے مطابق "وجادہ" ہیں، اور زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہیں،

حضرت سعید بن جبیرؒ کی بہت سی روایات مرسل ہیں، (یعنی اُن میں صحابی کا واسطہ محذوف ہے) لیکن ان کی مراسیل قابلِ اعتماد ہیں، حضرت یحیٰ بن سعیدؒ فرماتے ہیں کہ:

"سعید بن جبیرؒ کی مرسلات مجھے عطاءؒ اور مجاہدؒ کی مراسیل سے زیادہ پسند ہیں" (۳)

۳...... حضرت عکرمہؒ

یہ عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ کے نام سے مشہور ہیں، یہ بربری غلام تھے، حصین بن ابی الحر العنبری نے انہیں بطور ہدیہ حضرت ابن عباسؓ کو پیش کیا تھا، حضرت ابن عباسؓ نے ان کو انتہائی محنت سے تعلیم دی، اور انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کے علاوہ حضرت علیؓ، حضرت حسن بن علیؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت عقبہ بن عامرؓ، حضرت جابرؓ، حضرت معاویہؓ اور بعض دوسرے صحابہ سے بھی روایات نقل کی ہیں، (۴)

عکرمہؒ خود فرماتے ہیں کہ میں نے چالیس سال طلب علم میں گزارے ہیں، (۵) چنانچہ انہوں نے مصر، شام، عراق، اور افریقہ تک کے سفر کئے ہیں، (۶) امام شعبیؒ فرماتے

(۱) حلیۃ الاولیاء ص ۲۷۲ ج ۴ ترجمہ ۲۷۵۔ (۲) تہذیب التہذیب ص ۱۹۸ و ۱۹۹ ج ۷ ترجمہ عطاء بن دینار۔
(۳) ایضاً ص ۱۴ ج ۴ ترجمہ سعید بن جبیرؒ۔ (۴) تہذیب التہذیب ص ۲۶۴ ج ۷۔
(۵) تذکرۃ الحفاظ للذہبیؒ ص ۹۰ ج ۱ (۶) البدایۃ والنہایہ لابن کثیر، ص ۲۴۵ ج ۹۔

Marfat.com

ہیں کہ: ''ہمارے زمانے میں کتاب اللہ کا کوئی عالم عکرمہؒ سے بڑا باقی نہیں رہا'' (۱) حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں: ''تابعین میں چار آدمی سب سے زیادہ عالم تھے، عطاءؒ، سعید بن جبیرؒ، عکرمہؒ اور حسن بصریؒ'' (۲)

عکرمہؒ پر اعتراضات کی حقیقت

بعض محدثین نے عکرمہؒ پر کچھ اعتراضات بھی کئے ہیں، مشہور مستشرق گولڈزیہر نے انہی اعتراضات کو بھیانک بنا کر یہ تأثر دینے کی کوشش کی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے یہ مشہور شاگرد بھی تفسیری روایات کے مقابلے میں ناقابلِ اعتماد ہیں (۳) حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ محقق علماء نے ان اعتراضات کو پوری تحقیق وتفتیش کے بعد رَد کیا ہے، اس مسئلہ پر حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے مقدمۂ فتح الباری میں نہایت مبسوط اور کافی وشافی بحث کی ہے، انہوں نے ہی یہ بھی بتایا ہے کہ متعدد ائمۂ حدیث نے عکرمہؒ کے حالات کی تحقیق پر اور اُن پر عائد کئے جانے والے اعتراضات کی تفتیش کے لئے مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں حافظ ابن جریر طبریؒ، امام محمد بن نصر مروزیؒ، ابوعبداللہ بن مندہؒ، ابوحاتم بن حبانؒ، اور ابوعمر بن عبدالبرؒ جیسے حضرات شامل ہیں، (۴) اس کے بعد حافظ ابن حجرؒ نے بتایا ہے کہ عکرمہؒ پر جو اعتراضات وارد کئے جاتے ہیں اُن کا دارومدار تین اعتراضات پر ہے، ایک یہ کہ انہوں نے بعض غلط باتیں حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب کردی ہیں، دوسرے یہ کہ وہ عقیدۃً خارجی تھے، اور تیسرے یہ کہ وہ امراء وحکام سے انعامات وصول کرلیتے تھے،

جہاں تک اس تیسرے الزام کا تعلق ہے کہ انہوں نے امراء سے انعامات وصول کئے ہیں، سو ظاہر ہے کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کی بناء پر اُن کی روایات کو رَد کردیا جائے، رہے باقی دو اعتراضات، سو حافظ ابن حجرؒ نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ اُن میں سے کوئی الزام

(۱) تہذیب التہذیب ص ۲۶۶ ج ۷ ومفتاح السعادۃ ص ۴۱۰ ج ۱۔ (۲) تہذیب التہذیب حوالۂ بالا۔

(۳) دیکھئے مذاهب التفسیر الاسلامی از گولڈزیہر، ترجمہ عربی ڈاکٹر عبدالحلیم النجار ص ۹۵۔

(۴) هَدْیُ الساریؒ (مقدمہ فتح البلاری) للحافظ ابن حجرؒ ص ۱۹۲ ج ۲ فصل ۹ حرف العین۔

Marfat.com

اُن پر ثابت نہیں ہوا، اس سلسلے میں جتنے قصے اُن کی طرف منسوب ہیں، حافظ ابن حجرؒ نے ان میں سے ایک ایک کو نقل کر کے اس کی مدلّل تردید یا توجیہ کی ہے، مثلاً اُن پر جھوٹ کا جو الزام عائد کیا گیا ہے اس کا منشاء ایک غلط فہمی ہے، اور وہ یہ کہ بسا اوقات انہوں نے ایک حدیث دو آدمیوں سے سُنی ہوتی تھی، ایک موقع پر وہ ایک شخص سے روایت کرتے، پھر کوئی اُسی حدیث کے بارے میں پوچھتا تو دوسرے آدمی سے روایت کر دیتے، اس سے بعض لوگ یہ سمجھے کہ یہ حدیث گھڑتے ہیں، حالانکہ دونوں مرتبہ اُن کی روایت درست تھی، چنانچہ خود انہوں نے فرمایا ہے کہ:

أرأیت ھٰؤلاء الذین یکذبونی من خلفی ، افلا یکذبونی فی وجھی ؟

"بھلا یہ لوگ جو میرے پیٹھ پیچھے میری تکذیب کرتے ہیں میرے سامنے کیوں تکذیب نہیں کرتے؟"

مطلب یہ ہے کہ اگر وہ میرے سامنے تکذیب کریں تو میں اُن کو حقیقتِ حال سے آگاہ کردوں،

اِسی طرح اُن پر خارجی ہونے کا جو الزام لگایا گیا ہے اس کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ وہ کسی قابلِ اعتماد ذریعہ سے ثابت نہیں ہوا، البتہ ہوا یہ ہے کہ انہوں نے بعض جزوی (فقہی) مسائل میں ایسا مسلک اختیار کیا تھا جو خارجیوں کے مطابق تھا، اس سے بعض لوگوں نے انہیں خارجیت کی طرف منسوب کر دیا، چنانچہ امام عجلیؒ فرماتے ہیں:

عکرمۃ مولیٰ ابن عباس رضی اللّٰہ عنھما مکی تابعی ثقۃ بریئی مما یرمیہ بہ الناس بہ من الحروریۃ ،

"عکرمہ حضرت ابن عباسؓ کے مولیٰ ہیں، مکہ کے رہنے والے ہیں، ثقہ تابعی ہیں، اور لوگ اُن پر خارجیت کا جو الزام لگاتے ہیں اس سے بری ہیں"

Marfat.com

اور حافظ ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں:

"اگر ہر وہ شخص جس کی طرف غلط مذہب منسوب کر دیا گیا ہو اس نسبت کی وجہ سے ساقط العدالۃ قرار دیا جانے لگے تو اکثر محدثین کو چھوڑنا پڑیگا کیونکہ اُن میں سے تقریباً ہر ایک کی طرف ایسی باتیں منسوب ہیں جنہیں وہ پسند نہیں کرتے" (۱)

یہی وجہ ہے کہ تقریباً تمام ائمہ حدیث نے اُن سے روایات لی ہیں، امام بخاریؒ جو نقدِ رجال کے معاملے میں بہت سخت ہیں، اور جنہوں نے مشتبہ راویوں تک کو چھوڑ دیا ہے انہوں نے بھی اپنی صحیح میں اُن کی روایات نقل کی ہیں، امام مسلمؒ کی طرف منسوب ہے کہ وہ عکرمہؒ پر طعن کرتے تھے، لیکن انہوں نے بھی اپنی صحیح میں عکرمہؒ کی روایات مقروناً ذکر کی ہے، امام مالکؒ کی طرف بھی نسبت کی گئی ہے کہ وہ عکرمہؒ کو ناپسند کرتے تھے، لیکن خود انہوں نے موطا کی کتاب الحج میں عکرمہؒ کی روایت نقل کی ہے، (۲) امام محمد ابن سیرینؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اُن پر طعن کرتے تھے، لیکن خالد الحذاءؒ سے مروی ہے کہ:

"ہر وہ حدیث جس کے بارے میں محمد بن سیرینؒ یہ کہیں کہ ثبت عن ابن عباسؓ، یعنی ابن عباسؓ سے یہ ثابت ہے وہ انہوں نے عکرمہؒ سے سُنی ہوتی ہے، تاہم وہ اس لئے نہیں لیتے کہ وہ انہیں ذاتی طور پر ناپسند کرتے تھے۔" (۳)

غرض تحقیقی بات یہی ہے کہ عکرمہؒ کی روایات قابلِ قبول ہیں، اور اکثر ائمہ حدیث نے اُن کی روایات بے خوف و خطر ذکر کی ہیں

(۱) یہ تمام اقوال حافظ ابن حجرؒ نے نقل فرمائے ہیں، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ھدی الساری ، ص ۱۹۲ تا ۱۹۶ ج ۲ فصل نمبر ۹۔

(۲) التاریخ الکبیر للبخاریؒ، ص ۴۹ ج ۴ ترجمہ نمبر ۲۱۸۔

(۳) البدایة والنھایة ص ۲۴۵ ج ۹ وھدی الساری ، ص ۱۹۴ ج ۲۔

گولڈ زیہر کا ایک مغالطہ

آخر میں گولڈ زیہر کے ایک اور ضمنی مغالطہ کی نشاندہی مناسب ہوگی، اس نے یہ قصہ لکھا ہے کہ جب حضرت عکرمہؒ کی وفات ہوئی تو اُن کے جنازے میں شریک ہونے والے اتنے بھی نہیں تھے کہ اُن کا جنازہ اٹھانے کے لئے کافی ہوں، دوسری طرف اسی روز مشہور شاعر کثیر عزۃ کا انتقال ہوا تو اس کے جنازے میں قریشیوں کا ایک بڑا مجمع شریک تھا، اس سے گولڈ زیہر نے دو نتیجے نکالے ہیں، ایک یہ کہ اُس زمانے میں عام مسلمانوں کے دل میں ایک عوامی شاعر کا احترام حاملینِ سنت کے مقابلہ میں زیادہ تھا، اور دوسرے یہ کہ شرکاء جنازہ کی اس کمی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ لوگ ایک نسلی غلام کو مرنے کے بعد بھی ایک اصیل عرب کے مقابلے میں حقیر سمجھتے تھے،(۱)

لیکن گولڈ زیہر کی یہ خیال آفرینی اسی بغض وعناد پر مبنی ہے جسے ہر غیر تحقیقی بات کو قبول کر کے اس پر بے بنیاد خیالات کے محل تعمیر کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی، واقعہ یہ ہے کہ اوّل تو یہ قصہ ہی سرے سے غلط ہے کہ کثیر کے جنازے میں بڑا مجمع شریک ہوا اور حضرت عکرمہؒ کو چار اٹھانے والے بھی میسر نہ آئے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

والذی نقل انهم شهدوا جنازة كثیّر وتركوا عكرمة لم يثبت، لأن ناقاله لم يسمّ ،(۲)

"اور یہ جو منقول ہے کہ لوگ "کثیر" کے جنازے میں تو شریک ہوئے لیکن عکرمہؒ کو چھوڑ دیا، یہ بات ثابت نہیں، اس لئے کہ یہ قصہ ایک مجہول شخص نے بیان کیا ہے۔"

اور اگر بالفرض عکرمہؒ کے جنازے میں واقعۃً لوگ کم شریک ہوئے ہوں تب بھی جن حالات میں عکرمہؒ کی وفات ہوئی ہے اُن کے پیشِ نظر یہ کچھ بعید نہیں، کیونکہ تمام تواریخ میں

(۱) مذاهب التفسير الاسلامی، از گولڈ زیہر ص ۹۵ و ۹۶۔ (۲) تهذیب التهذیب ص ۲۷۳ ج ۷۔

Marfat.com

تصریح ہے کہ ایک عرصہ سے حکومت نے اُن کے خلاف گرفتاری کے احکام جاری کئے ہوئے تھے، جن کی بناء پر وہ روپوش ہو گئے تھے، اور اسی روپوشی کی حالات میں ان کا انتقال ہوا، ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں لوگوں کو ان کی وفات کا پورا علم نہ ہو سکا ہوگا، اس لئے اُن کے جنازے میں شرکت زیادہ نہ ہو سکی، اس سے یہ نتیجہ کون عقلمند نکال سکتا ہے کہ لوگوں کے دل میں اُن کا احترام ایک شاعر سے بھی کم تھا؟ بلکہ صحیح تاریخوں میں تو یہ منقول ہے کہ جب لوگوں کو ان کی اور کثیر کی وفات کا علم ہوا تو عام لوگوں کی زبانوں پر یہ جملہ تھا کہ:

مات أفقه الناس واشعر الناس ، (۱)

''آج سب سے بڑے فقیہ کا بھی انتقال ہو گیا، اور سب سے بڑے شاعر کا بھی۔''

پھر مستشرقین کا یہ اندازِ تحقیق بھی ملاحظہ فرمایئے کہ وہ ایک چھوٹے سے غیر مستند واقعے کی بنیاد پر کس ڈھٹائی کیساتھ بڑے بڑے عمومی نتائج نکال لیتے ہیں، سوال یہ ہے کہ عوام کے دلوں میں ''حاملینِ سنت'' کا احترام جانچنے کے لئے صرف ایک حضرت عکرمہؒ کا جنازہ ہی رہ گیا تھا؟ ان کے علاوہ جو لاکھوں ''حاملین سنت'' گزرے ہیں اُن کی زندگی اور وفات کے بے شمار واقعات سے اس مسئلہ پر کوئی روشنی نہیں پڑتی؟ اسی طرح غلام نسل کے علماء کے ساتھ عام لوگوں کا سلوک معلوم کرنے کے لئے بھی ایک یہی قصہ ان کو تاریخ میں مل سکا ہے؟ حضرت عکرمہؒ کے علاوہ جو ہزار ہا غلام علم حاصل کرنے کے بعد شہرت وعزت کے بام عروج تک پہنچے ہیں، اور خود حضرت عکرمہؒ کو اپنی زندگی میں جو عزت واحترام نصیب ہوا اُن واقعات سے اس موضوع پر کوئی رہنمائی نہیں ملتی؟ (۲)

حقیقت یہ ہے کہ کسی علمی کتاب میں مستشرقین کے اس قسم کے بے سروپا الزامات کا ذکر

---

(۱) البدایہ والنہایہ ص ۲۴۵ ج ۹۔

(۲) خود حضرت طاؤسؒ کے جنازے کا حال آگے آرہا ہے، نیز آگے جن ''حاملینِ سنت'' کے حالات آرہے ہیں، اُن میں سے بیشتر غلام تھے۔

Marfat.com

کرتے ہوئے بھی جی متلاتا ہے، لیکن یہ بات اس لئے ذکر کردی گئی کہ اُن حضرات کا معیارِ تحقیق اور اندازِ فکر ونظر بھی قارئین کے سامنے آجائے جو ''تحقیق'' کے نام پر اپنے بغض وحسد کے جذبات ٹھنڈے کرنے میں مصروف ہیں،

۴......حضرت طاؤسؒ

اُن کا پورا نام ابوعبدالرحمٰن طاؤس بن کیسان الحمیری الجندی ہے، یہ یمن کے شہر جند کے باشندے تھے، اور یہ بھی غلام تھے، انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت زید بن ارقمؓ، اور دوسرے متعدد صحابہؓ سے علم حاصل کیا تھا، لیکن حضرت عائشہؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ اور خلفائے راشدینؓ سے اُن کی روایات مُرسل ہیں، یہ اپنے زمانے میں علم وفضل کے علاوہ عبادت وزہد میں بھی بہت مشہور تھے، انہوں نے چالیس حج کئے ہیں، امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ ''اگر تم طاؤس'' کو دیکھتے تو یقین کرلیتے کہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتے۔'' عمرو بن دینارؒ کا قول ہے کہ ''میں نے لوگوں کے مال ودولت کے معاملے میں طاؤسؒ سے زیادہ سیر چشم کوئی نہیں دیکھا'' (۱)

علّامہ نوویؒ لکھتے ہیں ''اُن کی جلالتِ قدر، اُن کی فضیلت، وفورِ علم، صلاح وتقویٰ، قوتِ حافظہ، اور احتیاط پر علماء کا اتفاق ہے'' (۲) حافظ ابونعیم اصفہانیؒ نے حلیۃ الاولیاء میں اُن کے صلاح وتقویٰ کے واقعات اور ملفوظات تفصیل سے ذکر کئے ہیں، ۱۰۵ھ میں منیٰ یا مزدلفہ میں اُن کی وفات ہوئی، جنازے میں ارکانِ حکومت سے لے کر علماء وصلحاء تک ہر طبقے کے افراد شریک تھے، یہاں تک کہ ہجوم کی وجہ سے خلیفہ کو پولیس بھیجنی پڑی، حضرت عبداللہ بن الحسن بن علی بن ابی طالبؒ نے ان کا جنازہ مسلسل اپنے کاندھے پر اٹھائے رکھا، یہاں تک کہ اُن کی ٹوپی گر گئی اور چادر پھٹ گئی، (۳)

---

(۱) یہاں تک کے تمام اقوال تھذیب التھذیب، ص۹ و ۱۰ ج ۵ سے ماخوذ ہیں۔

(۲) تھذیب الاسماء، ص۲۵۱ ج ا ترجمہ نمبر ۲۶۹۔ (۳) حلیۃ الاولیاء، ص۳ ج۴ ترجمہ نمبر ۲۴۹۔

۵......حضرت عطاء بن ابی رباح

تابعین کے دَور میں عطاء نام کے چار بزرگ بہت مشہور ہیں، عطاء بن ابی رباح، عطاء بن یسارؒ، عطاء بن السائبؒ، اور عطاء الخراسانی،ان میں سے پہلے دو باتفاق ثقہ ہیں، اور آخری دو کے بارے میں کچھ کلام ہوا ہے،لیکن دینی علوم کی کتابوں میں صرف عطاء لکھا جاتا ہے تو عموماً عطاء بن ابی رباح ہی مراد ہوتے ہیں حضرت عطاء بن ابی رباح کا پورا نام ابومحمد عطاء بن ابی رباح المکی القریشی ہے، یہ ابن خثیم القریشی کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) تھے، حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری دور میں ولادت ہوئی، اور ۱۱۴ھ میں وفات پائی، انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت عائشہؓ اور دوسرے صحابہؓ وتابعینؒ سے علم حاصل کیا، اور خاص طور پر علم فقہ میں بہت مشہور ہوئے، کہا جاتا ہے کہ اپنے زمانے میں مناسک حج کے سب سے بڑے عالم تھے،(۱) عبادت وزہد میں نہایت معروف تھے، ابن جریجؒ کہتے ہیں کہ "بیس سال تک مسجد کا فرش اُن کا بستر رہا ہے" محمد بن عبداللہ الدیباجؒ کہتے ہیں کہ "میں نے کوئی مفتی عطاءؒ سے بہتر نہیں دیکھا، اُن کی مجلس مسلسل ذکر اللہ سے معمور رہتی تھی، جس کا سلسلہ ٹوٹتا نہیں تھا، اسی دوران اُن سے (فقہی) سوال کیا جاتا تو بہترین جواب دیتے۔"(۲)

البتہ حضرت عطاء بن ابی رباحؒ جن صحابہؓ سے روایت کرتے ہیں اُن سب سے ان کا سماع ثابت نہیں ہے یہاں تک کہ حضرت ابن عمرؓ جن سے وہ بکثرت روایات نقل کرتے ہیں اُن سے بھی اُن کا بلاواسطہ سماع نہیں ہے، اسی طرح حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت زید بن خالدؓ، حضرت اُم سلمہؓ، حضرت اُمّ ہانیؓ، حضرت ام کرزؓ حضرت رافع بن خدیجؓ، حضرت اُسامہؓ، حضرت جبیر بن مطعمؓ، حضرت ابوالدرداءؓ، اور حضرت فضل بن عباسؓ سے بھی انہوں نے بلاواسطہ روایات نہیں سُنیں، لہٰذا ان تمام حضرات سے اُن کی بلاواسطہ روایتیں مرسل ہیں،

(۱) تہذیب الاسماء، ص۳۳۳،۳۳۴ ج۱ ترجمہ نمبر ۴۰۹۔
(۲) تذکرۃ الحفاظ للذہبیؒ ص۹۲ ج۱۔

Marfat.com

اور امام احمدؒ وغیرہ اُن کی مراسیل کو "اضعف المراسیل" (سب سے کمزور مراسیل) کہتے ہیں، کیونکہ وہ ہر کس و ناکس سے روایات لے لیتے تھے، (۱)

۶......حضرت سعید بن المسیبؒ

آپ کا پورا نام سعید بن المسیب (۲) بن حزن القرشی المخزومی ہے، آپ حضرت ابو ہریرہؓ کے داماد تھے، اس لئے حضرت ابو ہریرہؓ کی بہت سی روایات آپ ہی سے مروی ہیں، عبادت و زہد کا حال یہ تھا کہ چالیس سال تک کوئی اذان ایسی نہیں ہوئی جو انہوں نے مسجد میں نہ سنی ہو، (۳) مسلسل روزے رکھتے تھے، اور عمر میں چالیس مرتبہ حج کیا ہے، کبھی کسی امیر کا کوئی انعام قبول نہیں کیا، گذر بسر تیل وغیرہ کی تجارت پر تھی، امام مالکؒ نے ان کا قول روایت کیا ہے کہ "میں بعض اوقات صرف ایک حدیث کی طلب میں کئی کئی دن رات سفر کیا کرتا تھا، (۴) آپ کی ولادت حضرت عمرؓ کی خلافت کے تیسرے سال ہوئی، اس لئے آپ نے بہت سے صحابۂ کرام سے احادیث سُنی ہیں، جن حضرات صحابہؓ سے انہوں نے براہ راست احادیث نہیں سُنیں اُن کو یہ بکثرت بلا واسطہ (مرسلاً) روایت کرتے ہیں، لیکن اُن کی مراسیل بہت سے ایسے علماء کے نزدیک بھی مقبول ہیں، جو مرسل کو حجت نہیں مانتے، مثلاً امام شافعیؒ مرسل کو قابلِ استدلال نہیں سمجھتے، لیکن فرماتے ہیں کہ ارسال ابن المسیب عندنا حسن (ابن مسیّب کی مرسل روایات ہمارے نزدیک حسن ہیں) اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہمیشہ ثقہ راویوں ہی سے روایات نقل کرتے تھے، غیر ثقہ راویوں کی روایات بیان نہیں فرماتے تھے، (۵)

لیکن امام نوویؒ نے اس خیال کی تردید فرمائی ہے، کہ شافعیہ کے نزدیک اُن کی مراسیل علی

---

(۱) تہذیب التہذیب ص ۲۰۲ و ۲۰۳ ج ۷۔

(۲) مسیّبؒ میں یا پر زبر اور زیر دونوں پڑھے جاسکتے ہیں، زبر کے ساتھ زیادہ مشہور ہیں، لیکن مروی ہے کہ حضرت سعید خود یا پر زبر پڑھنا پسند نہ کرتے تھے، کیونکہ اہلِ مدینہ میں عام رواج زیر کے ساتھ پڑھنے کا تھا، (تہذیب الاسماء للنووی ص ۲۱۹ ج ۱۔)

(۳) ایضاً ص ۸۷ ج ۴۔

(۴) تذکرۃ الحفاظ ص ۵۱ و ۵۲ ج ۱۔

(۵) تہذیب التہذیب ص ۸۵ تا ۸۷ ج ۴۔

Marfat.com

الاطلاق قابلِ قبول ہیں، اس کے بجائے وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اُن کی مرسلات کا حکم بھی وہی ہے جو دوسرے کبار تابعین کی مرسلات کا ہے، یعنی اگر کسی مسند روایت سے یا کسی اور مرسل سے یا بعض صحابہ کے اقوال سے یا صحابہ کے بعد اکثر فقہاء کے اقوال سے اس کی تائید ہو جائے تو اسے قبول کیا جائے گا ورنہ نہیں (۱) بہرکیف! یہ گفتگو امام شافعی کے مسلک پر ہے، حنفیہ کے نزدیک اُن کی مراسیل علی الاطلاق قابلِ اعتماد ہیں، آپ کی سن وفات کے بارے میں ۹۱ھ سے لیکر ۱۰۵ھ تک مختلف اقوال ہیں،

۷...... محمد بن سیرین

آپ کا پورا نام ابوبکر محمد بن سیرینؒ ہے، آپ کے والد سیرین حضرت انسؓ کے آزاد کردہ غلام تھے، اور آپ کی والدہ صفیہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی آزاد کردہ کنیز تھیں، جب یہ حضرت ابوبکرؓ کی ملکیت میں آئیں تو تین ازواج مطہراتؓ نے اُن کو خوشبو لگائی، اور اس تقریب میں اٹھارہ بدری صحابہؓ شریک ہوئے جن میں حضرت اُبی بن کعبؓ بھی شریک تھے، جنہوں نے دعاء کرائی اور باقی صحابہ نے آمین کہی، حضرت سیرینؒ کی اولاد میں چھ افراد محمد، معبد، انس، یحیٰ، حفصہ اور کریمہ معروف ہیں، اور چھ کے چھ حدیث کے ثقہ راوی ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور اور جلیل القدر صاحبزادے حضرت محمد بن سیرینؒ ہیں، جن کے عجیب وغریب حالات مستقل تصنیف چاہتے ہیں، آپ کا ورع وتقویٰ ضرب المثل ہے، حضرت ہشام بن حسانؒ کہتے ہیں کہ ''ہم ابن سیرین کے گھر میں مقیم رہے تو ہم دن کے وقت ان کے ہنسنے کی آوازیں سنتے تھے (کیونکہ آپ شگفتہ مزاج اور ظریف بزرگ تھے) اور رات کے وقت اُن کے رونے کی۔'' ورع وتقویٰ ہی کی بناء پر آپ نے قید وبند کی صعوبتیں بھی اٹھائیں، اسی گرفتاری کے دوران قید خانے کے دربان نے اُن کو پیش کش کی، کہ آپ روزانہ رات کو اپنے گھر چلے جایا کریں اور صبح کو واپس آجایا کریں، لیکن انہوں نے جواب دیا: ''نہیں! خدا کی قسم، میں سلطان

(۱) تہذیب الاسماء ص ۸۲ ج ۱ ومقدمۃ المجموع شرح المہذب ص ۱۰۰ ج ۱ مطبعۃ العاصمۃ قاہرہ۔

Marfat.com

کی خیانت پر تمہاری اعانت نہیں کروں گا" (۱)

اسی گرفتاری کے دوران مشہور صحابی اور ان کے والد کے آقا حضرت انسؓ کا انتقال ہو گیا، انہوں نے وصیت کی تھی کہ محمد بن سیرینؒ مجھے غسل دیں، لوگ اُن کے پاس آئے اور اس وصیت کا ذکر کیا، تو انہوں نے فرمایا کہ "میں قید میں ہوں" لوگوں نے کہا کہ: ہم نے امیر سے اجازت لے لی ہے" حضرت محمد بن سیرینؒ نے جواب دیا کہ "مجھے قید کرنے والا امیر نہیں بلکہ وہ شخص ہے جس کا حق مجھ پر واجب ہے" چنانچہ لوگوں نے اس شخص سے اجازت لی، تب انہوں نے جا کر حضرت انسؓ کو غسل دیا، (۲)

بہر حال! حضرت محمد بن سیرینؒ مسلّم طور پر تفسیر، حدیث اور فقہ کے امام ہیں، صحابہؓ میں سے حضرت انسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عمران بن حصینؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، اور حضرت زید بن ثابتؓ سے ان کا سماع ثابت ہے، جن صحابہؓ سے ان کا سماع نہیں ہے اُن سے بھی یہ بلاواسطہ (مرسلاً) روایت کرتے ہیں، لیکن ان کی مراسیل بہت سے وہ حضرات بھی قبول کرتے ہیں جو مرسل کو حجت نہیں مانتے، مثلاً علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

> ومحمد بن سيرين من اورع الناس في منطقه مراسيلة من اصح المراسيل، (۳)
>
> "محمد بن سیرینؒ اپنی گفتگو میں محتاط ترین انسان ہیں اور ان کی مراسیل صحیح ترین مراسیل میں سے ہیں"

آپ کی وفات بصرہ میں ۹/ شوال ۱۱۰ھ کو ئی، (۴)

۸......حضرت زید بن اسلمؒ

ان کا پورا نام ابوعبداللہ زید بن اسلم العمری (متوفی ۱۳۶ھ) ہے، یہ مدینہ طیبہ کے

(۱) یہاں تک کے تمام حالات تہذیب الاسماء واللغات ص ۸۳ و ۸۴ ج ۱ سے ماخوذ ہیں۔
(۲) حلیۃ الاولیاء لابی نعیم ص ۲۶۷ ج ۲۔ (۳) منہاج السنۃ ص ۸۶ ج ۳۔
(۴) تہذیب التہذیب ص ۲۱۶ ج ۹۔

Marfat.com

باشندے ہیں، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام تھے، انہوں نے حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت جابرؓ، حضرت انسؓ اور حضرت سلمہ بن الاکوعؓ وغیرہ سے روایات نقل کی ہیں، یہ علم تفسیر کے بڑے عالم تھے، اور باتفاق ثقہ ہیں، مسجد نبویؐ میں اُن کا حلقۂ درس ہوتا تھا، اور ان کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ ان کے صاحبزادے عبدالرحمٰنؒ فرماتے ہیں کہ میرے والد کبھی مجھے اپنے کسی شاگرد کے پاس بھیجتے تو وہ میرے سر کو بوسہ دے کر فرماتے: ''خدا کی قسم! تمہارے والد ہمیں اپنے اہل وعیال سے زیادہ محبوب ہیں، اور اگر ہمیں یہ خبر دی جائے کہ یا ہمارے اہل وعیال کو موت آئے گی یا زید بن اسلمؒ کو اور ہمیں یہ اختیار ملے کہ جس کی موت کو چاہیں اختیار کرلیں تو ہماری خواہش یہ ہوگی کہ زید بن اسلمؒ زندہ رہیں'' (۱)

حضرت ابوحازمؒ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت زید بن اسلمؒ کی مجلس میں چالیس فقہاء کے ساتھ رہتے تھے، ہم سب کی ادنیٰ خصلت یہ تھی کہ اپنی املاک سے ایک دوسرے کی غمخواری کرتے تھے اور اس مجلس میں مجھے کبھی دو آدمی بھی ایسے نظر نہیں آئے جو کسی بے فائدہ گفتگو پر بحث یا جھگڑا کر رہے ہوں، (۲)

حضرت زید بن اسلمؒ کو عموماً ثقہ قرار دیا گیا ہے، البتہ عبیداللہؒ بن عمرؓ فرماتے ہیں: ''مجھے ان میں کسی خرابی کا علم نہیں، البتہ وہ قرآن کریم کی تفسیر بکثرت اپنی رائے سے کرتے ہیں۔'' اور سفیان بن عیینہؒ کا قول ہے کہ: ''زید بن اسلمؒ صالح آدمی تھے، لیکن ان کے حافظہ میں کچھ نقص تھا'' (تہذیب التہذیب) ان دو حضرات کے علاوہ کسی اور سے اُن پر جرح نظر سے نہیں گزری،

حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت زید بن اسلمؒ کی ایک تفسیر تھی جسے اُن کے صاحبزادے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلمؒ روایت کرتے تھے، (۳) لیکن واضح رہے کہ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلمؒ اپنے صلاح وتقویٰ کے باوجود ضعیف ہیں، اور اکثر محدثین نے اُن کی روایات کو ناقابلِ اعتبار کہا ہے، (۴) لہٰذا حضرت زید بن اسلمؒ کی جو تفسیری روایات ان کے صاحبزادے عبدالرحمٰن سے

(۱) تہذیب التہذیب مع حاشیہ ص ۳۹۵ و ۳۹۶ ج ۳۔ (۲) تہذیب الاسماء، ص ۲۰۰ ج ۱۔

(۳) تذکرۃ الحفاظ ص ۱۲۵ ج ۱ ترجمہ نمبر ۲۳۔ (۴) ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ص ۱۷۸ و ۱۷۹۔

Marfat.com

مروی ہیں وہ پوری طرح قابلِ اعتماد نہیں ہیں، ان کے صاحبزادے کا حال آگے آرہا ہے،

۹......حضرت ابوالعالیہؒ

ان کا پورا نام ابوالعالیہ رفیع (بروزنِ زُبَیر) بن مہران الریاحی ہے یہ بصرہ کے باشندے ہیں، زمانۂ جاہلیت میں پیدا ہوچکے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دو سال بعد مسلمان ہوئے، حضرت ابوبکرؓ سے ملاقات کی ہے، اور صحابہؓ میں سے حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابوموسیٰؓ، حضرت ابوایوبؓ اور حضرت ابوبرزہؓ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں، قرآن کریم کے بہترین قاری تھے، یہ بھی بنی رباح کی ایک عورت کے آزاد کردہ غلام تھے، (۱) لیکن حضرت ابن عباسؓ ان کو اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھاتے تھے، جبکہ دوسرے قریشی لوگ نیچے بیٹھے ہوتے، اور فرماتے تھے: "علم اسی طرح انسان کے شرف میں اضافہ کرتا ہے" (۲) ان کے ثقہ ہونے پر علماء کا اتفاق ہے ۹۳ھ میں وفات ہوئی، (۳) ماوراء النہر کے علاقہ میں سب سے پہلے اذان دینے والے یہی تھے، (۴)

۱۰......حضرت عروہ بن الزبیرؒ

آپ حضرت زبیر بن عوامؓ کے صاحبزادے ہیں، مدینہ طیبہ کے مشہور فقہاءِ سبعہ میں سے ہیں، حضرت عائشہؓ کے بھانجے ہیں، اس لئے حضرت عائشہؓ سے انہوں نے بہت سی احادیث روایت کی ہیں، اور حضرت عائشہؓ کی روایات میں اُن کو سب سے زیادہ ثقہ قرار دیا گیا ہے، اُن کی جلالتِ قدر، علم وفضل، اور وثاقت پر اجماع ہے، (۵) ان کے صاحبزادے ہشامؒ فرماتے ہیں کہ میرے والد ہمیشہ روزے رکھتے تھے، اور روزے ہی کی حالت میں (۹۴ھ میں) وفات پائی،

---

(۱) تہذیب الاسماء ص۲۵۱ ج۲۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ص۵۸ ج۱ ترجمہ نمبر ۵۰۔

(۳) تہذیب التہذیب ص۲۸۴ ج۳۔ (۴) حلیۃ الاولیاء ص۲۲۱ ج۲۔

(۵) تہذیب الاسماء ص۳۳۱ و ۳۳۲ ترجمہ نمبر ۴۰۵۔

Marfat.com

ابن شوذبؒ کہتے ہیں کہ ''عروہؒ ہر روز چوتھائی قرآن کی تلاوت کرتے تھے، اور رات کو تہجد میں بھی قرآن پڑھتے تھے، یہ معمول ساری عمر میں صرف اُس رات قضا ہوا جس رات میں آپ کی ٹانگ (ایک بیماری کی وجہ سے) کاٹی گئی، (۱)

۱۱...... حضرت حسن بصریؒ

آپ کا پورا نام ابوسعید الحسن بن ابی الحسن یسار البصریؒ ہے، آپ حضرت زید بن ثابتؓ کے (اور بعض حضرات کے قول کے مطابق جمیل بن قطبہ کے) آزاد کردہ غلام تھے، اور آپ کی والدہ خیرہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی آزاد کردہ کنیز تھیں، چنانچہ کبھی کبھی آپ نے حضرت ام سلمہؓ کا دودھ بھی پیا ہے، آپ کی ولادت حضرت عمرؓ کی شہادت سے دو سال پہلے ہوئی، اور آپ نے بہت سے صحابہؓ کی زیارت بھی کی اور ان سے علم بھی حاصل کیا، علم و فضل کے اعتبار سے آپ کی جلالتِ قدر مسلّم ہے، اور آپ کی عبادت و زہد اور پُر حکمت ملفوظات مشہور ہیں، اس کے ساتھ ہی آپ نہایت بہادر مجاہد بھی تھے، متعدد جنگوں میں شریک ہوئے، (۲) اور حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں خراسان کے گورنر ربیع بن زیاد کے کاتب بھی رہے ہیں،

آپ نے بہت سی احادیث مرسلاً روایت کی ہیں، (یعنی جن صحابی سے آپ نے وہ حدیث سنی تھی ان کا واسطہ ذکر نہیں کیا) ایسی احادیث کے بارے میں محدثین کے درمیان شدید اختلاف رہا ہے، کہ وہ قابلِ قبول ہیں یا نہیں، بعض حضرات انہیں قبول کرتے ہیں اور بعض حضرات انہیں ضعیف قرار دیتے ہیں، امام ابن المدینیؒ فرماتے ہیں کہ: ''حسنؒ کی مرسلات اگر ثقہ راویوں سے مروی ہوں تو وہ صحیح ہیں اور بہت کم ساقط الاعتبار ہیں۔'' اور امام ابوزرعہؒ کا قول ہے کہ ''وہ تمام احادیث جو حسن بصریؒ نے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر (بلاواسطہ) روایت کی ہیں میں نے تحقیق سے اُن کو ثابت پایا، سوائے چار احادیث کے (جن

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ص ۵۹ ج ۱ ترجمہ ۵۱۔ (۲) تہذیب الاسماء ص ۱۶۱ ج ۱ ترجمہ نمبر ۱۲۲۔

Marfat.com

کی بنیاد مجھے نہیں ملی) لیکن امام احمدؒ نے اُن کی اور حضرت عطاء کی مراسیل کو "اضعف المراسیل" (کمزور ترین مراسیل) کہا ہے، (۱) آپ کی وفات ۱۱۰ھ میں ہوئی،

۱۲......حضرت قتادہؒ

آپ کا پورا نام ابوالخطاب قتادہ بن دِعامہ (بکسر الدال) السدوسی البصری ہے، آپ مادر زاد نابینا تھے، اس کے باوجود قوتِ حافظہ کا عالم یہ تھا کہ خود فرماتے ہیں: "میں نے کبھی کسی محدث سے حدیث کو دوبارہ سُنانے کی فرمائش نہیں کی، اور میرے کانوں نے کوئی ایسی بات نہیں سُنی جسے میرے دل نے یاد نہ کرلیا ہو" نیز فرماتے ہیں "قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں میں نے کچھ نہ کچھ (یعنی کوئی نہ کوئی روایت) سُن نہ رکھی ہو" امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ "قتادہؒ تفسیر کے زیادہ بڑے عالم ہیں" اس کے علاوہ اُن کو عربی لغت وادب اور تاریخ وانساب میں بھی بڑا درک حاصل تھا، البتہ محدثین نے فرمایا ہے کہ بعض اوقات روایات میں تدلیس کیا کرتے تھے، آپ کا انتقال ۱۱۸ھ میں طاعون کی وباء سے شہر واسط میں ہوا، (۲)

۱۳......محمد بن کعب القرظیؒ

آپ کا نام محمد بن کعب بن سلیم بن اسد القرظی ہے، کنیت ابوحمزہ یا ابوعبداللہ ہے، آپ کے والد بنو قریظہ میں سے تھے، اور غزوہ بنو قریظہ کے وقت نابالغ ہونے کی بناء پر انہیں امان دی گئی تھی، کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد بن کعب قرظیؒ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی میں پیدا ہو چکے تھے،

آپ نے حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت جابرؓ، حضرت انسؓ، حضرت براء بن عاذبؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت کعب

---

(۱) تہذیب التہذیب ص ۲۰۲ ج ۳ ترجمۂ عطاء بن ابی رباح ابن المدینیؒ اور ابوزرعہؒ کے اقوال نیز اس مسئلہ پر مفصل بحث کے لئے ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ص ۲۶۶ تا ۲۷۰ ج ۲۔

(۲) یہ تمام باتیں تذکرۃ الحفاظ ص ۱۱۵ تا ۱۱۷ طبقہ نمبر ۴ ترجمہ نمبر ۱۲ سے ماخوذ ہیں۔

بن عجرۃؓ، حضرت زید بن ارقمؓ، حضرت مغیرہ ابن شعبہؓ، حضرت عبداللہ بن جعفرؓ اور دوسرے بہت سے صحابہؓ سے روایات نقل کی ہیں،

امام ابن سعدؒ فرماتے ہیں ''ثقہ اور کثیر الحدیث عالم تھے۔'' امام عجلیؒ کا قول ہے کہ ''ثقہ اور صالح ہیں اور قرآن کریم کے عالم ہیں'' عون بن عبداللہؒ کہتے ہیں کہ: ''میں نے تفسیر قرآن کا اُن سے بڑا عالم نہیں دیکھا'' (۱) علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ: ''ان کے ثقہ ہونے پر اتفاق ہے۔''

آپ شروع میں کوفہ میں مقیم ہو گئے تھے، بعد میں پھر مدینہ طیبہ واپس آ گئے ۱۰۸ھ اور ۱۲۰ھ کے درمیان وفات پائی، (۲)

۱۴...... حضرت علقمہؒ

آپ کا پورا نام ابو شُبیل علقمہ بن قیس بن عبداللہ النخعی ہے، آپ کوفہ کے باشندے ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ہی پیدا ہو چکے تھے، یوں تو آپ نے بہت سے صحابہ سے احادیث روایت کی ہیں، لیکن آپ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے خاص شاگرد تھے، یہاں تک کہ صورت و سیرت میں بھی اُن سے مشابہ تھے، اس لئے حضرت ابن مسعودؓ کی روایات کے معاملہ میں آپ پر اور حضرت اسودؒ پر بطورِ خاص اعتماد کیا جاتا ہے، نہایت خوش الحان قاری تھے، اور حضرت ابن مسعودؓ آپ کو بُلا کر آپ سے قرآن کریم سُنا کرتے تھے، ایک مرتبہ ایک رات میں آپ نے پورا قرآن ختم کر لیا، باتفاق ثقہ ہیں، اور خاص طور سے علم فقہ میں آپ کا مقام بہت بلند ہے، آپ کی وفات کے بارے میں ۶۲ھ سے لے کر ۷۳ھ تک مختلف اقوال ملتے ہیں، (۳) آپ انتہائی متواضع بزرگ تھے، اپنے گھریلو کاموں میں مشغول رہتے تھے، اور اپنا باقاعدہ حلقۂ درس بنانا پسند نہیں کرتے تھے، فرماتے تھے کہ ''مجھے یہ بات پسند نہیں کہ لوگ میرے پیچھے پیچھے چلیں اور ایک دوسرے سے کہیں کہ یہ علقمہ ہیں'' آپ نے اپنے

(۱) تہذیب التہذیب ص ۴۲۰ تا ۴۲۲ ج ۹۔ (۲) تہذیب الاسماء، ص ۹۰ ج ۱۔
(۳) تہذیب التہذیب ص ۲۷۸ ج ۷۔

Marfat.com

مکان کے علاوہ صرف ایک قرآن کریم کا نسخہ اور ایک گھوڑا ورثہ میں چھوڑا،(۱)

۱۵......حضرت اسودؒ

آپ کا پورا نام ابوعمر واسود بن یزید بن قیس النخعیؒ ہے، آپ بھی کوفہ کے باشندے ہیں، اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے خاص شاگرد ہیں، حضرت علقمہؒ کے بھتیجے اور حضرت ابراہیم نخعیؒ کے ماموں ہیں، علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ: "آپ کی وثاقت اور جلالتِ قدر پر اتفاق ہے" عبادت وزہد میں بہت مشہور ہیں، کہا جاتا ہے کہ آپ نے عمر میں اسّی مرتبہ حج یا عمرے کے لئے حَرمین کا سفر کیا ہے، آپ کے صاحبزادے عبدالرحمٰنؒ سات سو رکعتیں روزانہ پڑھتے تھے، اس کے باوجود کہا جاتا تھا کہ وہ حضرت اسودؒ کے گھر والوں میں (عبادت کے اندر) سب سے کم محنت کرتے ہیں،(۲)

حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ: "حضرت اسودؒ رمضان میں دو راتوں کے اندر قرآن مجید ختم کر لیتے تھے اور مغرب اور عشاء کے درمیان سوتے تھے، اور رمضان کے علاوہ چھ راتوں میں قرآن ختم کرتے تھے" روزے اتنی کثرت سے رکھتے تھے کہ جسم نیلا پیلا ہو جاتا، حضرت علقمہؒ اُن سے کہتے کہ "اپنے جسم کو اتنی تکلیف کیوں دیتے ہو؟" تو جواب میں فرماتے کہ "اسی جسم کی (اخروی) راحت چاہتا ہوں" اور کبھی جواب میں فرماتے: "ابوشبل! (آخرت کا) معاملہ بڑا سنگین ہے،(۳) ۷۵ھ کے لگ بھگ آپ کی وفات ہوئی،

۱۶......مرۃ الہمدانیؒ

آپ کا پورا نام ابواسمٰعیل مرّۃ بن شراحیل الہمدانی السکسکی الکوفی ہے، اور آپ اپنے زمانے میں "مرۃ الطیب" اور "مرۃ الخیر" کے القاب سے معروف تھے، یوں تو آپ مخضرمین (۴)

(۱) حلیۃ الاولیاء لأبی نعیمؒ، ص۱۰۰ ج۲۔
(۲) تذکرۃ الحفاظ ص۴۸ ج۱ وتہذیب الاسماء، ص۱۲۲ ج۱۔
(۳) حلیۃ الاولیاء ص۱۰۳ و۱۰۴ ج۲ ترجمہ نمبر ۱۶۵۔
(۴) مخضرمین ان حضرات کو کہتے ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا لیکن زیارت نہیں کی۔

میں سے ہیں، اس لئے بہت سے صحابہؓ سے روایت کرتے ہیں، مثلاً حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت حذیفہؓ، حضرت ابوذرؓ وغیرہ، لیکن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے زیادہ علم حاصل کیا ہے چنانچہ تفسیر کی کتابوں میں حضرت ابن مسعودؓ کی تفسیری روایات ان سے بکثرت مروی ہیں، باتفاق ثقہ ہیں آپ کی کثرتِ عبادت کا حال یہ تھا کہ مورخین لکھتے ہیں ''آپ نے اتنے سجدے کئے ہیں کہ مٹی آپ کی پیشانی کو کھا گئی تھی'' اور آپ کی یومیہ رکعات کی تعداد بعض حضرات نے پانچ سو اور بعض نے چھ سو بتائی ہے، (۱) حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں: ''آپ تفسیر میں صاحب بصیرت تھے، تقریباً ۹۰ھ میں وفات پائی'' (۲) لیکن واضح رہے کہ کتبِ تفسیر میں آپ کی تفاسیر بکثرت سدّی سے مروی ہیں، جن کا حال ''ضعفاء'' کے عنوان کے تحت آگے آرہا ہے،

۱۷......حضرت نافعؒ

آپ کا پورا نام ابوعبداللہ نافع بن ہرمز ہے، اور بعض حضرات نے نافع بن کاوس بتایا ہے، آپ نیشاپور کے باشندے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام تھے، آپ جلیل القدر تابعی ہیں، آپ نے حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت ابولبابہؓ، حضرت رافع بن خدیجؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ سے علم حاصل کیا، حضرت ابن عمرؓ کے شاگردوں میں دو حضرات کو سب سے زیادہ قابلِ اعتماد قرار دیا گیا ہے، ایک حضرت ابن عمرؓ کے صاحبزادے سالم بن عبداللہؒ اور دوسرے اُن کے غلام نافعؒ، علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ ''ان کی جلالتِ قدر اور توثیق پر اجماع ہے، اور امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ''تمام اسانید میں سب سے زیادہ صحیح سند مالک عن نافع عن ابن عمرؓ ہے'' (۳) خود حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں: ''لقد من اللّٰہ تعالیٰ علینا بنافع'' (اللہ تعالیٰ نے نافعؒ کے ذریعہ ہم پر بڑا احسان فرمایا ہے) حافظ

(۱) تهذيب التهذيب، ص ۸۸ ج ۱۰ (۲) تذكرة الحفاظ ص ۶۳ ج ۱۔

(۳) تهذيب الاسماء، ص ۱۲۳ و ۱۲۴ ج ۲ ترجمہ نمبر ۱۸۷۔

Marfat.com

ابن حجرؒ لکھتے ہیں " لایعرف لہ خطأ فی جمیع مارواہ " (جتنی احادیث انہوں نے روایت کی ہیں ان میں کوئی غلطی دریافت نہیں ہوئی) (۱) امام مالکؒ حضرت نافعؒ کے خاص شاگرد ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آپ بہت متواضع بزرگ تھے، عموماً ایک سیاہ چادر اوڑھتے تھے اور بہت کم گفتگو کرتے تھے، حضرت نافعؒ خود فرماتے ہیں کہ "میں نے حضرت ابن عمرؓ کی تیس سال خدمت کی، اس کے بعد ابن عامرؒ نے انہیں پیشکش کی کہ وہ مجھے تیس ہزار درہم میں اُن کے ہاتھ فروخت کردیں، حضرت ابن عمرؓ نے مجھ سے فرمایا مجھے خطرہ ہے کہ کہیں ابن عامر کے دراہم مجھے فتنہ میں بتلا نہ کردیں، جاؤ تم آزاد ہو، ۱۱۷ھ میں آپ کی وفات ہوئی، (۲)

۱۸...... حضرت شعبیؒ

آپ کا پورا نام ابوعمرو عامر بن شراحیل الشعبی الحمیری ہے، آپ کوفہ کے مشہور فقہاء تابعین میں سے ہیں، تقریباً پانچ سو صحابہ کی زیارت کی ہے، حافظہ غیر معمولی طور پر قوی تھا، کبھی عمر بھر احادیث لکھ کر یاد نہیں کیں، فرماتے تھے کہ جو شخص مجھے کوئی بات سُناتا ہے مجھے فوراً یاد ہوجاتی ہے" انہی کا قول ہے کہ " مجھے سب سے کم جو چیز یاد ہے وہ اشعار ہیں، اس کے باوجود اگر میں چاہوں تو مہینہ بھر تک شعر سُناتا رہوں، اور کوئی شعر مکرر نہ ہو۔" آپ امام ابوحنیفہؒ کے خاص اساتذہ میں سے ہیں اور آپ کی جلالتِ قدر پر اتفاق ہے، امام احمدؒ اور امام عجلیؒ فرماتے ہیں کہ اُن کی مراسیل بھی صحیح ہیں، کیونکہ وہ صرف صحیح روایات ہی کو مرسلاً روایت کرتے ہیں، (۳)

۱۹...... حضرت ابن ابی ملیکہؒ

آپ کا پورا نام ابومحمد عبداللہ بن عبیداللہ بن ابی ملیکۃ التمیمی المکی ہے، آپ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے عہدِ خلافت میں مکہ مکرمہ کے قاضی اور مسجد حرام کے مؤذن تھے، بعد میں حضرت ابن زبیرؓ نے آپ کو طائف کا قاضی بنادیا تھا آپ نے بہت سے صحابہؓ سے احادیث

(۱) تہذیب التہذیب ص ۴۱۳ تا ۴۱۵ ج ۱۰۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ص ۹۴ ج ۱۔

(۳) ایضاً ص ۷۴ تا ۸۲، ج ۱۔

روایت کی ہیں، خود فرماتے ہیں کہ: ''میں نے تیس صحابۂ کرام سے ملاقات کی ہے''(۱) طائف کے قیام کے دوران آپ نے حضرت ابن عباسؓ سے بھی استفادہ کیا ہے، حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں: ''كان اماماً فقيهاً حجة فصيحاً مفوها متفقا علىٰ ثقته'' خلاصہ یہ کہ آپ کی امامت اور وثاقت پر اتفاق ہے، ۱۱۷ھ میں وفات پائی۔(۲)

۲۰...... حضرت ابن جریجؒ

آپ کا پورا نام ابو الولید عبد الملک بن عبد العزیز بن جریج القریشی المکی ہے، آپ تبع تابعین میں سے ہیں، اور حضرت طاؤسؒ، حضرت عطاء بن ابی رباحؒ، حضرت مجاہدؒ، حضرت ابن ابی ملیکہؒ اور حضرت نافعؒ وغیرہ کے شاگرد ہیں، خاص طور سے حضرت عطاءؒ کے ساتھ سترہ سال رہے ہیں، حضرت عطاءؒ سے پوچھا گیا کہ آپ کے بعد ہم کس سے مسائل پوچھا کریں، تو حضرت عطاءؒ نے آپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''اگر یہ نوجوان زندہ رہے تو ان سے۔'' اسی لئے آپ کو حضرت عطاءؒ کی روایات کے معاملہ میں اثبت الناس (تمام لوگوں میں سب سے زیادہ قابل اعتماد) کہا گیا ہے، آپ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ آپ دینی علوم کے پہلے باقاعدہ مصنف ہیں، جنہوں نے علوم کی پہلی بار تدوین کی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ: ''مادوّن العلم تدوينى احد'' (مجھ سے پہلے میری طرح کسی نے علم کی تدوین نہیں کی تھی، عبادت وزہد میں بھی آپ نہایت بلند پایہ بزرگ تھے، مہینہ میں صرف تین دن روزے کے بغیر رہتے تھے، ورنہ سارے مہینے روزے رکھتے تھے،(۳) امام عبد الرزاقؒ فرماتے ہیں کہ۔ ''جب کبھی میں ابن جریجؒ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتا تو مجھے یقین ہو جاتا کہ آپ کا دل خشیت اللہ سے معمور ہے''(۴)

بیشتر محدثین نے آپ کو ثقہ قرار دیا ہے، البتہ بعض علماء سے آپ پر معمولی جرح وتنقید بھی

---

(۱) تهذيب التهذيب، ص ۳۰۷ ج ۵۔ (۲) تذكرة الحفاظ، ص ۹۵ و ۹۶ ج ۱۔
(۳) تهذيب التهذيب، ص ۴۰۳ تا ۴۰۶ ج ۶۔ (۴) تهذيب الاسماء، ص ۲۹۷ ج ۲۔

Marfat.com

مروی ہے، مثلاً امام مالکؒ سے منقول ہے کہ: ''ابن جریج حاطب اللیل ہیں'' (یعنی رطب ویابس ہرطرح کی روایات لے لیتے ہیں) یحییٰ بن معینؒ فرماتے ہیں کہ ''وہ زہریؒ کی روایات کے معاملے میں کچھ نہیں ہیں۔'' (یعنی ناقابل اعتبار ہیں) اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ بعض اوقات ضعیف راویوں سے تدلیس کرجاتے تھے، اسی لئے محققین کا فیصلہ یہ ہے کہ جو روایات انہوں نے صراحۃ حدثنی یا اخبرنی کے الفاظ سے نقل کی ہیں وہ تو ٹھیک ہیں، البتہ جو روایات عن کے لفظ سے نقل کی ہیں وہ مشتبہ ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی آپ قابلِ اعتماد راوی ہیں، چنانچہ صحاح ستہ میں آپ کی روایات بکثرت مروی ہیں۔(۱)

۲۱...... حضرت ضحاکؒ

آپ کا پورا نام ابوالقاسم الضحاک بن مزاحم الہلالی ہے، آپ خراسان کے باشندے ہیں، ''ضحاک'' کے معنی ہیں ''بہت ہنسنے والا'' اور آپ کا نام ضحاک اس لئے رکھا گیا کہ آپ دو سال بطنِ مادر میں رہے، اور جب آپ پیدا ہوئے تو آپ کے دانت نکل چکے تھے، اور آپ ہنس رہے تھے،(۲) آپ صحابہؓ کے دَور میں پیدا ہوچکے تھے، لیکن کسی صحابی سے آپ کا روایت کرنا مشکوک ہے، یہاں تک کہ حضرت ابن عباسؓ سے بھی آپ کی روایات صحیح قول کی بناء پر مرسل ہیں، عبدالملک بن میسرہؒ فرماتے ہیں کہ ''ضحاک کی ملاقات حضرت ابن عباسؓ سے نہیں ہوئی، البتہ رے کے مقام پر حضرت سعید بن جبیرؒ سے ملاقات ہوئی ہے، اور انہی سے انہوں نے تفسیر حاصل کی ہے،(۳) اکثر علماء نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، صرف حضرت شعبہؒ اور یحییٰ بن سعید القطانؒ ان کو ضعیف قرار دیتے ہیں، لیکن اوّل تو یہ دونوں حضرات رجال پر جرح کرنے کے معاملے میں دوسروں سے زیادہ متشدد ہیں،(۴) دوسرے غالباً اُن کی جرح کا

(۱) تہذیب التہذیب ص۴۰۳ تا ۴۰۶ ج۶۔

(۲) مفتاح السعادۃ، طاش کبریٰ زادہ ص۴۰۴ ج۱، والبدایۃ والنہایۃ لابن کثیرؒ ص۲۲۳ ج۹، احوال ۱۰۲ھ۔

(۳) تہذیب التہذیب ص۴۵۳ ج۴۔

(۴) دیکھئے الاجوبۃ الفاضلۃ، مولانا عبدالحی لکھنویؒ ص۱۶۱ تا ص۱۸۰ مطبوعہ شام، بتحقیق الشیخ عبدالفتاح ابو غدۃ۔

Marfat.com

منشاء یہی ہے کہ ضحاک کی ملاقات کسی صحابی سے نہیں ہوئی، اس کے باوجود وہ صحابہؓ سے براہِ راست روایت کرتے تھے، ورنہ بذاتِ خود وہ ثقہ ہی ہیں، حافظ ذہبیؒ نے ان کا تذکرہ کر کے لکھا ہے: وثقہ احمد وابن معین وابوزرعہ وغیرہم، وضعفہ یحییٰ القطان وشعبہ ایضا، وھو قوی فی التفسیر (امام احمدؒ وابن معینؒ اور ابوزرعہؒ وغیرہ نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے، اور یحییٰ القطانؒ اور شعبہؒ نے ان کی تضعیف کی ہے اور وہ تفسیر میں قوی ہیں)(۱) اور حافظ ابن حجرؒ تحریر فرماتے ہیں: ''صدوق کثیر الارسال (سچے ہیں، مگر مُرسل روایات کثرت سے ذکر کرتے ہیں)(۲) یہ بات تو ہم پیچھے لکھ ہی چکے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ کی جو روایات ان کے طریق سے آئی ہیں انہیں محدّثین نے ضعیف قرار دیا ہے، البتہ خود اُن کے اپنے تفسیری اقوال قابلِ قبول ہیں، اُن کی وفات ۱۰۲ھ اور ۱۰۶ھ کے درمیان ہوئی ہے،

قرونِ اُولیٰ کے ضعفاء یا مختلف فیہ مفسرین

مذکورہ بالا حضرات تو وہ تھے جن کے ثقہ اور قابل اعتماد ہونے پر علماء محدثین کا تقریباً اتفاق رہا ہے، اور جن کا ذکر تفسیری اقوال وروایات میں بکثرت آتا رہتا ہے، ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ، حضرت وہب بن منبہؒ، اور کعب الاحبارؒ کا مفصل تذکرہ ''اسرائیلیات'' کے عنوان کے تحت آچکا ہے، اب تابعین اور تبع تابعین کے عہد کے بعض ان حضرات کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے جنہیں یا تو ضعیف قرار دیا گیا ہے یا جن کے قابلِ اعتماد ہونے میں قابلِ لحاظ اختلاف رہا ہے،

سُدّی کبیر

تفسیر کی کتابوں میں ''سدّی'' کے نام سے دو صاحب معروف ہیں، دونوں کا تذکرہ الگ الگ مناسب ہوگا،

---

(۱) المغنی فی الضعفاء للذہبیؒ ص۳۱۲ ج۱ ترجمہ نمبر۲۹۱۲۔

(۲) تقریب التہذیب ص۲۷۳ ج۱ مطبوعہ مدینہ منورہ۔

Marfat.com

ا......ابو محمد اسمٰعیل بن عبدالرحمٰن بن ابی کریمۃ السدی الکوفی (متوفی ۱۲۷ھ) ''السدّی الکبیر'' کہا جاتا ہے، اور تفسیر کی کتابوں میں جب صرف ''سُدّی'' لکھا جاتا ہے، تو عموماً یہی مراد ہوتے ہیں، اُن کو ''سدی'' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ کوفہ کی جامع مسجد کے دروازے پر ایک چبوترہ سا تھا، یہ اُس پر بیٹھ کر اوڑھنیوں کی تجارت کیا کرتے تھے، دروازے کے ایسے چبوترے کو عربی میں ''سدّہ'' کہتے ہیں، اس لئے ان کو سُدّی کہا جانے لگا،

اُن کو تفسیر قرآن کی درس و تدریس کا خاص ذوق تھا، چنانچہ تفسیر کی کتابیں اُن کے اقوال اور روایات سے بھری ہوئی ہیں، البتہ علم تفسیر اور روایات کے معاملہ میں یہ کس حد تک قابلِ اعتماد ہیں، اس مسئلہ میں محققین کی آراء مختلف ہیں، بعض حضرات نے اُن کی توثیق کی ہے، مثلاً حضرت یحییٰ بن سعید القطانؒ فرماتے ہیں: ''لابأس به (۱) ماسمعت احدا یذکرہ الا بخیر'' (اُن کی روایات میں کوئی حرج نہیں، میں نے جس کسی کو ان کا ذکر کرتے ہوئے سُنا، ذکر خیر کرتے ہوئے سُنا) امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ''وہ ثقہ ہیں۔'' امام ابن عدیؒ فرماتے ہیں: ''له احادیث وهو عندی مستقیم الحدیث صدوق لابأس به'' (میری نظر میں حدیث کے معاملے میں وہ ٹھیک ہیں، سچے ہیں، ان میں کوئی حرج نہیں) امام عجلیؒ فرماتے ہیں ''ثقة عالم بالتفسیر روایة له'' (وہ تفسیر کے ثقہ عالم اور راوی ہیں) امام نسائیؒ انہیں صالح کہتے ہیں، (۲) امام بخاریؒ کے انداز سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ انہیں قابل اعتبار سمجھتے ہیں، کیونکہ انہوں نے اپنی تاریخ کبیر میں ان کے بارے میں کوئی جرح نقل نہیں فرمائی، بلکہ اسمٰعیل بن ابی خالدؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''سدی قرآن کریم کے شعبیؒ سے زیادہ بڑے عالم ہیں'' اور یحییٰ بن سعید القطانؒ کا وہ قول بھی نقل کیا ہے جو اوپر گذرا کہ ''میں نے جس کسی کو اُن کا ذکر کرتے ہوئے سُنا، ذکر خیر کرتے ہوئے سُنا'' ان دو اقوال کو نقل فرما کر انہوں نے خود کوئی جرح

(۱) محدثین کے ان اقوال کا ہم نے تقریبی ترجمہ محض سہولت کے لئے کر دیا ہے، ورنہ یہ تمام فقرے اصطلاحی ہیں، اور ان کا ٹھیک ٹھیک مفہوم اصولِ حدیث پر نظر رکھنے والے حضرات سمجھ سکتے ہیں اس پورے مفہوم کو اردو میں منتقل کرنا ممکن نہیں۔ (۲) تهذیب التهذیب، ص ۳۱۳ و ۳۱۴ ج ۱۔

(۳) التاریخ الکبیر للبخاریؒ ص ۳۶۱ قسم اجلد ا ترجمہ نمبر ۱۱۴۵، طبع بیروت۔

Marfat.com

نہیں فرمائی، (۳) امام مسلمؒ کے نزدیک بھی وہ ثقہ ہیں، کیونکہ انہوں نے اپنی صحیح میں اُن سے حدیث لی ہے،

اس کے برخلاف دوسرے بہت سے علماء نے اُن پر جرح بھی فرمائی ہے، مثلاً امام شعبیؒ سے کسی نے کہا کہ ان السدی قد اعطی حظا من علم القراٰن (سدی کو قرآن کریم کے علم کا بڑا حصہ ملا ہے) اس کے جواب میں امام شعبیؒ نے فرمایا "قد اعطی حظا من جهل بالقراٰن" (ان کو قرآن کریم سے جاہل ہونے کا بڑا حصہ ملا ہے) حضرت یحییٰ بن معین انہیں ضعیف قرار دیتے تھے اور فرماتے تھے "فی حدیثه ضعف" (اُن کی احادیث میں ضعف ہے) امام ابوزرعہؒ انہیں لیّن (نرم) کہتے تھے، جو ادنیٰ درجہ کی توثیق ہے، امام ابوحاتمؒ فرماتے ہیں "یکتب حدیثه ولا یحتج به (ان کی حدیثیں لکھ لی جائیں مگر ان سے استدلال درست نہیں) ساجیؒ فرماتے ہیں" صدوق فیه نظر "(سچے ہیں مگر محلِ نظر ہیں) امام عقیلیؒ کا قول ہے" ضعیف وکان یتناول الشیخین "(ضعیف ہیں اور شیخین یعنی حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی بدگوئی کرتے تھے) امام طبریؒ کہتے ہیں" لا یحتج بحدیثه "(ان کی حدیث سے استدلال درست نہیں ہے) امام جوزجانیؒ فرماتے ہیں" کذاب شتام "(وہ جھوٹے اور تبرّا باز ہیں) (۱) امام فلاّسؒ نے حضرت عبدالرحمٰن بن مہدیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ" وہ ضعیف ہیں "اور حسین بن واقد المروزیؒ کہتے ہیں کہ" سمعت من السدّی فماقمت حتیٰ سمعته یشتم ابا بکر وعمر فلم اعدالیهٗ (میں نے سُدی سے احادیث سنی ہیں، اور اُن کو اس وقت چھوڑا میں نے اُن کو سُنا کہ وہ حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کے خلاف بدزبانی کر رہے ہیں، اس کے بعد میں اُن پاس نہیں گیا" (۲)

اُن کے بارے میں ساری بحث کا خلاصہ حافظ ابن حجر نے یہ نکالا ہے کہ "صدوق یهم ورمی بالتشیع "(وہ سچے ہیں، مگر ان کو روایت میں وہم ہو جاتا ہے،، اور ان پر تشیع کا بھی الزام ہے) (۳) لفظ" صدوق "محدّثین کی اصطلاح میں اُس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو جھوٹا

(۱) تہذیب التہذیب ص ۳۱۳ و ۳۱۴ ج ۱۔

(۲) میزان الاعتدال للذهبی ص ۲۳۶ و ۲۳۷ ترجمہ نمبر ۹۰۷۔

(۳) تقریب التهذیب ص ۷۲ ج ۱ ترجمہ نمبر ۵۳۲ طبع المدینة المنورة،

Marfat.com

تو نہ ہو لیکن اس کا حافظہ بھی معیاری نہ ہو، لہٰذا ان کی صحیح حیثیت یہ ہے کہ قوتِ حافظہ کے اعتبار سے یہ محدّثین کے معیار پر پورے نہیں اُترتے دوسرے اُن پر شیعہ ہونے کا بھی الزام ہے، لیکن ان کو "کذّاب" صرف امام جوزجانیؒ نے کہا ہے،

سدّی صغیر

۲...... دوسرے صاحب جو سُدی کے نام سے مشہور ہیں محمد بن مروان السدی ہیں، جو عبدالرحمٰن ابن زید بن الخطابؓ کے آزاد کردہ غلام تھے (۱) اُن کی روایات سُدی کبیر کے مقابلہ میں کم ہیں، اور اُن کو سدی کبیر سے ممتاز کرنے کے لئے "السدی الصغیر" کہا جاتا ہے، یہ بھی کوفہ کے باشندے ہیں، اور ان کے ضعیف ہونے پر تمام محدّثین کا اتفاق ہے، یہ مشہور مورخ کلبیؒ کے شاگرد ہیں، (جن کا ذکر آگے آرہا ہے) امام بخاریؒ فرماتے ہیں" لا یکتب حدیثه البتة، (ان کی احادیث ہرگز نہ لکھی جائیں) امام ابن معینؒ کا ارشاد ہے: "لیس بثقة" (وہ ثقہ نہیں) امام احمد فرماتے ہیں" ادر کته وقد کبر فتر کته (میں نے اُن کو اس وقت پایا جب وہ بوڑھے ہو چکے تھے لہٰذا میں نے انہیں چھوڑ دیا) حافظ ذہبیؒ اُن کے بارے میں فرماتے ہیں: "تر کوہ واتھمه بعضھم بالکذب" (محدثین نے انہیں چھوڑ دیا ہے، اور بعض لوگوں نے اُن پر جھوٹ کا الزام بھی لگایا ہے) (۲) اور ایک دوسرے مقام پر اُن کے بارے میں لکھتے ہیں "واہ بمرۃ" (انتہائی واہیات راوی ہیں) (۳) امام نسائیؒ فرماتے ہیں متروک الحدیث (۴) ابوعلی صالح بن محمد کہتے ہیں" کان ضعیفاً، وکان یضع الحدیث ایضا" (ضعیف تھے اور حدیثیں گھڑا بھی کرتے تھے) (۵)

---

(۱) تاریخ بغداد للخطیبؒ، ص ۲۹۱ ج ۳۔

(۲) میزان الاعتدال ص ۳۲ و ۳۳ ج ۴ والمغنی فی الضعفاء ص ۶۳۱ ج ۲ ترجمہ نمبر ۵۹۶۶،

(۳) میزان الاعتدال ص ۲۳۷ ج ۱ بہ ذیل ترجمہ اسماعیل بن عبدالرحمن السّدیّ الکبیر۔

(۴) کتاب الضعفاء والمتروکین للنسائیؒ مع التاریخ الصغیر للبخاریؒ ص ۳۰۳ مطبوعہ شیخوپورہ،

(۵) تاریخ بغداد للخطیبؒ ص ۲۹۲ ج ۳ طبع بیروت۔

Marfat.com

پیچھے حضرت ابن عباسؓ کے تذکرے میں یہ بتایا جاچکا ہے کہ "تنویر المقیاس فی تفسیر ابن عباس" کا مروّجہ نسخہ انہی سے مروی ہے، اور علامہ سیوطیؒ نے اس کی سند کو "سلسلة الکذب" قرار دیا ہے، اس لئے اس کا کوئی اعتبار نہیں، (۱)

مقاتل

مقاتل نام کے بھی دو صاحب معروف ہیں، ایک ابو بسطام مقاتل بن حیّانؒ اور دوسرے ابوالحسن مقاتل بن سلیمان، دونوں ایک ہی شہر کے یعنی بلخ کے باشندے ہیں، دونوں ایک ہی زمانے کے ہیں اور ایک ہی طرح کے اساتذہ سے روایت کرتے ہیں، اس لئے بسا اوقات ان میں التباس ہو جاتا ہے، ان میں سے اوّل الذکر (یعنی مقاتل بن حیّان) راجح قول کی بناء پر ثقہ ہیں، اور جلیل القدر علماء میں سے ہیں، لیکن تفسیر کی کتابوں میں ان کا حوالہ کم آتا ہے، تفسیر کی کتابوں میں جب صرف "مقاتل" لکھا جاتا ہے، تو اس سے مراد دوسرے صاحب (یعنی مقاتل بن سلیمان) ہوتے ہیں، کیونکہ وہی مفسّر کے لقب سے مشہور ہیں، اور انہی کی روایات اور اقوال کتبِ تفسیر میں زیادہ ہیں، لہٰذا یہاں ان کا حال قدرے تفصیل کے ساتھ پیش خدمت ہے:

مقاتل بن سلیمان (متوفی ۱۵۰ھ) نے ایک تفسیر لکھی تھی، جس کے حوالے کتبِ تفسیر میں بکثرت آتے ہیں، چند علماء نے ان کی تعریف کی ہے، لیکن اکثر محدّثین نے انہیں مجروح اور ناقابلِ اعتبار بتایا ہے، تعریف کرنے والوں میں امام شافعیؒ ہیں جو فرماتے ہیں: "الناس عیال علیٰ مقاتل فی التفسیر" (لوگ تفسیر کے معاملے میں مقاتل کے محتاج ہیں) نیز حضرت بقیہؒ کہتے ہیں کہ "حضرت شعبہؒ سے مقاتل کے بارے میں بکثرت سوال کیا جاتا تھا، میں نے ہمیشہ ان کو مقاتل کا ذکر خیر کرتے ہوئے ہی پایا" اور حضرت مقاتل بن حیّانؒ ان کو علم کا سمندر کہا کرتے تھے،

(۱) الاتقان ص ۱۸۹ ج ۲۔

Marfat.com

لیکن اُن چند تعریفی کلمات کو چھوڑ کر بیشتر ائمہ حدیث نے اُن پر شدید جرح اور تنقید کی ہے، اُن پر پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ وہ بے اصل روایات نقل کرتے ہیں، حضرت وکیعؒ فرماتے ہیں! "ہمارا ارادہ ہوا کہ ہم سفر کر کے مقاتل کے پاس جائیں، لیکن وہ خود ہی ہمارے شہر میں آگئے، ہم اُن کے پاس پہنچے، مگر ہم نے انہیں کذاب پایا، اس لئے ان سے کچھ نہیں لکھا" امام جوزجانیؒ اُن کے بارے میں کہتے ہیں "کان کذابا جسورا (بڑا ڈھیٹ کذاب ہے) امام ابن معینؒ فرماتے ہیں" لیس بشئی "(وہ کچھ بھی نہیں) عمرو بن علی (فلاسؒ) فرماتے ہیں "متروک الحدیث کذاب" امام ابن سعدؒ کہتے ہیں: "اصحاب الحدیث یتقون حدیثه وینکرونه" (علماء حدیث اس کی حدیث سے بچتے اور اُسے منکر سمجھتے ہیں) عبدالرحمٰن بن حکمؒ کہتے ہیں: "وہ قصہ گو تھا، لوگوں نے اس کی حدیثیں ترک کردی ہیں" ابو حاتمؒ اور امام عجلیؒ فرماتے ہیں: "متروک الحدیث" امام نسائیؒ نے انہیں کذاب قرار دیا ہے، اور ایک دوسرے موقع پر فرمایا کہ "رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی حدیثیں گھڑ کر منسوب کرنے والے چار آدمی بہت مشہور ہیں، ان میں سے ایک مقاتل بھی ہیں" امام دارقطنیؒ لکھتے ہیں "یکذب" (وہ جھوٹ بولتے ہیں،، امام حاکمؒ لکھتے ہیں: "لیس بالقوی عندھم "(وہ علماء کے نزدیک قوی نہیں ہیں) عبدالصمد بن عبدالوارثؒ فرماتے ہیں کہ: "مقاتل ہمارے پاس آئے اور ہمیں عطاءؒ کے واسطے سے کچھ حدیثیں سنانے لگے، پھر وہی حدیثیں ضحاکؒ کے واسطے سے سنائیں، پھر وہی احادیث عمرو بن شعیبؒ کے واسطے سے سُنائیں، ہم نے ان سے کہا کہ یہ روایات آپ نے کس سے سُنی ہیں؟ تو پہلے تو انہوں نے کہا کہ ان سب سے سنی ہیں، مگر پھر کہنے لگے، نہیں خدا کی قسم! مجھے یاد نہیں کس سے سنی ہیں (۱)...... اور امام بخاریؒ فرماتے ہیں: "لاشی البتة "(وہ ہرگز کوئی شے نہیں) (۲) عبداللہ بن مبارک اُن کی عبادت گذاری کی تعریف کرتے تھے، لیکن اُن کی روایات قبول نہیں کرتے تھے، (۳)

---

(۱) یہ تمام اقوال تھذیب التھذیب ص۲۸۲ تا ۲۸۵ ج ۱۰ سے ماخوذ ہیں۔

(۲) التاریخ الکبیر ص۱۴ قسم ۲ ج ۴ ترجمہ نمبر ۱۹۷۶۔

(۳) مفتاح السعادۃ، طاش کبریٰ زادہ (ص ۱۰۴ ج ۱ مطبوعہ دکن)

Marfat.com

اُن پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ عقائد کے اعتبار سے فرقۂ مجسمہ میں سے تھے (یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مشابہ قرار دیتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کے لئے اعضاء وغیرہ کے قائل تھے) عباس بن مصعب مروزیؒ کہتے ہیں کہ: ''مقاتل بن سلیمان اصلاً بلخ کے باشندے تھے، پھر مرو میں آگئے، یہاں انہوں نے جامع مسجد میں قصہ گوئی شروع کردی، یہیں پر اُن کے اور جہم بن صفوان (بانی فرقہ جہمیہ) کے درمیان مباحثے شروع ہوگئے، چنانچہ انہوں نے ایک دوسرے کیخلاف کتابیں لکھیں'' اور امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں: ''ہمارے یہاں مشرق کی جانب سے دو بڑے خبیث نظریات گھس آئے ہیں، ایک جہم (کا نظریہ) جو معطلہ میں سے تھا، اور ایک مقاتل (کا نظریہ) جو مشبّہ میں سے تھا'' نیز امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں: ''جہم نے نفی (صفات) میں غلو سے کام لیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو کالعدم بنادیا، اور مقاتل نے اثباتِ (صفات) میں غلو کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو اس مخلوقات کے مشابہ قرار دیدیا، (۱) چنانچہ حافظ شمس الدین ذہبیؒ نے اُن کو ضعفاء میں شمار کر کے لکھا ہے: ''مقاتل بن سلیمان البلخی المفسر، هالك، كذبه وكيع والنسائي (مقاتل بن سلیمان بلخی مفسر تباہ حال ہیں، وکیعؒ اور نسائیؒ نے انہیں کذاب کہا ہے) (۲)

اور حافظ ابن حجرؒ نے ان کے احوال کا خلاصہ یہ نکالا ہے کہ ''كذبوه وهجروه ورمي بالتجسيم'' (علماء نے ان کی تکذیب کی ہے اور اُن کی روایات کو چھوڑ دیا ہے، اور ان پر فرقۂ مجسمہ میں سے ہونے کا الزام بھی ہے) (۳)

اتنی شدید جرح و تنقید کے باوجود تفسیر کی کتابوں میں اُن کے اقوال بڑی کثرت سے ذکر کیے جاتے ہیں، اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ اگرچہ روایت حدیث میں اُن پر بھروسہ نہیں ہے لیکن وہ وسیع المعلومات آدمی تھے، اور چونکہ انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا مشغلہ تفسیر ہی کو بنایا تھا،

(۱) تہذیب التہذیب بحوالہ بالا،

(۲) المغنی فی الضعفاء للذہبی ص ۶۷۵ ج ۲۔

(۳) تقریب التہذیب ص ۲۷۲ ج ۲ ترجمہ نمبر ۱۳۴۷۔

Marfat.com

اوراس بارے میں مختلف طریقوں سے معلومات جمع کی تھیں، اس لئے اُن کی تفسیر میں بعض کام کی باتیں بھی نکل آتی ہیں، اس لئے ان کی معلومات بھی مفسرین نے ذکر کردی ہیں، تا کہ محقق علماء اُن میں سے کوئی بات مفید اور صحیح پائیں تو قبول کرلیں، ورنہ رَد کردیں، اس سلسلے میں بعض علماء کے اقوال یہ ہیں:

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ: ''اُن کے پاس کچھ کتابیں تھیں جنہیں دیکھتے رہتے تھے، مگر میرا خیال ہے کہ قرآن کا کچھ علم اُن کے پاس تھا،(۱) حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ: **انما جمع مقاتل تفسیر الناس وفسّر علیه من غیر سماع** (مقاتل نے مختلف لوگوں کی تفسیریں جمع کرکے اُن کے مطابق تفسیر کی ہے، مگر کسی سے ان تفسیروں کو براہِ راست نہیں سُنا) عباس بن مصعب مروزیؒ فرماتے ہیں: ''**کان حافظا للتفسیر لایضبط الاسناد**'' (انہیں تفسیر تو یاد تھیں مگر سند یاد نہ تھی)

نعیم بن حمادؒ کہتے ہیں کہ ''میں نے حضرت سفیان بن عیینہؒ کے پاس مقاتل کی ایک کتاب دیکھی تو ان سے پوچھا کہ: ''کیا آپ تفسیر میں مقاتل کی روایات نقل کرتے ہیں؟'' انہوں نے جواب میں کہا: ''نہیں، لیکن میں اس سے مدد لیتا ہوں'' حضرت عبداللہ بن المبارکؒ نے اُن کی تفسیر دیکھی تو کہا ''اس میں علم تو بڑا عجیب ہے، کاش! کہ اس کی اسناد بھی (صحیح) ہوتیں'' حضرت حماد بن عمروؒ نے فرمایا ''جو باتیں یہ بیان کرتے ہیں اگر انہیں علم کہنا صحیح ہو تو یہ کتنے بڑے عالم ہیں۔'' امام ابن حبانؒ فرماتے ہیں کہ: ''وہ یہود و نصاریٰ سے قرآن کا علم حاصل کرتے تھے جو اُن کی کتابوں کے موافق ہے، اور خلیلیؒ کہتے ہیں: ''اہلِ تفسیر کے نزدیک ان کا بڑا مقام ہے، اور وہ وسیع العلم تھے، لیکن حفاظ حدیث نے روایت میں اُن کو

(۱) **تاریخ بغداد للخطیب** ص۱۶۱ ج۱۳، خطیب بغدادیؒ نے یہ قصہ بھی نقل کیا ہے کہ ایک دن خلیفہ منصور بیٹھا ہوا تھا، ایک مکھی بار بار آ کر اس کے چہرے پر بیٹھ رہی تھی، یہاں تک کہ وہ پریشان ہوگیا، اتنے میں مقاتل بن سلیمان آگئے، منصور نے ان سے پوچھا: ''تمہیں پتہ ہے کہ اللہ نے مکھی کو کیوں پیدا کیا ہے؟'' مقاتل نے کہا: ''ہاں! اس لئے پیدا کیا ہے کہ اس کے ذریعہ جابر قسم کے لوگوں کو ذلیل کرے۔'' منصور خاموش ہوگیا، (ص۱۶۰ ج۱۳)

Marfat.com

ضعیف قرار دیا ہے"(۱)

لٰہذا مقاتل کی تفسیروں پر روایتی نقطۂ نظر سے تو ہرگز بھروسہ نہیں کرنا چاہئے، البتہ لغت وادب، تاریخ و قصص، کتبِ سابقہ کے حوالوں اور عام معلومات کے لحاظ سے اُن کی تفسیر میں کام کی باتیں بھی مل جاتی ہیں، جن سے محقق اہلِ علم کچھ نہ کچھ فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں، اس لئے عام مفسرین نے ان کو نقل کرنے میں قباحت نہیں سمجھی،

ربیع بن انسؒ

ان کا نام ربیع بن انس البکری الحنفی ہے، یہ اصلاً بصرہ کے باشندے ہیں پھر خراسان چلے گئے تھے، اس لئے ان کو بصری بھی کہا جاتا ہے اور خراسانی بھی، انہوں نے حضرت انسؓ، حضرت ابوالعالیہؒ اور حضرت حسن بصریؒ وغیرہ سے روایات لی ہیں، امام عجلیؒ، ابوحاتمؒ اور امام نسائیؒ نے ان کے لئے "صدوق" یا "لیس بہ باس" کے الفاظ استعمال کئے ہیں، (۲) جو ادنیٰ درجہ کی توثیق ہے البتہ حضرت یحییٰ بن معینؒ فرماتے ہیں: "کان یتشیع فیفرط" (وہ شیعہ تھے اور (تشیع میں) افراط سے کام لیتے تھے) اور امام ابن حبانؒ نے انہیں "ثقات" میں شمار کیا ہے، اور ساتھ ہی کہا ہے کہ "ابوجعفر رازیؒ نے ان کی جو روایات ذکر کی ہیں لوگ اُن سے احتراز کرتے ہیں، اس لئے کہ اُن کی روایات میں اضطراب بہت ہے" (۳) اور حافظ ابن حجرؒ نے اُن کے بارے میں خلاصہ یہ ذکر کیا ہے کہ: "صدوق له اوهام رمی بالتشیّع" (وہ سچ بولتے ہیں، مگر ایک تو ان کی روایات میں وہم بھی ہو جاتا ہے دوسرے اُن پر تشیع کا الزام ہے) (۴)

---

(۱) تہذیب التہذیب ص ۲۸۰ تا ۲۸۴، ج ۱۰ و میزان الاعتدال ص ۱۷۳ ج ۴، طبع مصر، مقاتل بن سلیمان کے بارے میں جتنے اقوال ہم نے تہذیب التہذیب سے بلاسند نقل کئے ہیں ان کی سند کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ بغداد للخطیب" ص ۱۶۰ تا ۱۶۹۔

(۲) تہذیب التہذیب ص ۲۳۹ ج ۱ و الجرح والتعدیل، لابو ابی حاتمؒ ص ۴۵۴ ج ۱ قسم ۲ ترجمہ نمبر ۲۰۵۴ طبع دکن۔

(۳) تہذیب التہذیب ص ۲۳۹ ج ۳۔ (۴) تقریب التہذیب ص ۲۴۳ ج ۱۔

عطیّۃ العوفی

ان کا پورا نام ابوالحسن عطیّہ بن سعد بن جُنادۃ العوفی الجدلی (متوفی ۱۱۱ھ) ہے، یہ کوفہ کے باشندے تھے، تابعین میں سے ہیں، اور حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت زید بن ارقمؓ وغیرہ سے روایات نقل کرتے ہیں، ان کو امام نسائیؒ نے ''ضعیف'' کہا ہے،(۱) نیز امام احمدؒ، یحییٰ بن سعید القطانؒ، ہُشیمؒ، ابوحاتمؒ، ابن عدیؒ جوزجانیؒ، ابن حبانؒ، امام ابوداؤد اور ساجیؒ وغیرہ نے بھی اُن کی تضعیف کی ہے، صرف ابن سعدؒ نے اتنا لکھا ہے کہ: ''لہ احادیث صالحۃ ومن الناس من لا یحتج بہ'' (وہ ٹھیک حدیثیں روایت کرتے ہیں، اور بعض لوگ ان سے استدلال نہیں کرتے) اور امام ابوزرعہؒ نے انہیں ''لین'' کہا ہے جوادنیٰ درجہ کی توثیق ہے، اور یحییٰ بن معینؒ ان کو ''صالح'' کہتے ہیں، یہ بھی ہلکی قسم کی توثیق ہے، دراصل ان پر چار قسم کے اعتراضات ہیں، پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ انہوں نے روایات کی سند میں مغالطہ انگیزی کا ارتکاب کیا ہے، امام احمدؒ اور امام ابن حبانؒ نے اس کی تفصیل یہ بتائی ہے کہ یہ کلبیؒ کے پاس جاکر ان سے تفسیر کے بارے میں سوالات کیا کرتے تھے اور اُن سے روایات لیتے تھے، لیکن چونکہ کلبی ضعیف اور بدنام ہیں (جیسا کہ آگے آرہا ہے) اس لئے انہوں نے ان کی کنیت اپنی طرف سے ابوسعید رکھ لی تھی، اور جو روایات یہ کلبی سے سنتے اُن کو کلبی کا نام لینے کے بجائے ابوسعید کی کنیت سے روایت کردیتے، اور چونکہ عطیۃ العوفی نے مشہور صحابی حضرت ابوسعید خدریؓ سے بعض احادیث سُنی تھیں، اس لئے ناواقف لوگ یہ سمجھتے ...... کہ یہ روایت بھی حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہوگی، حالانکہ درحقیقت وہ کلبی کی روایت ہوتی تھی،(۲)

اُن پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ شیعہ تھے، اور تیسرا اعتراض یہ ہے کہ روایات نقل کرنے

---

(۱) کتاب الضعفاء والمتروکین، للنسائیؒ، مع التاریخ الصغیر للبخاریؒ ص ۳۰۱،

(۲) تہذیب التہذیب ص ۲۲۵ و ۲۲۶ ج ۷۔

میں غلطیاں کرتے تھے، اور چوتھا اعتراض یہ ہے کہ مدلّس تھے، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ ان کے بارے میں لکھتے ہیں: "صدوق یخطیء کثیرا، کان شیعیا مدلّساً" (سچ بولنے والے ہیں مگر غلطیاں بہت کرتے ہیں، شیعہ تھے اور مدلّس تھے)(۱) اور حافظ شمس الدین ذہبیؒ ضعفاء میں اُن کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں" تابعی مشهور مجمع علیٰ ضعفه" (مشہور تابعی ہیں، اُن کے ضعف پر اجماع ہے)(۲) البتہ امام ترمذیؒ نے اُن کی بعض روایات کو حسن قرار دیا ہے، (۳) لیکن امام ترمذیؒ کی اصطلاح میں حسن سے مراد ہر وہ حدیث ہوتی ہے جس کی سند میں کوئی راوی متہم بالکذب (جھوٹ کا مُلزَم) نہ ہو، اور وہ ایک سے زائد طریقوں سے مروی ہو، (۴) اس لئے ان کی تحسین سے اُن اعتراضات کا دفعیہ نہیں ہوتا جو عطیّۃ العوفی پر وارد کئے گئے ہیں،

عبدالرحمٰن بن زید بن اسلمؒ

ان کا پورا نام عبدالرحمٰن بن زید اسلم العدوی المدنی (متوفی ۱۸۲ھ) ہے، یہ حضرت زید بن اسلمؒ کے صاحبزادے ہیں جن کا تذکرہ پیچھے آچکا ہے، ان کو بیشتر محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے، صرف امام ابن عدیؒ کا قول ہے کہ "له احادیث حسان، وهو ممن احتمله الناس وصدقه بعضهم وهو ممن یکتب حدیثه" (ان سے حسن احادیث مروی ہیں وہ ان راویوں میں سے ہیں جنہیں لوگوں نے گوارا کیا ہے، اور بعض حضرات نے اُن کی تصدیق کی ہے، ان کی حدیثیں لکھی جاسکتی ہیں) باقی تمام علماء جرح نے ان کی تضعیف کی ہے، امام بخاریؒ لکھتے ہیں: "ضعفه علیّ جدًّا" (علی ابن المدینیؒ نے ان کو بہت ضعیف کہا ہے)(۵) امام نسائیؒ لکھتے ہیں: "ضعیف(۶)" امام احمدؒ اور امام ابوزرعہؒ نے بھی ان کی تضعیف کی ہے،

(۱) تقریب التہذیب ص ۲۴ ج ۲۔ (۲) المغنی فی الضعفاء ص ۴۳۶ ج ۲ ترجمہ نمبر ۴۱۳۹،
(۳) الاتقان ص ۱۸۹ ج ۲ نوع نمبر ۸۰۔ (۴) دیکھئے کتاب العلل للترمذیؒ۔
(۵) التاریخ الکبیر للبخاریؒ، ص ۲۸۴ ج ۳ قسم ا ترجمہ نمبر ۹۲۲۔
(۶) کتاب الضعفاء والمتروکین، مع التاریخ الصغیر ص ۲۹۶۔

Marfat.com

امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ "زید بن اسلمؒ کے تمام بیٹے ضعیف ہیں۔" امام ابوحاتمؒ فرماتے ہیں کہ "اپنی ذات میں صالح آدمی تھے، مگر حدیث میں بہت کمزور۔" امام ابن خزیمہؒ کہتے ہیں: "لیس هو ممن یحتج اهل العلم بحدیثه لسوء حفظه وهو رجل صناعته العبادة والتقشف" (وہ ان لوگوں میں سے نہیں جن کی حدیث سے اہل علم استدلال کر سکیں، کیونکہ ان کا حافظہ کمزور تھا، اُن کا اصل کام عبادت وزہد ہے) امام ابن حبانؒ فرماتے ہیں: "کان یقلب الاخبار وهو لایعلم حتی کثر ذلک فی روایته من رفع المراسیل وباسناد الموقوف فاستحق الترک" (وہ روایات کو غیر شعوری طور پر پلٹ دیتے ہیں، یہاں تک کہ اُن کی روایات میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ مرسل کو مرفوع بنا دیا اور موقوف کو مسند کر دیا، اس لئے وہ مستحقِ ترک ہیں) امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ: "حدیثه عند اهل العلم بالحدیث فی النهایة من الضعف۔" (علمائے حدیث کی نظر میں ان کی احادیث انتہائی ضعیف ہیں) اس کے علاوہ امام مالکؒ، امام ابن معینؒ، دراوردیؒ، معنؒ، امام ابن سعدؒ، ساجیؒ، حاکمؒ، ابونعیمؒ اور جوزجانیؒ سے بھی اُن پر سخت جرح منقول ہے، اور علامہ ابن جوزیؒ نے لکھا ہے: "اجمعوا علی ضعفه" (ان کے ضعف پر اجماع ہے)(۱) چنانچہ ابن حجرؒ نے ان کے بارے میں فیصلہ یہی کیا ہے کہ وہ ضعیف ہیں۔(۲)

کلبی

ان کا پورا نام ابوالنضر محمد بن السائب بن بشر بن عمرو بن عبدالحارث بن عبدالعزی الکلبی (متوفی ۱۴۶ھ) ہے، یہ قبیلۂ بنوکلب کی طرف منسوب ہیں، کوفہ کے باشندے تھے، اور تاریخ وانساب اور تفسیر میں مشہور ہیں، علماء اُن کے ضعیف اور نا قابلِ اعتبار ہونے پر متفق ہیں، صرف امام ابن عدیؒ نے اتنا لکھا ہے کہ "له غیر ما ذکرت احادیث صالحة، وخاصة عن ابی صالح، وهو معروف بالتفسیر ولیس لاحد اطول من

(۱) تهذیب التهذیب ص ۱۷۷ تا ۱۷۹ ج ۶، مزید ملاحظہ ہو میزان الاعتدال ص ۵۶۴ ج ۲۔

(۲) تقریب التهذیب ص ۴۸۰ ج ۱ ترجمہ نمبر ۹۴۱۔

Marfat.com

تفسیره، وحدث عنه ثقات من الناس ورضوه فی التفسیر واما فی الحدیث فله مناکیر ''(ان کی جو حدیثیں میں نے ذکر کی ہیں اُن کے سوا ان کی حدیثیں ٹھیک ہیں، خاص طور سے وہ احادیث جو ابو صالح سے مروی ہیں، وہ تفسیر میں مشہور ہیں، اور کسی کی تفسیر ان کی تفسیر سے زیادہ طویل نہیں ہے، اور ان سے بعض ثقہ لوگوں نے بھی حدیثیں لی ہیں، اور تفسیر میں انہیں گوارا کیا ہے، البتہ حدیث میں اُن کی روایات منکر ہیں) لیکن باقی تمام اہلِ علم نے اُن پر شدید جرح کی ہے،

ان پر سب سے سنگین الزام جھوٹی روایتیں بیان کرنے کا ہے، معتمر بن سلیمانؒ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ: ''کوفہ میں دو کذاب تھے، ان میں سے ایک کلبی ہیں۔'' تفسیر میں ان کی بیشتر روایات ابو صالح سے مروی ہیں، لیکن ابو جناب کلبیؒ بیان کرتے ہیں کہ ابو صالح نے قسم کھا کر کہا ہے کہ میں نے کلبی کو کوئی بات تفسیر کی نہیں سُنائی، اور سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ کلبی نے ایک مرتبہ خود اعتراف کیا کہ ''میں نے ابو صالح سے ابن عباسؓ کی جو روایتیں بیان کی ہیں وہ جھوٹ ہیں، تم انہیں روایت نہ کرو'' حضرت سفیان ثوریؒ سے بعض احادیث کلبی کی سند سے مروی ہیں، اس سے بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ جب سفیان ثوریؒ جیسا محدّث کلبی سے روایت کرتا ہے تو وہ ثقہ ہی ہوں گے، لیکن اس کی حقیقت حضرت ابو حاتمؒ نے بیان فرمائی ہے، کہ ''حضرت سفیان ثوریؒ کا مقصد ان سے روایت لینا نہیں تھا، بلکہ انہوں نے بعض اوقات اظہارِ تعجب کے لئے کلبی کی روایات مجلس میں سُنائیں، اس پر بعض حاضرین نے ان روایات کو سفیان ثوریؒ سے نقل کر دیا''(۱) اور حضرت قرۃ بن خالدؒ کہتے ہیں کہ: ''لوگوں کا خیال عام طور سے یہ تھا کہ کلبی جھوٹ بولتے ہیں''

ان پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ انتہائی غالی شیعہ تھے، حضرت ابو جزءؒ کہتے ہیں کہ ''میں

---

(۱) یہ تمام اقوال تہذیب التہذیب سے نقل کئے جا رہے ہیں، البتہ حافظ ذہبیؒ نے خود سفیان ثوریؒ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ لوگوں سے کہا ''کلبی سے بچو'' ان سے پوچھا گیا کہ ''آپ تو اس سے روایت کرتے ہیں؟'' اس پر انہوں نے فرمایا: ''میں اس کے جھوٹ سچ کو پہچانتا ہوں'' (میزان الاعتدال ص ۵۵۸ ج ۳۔

Marfat.com

نے اُس کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لے کر آئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کام سے اُٹھ کر چلے گئے، حضرت علیؓ وہاں بیٹھے تھے تو جبرئیل علیہ السلام نے وہ وحی حضرت علیؓ پر نازل کردی۔'' ابوجزءؒ کا یہ قول مشہور محدث یزید بن زریعؒ کے سامنے نقل کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ: ''میں نے کلبی سے یہ بات تو نہیں سُنی لیکن یہ میں نے خود دیکھا کہ وہ سینہ پیٹ پیٹ کر کہہ رہے تھے کہ میں سبائی ہوں میں سبائی ہوں'' (۱) یہی قول حافظ ذہبیؒ نے ہمامؒ سے بھی نقل کیا ہے کہ ''میں نے اسے کہتے ہوئے سُنا ہے کہ میں سبائی ہوں'' اور امام ابن حبانؒ فرماتے ہیں: ''کلبی سبائی تھا اور ان لوگوں میں سے تھا جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی وفات نہیں ہوئی، وہ دوبارہ دنیا میں آئیں گے اور اس کو ایسے وقت میں عدل وانصاف سے بھر دیں گے جب وہ ظلم وجور سے بھری ہوگی، یہ لوگ جب کوئی بادل دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں: ''امیر المؤمنین اس میں ہیں'' (۲)

خلاصہ یہ کہ کلبی قرونِ اولیٰ کے مفسرین میں ضعیف ترین مفسر ہیں، امام احمدؒ سے پوچھا گیا کہ: کیا کلبی کی تفسیر کو دیکھنا جائز ہے؟'' تو انہوں نے فرمایا: ''نہیں'' حافظ ذہبیؒ نے ان کا طویل تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''**لایحل ذکرہ فی الکتب فکیف الاحتجاج به؟** (۳)'' (کتابوں میں اُن کا ذکر ہی درست نہیں، تو ان سے استدلال کیونکر درست ہوسکتا ہے)

آخر میں تفننِ طبع کے لئے ان کا ایک لطیفہ پیشِ خدمت ہے، وہ خود کہتے کہ میں نے یادداشت کا مظاہرہ بھی ایسا کیا ہے کہ کسی نے نہ کیا ہوگا، اور بُھول کا مظاہرہ بھی ایسا کیا کہ کسی نے نہ کیا ہوگا، یادداشت کا واقعہ تو یہ ہے کہ میں نے پورا قرآن چھ یا سات دن میں یاد کرلیا تھا، اور بُھول کا عالم یہ ہے کہ ایک روز میں نے اپنا خط بنانے کے لئے ڈاڑھی کو مٹھی میں پکڑا، چاہتا یہ تھا کہ مٹھی سے نیچے کے بالوں کو کاٹ دوں، لیکن بُھول کر مٹھی کے اوپر سے

---

(۱) تہذیب التہذیب ص ۱۷۸ تا ۱۸۱۔ (۲) میزان الاعتدال ص ۵۵۸ ج ۳۔

(۳) ایضاً صفحہ ۵۵۹ ج ۳۔

Marfat.com

پوری ڈاڑھی کاٹ ڈالی،(۱)

یوں تو تفسیر کی کتابوں میں اور بھی بہت سے لوگوں کے نام آتے ہیں، لیکن جن حضرات کا تذکرہ اس باب میں آگیا ہے یہ وہ حضرات ہیں جن کے حوالے تفسیر میں انتہائی کثرت سے آئے ہیں، اور اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ بعد کی تمام تفاسیر کا بنیادی مأخذ یہی حضرات ہیں، اور بیشتر تفاسیر انہی کی روایات اور اقوال کے گرد گھومتی ہیں، اس لئے ان حضرات کے احوال معلوم ہونے سے انشاء اللہ ان تمام تفاسیر کے مطالعے میں بصیرت پیدا ہوگی جنہوں نے تفسیر بالرّوایۃ کا طریقہ اختیار کیا ہے، مثلاً:

تفسیر ابن جریرؒ، تفسیر الدّر المنثور اور تفسیر ابن کثیرؒ وغیرہ، یا جن میں سند کے بغیر قدیم ائمۂ تفسیر کے اقوال بیان ہوتے ہیں، جیسے روح المعانی، تفسیر القرطبیؒ، اور متأخرین کی دوسری تفاسیر،

متأخرین کی چند تفسیریں

جیسا کہ اس باب کے شروع میں عرض کیا جا چکا ہے، ہم نے اس کتاب میں علم تفسیر کی مفصل تاریخ بیان کرنے کے بجائے صرف قرونِ اُولیٰ کے بعض اُن مفسرین کے تعارف پر اکتفا کیا ہے جن کی روایات اور اقوال پر پورے علم تفسیر کی بنیاد ہے، بعد میں قرآن کریم کی جو تفسیریں لکھی گئیں، اور علماءِ امت نے جس جس پہلو سے قرآن کریم کی خدمت کی وہ ایک طویل الذیل موضوع ہے، جو مستقل تصنیف چاہتا ہے، یہ دعویٰ تو کوئی بھی نہیں کرسکتا کہ تفسیر قرآن کا حق ادا ہو چکا ہے، لیکن یہ بھی اپنی جگہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ شمع رسالتؐ کے پروانوں نے اللہ تعالیٰ کی اس عظیم کتاب کی خدمت میں صرف محنت وعرق ریزی ہی سے نہیں، جنونِ عشق سے کام لیا ہے، چنانچہ یہ دعویٰ بلاخوفِ تردید کیا جاسکتا ہے، کہ دنیا میں نہ کسی کتاب کی اتنی شرحیں لکھی گئی ہیں نہ اُس کے اتنے ترجمے ہوئے ہیں، اور نہ اس کی مختلف

(۱) الوافی بالوفیات للصفدیؒ ص۸۳ ج۳ مطبعہ ہاشمیہ دمشق ۱۹۵۳ء و میزان الاعتدال ص۵۵۶ ج۳، لیکن خطیب بغدادیؒ نے یہ قصہ اُن کے بجائے اُن کے بیٹے ھشام ابن الکلبی کی طرف منسوب کرکے بیان کیا ہے۔ (تاریخ بغداد ص۴۶ ج۱۴ ترجمہ ھشام ابن الکلبی)

Marfat.com

پہلوؤں سے اس قدر خدمت کی گئی ہے، حالانکہ اس مقصد کے لئے کسی بھی دَور میں کوئی عالمی تنظیم قائم نہیں رہی،

بہر کیف! آج ان تمام خدمات کی روشنی میں قرآن کریم سے استفادہ بہت بہت آسان ہے، اور جو شخص کسی آیت کی تفسیر معلوم کرنا چاہے اس کے لئے پورے کتب خانے موجود ہیں، اگر صرف اُن تفسیروں کا تعارف کرایا جائے جو آجکل دستیاب ہیں تب بھی اس کے لئے ایک مستقل تالیف چاہئے، لیکن یہاں میں صرف اُن چند تفاسیر کا مختصر تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جن کا احقر پر ذاتی طور سے بڑا نا قابلِ فراموش احسان ہے، اور جو احقر کو سلف کے تفسیری علوم کا خلاصہ محسوس ہوتی ہیں، اور جب کبھی کسی آیت کی تفسیر میں کوئی الجھن پیش آئی ہے احقر نے سب سے پہلے انہی کی طرف رجوع کیا ہے، اور جن کے بارے میں میرا ناچیز خیال یہ ہے کہ ہم جیسے لوگوں کے لئے جو ضخیم تفاسیر کا باقاعدہ مطالعہ نہیں کر پاتے یہ کتابیں بڑی حد تک دوسری کتب کی کمی پوری کردیتی ہیں،

۱...... تفسیر ابن کثیر

ان میں سرفہرست تفسیر ابن کثیر ہے، یہ حافظ عماد الدین ابوالفداء اسمٰعیل بن الخطیب ابی حفص عمر بن کثیر الشافعیؒ (متوفی ۷۷۴ھ) کی تصنیف ہے، اور چار جلدوں پر مشتمل ہے، اس کتاب کو تفسیر ابن جریرؒ کا خلاصہ کہنا چاہئے، حافظ ابن کثیرؒ نے جو طریقہ اختیار فرمایا ہے وہ تفسیر بالروایہ کا طریقہ ہے، یعنی ہر آیت کے تحت وہ پہلے اس کی تفسیر کا خلاصہ بیان فرماتے ہیں، پھر اس کے مختلف کلمات یا جملوں کی تفسیر میں انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ وتابعینؒ کی جتنی روایات ملتی ہیں وہ ذکر فرماتے ہیں، لیکن ان سے پہلے کے جن مفسرین نے تفسیر بالروایہ کا طریقہ اختیار فرمایا ہے، مثلاً حافظ ابن جریرؒ، ابن مردویہؒ، اور ابن ماجہؒ وغیرہ، انہوں نے تفسیری روایات کو صرف جمع کرنے کا کام کیا ہے، اُن کی چھان پھٹک نہیں کی، لیکن حافظ ابن کثیرؒ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مفسر ہونے کے ساتھ ساتھ جلیل القدر محدث بھی ہیں، اور روایات پر

Marfat.com

جرح وتنقید کے فن سے واقف ہیں، چنانچہ انہوں نے اوّل تو اُن ضعیف اور موضوع روایات کو بکثرت چھانٹ دیا ہے جو متقدمین کی کتابوں میں لکھی چلی آرہی تھیں، دوسرے جو کمزور روایات وہ لائے ہیں عموماً اُن کی علل اسناد پر بھی تنبیہ فرمادی ہے، (مثلاً ملاحظہ ہو، ص ۷۷ وص ۲۱۳ ج ۱ وص ۱۷ تا ۲۱ وص ۲۴ و ۸۹ ج ۳ وص ۵۰۸ و ۵۱۹ و ۵۲۰ ج ۴ وغیرہ)

تفسیر بالروایۃ کی کتابیں اکثر وبیشتر اسرائیلیات سے لبریز ہیں، لیکن ایسی روایات کے بارے میں حافظ ابن کثیرؒ کا طرزِ عمل انتہائی محتاط، صاف ستُھرا اور خالص قرآن وسنت پر مبنی ہے، جس کی تفصیل خود انہی کے الفاظ میں "اسرائیلیات" کے عنوان کے تحت آچکی ہے، چنانچہ انہوں نے اوّل تو اپنی کتاب میں اسرائیلی روایات زیادہ نقل نہیں کیں، اور جہاں نقل کی ہیں وہاں عموماً یہ بتادیا ہے کہ یہ اسرائیلی روایات ہیں، مثلاً سورۂ صافات میں انہوں نے بعض ایسے آثار نقل کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ذبیح حضرت اسحٰق علیہ السلام تھے، اور اس کے بعد لکھا ہے کہ "اللہ ہی بہتر جانتا ہے، لیکن بظاہر یہ سارے اقوال کعب الاحبار سے ماخوذ ہیں...... ان روایات میں ہر طرح کی رطب ویابس باتیں جمع تھیں، اور اس امّت کو ان باتوں میں سے ایک حرف کی بھی ضرورت نہیں ہے" (ص ۱۷ ج ۴)

بہرکیف! روایتی لحاظ سے تفسیر ابن کثیرؒ سب سے محتاط اور مستند تفسیر ہے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اس تفسیر میں درج ہر روایت درست ہے، بلکہ بعض مقامات پر حافظ ابن کثیرؒ بھی ضعیف روایات کو کسی تنبیہ کے بغیر نقل کر گئے ہیں، مثلاً سورۂ توبہ کی آیت وَمِنْهُمْ مَّنْ عَاهَدَ اللّٰهَ الخ کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت ثعلبہؓ کی جو روایت انہوں نے نقل کی ہے (ص ۳۷۴ ج ۲) وہ محدثین کے نزدیک ضعیف ہے،

اس کے علاوہ جن مفسرین کے بارے میں ہم نے پیچھے ذکر کیا ہے کہ وہ ضعیف تھے، مثلاً مقاتل، کلبی اور عطیۃ الکوفی وغیرہ، اُن کے اقوال بھی انہوں نے بکثرت ذکر کیے ہیں، لیکن عموماً ان کے وہی اقوال بغیر تنقید کے لئے ہیں جو کسی دلیل شرعی کے خلاف نہیں ہیں، لہٰذا ان کی حیثیت مستند روایت کی نہیں بلکہ مفسرین کے اپنے اقوال کی ہے،

Marfat.com

۲...... تفسیر کبیر

دوسری کتاب امام رازیؒ کی تفسیر کبیر ہے، اس کا اصل نام "مفاتیح الغیب" ہے، لیکن تفسیر کبیر کے نام سے زیادہ مشہور ہے، یہ امام فخر الدین محمد ابن ضیاء الدین عمر الرازی (متوفی ۶۰۶ھ) کی تصنیف ہے، جس طرح روایت کے اعتبار سے تفسیر ابن کثیرؒ نہایت جامع اور بے نظیر تفسیر ہے، اسی طرح علوم درایت کے لحاظ سے تفسیر کبیر کا کوئی جواب نہیں، بعض لوگوں نے اس کتاب پر یہ فقرہ چست کیا ہے کہ: "فیہ کل شیء الا التفسیر" (اس میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے) (۱) لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فقرہ اس کتاب پر بڑا زبردست ظلم ہے، اس لئے کہ حلِ قرآن کے لئے اس تفسیر کا کوئی جواب نہیں ہے، اس کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱...... ہر آیت کی تفسیر، ترکیب نحوی اور شان نزول سے متعلق سلف کے جتنے اقوال ہوتے ہیں، امام رازی اُن کو نہایت مرتب اور منضبط انداز میں پوری شرح و وضاحت سے بیان کرتے ہیں، جس سے بآسانی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں کتنے اقوال ہیں، اور کیا کیا؟ دوسری تفسیروں میں یہ مباحث عموماً منتشر اور بکھرے ہوئے ہوتے ہیں، جن سے خلاصہ نکالنے میں وقت لگتا ہے، لیکن تفسیر کبیر میں یہ سب باتیں یک جا اور منضبط طریقے سے مل جاتی ہیں،

۲...... قرآن کریم کے اندازِ بیان کی شوکت و عظمت کو پوری تفصیل سے بیان فرماتے ہیں،

۳...... آیت سے متعلق جو فقہی احکام ہوتے ہیں انہیں تفصیلی دلائل کے ساتھ ذکر کرتے ہیں،

۴...... آیت میں جن باطل فرقوں اور عقل پرستوں نے کوئی تحریف کی ہوتی ہے اسے بتمام وکمال ذکر کر کے اس کی مدلّل اور مفصل تردید کرتے ہیں، اس طرح اس میں جہمیہ، معتزلہ، مجسمہ،

(۱) الاتقان ص ۱۹۱ ج ۲، مطبع حجازی، قاہرہ وتحبیب المسلمین بکلام رب العالمین، محمد کمال الدین بن محمد الحسینی الدہمی ص ۱۸۷، مطبوعہ ۱۳۵۸ھ لیکن ہماری ناچیز رائے میں اگر یہ فقرہ کسی کتاب پر راست آسکتا ہے تو وہ ہمارے دور کی تفسیر الجواہر للطنطاویؒ ہے۔

Marfat.com

اباحیہ اوران کے زمانے کے تمام باطل فرقوں کی تردید موجود ہے،

۵...... تفسیر کبیر کی ایک خصوصیت، جس کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے، اس کا بیان کیا ہوا ربطِ آیات ہے، واقعہ یہ ہے کہ آیتوں کے درمیان ربط ومناسبت کی جو وجہ وہ بیان فرماتے ہیں وہ عموماً اتنی بے تکلف، دلنشیں اور معقول ہوتی ہے کہ اس پر دل نہ صرف مطمئن ہو جاتا ہے، بلکہ اس سے قرآن کریم کی عظمت کا غیر معمولی تأثر پیدا ہوتا ہے،

۶...... خلاصہ یہ کہ تفسیر کبیر انتہائی جامع تفسیر ہے، اوراحقر کا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ حل قرآن کے سلسلہ میں جب بھی کوئی دشواری پیش آئی ہے، تفسیر کبیر نے اس معاملے میں غیر معمولی رہنمائی کی ہے، عموماً لوگ اس کا طولِ بیان دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں، (حد یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر اس کے ۱۵۰ صفحات میں آئی ہے) لیکن یہ تطویل شروع میں زیادہ ہے، بعد میں اتنی نہیں رہی، اوراس سے استفادہ کیا جائے تو علم ومعرفت کے گوہر نایاب ہاتھ آتے ہیں، البتہ اس تفسیر کے بارے میں چند باتیں ذہن نشین رہنی چاہئیں:

۱...... امام رازیؒ نے یہ تفسیر سورۂ فتح تک لکھی تھی، کہ وفات ہوگئی، چنانچہ سورۂ فتح کے بعد ایک دوسرے عالم قاضی شہاب الدین بن خلیل الخولی الدمشقی (متوفی ۶۳۹ھ) یا شیخ نجم الدین احمد بن محمد القمولی (متوفی ۷۷۷ھ) نے مکمل فرمایا،(۱) لیکن کمال یہ ہے کہ امام رازیؒ کے اندازِ نگارش کو اس طرح برقرار رکھا ہے کہ اگر کسی کو یہ حقیقت معلوم نہ ہو تو وہ کبھی شبہ بھی نہیں کرسکتا کہ یہ امام رازیؒ کے سوا کسی اور کی تحریر ہے،

۲...... تفسیر کبیر کی روایات دوسری تفاسیر کی طرح رطب ویابس کا مجموعہ ہیں،

۳...... معدودے چند مقامات پر امام رازیؒ نے جمہور مفسرین سے الگ راہ اختیار کی ہے، (مثلاً لم یکذب ابراھیم الا ثلث کذبات کی حدیث صحیح کو رد کردیا ہے) لہٰذا جہاں انہوں نے تفرد اختیار کیا ہے وہاں عمل جمہور ہی کے مسلک پر ہونا چاہئے،

---

(۱) کشف الظنون ص ۷۷۴ ج ۲۔

۳......تفسیر ابی السعود

اس تفسیر کا پورا نام ”ارشاد العقل السلیم الیٰ مزایا القرآن الکریم“ ہے یہ قاضی ابوالسعود محمد بن محمد العمادی الحنفی (متوفی ۱۹۵۱ھ) کی تصنیف ہے، اور بلاشبہ ان کی علمی گہرائی، دقتِ نظر اور تدبرِ قرآنی کا شاہکار ہے، یہ کل پانچ جلدوں پر مشتمل ہے، اور اس میں اختصار کے ساتھ قرآن کریم کی بڑی دلنشیں تفسیر کی گئی ہے، اس کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نظم قرآن، تناسب آیات اور بلاغت کے بڑے نفیس نکات ملتے ہیں، جن سے قرآن کریم کی مراد سمجھنے میں بہت آسانی بھی ہو جاتی ہے، اور قرآن کریم کے معجزانہ اندازِ بیان کی عظمت بھی سمجھ میں آنے لگتی ہے،

۴......تفسیر القرطبی

اس کا پورا نام ”الجامع لاحکام القرآن“ ہے، یہ اندلس کے مشہور اور محقق عالم علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح القرطبیؒ (متوفی ۶۷۱ھ) کی تصنیف ہے، جو فقہ میں امام مالکؒ کے مسلک کے پیرو تھے، اصل میں اس کتاب کا بنیادی موضوع تو قرآن کریم سے فقہی احکام و مسائل کا استنباط تھا، لیکن اس ضمن میں انہوں نے آیتوں کی تشریح، مشکل الفاظ کی تحقیق، اعراب و بلاغت اور متعلقہ روایات کو بھی تفسیر میں خوب جمع کیا ہے، خاص طور پر روزمرہ کی زندگی کے لئے قرآن کریم سے جو ہدایات ملتی ہیں ان کو اچھی طرح واضح فرمایا ہے، اس کتاب کا مقدمہ بھی نہایت مفصل اور علوم قرآن کے اہم مباحث پر مشتمل ہے، یہ تفسیر بارہ جلدوں میں ہے اور بار بار شائع ہو چکی ہے،

۵......رُوح المعانی

اس کا پورا نام ”روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی“ ہے، اور یہ بغداد کے مشہور عالم علّامہ محمود آلوسی حنفی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۷۰ھ) کی تصنیف

Marfat.com

ہے، اور تیس جلدوں پر مشتمل ہے، یہ چونکہ بالکل آخری دَور کی تصنیف ہے، اس لئے انہوں نے کوشش کی ہے کہ سابقہ تفاسیر کے اہم مباحث اس میں جمع کردیں، چنانچہ اس میں لغت، نحو، ادب، بلاغت، فقہ، عقائد، کلام، فلسفہ، ہیئت، تصوف اور متعلقہ روایات پر بھی مبسوط بحثیں کی ہیں، اور کوشش یہ فرمائی ہے کہ آیت سے متعلق کوئی علمی گوشہ تشنہ نہ رہے، روایاتِ حدیث کے معاملے میں بھی علامہ آلوسیؒ دوسرے مفسرین کے مقابلہ میں محتاط رہے ہیں، اس لحاظ سے اس کتاب کو سابقہ تفاسیر کا خلاصہ کہنا چاہئے، اور اب تفسیر قرآن کے سلسلے میں کوئی بھی کام اس کی مدد سے بے نیاز نہیں ہوسکتا،

یہ پانچ تفاسیر احقر کے ناچیز ذوق کے مطابق ایسی ہیں کہ اگر کوئی شخص صرف انہی پر اکتفاء کرلے تو انشاء اللہ مجموعی حیثیت سے اُسے دوسری تفاسیر سے بے نیاز کردیں گی، یہ احقر کی ذاتی رائے تھی، بعد میں اپنے مخدوم بزرگ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب مدظلم العالی کے ایک مقالے سے اس کی تقریباً حرف بہ حرف تائید ہوگئی، فللّٰہ الحمد موصوف اپنے گرانقدر مقالے "یتیمة البیان "میں تحریر فرماتے ہیں:

> چونکہ عمر عزیز کم ہے، آفاتِ زمانہ زیادہ، اور ہمارے دَور میں ہمتیں پست، اور عزائم کمزور ہوگئے ہیں...... اس لئے میں اپنے طالب علم بھائیوں کو چار ایسی تفاسیر کی نشاں دہی کرنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص اُن پر قناعت کرنا چاہے تو وہ انشاء اللہ کافی ہوں گی،
>
> ایک تفسیر ابن کثیرؒ...... جس کے بارے میں ہمارے استاذ (حضرت علاّمہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ) فرماتے تھے کہ "اگر کوئی کتاب کسی دوسری کتاب سے بے نیاز کرسکتی ہے تو وہ تفسیر ابن کثیرؒ ہے جو تفسیر ابن جریرؒ سے بے نیاز کردیتی ہے" دوسری تفسیر کبیر امام رازیؒ جس کے بارے میں ہمارے استاذؒ فرماتے تھے کہ "قرآن کریم کے مشکلات میں مجھے کوئی مشکل ایسی نہیں ملی جس سے امام رازیؒ نے تعرض نہ کیا

Marfat.com

ہو، یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات مشکلات کا حل ایسا پیش نہیں کر سکے
جس پر دل مطمئن ہو جائیں، اور اس کے بارے میں جو کہا گیا ہے کہ
فیہ کل شئی الا التفسیر ، تو یہ خواہ مخواہ اس کی جلالت قدر کو کم
کر کے دکھانا ہے، اور شاید یہ کسی ایسے شخص کا قول ہے جس پر روایات
کا غلبہ تھا، اور قرآن کریم کے لطائف وعلوم کی طرف توجہ نہ تھی، تیسری
تفسیر روح المعانی جو میرے نزدیک قرآن کریم کی ایسی تفسیر ہے جیسے
صحیح بخاریؒ کی شرح فتح الباری، الا یہ کہ فتح الباری ایک کلام مخلوق کی
شرح ہے، اس لئے اس نے شرح بخاریؒ کا جو قرضہ اُمت پر تھا اُسے
چکا دیا ہے، اور اللہ کا کلام اس سے بلند و برتر ہے، کہ کوئی بشر اس کا حق
ادا کر سکے، چوتھی تفسیر ابی السعود ہے، جس میں نظم قرآنی کو بہترین
عبارت میں بیان کرنے پر خاص توجہ دی گئی ہے، اور وہ بسا اوقات
زمخشری کی کشاف سے بے نیاز کر دیتی ہے۔“ (۱)

اس عبارت میں تفسیر قرطبیؒ کو چھوڑ کر انہی چار کتابوں کا تذکرہ انہی خصوصیات کے ساتھ کیا گیا ہے، جو ناچیز کی سمجھ میں آئی تھیں، حضرت شاہ صاحبؒ اور ان کے تلمیذ رشید حضرت بنوری مدظلہم کے ساتھ اس توافق پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوں،

یہ بحث تو عربی تفاسیر کے بارے میں تھی، اردو زبان میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ”بیان القرآن“ اپنے مضامین کے اعتبار سے بے نظیر تفسیر ہے، اور اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب انسان تفسیر کی ضخیم کتابیں کھنگالنے کے بعد اس کی طرف رجوع کرے، البتہ اس کی زبان چونکہ علمی اور اصطلاحی انداز کی ہے، اس لئے عام اردو داں حضرات کو اس کے سمجھنے میں دشواری ہوتی تھی، اسی ضرورت کے پیش نظر احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم العالی نے ”معارف

(۱) ملخص از ”یتیمۃ البیان ، مقدمہ مشکلات القرآن“ ص۲۳و۲۴ طبع مجلس علمی دہلی ۱۳۵۷ھ۔

القرآن'' کے نام سے آٹھ جلدوں میں مفصل تفسیر تحریر فرمائی ہے، جس میں بیان القرآن کی شرح اور تسہیل بھی ہے، اور عصر حاضر کی ضروریاتِ زندگی پر قرآن کریم کی ہدایات کی بہترین وضاحت بھی (اور عصر حاضر کی ضروریاتِ زندگی پر قرآن کریم کی ہدایات کی بہترین وضاحت بھی) اور تہذیب جدید کے مسائل پر قرآنی فکر کے تحت بھر پور تبصرہ بھی، اب تک اردو زبان میں جتنی تفاسیر منظر عام پر آئی ہیں اُنمیں یہ ایک منفرد تفسیر ہے، جس میں سلف صالحین کے مسلک ومشرب کی پوری حفاظت کے ساتھ عصر حاضر کی ضروریات کو بطریق احسن پورا کیا گیا ہے، بحمد اللہ یہ تفسیر عوام وخواص میں بیحد مقبول ہورہی ہے، اوراس سے بڑا فائدہ پہنچ رہا ہے،

آخر میں دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن کریم کی رفعت وعظمت پہچاننے کی توفیق عطا فرمائے، اس کی صحیح فہم کی دولت سے نوازے، اور اس کی تلاوت، اس پر عمل اور اس کی نشرواشاعت کے جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں انہیں ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین،

اَللّٰهُمَّ اٰنِسْ وَحْشَتِیْ فِیْ قَبْرِیْ، اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِیْ بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِیْمِ وَاجْعَلْهُ لِیْ اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّهُدًی وَّرَحْمَةً اَللّٰهُمَّ عَلِّمْنِیْ مِنْهُ مَا جَهِلْتُ وَذَكِّرْنِیْ مِنْهُ مَا نَسِیْتُ وَارْزُقْنِیْ تِلَاوَتَهٗ اٰنَاءَ اللَّیْلِ وَاٰنَاءَ النَّهَارِ وَاجْعَلْهُ لِیْ حُجَّةً یَّا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ

وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا

وَصَلَّى اللّٰهُ تعالیٰ علیٰ سیدنا و مولانا محمد و علیٰ اٰله واصحابه وازواجه واتباعه اجمعین

احقر

محمد تقی عثمانی

دار العلوم کورنگی کراچی نمبر ۱۴ لیلة الجمعة ۱۵/ ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ

کمپوزر: محمد حبیب الرحمٰن علی حسنہ

Marfat.com

کتاب الآثار

مکمل دو جلد

تالیف

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مایہ ناز شاگرد قاضی ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کی

امام صاحب سے مروی احادیث پر مشتمل کتاب...... جدید ترتیب

اور احادیث کی تخریج کے ساتھ پہلی بار کمپیوٹرائز ایڈیشن۔

خصوصیات

خوبصورت ٹائیٹل

بیروت اسٹائل

مضبوط ریگزین جلدیں

ناشر

مکتبہ دار العلوم کراچی

Marfat.com

بحوث
فی
قضایا فقهیہ معاصرہ

مکمل دو جلد

تالیف

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ
کی دورِ جدید کے جدید فقہی مسائل ومباحث پر مشتمل عربی زبان میں
شاندار کتاب

خصوصیات

خوبصورت ٹائیٹل
بیروت اسٹائل
مضبوط ریگزین جلدیں

ناشر
مکتبہ دار العلوم کراچی

Marfat.com

ازالۃ الخفاء
عن خلافۃ الخلفاء

مکمل چار جلد

تالیف

مسند ہند شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی خلافتِ خلفائے راشدین پر مشہور زمانہ کتاب پہلی مرتبہ عربی زبان میں۔

خصوصیات

احادیث وآثار کی مکمل تخریج

خوبصورت ٹائیٹل

بیروت اسٹائل

مضبوط ریگزین جلدیں

ناشر

مکتبہ دار العلوم کراچی

Marfat.com

جواہر الفقہ

فقہی رسائل ومقالات کا نادر مجموعہ

مکمل سات جلد

تالیف

مفتی اعظم پاکستان

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

خصوصیت

خوبصورت ٹائیٹل بمع خوبصورت بکس

ناشر

مکتبہ دار العلوم کراچی

Marfat.com

صاحبِ تصنیف

نام : مولانا محمد تقی عثمانی ابن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ
(مفتی اعظم پاکستان، بانی دارالعلوم کراچی)

ولادت : 5 شوال المکرم 1362ھ (اکتوبر 1943ء)

تعلیم : 1۔ تکمیل درس نظامی دارالعلوم کراچی 1379ھ (1960ء)
2۔ فاضل عربی پنجاب بورڈ 1958ء۔ امتیازی درجے کے ساتھ
3۔ بی اے کراچی یونیورسٹی 1964ء
4۔ ایل ایل بی کراچی یونیورسٹی 1967ء۔ امتیازی درجے کے ساتھ
5۔ ایم اے عربی پنجاب یونیورسٹی 1970ء۔ امتیازی درجے کے ساتھ

تدریس : حدیث وفقہ کے علاوہ مختلف اسلامی علوم کی تدریس، دارالعلوم کراچی 1960ء سے تاحال۔

صحافت : ادارت ماہنامہ ''البلاغ'' 1967ء سے تاحال
ادارت ماہنامہ ''البلاغ انٹرنیشنل'' (انگریزی) 1989ء سے تاحال

مناصب : 1۔ نائب صدر دارالعلوم کراچی 1976ء سے تاحال
2۔ نگراں شعبہ تصنیف وتالیف۔ دارالعلوم کراچی
3۔ جج شریعت اپیلیٹ بنچ۔ سپریم کورٹ آف پاکستان
4۔ نائب رئیس ''مجمع الفقہ الاسلامی'' جدہ، سعودی عرب
5۔ معاشیات اور بنکنگ پر قابل قدر کام کے باعث اسلامی ممالک کے مختلف بینکوں میں (Shariah Supervisory Boards) شریعت نگرانی بورڈز کے ممبر

تصانیف : تصانیف کی فہرست اسی کتاب کے فلیپ پر ملاحظہ فرمائیں۔